کاروانِ زندگی

اوّل

ایک معلّم، مصنّف، مؤرخ و داعی کی سرگزشتِ حیات، جس میں ذاتی زندگی کے مشاہدات و تجربات، احساسات و تأثرات اور ہندوستان اور عالم اسلام کے واقعات و حوادث اور تحریکات و شخصیات کے مطالعہ کا حاصل اس طرح گھل مل گیا ہے کہ وہ ایک دلچسپ و سبق آموز "آپ بیتی" اور ایک مؤرخانہ و حقیقت پسندانہ "جگ بیتی" بن گئی ہے، اور چودھویں صدی ہجری اور بیسویں صدی عیسوی کی تاریخ و سرگزشت کا ایک اہم باب محفوظ ہوگیا ہے، جس سے مؤرخین بیش قیمت فائدہ اور دینی و علمی کام کرنے والے روشنی اور رہنمائی حاصل کرسکتے ہیں۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی

شائع کردہ

مکتبۂ اسلام ۱۴۱/۷۷ اگوئن روڈ، لکھنؤ

بارِ سوم

۱۴۲۰ھ — ۲۰۰۰ء

کتابت ــــــــ ظہیر احمد کاکوروی و محمد الیاس لکھنوی
طباعت ــــــــ کاکوری آفسیٹ پریس لکھنؤ، فون: ۲۲۹۶۱۶
صفحات ــــــــ ۵۱۸
قیمت ــــــــ =/۱۰۰

طابع و ناشر

مکتبۂ اسلام

۱۸۲/۵۴ رؤف مارکٹ ۱۸ گوئن روڈ لکھنؤ

فہرست عناوین
(کاروانِ زندگی)

باب چہارم

باب پنجم

باب نہم

باب دہم

باب یازدہم ۱۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

الحمد للہ والصلاۃ والسلام علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

راقم کے قلم سے عقائد و عبادات، تفسیر آیات اور سیرت طیبہ کے جیسے نازک و پُر عظمت موضوع سے لے کر تاریخ و سیر و سوانح کے مورخانہ اور ذمہ دارانہ موضوع تک، معاصر شخصیتوں کے سوانحی خاکے اور ان کے بارے میں نقوش و تاثرات کے پرخار و دشوار گذار مضمون سے لے کر شعر و ادب و فکر و فن کے جیسے لطیف مضمون تک مستقل کتابیں نکلی ہیں، جن کی تعداد درجنوں تک پہونچ گئی ہے، لیکن اس کو کسی کتاب کے شروع کرنے کے بارے میں اتنا تردد اور ذہنی کشمکش پیش نہیں آئی، جتنی "آپ بیتی" اور اپنی سرگذشت حیات کے شروع کرنے میں پیش آئی، اسی تردد میں کئی سال گذر گئے اور اس پر قلم فرسائی کی ہمت نہ ہوئی۔

اس کے مختلف اسباب تھے، ایک سبب تو یہ کہ "ایاز قدر خود را بشناس" کا روایتی و حکیمانہ جملہ، اس پرخار وادی میں قدم رکھنے سے روکتا تھا۔ سیاست، قیادت، شہرت و مقبولیت، مشیخت، کمال علمی، ان میں سے کوئی چیز ایسی نہ تھی، جو اس تصنیف کے لئے وجہ جواز فراہم کرتی، پھر اس میں اپنے حالات و واقعات کو بیان اور رفقاء کار و معاصرین کا ذکر کئے بغیر (جس سے اگر کوئی آپ بیتی خالی ہو تو بے معنی اور بے جان بن جاتی ہے) اس راہ میں دو قدم بھی

چلا نہیں جا سکتا، اور اس میں قدم قدم پر لغزش اور اپنے بارے میں خود فریبی و خود ستائی، دوستوں اور ساتھیوں کے بارے میں حق تلفی یا مبالغہ آرائی کے الزام کا اندیشہ ہے، پھر کسی زندہ با شعور، صاحب ضمیر انسان سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنی سرگذشت حیات لکھنے وقت گرد و پیش کے واقعات، تحریکات و جماعتوں، حوادث اور سانحات سے آنکھیں بند کر لے گا، خصوصاً جب اس کا تعلق ایسے دین و ملت سے ہو جس میں (اپنی مخصوص ساخت کی وجہ سے) خارجی حالات سے متاثر ہونے اور ان کو متاثر کرنے کی غیر معمولی صلاحیت ہے، پھر ایسے ادارہ اور جماعت و ماحول سے بھی اس کا تعلق ہو جس کی مخصوص اقدار و تصورات کی حمایت حمیّت کے درجہ تک اور ناپسندیدگی قلبی اذیّت کی حد تک پہونچی ہوئی ہے، پھر زمانہ بھی اس کو ایسا ملا ہو جس میں تاریخ صدیوں کی مسافت برسوں کے حساب سے اور برسوں کی مسافت ہفتوں اور دنوں کے حساب سے پوری کر رہی ہو، اور وہ حوادث پیش آ رہے ہوں، جو دنیا کے سیاسی نقشہ ہی کو زیر و زبر نہ کرتے ہوں بلکہ زندگی کا سانچہ اور انسانیت کا حُلیہ ہی بدل رہے ہوں، اور خاص طور پر اس ملت کے حال و مستقبل پر اثر انداز ہو رہے ہوں، جس سے لکھنے والے کی قسمت وابستہ اور قلب و ضمیر مربوط ہیں، ایسی حالت میں قلب کو قلم سے، جذبات کو واقعات سے، اور "جگ بیتی" کو "آپ بیتی" سے الگ کر کے کوئی بڑے سے بڑا غیر جانبدار مؤرخ، اور پیشہ ور داستان گو بھی (جو صرف تفریح طبع کا سامان کرتا ہے) کوئی کہانی سنا نہیں سکتا، جب بھی اس موضوع پر قلم اٹھانے کے لئے عزیز و دوست فرمائش کرتے یا دل میں تقاضہ پیدا ہوتا تو اس راہ کی مشکلات اس خیال سے باز رہنے کی تلقین کرتیں کہ "ناکردن یک عیب و کردن صد عیب" اور بقول شاعر حکیم ؎

"تا مرد سخن نہ گفتہ باشد   عیب و ہنرش نہفتہ باشد

اسی کشمکش میں زمانہ گزرتا چلا گیا، اور اس عرصہ میں وہ عزیز و رفیق بھی دنیا سے رخصت ہو گئے جو اس کا خاص طور پر تقاضہ کرتے تھے، اور جن سے زندگی کے بعض واقعات و حوادث کی تفصیلات و جزئیات اور سنہ و تاریخ معلوم کرنے میں مدد مل سکتی تھی[1]، بعض ایسے محبت کرنے والے بھی رخصت ہو گئے جو اس کو سب سے زیادہ دلچسپی اور ذوق و شوق سے پڑھتے۔

اچانک ماہ دسمبر ۱۹۸۲ء کے آغاز میں میں ایسے تین[3] چار[4] کاموں کی تکمیل سے فارغ ہوا، جنھوں نے مہینوں سے پوری توجہ مرکوز کر رکھی تھی، اور جن کو مکمل کئے بغیر میرے لئے کسی اور موضوع کی طرف توجہ کرنا ممکن نہ تھا، میرے لئے یکسر بیکار رہنا زندگی کا عظیم مجاہدہ اور ایک طرح کی سزا ہے، اس فرصت میں جس کی مدت بہت قلیل اور محدود نظر آتی تھی، اور ابھی کسی بڑے اہم تصنیفی کام شروع کرنے کا پورا سامان نہیں ہوا تھا، دفعتاً خیال آیا کہ میں اس کتاب کا سلسلہ شروع کر دوں، اس کی افادیت کے دو پہلو خاص طور پر سامنے آئے۔

۱۔۔۔ اپنی زندگی کے واقعات اور اپنے ساتھ خدا کا معاملہ دیکھ کر بے ساختہ قرآن مجید کی آیت یاد آتی ہے، ارشاد خداوندی ہے:۔

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي	ہم عنقریب ان کو اطراف (عالم) میں بھی
أَنْفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ	اور خود ان کی ذات میں بھی نشانیاں
أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ	دکھائیں گے، یہاں تک کہ ان پر ظاہر
شَهِيدٌ ○ (سورۂ حٰم السجدہ۔ ۵۳)	ہو جائے گا کہ وہ حق ہے، کیا تم کو یہ کافی نہیں
	ہے کہ تمہارا پروردگار ہر چیز سے خبردار ہے؟

---

[1] ان میں پیش پیش عزیز گرامی قدر مولوی سید محمد ثانی مرحوم تھے، جو اب اپنے پیدا کرنے والے کے یہاں جا چکے ہیں۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

حقیر ذہنی و علمی صلاحیتوں، محدود ماحول، ناسازگار حالات اور قلیل وسائل کے ساتھ رحمت الٰہی کی جو کرشمہ سازی، اور مربّیِ مطلق کی جو بندہ نوازی دیکھی، اس سے والدین کی دعاؤں کی تاثیر، نیک نیت و سراپا شفقت سرپرستوں کی تعلیم و تربیت، شفیق ولائق اساتذہ کی محنت، خدا کے مقبول بندوں کی نظر شفقت، ان کی دلی مسرت اور قلبی اطمینان کا فائدہ اور ان سے انتساب اور ان پر اعتماد کی برکت ظاہر ہوئی، صحیح مقاصد و مشاغل زندگی کے انتخاب (جو توفیق الٰہی کے بغیر ممکن نہ تھا) حد درجہ کی کمزوری، ہمت کی پستی اور طبیعت کی افسردگی کے باوجود، چند اصولوں کی پابندی اور۔ ع

پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

پر عمل کی کوشش کا ثمرہ کھلی آنکھوں دیکھا، خیال آیا کہ اپنی زندگی کی حقیر کہانی کے ذیل میں اگر یہ حقائق پڑھنے والوں کے سامنے آئے تو موعظتُ عبرت کا سامان بھی ہوں گے، اور حوصلہ و ہمت کی بلندی اور خدا سے اچھی امیدیں رکھنے کا سبب بھی، ان حقائق و عِبَر کو ایک سیدھی سادی کہانی اور اپنے اوپر گزرے ہوئے واقعات میں جس طرح دلنشین کیا جا سکتا ہے، ایک پُرجلال علمی مقالہ اور باعظمت دینی خطبہ میں نہیں کیا جا سکتا، خصوصاً ایک کم حیثیت معاصر کی سرگزشت میں زندگی کے تجربے اور واقعات کے جو نتائج سامنے آتے ہیں، وہ بعض اوقات تاریخ کی نامور شخصیتوں اور قدیم العہد اسلاف کی قابل احترام سوانح عمریوں سے نہیں اخذ کئے جا سکتے، اور ان کی تقلید و محاکات کا وہ جذبہ نہیں پیدا ہو سکتا، جو اپنے معاصر یا خورد کی خود نوشت سوانح سے پیدا ہوتا ہے، اس لئے کہ اس میں زمانہ کے تفاوت اور عہد خیر و برکت اور عہد شرور و فتن کے فرق کا عذر نہیں کیا جا سکتا۔

۲ــــ دوسرا سبب یہ تھا کہ بہت سے موضوع، واقعات و حوادث، ادارے و تحریکات

اشخاص اور جماعتیں ہیں، جن کو صرف اپنی سوانح اور سرگذشت میں سمیٹا جا سکتا ہے، اگر ان پر مستقلاً روشنی ڈالی جائے تو ہر ایک کے لئے الگ کتاب کی ضرورت ہے، پھر اس کی مورخانہ ذمہ داریاں اور تصنیفی آداب ایسے ہیں، جو ایسے بہت سے حقائق اور مغز کی بات کو سامنے آنے نہیں دیتے جو "آپ بیتی" اور خود نوشت سوانح میں بے تکلف آسکتے ہیں؛ اس طرح ایک فرد کی سوانح (اگر وہ کسی خیالی دنیا میں نہیں رہتا، اور خدا نے اس کو حالات و ماحول کا شعور بھی عطا فرمایا ہے اور اس سے متاثر ہونے کی صلاحیت بھی اور اس کو دوسروں کے سامنے پیش کرنے کی لیاقت بھی) اس عہد کا مرقع، اور اس کی بولتی ہوئی تصویر بن جاتی ہے، اور اس میں ایک مورخ و مصنف کو بعض اوقات وہ کام کی باتیں مل جاتی ہیں، جو عُرفی تاریخوں اور پُرجلال سوانح عمریوں میں نہیں ملتیں۔

شاید یہ خیال ناچیز مصنف کے لئے عناں گیر ہوتا کہ وہ ایک بدعت کا ارتکاب کرنے جا رہا ہے، اور جو وقت ابھی تک خدا کے مقبول بندوں اور مصلحین و مجدّدین امت کے حالات مرتب کرنے اور ان کے کارناموں کو اجاگر کرنے میں صرف ہوا تھا، اس کو وہ اپنی خود نمائی اور خود ستائی میں صرف کر کے اضاعتِ وقت اور اپنی نامہ سیاہی و فضیحت کا سامان کر رہا ہے، یوں تو نامور عرب ادیبوں اور اہل قلم کے قلم سے اس زمانہ میں بڑی کامیاب دلکش اور پراثر سرگذشتیں اور سوانح حیات نکلی ہیں، جن میں "فجر الاسلام" اور "ضحی الاسلام" کے سلسلہ کے نامور مصنف اور صاحبِ اسلوب مصری فاضل ڈاکٹر احمد امین کی "حیاتی" سب سے فائق ہے، اس سے نہ صرف ان کی زندگی کے واقعات و تجربات، بلکہ ان کے دور کے معاشرہ و تمدن، نظامِ تعلیم و تربیت، اور اس عہد کے مصر کی زندگی کا نقشہ سامنے آجاتا ہے[1]، لیکن

---

[1] ڈاکٹر احمد امین کے علاوہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی "الایام" اور الاستاذ عباس محمود العقاد کی (باقی ص۱۲ پر)

مصنف کی حوصلہ افزائی اور تسکین قلب کے لئے (جس نے ہندوستان کے دینی ماحول میں زندگی گذاری ہے) تنہا یہ مثال کافی نہ تھی کہ خود ہندوستان اور یورپ میں اس نصف صدی میں پچاسوں سرگذشتیں اور "اپنی کہانی اپنی زبانی" لکھی گئیں[۱]، دفعتاً یہاں کے دینی علمی طبقہ کے افراد اور اپنے قابل احترام بزرگوں کی تین مثالیں سامنے آئیں، ایک شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی "نقش حیات" جس کو مولانا نے اپنی زندگی کے حالات لکھنے کے لئے شروع کیا تھا، افسوس ہے کہ صفحہ ۱۳۰ پر جا کر ذاتی حالات کو ختم کر دیا، اور ہندوستان کے اس جہاد آزادی کی تاریخ لکھنی شروع کر دی جس میں ان کے استاد و مربّی شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کا قائدانہ حصہ تھا، اور پھر اسی کی تفصیل، اسباب و محرکات اور پس منظر کے تذکرہ میں کتاب کا دوسرا حصہ بھی ختم ہو گیا۔

دوسری مثال اپنے مخدوم و محترم برکۃ العصر و ریحانۃ الہند شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کی سامنے آئی، جنھوں نے "آپ بیتی" سات حصّوں میں مرتب کی، جو انھیں کے نہیں بلکہ ان کے عہد، ان کے ماحول اور خاص طور پر دینی نظام تعلیم اور اس کے خصائص اور اس کے کارکنوں کے طرز زندگی اور مزاج و کردار کی آئینہ دار بن گئی۔

تیسری مثال مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کی آئی، جنھوں نے اپنے خاص انداز نگارش میں "آپ بیتی" مرتب کی جو موعظت انگیز بھی ہے اور ادب آموز بھی، اور ان کے عہد طفولیت، شباب اور سن کہولت کا ایک "ٹیپ رکارڈ" بھی، ان تینوں مثالوں سے جن سے

(باقی صفحہ ۱۱ کا) "أنا" علامہ محمد کرد علی کی مذکرات ۱-۲-۳ قابل ذکر کتابیں ہیں جن کو عرب اہل دانش وادب کی نئی نسل نے مزے لے لے کر پڑھا ہے۔ [۱] جس میں گاندھی جی کی "تلاش حق" جواہر لال کی "میری کہانی" نواب صاحب چھتاری، سر رضا علی، ظفر حسن ایبک، پروفیسر رشید احمد صدیقی کی کتابیں قریبی زمانہ میں لکھی گئیں

(علیٰ حسب مراتب) عقیدت، مناسبت اور کسی حد تک معاصرت کا بھی شرف حاصل تھا، اس خیال کو تقویت ہوئی اور یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ کام کم سے کم اپنے حلقہ و سلسلہ میں اب بدعت نہیں رہا، اور اگر بدعت بھی ہے تو "بدعت حسنہ" کہلانے کا مستحق ہے۔

اس تصنیف کا محرّک یہ خیال بھی تھا کہ اپنے فکری شعور، ذہنی ارتقاء، تحریر و تصنیف کی تاریخ اور اپنے زمانے کے اہم واقعات و حوادث اور دعوتوں اور تحریکوں کا ذکر کرنے کے سلسلے میں اپنے ان خیالات و افکار، مشاہدات و تأثرات، اور دعوت و تحریک کو اجمالاً و اختصاراً پیش کرنے اور اپنی تحریروں اور کتابوں کے مرکزی نقطۂ خیال اور اُن کے اہم اقتباسات پیش کرنے کا بھی موقع ملے گا جو کثیر التعداد مضامین اور ان کتابوں میں بکھرے ہوئے ہیں، جن کی تعداد اب پچاس[۵] سے اوپر ہو چکی ہے، اور جن پر بیک وقت ہر صاحب ذوق کی نظر پڑنی مشکل ہے۔

مضامین و مندرجات میں معزز ناظرین کو کہیں کہیں اطناب و طوالت نظر آئے گی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ سوانح و تاریخ اور اپنی سرگذشت کا یہ فطری و قدرتی فرق تسلیم کرنا چاہئے کہ دوسروں کی سوانح و سیر میں مصنف ان قابل احترام شخصیتوں کا وکیل اور ان کا ترجمان ہوتا ہے، اور اپنی سرگذشت میں کسی حد تک آزاد اور اپنا ہی وکیل و ترجمان، اس لئے "آپ بیتی" کے مضامین و مندرجات کو توازن و تناسب کے اس پیمانے سے ناپنا صحیح نہیں ہوگا جس پیمانے سے سوانح اور تذکروں کے مضامین کو بالعموم ناپا جاتا ہے، "آپ بیتی" کے مصنف کو اس کی اجازت دینی چاہئے کہ وہ اپنے نقطۂ نظر اور اپنی زندگی پر اثر انداز ہونے اور اپنے نزدیک اہم سمجھنے کے مطابق اختصار و اطناب اور اجمال و تفصیل سے کام لے، ورنہ سوانح و سرگذشت میں کوئی فرق نہیں رہ جائے گا۔

اتفاق سے بعض طبّی ضرورتوں کی بناء پر مجھے مہینہ دو مہینے کا راحت و فراغت کا وقت مل گیا جس میں مَیں اپنے مستقر اور کتابی ذخیرہ سے دور ہونے کی بنا پر کوئی ایسا کام نہیں کرسکتا تھا جس میں کتابوں کی طرف بار بار رجوع اور کثیر التعداد مآخذ کی ضرورت پڑتی ہے، میں نے یہ کام "دائرۂ شاہ علم اللہؒ" میں دسمبر ۸۲ء کے دوسرے ہفتہ سے شروع کردیا، اور اس کا سلسلہ جنوری ۸۳ء میں ریاست کرناٹک میں بھٹکل کے مقام اور بمبئی کے پُرسکون وصحت افزا ماحول میں جاری رہا، اور اس کی تکمیل پھر ماہ مارچ ۸۳ء میں رائے بریلی میں اپنے قیام گاہ "دائرہ شاہ علم اللہؒ" میں ہوئی جہاں وہ پُرانی یادداشتیں اور تحریریں موجود تھیں جن کے بغیر اس کام کی تکمیل نہیں ہوسکتی تھی۔

میں نے اس زمانہ میں جس کی مہلت بہت محدود تھی اپنے کو اس کا پابند کیا کہ صرف نصف صدی ۱۵ء سے ۶۵-۶۶ء تک کی روئیداد قلم بند کرلوں، اس کے بعد اگر زندگی نے وفا کی اور توفیق الٰہی شامل حال رہی تو میں خود اس کی تکمیل کردوں گا ورنہ کوئی عزیز اس کام کو انجام دے گا اور اگر وہ حصہ رہ بھی گیا تو مجھے زیادہ قلق نہ ہوگا کہ اہم اور بنیادی حصہ اس کتاب میں آگیا ہے۔

ابوالحسن علی حسنی ندوی

دائرۂ شاہ علم اللہؒ تکیہ کلاں رائے بریلی

۹-۶-۱۴۰۳ھ
۲۵-۳-۱۹۸۳ء

باب اوّل

خاندان، وطن، ماحول، بچپن، عہد طفلی کے چند نقوش و تاثرات

خاندانی حالات میں تاریخی مواد و معلومات کی فراوانی

خاندان کے حالات، اس کی شرافت و نجابت، اور اس کی نامور شخصیتوں کے کارناموں کو اجاگر کرنے میں دراز نفسی، اور وقائع نگاری کے ساتھ انشاء پردازی اور جذباتیت کا شامل ہو جانا، ان اہل قلم اور مصنفین و مورخین کی پرانی کمزوری ہے (اور شاید کسی قدر فطری اور نفسیاتی) جو خوش قسمتی سے کسی ایسے خاندان میں پیدا ہوتے ہیں، جس کی عالی نسبی معروف ہوتی ہے، اور جو ہر دور میں، یا ایک طویل عرصہ تک ممتاز شخصیتیں اور اہل کمال پیدا کرتا رہا ہے، شاید اسی بناء پر ہندوستان میں فارسی کا قدیم طنزیہ جملہ "پدرم سلطان بود" مشہور ہے۔

لیکن یہاں راقم سطور کو اس لئے اس کی ضرورت نہیں ہے کہ ضلع رائے بریلی کے حسنی قطبی[۱] سادات کے خانوادے کے انساب، قدیم تاریخ، اور اس کی نامور شخصیتوں کے تعارف پر اتنا تاریخی مواد منظر عام پر آچکا ہے کہ اب "آپ بیتی" میں اس کو از سر نو پیش کرتے، یا اس پر کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں، غالباً ہندوستان میں سادات کی دو شاخوں (بلگرام کے حسینی واسطی سادات، اور

---

[۱] امیر کبیر سید قطب الدین محمد المدنی (متوفی ۶۷۷ھ) کی طرف انتساب کی وجہ سے (جن سے ہندوستان میں اس خاندان کی بنیاد پڑی) اس خاندان کے لوگ سادات قطبیہ بھی کہلاتے ہیں۔

رائے بریلی کے حسنی قطبی سادات) پر جتنا تاریخی مواد موجود ہے اور ان کے انساب، حالات وکمالات پر جتنی مؤرخانہ اور عالمانہ کتابیں لکھی گئی ہیں، سادات کے دوسرے خاندانوں اور دوسری شاخوں پر (ہمارے محدود علم میں) کم لکھی گئی ہوں گی، اس کا سبب ان دونوں خاندانوں کا کوئی نسبی امتیاز اور علوئے خاندانی نہیں، اور نہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دوسری شاخوں میں اہل کمال اور مشاہیر رجال پیدا نہیں ہوئے، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان دونوں شاخوں میں تاریخی ذوق رکھنے والے مورخ واہل قلم، اور اپنے خاندان کا تعارف، ان کے آثار باقیہ کی حفاظت کا شوق، اور شیخ سعدیؒ کی اس نصیحت ؎

نام نیکِ رفتگان ضائع مکن

تا بماند نام نیکت پائیدار

پر عمل کرنے والے تقدیر الٰہی سے زیادہ پیدا ہوئے۔

بلگرام کے واسطی سادات میں مورّخ ہند علامہ میر غلام علی بلگرامی (متوفی ۱۲۰۰ھ) پیدا ہوئے جنھوں نے "مآثر الکرام" "خزانۂ عامرہ" "ید بیضاء" اور "سرو آزاد" خصوصاً "مآثر الکرام" کے ذریعہ اپنے خاندان، بلکہ بلگرام کو زندہ جاوید بنا دیا، اور رائے بریلی کے حسنی خاندان میں مولانا سید نعمان (عم معظم حضرت سید احمد شہیدؒ) مولوی حکیم سید فخر الدینؒ، اور آخر میں مورخ ہند مولانا حکیم سید عبدالحیؒ (مصنّف "نزہۃ الخواطر") نے اس خاندان کے انساب کو محفوظ تاریخ کو مدوّن اور اس کے نامور فرزندوں کے کارناموں کو اپنی فارسی، عربی، اردو تصنیفات کے ذریعہ عوام وخواص تک پہونچا دیا، مولانا سید نعمان صاحب کی "اعلام الہدیٰ" مولوی حکیم سید فخر الدین صاحب کی "سیرۃ السادات" "سیرت علمیہ" اور "مہر جہانتاب" مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب کی "تذکرۃ الابرار" اور "نزہۃ الخواطر" (۱-۸) نے اب اس خاندان کو عرصہ تک کسی نئے تعارف اور نئی تاریخی تحقیقات سے مستغنی کر دیا ہے۔

حسنی قطبی سادات کے عمومی تعارف اور اس پر تحقیقی و تاریخی کام کی فراوانی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں تیرھویں صدی ہجری کے آغاز پر حضرت سید احمد شہیدؒ کی جیسی تاریخ ساز اور عہد آفریں شخصیت پیدا ہوئی جس نے کم سے کم تحتی برّاعظم ہندوستان کے مسلمانوں، اور اپنے بعد کے آنے والے مصنفین و مورخین کو (جن میں غیر مسلم اہل قلم و مصنفین بھی شامل ہیں) نہ صرف اپنی شخصیت، حیات، اور کارناموں کی تحقیق و تاریخ کی طرف متوجہ اور ان کی علمی و تحریری صلاحیتوں کو اس موضوع پر مرکوز کر دیا، بلکہ قدرتاً پورے برّصغیر بلکہ عالم اسلام کی نگاہیں اس خاندان اور اس کے مرکز و مسکن کی طرف اٹھ گئیں جس نے ان کی سی شخصیت پیدا کی، اور ضمناً ان کے ساتھ ان کا خاندان، ان کے آبائے کرام، اور وہ خاندانی ماحول بھی روشنی میں آگیا جس میں ان کا نشو و نما ہوا تھا، بعد میں مولانا حکیم سید عبد الحی صاحبؒ کی شخصیت نے اس خاندان کی شہرت و عزت میں اضافہ کیا، اور جس نے ہندوستان کے پانچ ہزار کے قریب مسلمان ناموروں کا عرب اور علمی دنیا سے تعارف کرایا "الجزاء من جنس العمل" کے اصول سے اس کا ان کو یہ صلہ ملا کہ ان کی زندگی، حالات و خدمات بھی، اور ضمناً ان کا خاندانی تعارف بھی اردو، عربی میں تفصیل کے ساتھ سامنے آگیا،[1] اس کے بعد خاندان کے متعلق قدرے تفصیل سے لکھنا اور بھی غیر ضروری ہو گیا۔

---

[1] اردو میں راقم کی کتاب "حیات عبد الحیؒ" شائع کردہ ندوۃ المصنفین دہلی، اور عربی میں دار الشروق جدّہ کی شائع کردہ کتاب "حیاۃ العلامۃ عبد الحی الحسنی" تالیف ڈاکٹر سید قدرت اللہ حسینی استاد فاروق کالج کالی کٹ جس پر ڈاکٹر عبد الحلیم عویس پروفیسر کلیۃ العلوم الاجتماعیۃ جامعۃ الامام محمد ابن سعود ریاض کا فاضلانہ مقدمہ بھی ہے، خاص طور پر قابل ذکر ہیں، علامہ خیر الدین زرکلی کی شہرۂ آفاق کتاب "الاعلام"، اور اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور میں بھی ان کا تذکرہ و تعارف ہے، متفرق تعارفی مضامین اس کے علاوہ ہیں۔

کوئی خاندان عروج وزوال کے عالمگیر قانون سے مستثنیٰ نہیں

یہاں پر اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ کم سے کم ہندوستان میں جس خاندان کی تاریخ یا تذکرہ پڑھا جائے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خاندان سرتاپا بے عیب، ہر کمزوری وخامی سے مبرّا، اور دینی، اخلاقی، روحانی اور معاشرتی لحاظ سے ایک معیاری اور مثالی خاندان تھا، جس کی نظیر ڈھونڈھنے سے بھی نہیں مل سکتی، نیز پڑھنے والے کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس میں ابتداء سے اس وقت تک یکساں حالت رہی ہے، اور کہیں کہیں پڑھنے والے کو یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ اس خاندان میں صرف ولی، عبقری (جینیس) اور عام سطح انسانی سے بلند غیر معمولی انسان ہی پیدا ہوتے رہے، اور خلاصہ یہ کہ "ایں خانہ تمام آفتاب است۔"

حالانکہ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ اقوام وملل، اور خاندان اور خانوادے یکساں طور پر نشیب وفراز، عروج وانحطاط، علمی ودینی کمال، اور اخلاقی زوال دونوں کا نشانہ رہتے ہیں، اور ہر دور میں دونوں حالتوں کی مثالیں ملتی ہیں، زمانہ کی سرد وگرم ہوائیں، سازگار اور ناسازگار فضا، حکومت ومعاشرے کے انقلابات، مربّیوں کی تربیتی جد وجہد، اور اس سے تغافل، اور رخصت وعزیمت کے فطری رجحانات نئی نسلوں پر یکساں عمل کرتے رہے ہیں، اور ان کے اثر سے کبھی مردم خیزی، اور مرد آفرینی کا دور نظر آتا ہے، اور زبانِ حال مجبور ہو کر کہنے لگتی ہے کہ ؂

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست!

اور کبھی قحط الرجال کا ایسا منظر نظر آتا ہے کہ زبانِ حال بے ساختہ گویا ہو جاتی ہے کہ ؂

گوئے توفیق وسعادت درمیان افگندہ اند
کس بمیدان درنمی آید سواراں راچہ شد؟

اس سنت اللہ اور قانون فطرت سے نہ کوئی ملت مستثنیٰ ہے نہ کوئی خاندان :۔

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى (سورۂ النجم۔ ۳۹، ۴۰)	اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے اور یہ کہ اس کی کوشش دیکھی جائے گی۔

اور :۔

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ۔ (سورۂ النسا۔ ۱۲۳)	(نجات) نہ تو تمہاری آرزوؤں پر ہے اور نہ اہلِ کتاب کی آرزوؤں پر، جو شخص بُرے عمل کرے گا اسے اسی (طرح) کا بدلہ دیا جائے گا۔

اور :۔

اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (سورۂ الاسراء۔ ۲۱)	دیکھو ہم نے کس طرح بعض کو بعض پر فضیلت بخشی ہے۔

کا عالمگیر قانون اقوام وملل پر بھی حاوی ہے اور خاندانوں اور افراد پر بھی نافذ اور منطبق، اسی حقیقت کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس طرح واضح فرمایا کہ "من ابطأ بہ عملہ لم یسرع بہ نسبہ" (جس کو اس کے عمل نے پیچھے ڈال دیا، اس کو اس کا نسب آگے نہیں بڑھا سکتا۔)

ہمارے خاندان کا معاملہ بھی یہی ہے کہ وہ عروج وزوال، اور رخصت وعزیمت

دونوں دوروں سے گذرا ہے، اس کی گزشتہ اور موجودہ نسل، اور ایک ہی عہد اور ایک ہی جگہ کے افرادِ خاندان میں عظیم تفاوت رہا ہے، اس میں مختلف وقتوں میں دینی و اخلاقی کمزوریاں بھی یقیناً آئی ہوں گی، اور وہ زمانہ کے اثرات سے کُلّیۃً کبھی محفوظ نہیں رہا ہوگا، خود میں نے بدوِشعور سے جو زمانہ پایا، اس میں بھی بہت سی کمزوریاں نظر میں آئیں، دین سے غفلت بھی دیکھی، دنیا سے محبت بھی، خاندانی تنازعات (جو کبھی مقدمہ بازی تک پہونچا دیتے) ایک دوسرے کا مقاطعہ (جو بعض اوقات سالہا سال تک قائم رہتا اور جس سے صرف غمی کے موقعہ اور کسی عزیز کی وفات ہی مستثنیٰ ہوتی) علم دین کے حصول سے غفلت اور جدید تعلیم و دنیوی ترقی کا شوق و جذبہ، بہت سی سنتوں کا ترک، اور تقریبات میں متعدد غیر اسلامی رسوم کا رواج زمینداری، اور مغربی تعلیم کے کھلے ہوئے اثرات دیکھنے میں آئے۔

چند تاریخی خصائص

لیکن اس ناہمواری کے باوجود جو حیات انسانی کا خاصّہ، فطرت انسانی کا تقاضہ اور اقوام و ملل، اور خاندانوں کی تاریخ یا تقدیر ہے، خاندان کی گزشتہ تاریخ پر جس قدر نظر ڈالی، اور اس کا موجودہ دور جو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا، اس میں چند باتیں قدرِ مشترک (COMMON FACTORS) کے طور پر نظر آئیں، ازراہ انصاف ان کا تذکرہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے، جہاں تک اپنے دل و دماغ کو ٹٹولتا ہوں، اور احتساب نفس سے کام لیتا ہوں، ان کے تعیّن اور ذکر میں خاندانی عصبیت، اور جذباتی عقیدت (جس سے محفوظ و آزاد رہنا حقیقتاً بہت مشکل ہے) نظر نہیں آتی" والغیبُ عند اللہ تعالیٰ"

۱۔ خاندان کی جتنی تاریخ محفوظ ہے، اور اس کے حالات کا جتنا علم ہو سکا ہے،

اس خاندان نے اپنے نسب کی حفاظت اس غلو و مبالغہ کی حد تک کی ہے جس کا نہ شریعت نے مکلّف کیا ہے اور نہ بہت سے ممالک بالخصوص بلاد عربیہ میں (جہاں سے سادات و شیوخ کے خاندان آئے) اس کو ضروری سمجھا گیا ہے، شاید اس کی وجہ ہندوستان کی آب و ہوا، یہاں کا معاشرتی و طبقاتی ڈھانچہ، اور غیر مسلم اکثریت کے اس ملک میں اپنے خصائصِ خاندانی، روایات، اور خون کی حفاظت کا جذبہ ہو، جس کی ضرورت یہاں اکثر عربی النسل خاندانوں نے محسوس کی، غلو اور مبالغہ اس لئے کہتا ہوں کہ اس خاندان نے ہمیشہ سادات ہی میں یا کبھی کبھی معروف النسب شیوخ میں رشتہ کرنا ضروری سمجھا، اور اگر کبھی کسی نے کھلے طریقہ پر کسی غیر کفو سے شادی کر لی تو خاندان نے اگرچہ اس کو برادری میں شامل رکھا، اور اخوت و مساوات کا معاملہ کیا لیکن مصاہرت و ازدواجی تعلقات منقطع کر لئے، اور نسب نامہ میں اس فردِ خاندان کے نام کے ساتھ اس اصول سے انحراف کی نشاندہی کر دی[1]، اور یہ بات خاندان کے لوگوں کو ہمیشہ معلوم رہی۔

اس کا اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ خاندانی خصائص و روایات کا تسلسل بڑی حد تک قائم رہا، اور خاص طور پر عقائد میں کوئی فرق نہیں آیا، اور مشرکانہ اعمال و بدعات داخل نہیں ہونے پائے، بعد میں اس میں اتنا غلو اور ہوا کہ دائرہ سمٹتے سمٹتے بہت محدود ہو گیا، اور اس کا اثر اولاد کی صحت جسمانی، قویٰ، اور ذہنی ملکات پر پڑا، اور بعض امراض متوارث ہو گئے، اس موقعہ پر اتالیق امت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی وہ ہدایت یاد آتی ہے، جو انھوں نے عرب کے ایک قبیلہ کو فرمائی تھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ اس کے افراد نمایاں طریقہ پر ضعیف و نحیف اور پستہ قامت ہیں، فرمایا "مالکم ضویتم" (کیا بات ہے تم اتنے سکڑ کیسے گئے؟) انھوں نے کہا

---

[1] ملاحظہ ہو "سیرۃ السادات" از مولوی حکیم سید فخر الدین صاحب خیالیؔ

"قدیب امہاتنا من اٰبائنا یا امیر المؤمنین"! (امیر المومنین! ہمارے والدین کی آپس میں قدیم اور مسلسل قرابت اس کا سبب ہے) فرمایا "اغربوا التجبوا" (ذرا باہر نکل کر شادی کرو، اولاد قوی اور ہونہار پیدا ہوگی) اس بارے میں دونوں جانب قوی دلائل اور متضاد تجربے ہیں، اور ہر زمانہ اور ہر عہد کے لئے ایک کلیہ قائم کرنا مشکل ہے۔

۲- جہاں تک خاندان کے تذکرے، اور معاصر تاریخ بتاتی ہے، یہ حقیقت نظر آتی ہے کہ یہ خاندان اپنی آمد ہندوستان کے وقت سے لے کر (جو حضرت امیر سید قطب الدین محمد المدنی کے ذریعہ ساتویں صدی ہجری کے وسط میں ہوئی) میرے شعور کے وقت تک خالص عقیدۂ توحید پر قائم، مشرکانہ اثرات سے محفوظ، بدعات سے مجتنب اور تشیّع کے اثرات سے دور رہا،[1] توحید اور اتباع سنت کی دعوت، اس کا عام طور پر شعار اور خصوصیت رہی، اس کی ایک کھلی ہوئی دلیل یہ ہے کہ اس خاندان کے کسی بزرگ کی (جن میں سے بعض اپنے عہد کے مرجع خلائق اور معروف و مسلّم مشائخ و اولیاء میں سے تھے) قبر پختہ اور اس پر گنبد و عمارت نہیں ہے، اگر کہیں کسی قبر کے پختہ یا چار دیواری ہونے کا استثناء ہے، تو وہ سیلاب سے حفاظت، یا بعد کے کسی متوسّل کا عمل ہے، اسی طرح خاندان میں کبھی کسی دور میں کسی بزرگ کے عُرس کا منانا سنا نہیں گیا، نہ کسی شاخ میں فاتحہ، قُل، تیجے، یا چالیسویں کا رواج ہے، اور جہاں تک اس خاندان کے سب سے بڑے مرکز نصیر آباد (ضلع رائے بریلی) اور دائرہ شاہ علم اللہؒ (شہر رائے بریلی) کا تعلق ہے، وہاں قبریں ایسی خام، اور بغیر کسی لوح اور کتبے کے ہیں، جیسی سعودی حکومت کے بعد جنۃ البقیع مدینہ طیبہ، اور جنۃ المعلیٰ مکہ معظمہ میں نظر آتی ہیں، میرے علم کی حد تک اب بھی خاندان میں

---

[1] حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ اس خاندان کے ایک بزرگ مولانا سید محمد معین کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:
"سنی شریف کہ یکے از نوادر است در خاندان حضرت سید بحشم شاہد کردیم" (مکتوب ۱۳ مجموعہ مکاتیب حضرت شاہ ولی اللہ، کتبخانہ جانڈ پور)

(اللہ نظر بد سے بچائے) کتنی ہی علمی کوتاہیاں اور اخلاقی کمزوریاں ہوں، شرک و بدعت سے خاندان محفوظ ہے" والعلم عند اللہ تعالیٰ"۔

۳۔ خاندانی تذکرے اور انساب کی مفصل کتابوں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان کا ایک امتیازی وصف جو اس کے اکثر تاریخی عہدوں میں قائم رہا، مردانگی، حمیّت دینی اور جذبۂ جہاد ہے، جس کو مجموعی طور پر عربی زبان کا قدیم لفظ "فُتُوَّۃ" یا تھوڑے فرق و اختلاف کے ساتھ یورپ کے قرون وسطی کی اصطلاح (CHIVALRY) ادا کرتی ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ اس خاندان کی تاریخ میں بار بار ان اولوالعزم قائدین یا مجاہدین کے نام آتے ہیں، جنھوں نے اپنے اپنے زمانہ میں جہاد میں حصہ لیا، اور شہادت سے سرخ رو ہوئے، شاہ علم اللہ صاحبؒ کے تین صاحبزادے جہاد میں شریک ہوئے، اور دو پوتے میر عظیم الدینؒ بن سید آیت اللہؒ اور سید محمد جامعؒ بن میر محمد احسن بن سید آیت اللہؒ اور ایک بھتیجہ اور داماد سید عبدالرحیم بن سید ہدایت اللہ شہید ہوئے۔[1]

حضرت شاہ ابو سعیدؒ جو حضرت شاہ علم اللہؒ کے پر پوتے، اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کے خواص اصحاب، اور ان کے سلسلہ کے خلفائے اجل میں سے تھے، مجاہدانہ جذبات کے حامل، اس ملک میں اسلام کے بقا و ارتقا کے لئے فکرمند اور ان مساعی میں سرگرم و کوشاں رہتے تھے، جو ان میں قوت و اتحاد پیدا کرے، حضرت سید محمد نعمان کے ایک مکتوب سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ خطرہ میں پڑ کر اور رزمگاہ میں خود جا کر دو متقابل مسلمان طاقتوں کو مزید تصادم اور نبرد آزمائی سے بچا لیا تھا، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے اس پر بڑی خوشنودی کا اظہار فرمایا، سید نعمانؒ اپنے اس مکتوب میں جو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی وفات کے

---

[1] تذکرۃ الابرار، وسیرۃ السادات (سیرت سید احمد شہیدؒ ۱۔ ص ۹۳-۹۴)

عین بعد شاہ ابوسعید صاحب کو لکھا ہے، تحریر فرماتے ہیں:۔

الحمد للہ رضامندی حضرت صاحب	بحمد اللہ حضرت مرحوم کی جناب سے
قدس سرہٗ ازاں صاحب و توجہات عالیہ	رضامندی، اور آپ کے حال پر
برحال ایشاں زیادہ تر از حد بیان	آں جناب کی توجہات عالیات
یافتہ اکثر او قات استفسار احوال سامی	میں نے جتنی پائیں، وہ بیان میں
فرمودند، و ماجرائے غارت گری ابدالیاں	نہیں آسکتیں، ابدالیوں کی غارت گری
و رسیدن آں صاحب در عین رستخیز	کا واقعہ، آپ کا عین ہنگامہ میں
و انطفا یافتن التہاب نہب بسبب	پہنچ جانا، لوٹ مار کی آگ کا فرو
قدوم گرامی از زبان دُرفشاں مودّی	ہو جانا زبان مبارک سے ارشاد
ساختند۔[1]	فرمایا۔[2]

خاندانی روایتوں، اور حضرت سید احمد شہیدؒ کے تذکروں سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ سلطان شہید (سلطان ٹیپو) جو۔ ع

ترکش ما را خدنگ آخریں

کا مصداق صحیح، اور ہندوستانی مسلمانوں کی خودداری، مؤمن کی فراست، اور مجاہد کی غیرتِ ایمانی کی آخری نشانی تھے، اور جس نے "گیدڑ کی سو سالہ زندگی پر شیر کی ایک دن کی زندگی کو ترجیح" دے کر[3] انگریزی افواج کے مقابلہ میں سرنگا پٹن کے معرکہ میں شہادت[4] سے سُرخرو ہو کر

---

[1] مجموعہ آثر الابرار قلمی [2] جس واقعہ کی طرف اشارہ ہے، اس کی تفصیل معلوم نہیں ہو سکی۔

[3] سلطان شہیدؒ کا مشہور تاریخی مقولہ [4] سلطان کی شہادت شاہ ابوسعید صاحب کی وفات کے ۲۱ سال کے بعد ہوئی، اس وقت سید صاحب کی عمر ۱۴ سال تھی۔

مسلمانوں بلکہ پورے ہندوستان کی عزت رکھ لی، وہ اور ان کا خاندان حضرت شاہ ابوسعیدؒ اور ان کے جلیل القدر فرزند حضرت شاہ ابواللیث سے (جو سید شہیدؒ کے حقیقی ماموں تھے) بیعت وارادت کا تعلق رکھتے تھے، خود حضرت شاہ ابواللیث صاحب کا سفر حج سے واپسی ۱۲۰۸ھ میں (ٹیپو سلطان م ۱۲۱۴ھ/۱۷۹۹ء کی حیات میں) کوڑیا ربندر پر (جو اب منگلور ریاست کرناٹکا کہلاتا ہے، اور اس وقت ٹیپو سلطان کی قلمرو میں شامل تھا) اترنا، اور مختصر علالت کے بعد وفات پانا، اور وہیں مدفون ہونا بتاتا ہے کہ اس مجاہد خاندان کے حضرت شاہ علم اللہ صاحبؒ کی اس شاخ، اور سید صاحبؒ کے اجداد مادری سے عقیدت وارادت کے مستحکم تعلقات تھے، اور کیا عجب ہے کہ اس تعلق نے بھی اس جذبہ اور کردار کی تشکیل و تربیت میں حصہ لیا ہو، جس کا اظہار اس خاندان کے انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار سے نفرت، اور اس کے ازالہ کے لئے جان کی بازی لگا دینے کی شکل میں ہوا، سید صاحبؒ کے سوانح و حالات کے معتبر و قابل وثوق دفتر "وقائع احمدی" میں جو نواب وزیر الدولہ مرحوم والی ریاست ٹونک کی ہدایت پر شرکائے جہاد، اور اہل قافلہ کے چشم دید واقعات، اور باوثوق روایات کی مدد سے مرتب ہوا، سید صاحب کے سفر حج (۱۲۳۶ھ) کے سلسلہ اور کلکتہ کے قیام کے ضمن میں آتا ہے۔

"ایک روز سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں محمد قاسم نام ایک خواجہ سرا آئے، اور سلام کے بعد عرض کیا کہ "یہاں شہر میں سلطان ٹیپو کے جو شہزادے نظر بندوں کے طور پر رہتے ہیں، انھوں نے جب سنا کہ تکیہ کے ایک پیرزادہ صاحب منشی امین الدین کے باغ میں اترے ہیں، تو انھوں نے مجھ سے فرمایا کہ تم جا کر ان کا حال دریافت کرو کہ وہ کس کی اولاد میں ہیں؟ کیونکہ سید ابوسعید اور سید ابواللیث مرحوم و مغفور ہمارے خاندان کے مرشدوں میں ہیں، ان کا مکان بھی وہیں ہے، اگر اسی خاندان کے کوئی صاحب ہیں،

تو ہم بھی ان کی قدم بوسی سے شرف یاب ہوں۔

سید صاحب نے فرمایا کہ "سید ابو سعید صاحب تو ہمارے حقیقی نانا اور سید ابو اللیث صاحب کے ماموں تھے۔

...... دوسری بار اسی دن یا اگلے روز محمد قاسم خواجہ سرا پھر آئے اور ان شاہزادوں کا پیام آپ کے پاس لائے کہ شاہزادوں نے آداب و تسلیمات کے بعد عرض کیا ہے کہ "آپ تو ہمارے خاندان کے پیر و مرشد ہیں، ہم لوگوں کی بڑی بے نصیبی ہے کہ تمام اہل شہر آپ کے شرف بیعت سے مشرف ہوئے اور ہم اب تک اس نعمت عظمیٰ سے محروم ہیں، آپ ضرور غریب خانہ پر تشریف لائیں، اور اپنے دیدار فیض آثار سے ہم کو محظوظ فرمائیں[1]"

اس کے بعد ان شہزادوں اور خاندان کی بیگمات کی بیعت و ارادت اور اس کے اثرات و برکات کا تفصیل سے ذکر ہے[2]۔

یہ وصف اس خاندان نے تیرہویں صدی ہجری کے وسط تک نمایاں طریقہ پر قائم رکھا، اور کچھ تعجب نہیں کہ حضرت سید احمد شہیدؒ کے ذہنی نشو و نما اور سیرت کی تشکیل میں اس کا بھی حصہ رہا ہو، اسی کا اثر تھا کہ سید صاحب کی تحریک جہاد میں اس خاندان کے افراد اور ان کے قریبی اعزہ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، سید صاحب کے ساتھ ان کے تین بھانجے سید حمید الدین، سید احمد علی، اور سید عبد الرحمٰن، ایک نواسہ سید حسن مثنیٰ ابن سید احمد علی، اور متعدد افراد خاندان جن میں سید ابو محمد، اور سید ابو الحسن نصیر آبادی کا خاص طور پر نام آتا ہے، گئے، جن میں سید احمد علی

---

[1] وقائع احمدی (قلمی) محفوظہ کتب خانہ ندوۃ العلماء۔ لکھنؤ ص ۸۹۸-۹۰۵

[2] ملاحظہ ہو "سیرت سید احمد شہیدؒ" حصہ اول ص ۳۲۵-۳۳۰

اوران کے نوجوان صاحبزادہ سید حسن مثنیٰ، اور دو دوسرے اعزہ سید ابو محمد اور سید ابوالحسن نے بڑے مردانہ اور دلیرانہ طریقہ پر شہادت حاصل کی، خاندان مجموعی طور پر اس تحریک کا مؤید اور ہم نوا تھا، اور اسی رشتہ اور جذبہ پر ٹونک کے محلہ قافلہ کی بنیاد پڑی، اور آخر آخر تک وہاں کے رہنے والوں کے دلوں کے خاکستر میں یہ چنگاری فروزاں رہی، یہی جذبہ اور دینی حمیت تھی جس نے سید صاحب کے بھانجے سید احمد علی صاحب شہید کے ایک صاحبزادہ سید ابوالقاسم ٹونکی کو مصر اور بہنسا کی فتوحات کو "مقام الاسلام" کے نام سے نظم کرنے پر آمادہ کیا، پھر دوسرے بھانجہ سید حمید الدین صاحب کے پوتے منشی سید عبدالرزاق صاحب کلامی (ابن سید محمد سعید بن سید حمید الدین) سے "صمصام الاسلام" کے نام سے فتوح الشام کا وہ جوش آفریں شاہنامۂ اسلام نظم کرایا، جو ۲۵ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ رستخیز میں بھی اس خاندان کی ہمدردی اور جذبات اپنے ان ہم وطنوں کے ساتھ تھے، جو انگریزوں سے نبرد آزما تھے، اسی کے نتیجہ میں اس خاندان کے ایک ممتاز فرد میرے دادا مولوی حکیم سید فخر الدین صاحب کو عرصہ تک بعض دیہاتوں میں مستور و مخفی رہنا پڑا[1]، اس دور میں خاندان کے باصلاحیت افراد نے انگریزی حکومت کا متوسل ہونے کے بجائے، بندیل کھنڈ کی ہندو ریاستوں، ناگود، ریواں وغیرہ سے، اور مسلم ریاستوں حیدرآباد اور بھوپال و ٹونک سے تعلق ملازمت کو ترجیح دی ہے۔

۴۔ خاندان کے اکثر افراد کے حالات کے مطالعہ، اور بار بار پیش آنے والے واقعات اور تجربات سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان کے افراد میں (خواہ اس کو کلیہ قرار نہ دیا جائے جس میں کوئی استثناء نہیں) اکثر اور بالعموم اس صفت کی کمی نظر آتی ہے جس کو

---

[1] ملاحظہ ہو "مہر جہاں تاب" فارسی قلمی محفوظہ کتب خانہ ندوۃ العلماء۔

چالاکی" "سیاسی ذہانت" اور عربی کے بلیغ لفظ "شطارۃ" سے ادا کیا جاتا ہے، ان میں ایک طرح کی (بغیر غباوت و بلادت کے) سادہ دلی یا بھولا پن پایا جاتا ہے اور عام حالات میں ان میں ظالم بننے سے زیادہ مظلوم بننے، کسی کو نقصان پہونچا کر نفع حاصل کرنے سے زیادہ کھونے اور نقصان اٹھا لینے کی صلاحیت کا پتہ چلتا ہے، اس میں یقیناً ہر دور میں استثناءات رہے ہوں گے اور "وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِي إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ" کا قول جس طرح فرد کے حسب حال ہے، اسی طرح جماعتوں اور خاندانوں کے بھی ہونا طبعی اور ہر طرح سے قرین قیاس ہے، اس خاندان کے افراد سے مختلف زمانوں میں بڑی بڑی زیادتیاں بھی ہوئی ہوں گی، حقوق کی پامالی اور حدود سے تجاوز بھی بعید از قیاس نہیں، لیکن اس سے اس غالب و عمومی خاندانی مزاج و کردار (CHARACTER) کے تعین میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کہ اس کا تعلق اکثریت سے ہے نہ کہ کلّیہ سے۔

۵۔ خاندان کے انساب و تاریخ اور محفوظ تذکروں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس خاندان کا رشتہ ہمیشہ کسی نہ کسی طرح سے شریعت اور طریقت سے مربوط رہا، اور اس میں ایک طرف علمائے ربّانی پیدا ہوتے رہے تو دوسری طرف مشائخ روحانی، جن میں سے بعض مشائخ کا سلسلہ دور دور پہونچا، اور بڑے بڑے صاحب باطن، عالی نسبت شیوخ اس سلسلہ میں منسلک نظر آتے ہیں، نیز یہ کہ اس خاندان کے افراد نے (جن میں تزکیۂ نفس اور دولتِ باطنی کے حصول کی طلب تھی) اپنے زمانہ کے صحیح العقیدہ، داعی سنت، اور صاحبِ کمال مشائخ کی طرف بلا تکلف رجوع کیا، اور ان سے علمی فیض، اور باطنی نعمت حاصل کی، اور اس میں کسی خاندانی زعم یا احساس برتری کو حائل نہیں ہونے دیا، نہ بُعد مسافت اور سفر کی مشقتوں کو خاطر میں لائے، چنانچہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے تجدیدی کارنامے

کے بعد تقریباً پورا خاندان ان کے خلیفۂ اعظم حضرت سید آدم بنوری رحمۃ اللہ علیہ سے منسلک ہوگیا، نیز اس خاندان کے افراد وقتاً فوقتاً حضرت مجدد کی اولاد امجاد سے رجوع واستفادہ کرتے رہے، پھر حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے دور میں علم اللہی خاندان ان سے اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے وابستہ ہوا، اور ان کی دعوت واصلاح اور خیالات کا علَم بردار بن گیا۔

۶۔ یہ بھی خاندانی حالات کے تتبع اور مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان میں کبھی دولت وثروت کی فراوانی نہیں رہی، زیادہ تر مجاہدہ اور عسرت کا دور گذرا، اور زیادہ سے زیادہ بقدر کفاف خاندان کے لوگوں کو حاصل ہوا، اور اس طرح دعائے نبویؐ "اللھم اجعل رزق آل محمد کفافاً" (اور بعض روایات میں ہے "قُوتاً") کا عموماً اس خاندان میں ظہور ہوتا رہا۔

یہ وہ چند خاندانی خصائص اور مشترک صفات ہیں، جن کو "استقراء" کے اصول سے متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اور جس کی سَو فی صدی صحت یا اس کے تعین میں غیر شعوری وابستگی یا خواہش مندانہ غور وفکر (WISHFUL-THINKING) سے آزاد اور محفوظ رہنے کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ۔ ع

ہوس سینہ میں چھپ چھپ کر بنا لیتی ہے تصویریں

اور بقول امام شافعیؒ ؎

وعین الرّضا عن کل عیب کلیلۃٌ

کما انّ عین السخط تُبدِی المساویا

دادیہال اور نانیہال اور ان کا قریبی اتصال

یہاں اس "آپ بیتی" میں مَیں اپنے دادا مولوی حکیم سید فخر الدین صاحبؒ اور اپنے نانا حضرت سید شاہ ضیاء النبی صاحبؒ کا تعارف نہیں کرا سکتا، اور نہ اس کی ضرورت سمجھتا ہوں کہ ان دونوں حضرات کے مفصل حالات و کمالات ظاہری و باطنی میری کتاب "حیات عبد الحیؒ"[1] اور "کاروان ایمان و عزیمت"[2] میں نیز "نزہۃ الخواطر" کی جلد ہشتم میں تفصیل سے آگئے ہیں، نہ اپنے والد مرحوم مولانا حکیم سید عبد الحی صاحبؒ اور والدہ ماجدہ سیدہ خیر النساء صاحبہؒ کا مفصل تذکرہ پیش نظر ہے کہ ان دونوں پر بھی میری دو مفصل کتابیں "حیات عبد الحیؒ" اور "ذکر خیر"[3] طبع ہو چکی ہیں، اور دریا کو کوزہ میں بند کرنا بہت دشوار ہے، البتہ اس کا ذکر ضرور کروں گا کہ میرے دادیہال اور نانیہال کا (جو اسی خاندان کی دو شاخیں تھیں) قریبی اتصال یا "قران السعدین" کس طرح ہوا، اور اس میں اللہ تعالیٰ نے کیسی برکت عطا فرمائی، اس حصہ کو میں اپنی کتاب "ذکر خیر" سے نقل کرتا ہوں کہ اس میں بہت سے اخلاقی سبق، اور دینی موعظت کا سامان ہے۔

"جس طرح خاندان میں ہمارے نانا صاحب کا گھر سب سے زیادہ کھاتا پیتا خوش حال اور با وجاہت تھا، ہمارے دادا صاحب کے یہاں اسی قدر اس چیز کی کمی تھی، یہاں کوئی جائیداد اور زمینداری عرصہ سے نہ تھی، خاندان کی اس شاخ میں بہت اوپر سے علم دین کا سلسلہ چلا آرہا تھا، اور یہ مولویوں کا گھرانا مشہور تھا، یہاں جائیداد کے بجائے کچھ کتابوں کا

---

[1] شائع کردہ ندوۃ المصنفین دہلی [2] شائع کردہ سید احمد اکیڈمی لاہور۔
[3] شائع کردہ مکتبۂ اسلام گوئن روڈ لکھنؤ۔

ذخیرہ، اور دینی علم نسلاً بعد نسل منتقل ہوتا رہا، اور یہی اس کی سب سے بڑی جائیداد تھی، اسی دور میں خاص طور پر گھر میں ایک طرح کی تنگی اور عسرت تھی، دادا صاحب حاذق طبیب اور بڑے فاضل اور مصنف تھے لیکن طبیعت میں بے نیازی اور خودداری بہت تھی، کبھی معاش کی طرف پوری توجہ نہیں فرمائی گھر میں کسی کسی وقت فاقہ ہو جانا بھی کوئی نادر بات نہ تھی۔

والد صاحب مرحوم نظامت ندوۃ العلماء میں پہلے تیس ۳۰ چالیس ۴۰ روپے ماہوار کے ملازم تھے، پھر اس کو بھی ترک کر دیا، ایسی حالت میں جب میرے والد صاحب کے عقد ثانی کا پیام حضرت سید شاہ ضیاء النبی صاحب کے یہاں ان کی صاحبزادی سیدہ خیر النساء صاحبہ کے لئے پہونچا تو میری نانی صاحبہ کو اس کے قبول کرنے میں بڑا تردد ہوا، عورتیں ان معاملات میں زیادہ دوربین اور حسّاس ہوتی ہیں، گھر سے گھر ملا ہوا تھا، وہ گھر کی حالت سے واقف تھیں، ان صاحبزادی کا پہلا پیام انھیں کے چچازاد بھائی سے جو ضلع کے چھوٹے موٹے تعلقہ دار تھے، آچکا تھا، اس کے مقابلہ میں اس غریب گھر کے پیام کو (اگرچہ وہ نسبی اور عرفی حیثیت سے مساوی تھا) ترجیح دینا ان کی سمجھ میں نہ آیا، جان بوجھ کر بیٹی کو تکلیف میں ڈالنا ان کے نزدیک کوئی عقلمندی کی بات نہ تھی، لیکن نانا صاحب کو والد صاحب کے ساتھ بڑی محبت تھی، والد صاحب نے ان سے روحانی استفادہ بھی کیا تھا، اور وہ ان کی علمیت اور صلاحیت سے واقف تھے، پیام آتے ہی وہ کھل گئے، گویا ان کی مراد بر آئی، نانی صاحبہ سے انھوں نے صاف کہہ دیا کہ سید[1] جوان صالح، عالم اور ہونہار ہیں، میں ان پر کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا، میرے نزدیک غربت اور امارت کی کوئی اہمیت نہیں ہے، اصل دیکھنے کی چیز صلاحیت اور علم ہے۔

---

[1] والد صاحب کی عرفیت خاندان میں سید میاں تھی، عام طور پر جن کا نام سید احمد ہوتا تھا، احتراماً ان کو صرف سید یا سید میاں کے نام سے پکارتے تھے، والد صاحب کا نام بھی عقیقہ کے وقت سید احمد رکھا گیا تھا۔

خود والدہ صاحبہ کی زبان سے اس قصہ کو سنئے، وہ اپنے رسالہ الدعاء والقدر[1] میں لکھتی ہیں:۔

"جس طرف سے زیادہ کوششیں تھیں، وہ میرے (حقیقی) چچا کا گھر تھا، دو بہنیں میری اس گھر میں منسوب ہو چکی تھیں، یہ گھر ایک مدت سے سرسبز اور آباد تھا، دنیاوی اعتبار سے گھر خوبی میں بے مثال تھا، مال و دولت، عزت، شرم و حیا، صورت و سیرت، غرض اس سے بہتر کوئی گھر نہ تھا، یہ ہمارے لئے باعث فخر سمجھا جاتا تھا، والدہ مرحومہ کی دلی خواہش اسی طرف تھی، اپنے حقیقی بھائی کے گھر پر بھی اس کو ترجیح دیتیں، اور مجھے بھی یہ گھر عزیز تھا، تمام باتیں میرے موافق تھیں مگر والد مرحوم کا خیال تھا کہ مفلس ہو، مگر متقی اور پرہیزگار ہو، یہ خوبی یہاں نہیں پائی جاتی تھی۔"

اس کشمکش اور تردد و انتظار کے زمانہ میں والدہ صاحبہ نے جن کو ہمیشہ خوابوں سے مناسبت رہی کئی ایسے خواب دیکھے جن میں والد صاحب کے گھر کی طرف اشارہ تھا، اور یہ کہ اگر یہ دونوں گھر مل گئے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص عنایتیں ہوں گی، اسی کے آگے پیچھے ایک نہایت بشارت آمیز خواب دیکھا جس سے وہ زندگی بھر تسکین حاصل کرتی رہیں، جب وہ اس کا تذکرہ کرتیں تو ان پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی، وہ لکھتی ہیں:۔

"ایک رات کو میں نے خواب دیکھا کہ خاص اس مالک کریم، رحمان و رحیم کی عنایت و مہربانی سے ایک آیت کریمہ مجھے حاصل ہوئی، صبح تک وہ زبان پر جاری تھی، مگر کچھ خوف ایسا تھا کہ میں بیان نہ کر سکی، منہ سے نکلنا دشوار تھا، اور اس کے معنی بھی مجھے معلوم نہ تھے، جب معنی دیکھے تو خوشی سے پھول گئی، اور تمام فکر و غم

---

[1] اس رسالہ میں انھوں نے دعاء کی تاثیر، تقدیر کی کار فرمائی، اور اپنے رویائے صادقہ اور مبشرات لکھے ہیں۔

بھول گئی، اپنی اس خوش نصیبی پر فخر کیا، اور اس خواب کو بیان کیا، ہر شخص سن کر رشک کرتا، اور والد مرحوم تو خوشی میں رونے لگے، وہ آیت کریمہ یہ ہے :۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ	سو کسی کو معلوم نہیں جو چھپا دھرا ہے
قُرَّةِ اَعْیُنٍ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ[۱]	ان کے واسطے آنکھوں کی ٹھنڈک
(السجدہ ۔ ۱۷)	بدلہ اس کا جو کرتے تھے ۔

بالآخر نانا صاحب کا فیصلہ اور ارادہ غالب رہا، اور ۱۳۲۲ھ (۱۹۰۴ء) میں بخیر و خوبی یہ رشتہ ہو گیا، دادا صاحب جو اس کے اصل محرک تھے[۲]، اس رشتہ سے باغ باغ، اور اپنے انتخاب پر مطمئن و مسرور تھے ۔

میری ولادت سے پہلے گھر کا نقشہ

والدہ صاحبہ اپنے اس نئے گھر میں آئیں، تو اس کا نقشہ انھوں نے وہی دیکھا جس کو وہ سنا کرتی تھیں، تنگی ترشی کا زمانہ، کبھی فراغت کبھی فاقہ، گھر میں کئی کھانے والے، اور دادا صاحب کی آمدنی برائے نام، ادھر نانی صاحبہ اپنی شفقت کی بناء پر اس ٹوہ میں رہتی تھیں کہ بیٹی کو کچھ تکلیف تو نہیں ہے، کبھی کسی ماما کو بھیجتیں کہ گھر میں کچھ پک رہا ہے یا نہیں ؟ والدہ صاحبہ نے کئی بار سنایا کہ جب میں کسی کو اپنے میکے سے آتے دیکھتی تو چولھے پر ہانڈی رکھ دیتی اور آگ

---

[۱] الدعاء والقدر ص ۲۳   [۲] اس میں اس بات کو بھی دخل تھا کہ مولوی حکیم سید فخر الدین صاحب اور حضرت سید شاہ ضیاء النبی عزیز قریب ہونے کے ساتھ پیر بھائی، اور حضرت مولانا سید خواجہ احمد صاحب نصیر آبادیؒ کے دست گرفتہ، اور ان کے سلسلہ میں صاحب اجازت و ارشاد بھی تھے، اور دلوں میں اس کی وجہ سے خاص مناسبت اور ارتباط تھا۔

جلا دیتیں تاکہ معلوم ہو کہ کھانا پک رہا ہے، حالانکہ اس میں پانی کے سوا کچھ نہ ہوتا، بعض اوقات نانی صاحبہ اپنی فراست سے تاڑ لیتیں اور کھانے کا خوان لگا کر بھیج دیتیں۔

کچھ ہی عرصہ کے بعد والد صاحب نے مطب شروع کرنے کا ارادہ کیا، والدہ صاحبہ کہتی تھیں کہ مجھ سے مشورہ لیا، میں نے اس کی بڑی تائید کی، اور مطب کا سلسلہ شروع ہو گیا، مطب شروع ہوتے ہی وہ پریشانی دور ہو گئی، آمدنی کا سلسلہ شروع ہوا، اور بہت جلد اتنی برکت اور ترقی ہوئی کہ گھر کا نقشہ ہی بدل گیا، گھر کا بڑا حصہ خام تھا، والدہ صاحبہ کی بلند ہمتی اور زندہ دلی سے اس کی تعمیر کا سلسلہ شروع ہوا، اور رفتہ رفتہ ایک پختہ حویلی بن گئی، والد صاحب کی دونوں بہنوں (سیدہ شمس النساء اہلیہ مولانا سید طلحہ صاحب حسنی ایم۔ اے اور سیدہ فاطمہ اہلیہ سید محمد یوسف صاحب حسنی) اور بھائی صاحب (ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب) کو اس طرح اپنی تربیت اور شفقت میں لیا کہ وہ ماں کو بھول گئے[۱]، اور ساری عمر ان سب نے انھیں کو ماں سمجھا، جس گھر میں گھر والوں کو خود کبھی کبھی فاقہ کرنا پڑتا تھا، اب وہاں ہر گھر سے زیادہ مہمانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، رائے بریلی، اور لکھنؤ میں اپنے پرایوں، اور قریب و دور مہمانوں کا ملجا و ماویٰ بن گیا[۲]۔

اسی گھر میں ۱۳۲۴ھ (جون ۱۹۰۶ء) کو میری بڑی ہمشیرہ سیدہ امت العزیز (والدۂ عزیزان سید محمود حسن، مولوی سید محمد ثانی (مرحومین) و محمد رابع و محمد واضح سلمہما) اور ۱۳۲۵ھ (۱۹۰۷ء) میں میری دوسری ہمشیرہ سیدہ امت اللہ عائشہ رض (مصنفۂ "زاد سفر" بچوں کی "قصص الانبیاء" "ہمارے حضورؐ" وغیرہ) کی ولادت ہوئی، اور ۶ محرم ۱۳۳۳ھ (۱۹۱۴ء) کو

---

[۱] بھائی صاحب کی والدہ مرحومہ کا انتقال ۱۳۱۹ھ (۱۹۰۱ء) میں ہوا، اس وقت بھائی صاحب کی عمر آٹھ برس کی تھی، جب میری والدہ صاحبہ گھر آئیں تو ان کی عمر گیارہ سال کی تھی۔ [۲] ذکر خیر ص ۳۳-۸۰

میری ولادت ہوئی۔[1]

دائرہ شاہ علم اللہؒ یا تکیہ کلاں

قبل اس کے کہ میں اپنے بچپن کا حال، اس وقت کا ماحول، اور ابتدائی نقوش اور یادوں کا ذکر کروں، اس چھوٹی سی دیہاتی بستی کا ایک نقشہ دکھانا چاہتا ہوں جس کی بنیاد ۱۰۸۰ھ میں عارف کامل حضرت سید شاہ علم اللہ حسنی نقشبندیؒ[2] (خلیفہ حضرت سید آدم بنوریؒ) کے ہاتھوں اسی جذبہ پر پڑی، جو ان کے مورث اعلیٰ، اور اس ملت کے مؤسس اول سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے سینہ میں موجزن تھا، اور جس کا مقصد "رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ" کے الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے، وہ بستی جس نے اپنے اپنے وقت میں کبار اولیاء اللہ، مصلحین ومجاہدین پیدا کئے، جن میں حضرت سید احمد شہیدؒ کا نام اور کام سب سے زیادہ روشن اور تاباں ہے۔

آپ جب شہر رائے بریلی سے مشرق وشمال کی طرف سے آئیں، تو میل ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر سئی ندی کے کنارہ سادات کے چند گھروں کی ایک چھوٹی سی بستی نظر آئیگی، شہر کو اس بستی سے ملانے والا راستہ کھیتوں کے درمیان پگڈنڈیوں کا ہے جو بالکل خام، اور بارش میں تقریباً ناقابل گذر ہو جاتا ہے[3]

---

[1] میرے خاندانی بزرگ سید عبداللہ صاحب تحصیلدار فرزند حضرت مولانا سید خواجہ احمد نصیر آبادی سے میں نے سنا ہے کہ میرا تاریخی نام ظہور حید رہے، اس سے ۱۳۳۳ھ نکلتا ہے۔ [2] حضرت کے حالات وعلوئے مرتبہ وکمالات باطنی کے لئے ملاحظہ ہو مہر صاحب کی کتاب "سید احمد شہیدؒ" حصہ اول، راقم کی کتاب "سیرت سید احمد شہیدؒ" حصہ اول، اور عزیزی مولوی سید محمد الحسنی کی کتاب "تذکرۂ حضرت شاہ علم اللہؒ"۔ [3] حال میں پختہ سڑک بن گئی ہے، جو اس بستی کو شہر جانے والی سڑک سے ملا دیتی ہے، پگڈنڈیوں کا پرانا راستہ اب بھی موجود ہے۔

اس بستی میں میرے بچپن میں صرف آٹھ گھر تھے، جن کو دو دو پر تقسیم کیا جا سکتا ہے کہ ان میں ایک گھر سے دوسرے گھر جانے کا دروازہ تھا، پہلے جانب غرب دو مکان ذرا ہٹے ہوئے نظر آئیں گے، جو اسی خاندان کی ایک شاخ کے افراد[۱] ہیں، اگر مشرق و شمال کی طرف سے اس بستی میں داخل ہوں تو پہلے املی کا ایک نہایت تناور اور چھتناری درخت ملے گا، جس کے نیچے پوری پوری بارائیں اور قافلے ٹھہر سکتے تھے، ایک طرف سے متصل بلکہ اس درخت کے زیر سایہ ہمارے دادا صاحب کا بیٹھکہ جو خام اور خس پوش تھا ملے گا، جو ان کا دار التصنیف بھی تھا، مطب بھی تھا، اور ملاقات کا کمرہ بھی، اس بیٹھکے کے (جس کو ابھی تک ہم لوگ تکیہ کی اصطلاح میں بنگلہ کہتے ہیں) بالمقابل ہمارا آبائی مکان ہے، اس کے اور بیٹھکے کے درمیان صرف تین چار گز کی پتلی گلی ہے، اس گھر سے متصل ہی اس خاندان کے اس وقت کے سب سے زیادہ باوجاہت بزرگ اور ضلع کے زمیندار اور رئیس نیز آنریری مجسٹریٹ مولوی سید خلیل الدین صاحب اور ان کے چھوٹے بھائی سید امین الدین صاحب[۲] کی حویلی ہے، ہمارے گھر سے اس گھر میں جانے کا زینہ ہے، اور دونوں گھروں کی ہر وقت کی آمد و رفت، اس حویلی سے متصل سید خلیل الدین صاحب کا دیوان خانہ ہے، جو اس چھوٹی سی بستی میں سب سے شاندار، اور باوقار بیٹھکہ یا بنگلہ ہے، دونوں بھائیوں کا اسی میں قیام ہے، یہیں زمینداری کے معاملات طے ہوتے ہیں، ضلعدار اور لگان دینے والے کسان یہیں آتے ہیں، بستی کے معزز مہمان اور خاندان کے باوجاہت بزرگ یہیں مہمان رہتے ہیں، اس کے بالکل بالمقابل ان کے چچازاد بھائیوں سید احمد سعید صاحب اور حافظ سید عبید اللہ صاحب کا مکان اور بنگلہ ہے، ان چاروں بھائیوں کی جائیداد مشترک ہے،

---

[۱] سید نذیر احمد صاحب و سید احمد حسن صاحب [۲] یہ دونوں بھائی میرے والد صاحب کے حقیقی پھوپھی زاد بھائی، اور میری والدہ صاحبہ کے حقیقی چچازاد بھائی تھے۔

اور ضلع کے بڑے زمینداروں میں ان کا شمار ہے' ان دونوں مکانوں کے درمیان ایک کھلا میدان ہے' جو بستی کے بچوں کے کھیلنے کی جگہ، اور تقریبات کے منعقد ہونے کا محل ہے' اس کو قصداً خالی رکھا گیا ہے' تاکہ بستی کی ہوا اور فضا اچھی رہے' اور لوگوں کو جمع ہونے اور بچوں کو کھیلنے کا موقعہ ملے، میدان کے نیچے مغربی جانب مسجد اور جنوب کی طرف جانے والا راستہ ہے' جس سے گاڑیاں بھی گذر سکتی ہیں' اس راستہ سے آپ جنوب کی جانب آگے بڑھیں گے تو چند قدم پر سید محمد نعیم صاحب عرف اچھے میاں صاحب کا بنگلہ ہے' جو بہت خوش سلیقگی اور نستعلیقی کے ساتھ بنایا گیا ہے[1]، اس سے آگے بڑھئے گا تو بائیں طرف ایک ٹیلہ سا نظر آئے گا' جس پر کبھی اسی خاندان کے بعض بزرگوں کا مکان تھا، جو اب منہدم ہو چکا ہے[2]، آگے بڑھیں گے تو دائیں طرف ایک تالاب سا نظر آئے گا، جس کو یہاں گڈھیّا کہا جاتا ہے، اور جس میں سال کے بعض مہینوں میں پانی بالکل نہیں رہتا، یا برائے نام رہ جاتا ہے' غالباً یہیں سے مٹی لے کر مکانوں کی تعمیر ہوئی، اس لئے یہ ایک نشیبی قطعہ زمین بن کر رہ گیا، اس کے کنارے املی کا ایک دوسرا نہایت تناور اور چھتناری درخت ہے' جس کے نیچے گرمیوں میں جنوبی حصہ کے رہنے والے چارپائیاں بچھا کر یا مونڈھے ڈال کر بیٹھتے ہیں' اور تفریح کرتے ہیں' یہیں مشرقی جانب بلندی پر جہاں بڑے سیلاب میں بھی پانی نہیں پہونچتا، تکیہ کے قدیم ترین مکانات اور وہ دائرہ ملے گا،

---

[1] اب اس کی جگہ پر سید عبداللہ صاحب مرحوم کا پختہ اور عمدہ مکان ہے جو ہمارے عزیزوں سید محمد مسلم حسنی اور سید مجتبیٰ صاحبان کی رہائش گاہ ہے۔ [2] اسی کھنڈر پر عم محترم سید محمد اسماعیل صاحب فرزند سید محمد اسحٰق صاحب (نبیرۂ حضرت سید احمد شہیدؒ) و والد برادران عزیز سید احمد الحسنی، سید ابراہیم و سید اسحٰق ساکنان حال پاکستان نے ٹونک کے اخراج کے بعد اپنے برادر بزرگ مولوی سید خلیل الدین صاحب کے مشورہ اور تعاون سے مکان بنایا، اور وہاں اپنے آخری قیام رائے بریلی تک مقیم رہے' وہیں سے دوبارہ ٹونک منتقل ہوئے' اور وہیں ۱۱ ستمبر ۱۹۴۹ء کو وفات پائی، رحمہ اللہ تعالیٰ۔

جس میں اس نو آبادی کے بانی حضرت سید شاہ علم اللہ صاحبؒ اور ان کی اولاد کا مسکن، اور حضرت سید احمد شہیدؒ کا مولد و منشا ہے، یہاں بھی دو ہی مکانات تھے، جو ایک دوسرے سے پیوست اور جڑواں تھے، اور درمیان میں دروازہ ہے، اس کے پہلو میں جانب جنوب وہ بیٹھک یا بنگلہ ہے، جو اس بستی کی سب سے زیادہ پر رونق اور آباد جگہ ہے[1]، ٹونک کے اعزہ آتے ہیں تو عام طور پر یہیں ان کا قیام ہوتا ہے، سامنے وہ تاریخی اور بابرکت مسجد ہے، جس کی پختہ تعمیر[2] ۱۰۸۳ھ میں حضرت شاہ علم اللہ صاحبؒ کے مبارک ہاتھوں سے ہوئی، اس کی بنیادوں میں زمزم ڈالا گیا اور اس کو بیت اللہ شریف کے نقشہ پر تقریباً اسی طول و عرض کے ساتھ بلا مینار و گنبد کے تعمیر کیا گیا، صرف ادباً چند انگل کم رکھا، یہی مدرسہ بھی تھا، خانقاہ بھی تھی، اور حضرت سید احمد شہیدؒ کے زمانہ میں جہاد کی تربیت گاہ، اور جماعت مجاہدین کی قیام گاہ بھی، مسجد کے بالکل بالمقابل مشرقی جنوبی گوشہ پر ایک چار دیواری یا حظیرہ ہے، جس کو اہل خاندان قدیم زمانہ سے "روضہ" کہتے ہیں، اس کے اندر حضرت شاہ علم اللہؒ، ان کے بڑے صاحبزادہ سید آیت اللہ، شاہ صاحب کی اہلیہ محترمہ، اور نامور اور بلند مرتبت صاحبزادہ حضرت سید محمد عدل عرف شاہ لعل، اور اسی خاندان کے چند افراد کی قبریں ہیں، جو سب کی سب خام ہیں، اور کسی پر لوح مزار، یا کسی قسم کا امتیازی نشان نہیں ہے[3]، مسجد کے دوسرے سرے شمالی مشرقی گوشہ پر حضرت شاہ علم اللہ صاحبؒ کے تیسرے صاحبزادہ

---

[1] یہی برادر محترم سید محمد جعفر صاحب کی نشستگاہ اور مہمان خانہ تھا، سید جعفر صاحب (حال مقیم کراچی) حضرت شاہ ابو سعید صاحب کی اولاد میں ہیں، خاندان کے باوجاہت و بااثر لوگوں میں تھے۔ [2] ۱۰۵۰ھ میں جب شاہ صاحب یہاں منتقل ہوئے تو ضرورت کے لئے خام مسجد تیار کر لی تھی، [3] چونکہ یہ چار دیواری ایک چبوترہ پر واقع ہے، اس لئے یہاں سیلاب کا پانی عام طور پر نہیں جاتا، یا بہت دیر میں جاتا ہے، اس لئے سیلاب کے زمانہ میں جن خوش قسمت افراد کا انتقال ہوا، ان کو اسی حظیرہ میں جگہ ملی، عرصہ کے بعد میرے والد صاحب کے انتقال پر باتفاق خاندان یہ حظیرہ کھولا گیا، اور ان کی تدفین عمل میں آئی، اس کے بعد میرے ہی گھر کے متعدد افراد جن کا ذکر اپنی اپنی جگہ پر آئے گا دفن ہوئے۔ رحمہما اللہ جمیعاً۔

سید ابو حنیفہ، اور حضرت سید احمد شہیدؒ کے والد محترم سید عرفان صاحب ایک چھوٹے سے چبوترہ میں مدفون ہیں، یہاں قبور کا کوئی نشان نہیں رہا ہے مسجد کے قبلہ رخ مغربی جانب خاندان کا عام قبرستان ہے، اور راقم سطور کے دادیہالی و نانیہالی بزرگ شمالی جانب اور شاہ علم اللہ صاحبؒ کے چوتھے صاحبزادہ شیخ وقت حضرت سید محمد نقشبندی اور ان کے سلسلہ کے لوگ جنوبی مغربی جانب مولسری کے درخت کے قریب آسودۂ خاک و محو خواب ہیں۔ ع

سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

مسجد کے نیچے سئی ندی بہتی ہے، جو دیکھنے میں ایک حقیر، بے ضرر، اور بے آزار ندی معلوم ہوتی ہے، لیکن سخت بارش اور سیلاب کے زمانہ میں اس کی طغیانی و فتنہ سامانی کا یہ حال ہوتا ہے کہ اس کی حقیر حالت کو دیکھ کر فارسی کا یہ شعر پڑھنے کو جی چاہتا ہے ؎

گربۂ مسکین اگر پر داشتے

تخم کنجشک از جہاں برداشتے

گرمیوں میں شام کو مسجد کا جنوبی حصہ اور ندی کا کنارہ پوری بستی کی تفریح گاہ اور اجتماع کا مرکز بن جاتا ہے، شاید چند بڑے بوڑھوں کے علاوہ پوری آبادی یہاں مولسری کے اس درخت کے نیچے جو جانب جنوب مغرب ہے، سمٹ کر آجاتی ہے، ندی میں نہانے کا ایک ہنگامہ برپا ہوتا ہے، پیرنے والے اپنے کمالات دکھاتے ہیں، اور جن کو پیرنا نہیں آتا ان کو "فی سبیل اللہ" پیرنا سکھاتے ہیں، گویا یہ بڑا کار ثواب اور ان کا اخلاقی فریضہ ہے، اور جو اس خطرناک کام سے ڈر کر بھاگتے ہیں، ان کو ان "مجاہدین" کی پولیس پکڑ کر لاتی ہے اور زبردستی پیرنا سکھاتی ہے، اس لحاظ سے یہ کام بڑا اچھا تھا کہ یہاں سیلاب آتے رہتے ہیں، اور یہاں ہر شخص کے لئے بقدر ضرورت پیرنا جاننا ضروری ہے، اس کار خیر میں ہمارے ٹونک کے

اعزہ اور برادر محترم حافظ سید حبیب الرحمن صاحب پیش پیش رہتے تھے، مغرب کی اذان تک یہ ہنگامۂ کارزار گرم رہتا ہے، ندی کے پار مغربی جانب تخمی آموں کا ایک گھنا باغ ہے، جو میرے دادا صاحب اور ان کی اولاد کی ملکیت ہے، آموں کے موسم میں جب ندی بھری ہوتی ہے، اور اس کا پاٹ بہت بڑا ہو جاتا ہے، پیراک لوگ ندی پار کر کے باغ میں جاتے ہیں، اور آموں سے ان کی ضیافت کی جاتی ہے۔

بستی کے مکانوں کے مغربی جانب باغات کا سلسلہ ہے، مشرقی اور شمالی جانب ہرے بھرے کھیتوں کا، جس کی وجہ سے یہ بستی اس بحر اخضر میں ایک جزیرہ معلوم ہوتی ہے، بارش کے زمانہ میں خاص طور پر اس کی خوش نمائی اور بڑھ جاتی ہے، لیکن ہر تھوڑی مدّت کے بعد آنے والا سیلاب اس قابلِ رشک جائے وقوع اور ان دل فریب مناظر کی قیمت وصول کر لیتا ہے، اور اکثر بستی کے رہنے والوں کو اپنا محبوب مسکن چھوڑ کر کہیں شہر میں، یا آس پاس کسی بلند سطح گاؤں میں پناہ لینی پڑتی ہے، اس جبری منتقلی، اور سیلاب کی لائی ہوئی پریشانیوں کی وجہ سے کبھی کبھی بستی والوں کو خیال ہوا ہے کہ وہ مستقل طور پر اپنی سکونت کے لئے کوئی اور بلند جگہ انتخاب کریں، جہاں وہ اس سیلاب کے گزند سے محفوظ رہیں، لیکن پھر وطن کی کشش، اور مسجد و مقابر کی حفاظت کا جذبہ، نیز وہاں کی سہولتوں کا خیال دامن گیر ہوتا ہے، اس طرح اس خاندان نے تین سو برس یہاں گزار دیئے ہیں، آگے کا حال اللہ کو معلوم ہے۔

تکیہ کا بچپن، بعض حوادث، اور خاندانی خصوصیات

میری ولادت کے بعد سب سے اہم واقعہ جو پیش آیا، اور جس کی یاد ابھی تک دلوں میں تازہ اور اس کے قصّے وردِ زبان ہیں، وہ ۱۹۱۵ء کا وہ ہولناک طوفانی سیلاب ہے، جو طوفان نوحؑ کا

ایک چھوٹا موٹا نمونہ تھا، میری عمر اس وقت ایک سال کچھ مہینے تھی کہ اکتوبر ۱۹۱۵ء میں اچانک یہ سیلاب آیا جس نے پچھلے سب ریکارڈ توڑ دیئے، اور ابھی تک (جہاں تک اس خاندان اور بستی کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے) تین ۳۰۰ سو برس کا سب سے بڑا سیلاب تھا بستی کے باشندے بڑی بے سروسامانی اور پریشانی کی حالت میں نکلے، سب سے اہم مسئلہ مستورات اور بچوں کی منتقلی کا تھا جن کو کمر کمر پانی میں نکلنا پڑا، پردے کا پورا اہتمام ممکن ہی نہ تھا مشکل سے ایک دو پالکیوں کا انتظام کیا گیا جن میں بعض نو کدخدا بیبیاں اور شیر خوار بچے تھے، انھیں بچوں میں ایک میں بھی تھا، جو اپنی چھوٹی پھوپھی کی گود میں تھا جن کی شادی چند مہینے پہلے ہوئی تھی، سنا ہے کہ خاندان کے بزرگ بالخصوص سید خلیل الدین صاحب اور سید امین الدین صاحب اس منظر کو دیکھ کر رو رہے تھے، اور یہ سمجھا جا رہا تھا کہ یہ شامت اعمال کا نتیجہ اور خدا کی طرف سے تنبیہ اور تادیب کا سامان ہے، لیکن الحمد للہ اس عالم آشوب میں جانیں اور قیمتی املاک محفوظ رہیں، البتہ ہمارا آبائی مکان جو نیم پختہ اور نیم خام تھا، گر گیا، مسجد کے ایک مؤذن باز میر مرحوم جنھوں نے جانے پر ضد کی، اور ہمارے مکان کی ایک چھت پر ڈیرہ ڈالے رہے، رات کی تاریکی میں اندازہ نہ ہونے کی وجہ سے گر گئے، اور جاں بحق ہوئے، اس کے علاوہ کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔

بڑی بات یہ ہے کہ اس افراتفری میں ہمارے گھر کے بزرگوں کو اس کتابی ذخیرے کے محفوظ کر دینے کا ہوش باقی رہا، اور ان کو اس کا موقعہ ملا، جو نہایت بیش قیمت مخطوطات، فرامین، دستاویزوں، سندوں، فتووں، اور خاندان کے مصنفین کے مسودات پر مشتمل تھا، اور جس کی قیمت کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا، لیکن اب بھی بعض قلمی کتابوں پر سیلاب کے ہلکے سے نشانات نظر آتے ہیں، کتابوں کا یہ سب سے بڑا ذخیرہ ہمارے ہی یہاں تھا، دوسرے نمبر پر خاندان کے ایک دوسرے بزرگ میاں عبدالرشید صاحب کے یہاں جن کا مکان اور بیٹھک

عین لب دریا تھا، وہ بھی محفوظ رہا۔

تکیہ سے منتقل ہو کر بستی کے یہ گھر سید اقبال علی صاحب جعفری کی کوٹھی میں منتقل ہوئے، جو فرقہ اثنا عشری سے تھے، اور شہر کے شرفاء ورؤسا میں ان کا شمار تھا، خاندان سے ان کے عزیزانہ روابط تھے، پھر اس کوٹھی کی خستگی کو دیکھ کر دوسرے مکانات میں منتقل ہوئے، خاص ہمارا گھر لکھنؤ منتقل ہو گیا، کچھ دن والد صاحب کے مخلص دوست اور کرم فرما نواب سید نورالحسن خاں (فرزند اکبر والا جاہ نواب سید صدیق حسن خاں) کی دعوت پر ان کے افراد خاندان کی کوٹھیوں میں رہے، پھر والد صاحب کے اس مکان میں منتقل ہو گئے، جہاں ان کی سکونت تھی، اور مطب کرتے تھے۔

اس سے کم درجہ کا ایک سیلاب غالباً ۱۹۲۱ء میں آیا، جس میں میں چھ سات سال کا تھا، اس وقت والد صاحب تکیہ پر تھے، ہم لوگ پاس کے گاؤں میدان پور منتقل ہو گئے، جو سید خلیل الدین صاحب سید عبیداللہ صاحب کی زمینداری میں تھا، اور تکیہ سے جانب شمال چند کھیتوں کے فاصلہ سے آباد ہے، گاؤں کے مکینوں نے جس سے جس کا زیادہ تعلق تھا اس کو اپنے مکان میں ٹھہرایا، اور راحت پہونچانے میں کوئی دریغ نہیں کیا۔

مجھے اپنے بالکل ابتدائی بچپن کے جو والد صاحب کی وفات سے پہلے تکیہ پر گذرا کچھ زیادہ باتیں یاد نہیں، خواب کی طرح اپنی کھلائی انّا کی صورت یاد ہے، جن کا نام چیراسن تھا اور رائے بریلی کی رہنے والی تھیں، ان کی ہڈیاں پھولوں میں رہیں، مجھ پر بڑی شفیق تھیں، اور میری خوشی اور ضد سے بہت سے پر مشقت کام ہنسی خوشی کرتی تھیں، اتنا یاد ہے کہ اس زمانہ میں مجھے آشوب چشم اور خارش کی بہت شکایت ہوتی تھی، آنکھ میں چاکسو اور سفیدہ ڈالنے کی تکلیف ابھی تک یاد ہے، اپنی خالہ صاحبہ کا جو قرآن شریف کی جیّد حافظ

بھی تھیں؎۱، محبت سے شام کو روٹی اور کباب کھلانا جو ایک بوڑھی عورت بیچنے لاتی تھی یاد ہے، اپنا مکان چونکہ زیرِ تعمیر تھا، اور اس وجہ سے بھی کہ میرے چھوٹے ماموں مولوی حافظ سید عبیداللہ صاحب کو میری والدہ سے بے حد محبت تھی، اس زمانہ میں ہمارا قیام زیادہ تر انھیں کے گھر میں ہوتا تھا، اور وہ مجھ میں اور اپنے چھوٹے بیٹے سید مصطفےٰ مرحوم میں نہ صرف یہ کہ فرق نہیں کرتے تھے، بلکہ مجھے کھلی ترجیح دیتے تھے، میری ممانی (والدہ مولانا سید ابوالخیر صاحب برقؔ و حافظ سید حبیب الرحمٰن صاحب) جو میری والدہ کی سگی ماموں زاد بہن بھی تھیں، اور بھابھی بھی، اور قرآن کی حافظ بھی، اولاد کی طرح محبت کرتی تھیں۔

یہاں پر اپنے شفیق ماموں کا قدرے تفصیل سے ذکر کئے بغیر قلم آگے بڑھنے سے انکار کرتا ہے "پرانے چراغ" حصہ دوم سے مَیں وہ چند سطریں نقل کرتا ہوں کہ وہ اس بستی کی سب سے زیادہ محبوب اور دل آویز شخصیت تھی، اور میری ذہنی و اخلاقی تربیت میں ان کا بھی بڑا حصہ ہے:۔

"ماموں مولوی حافظ سید عبیداللہ صاحب مرحوم عجیب دل آویز اور جامع شخصیت کے مالک تھے، اور بعض اہل نظر کے بقول اسلامی زندگی کا ایک چلتا پھرتا نمونہ، اپنے زمانہ کے شیخ کامل حضرت سید شاہ ضیاء النبیؒ کے فرزند ارجمند، قرآن مجید کے جید حافظ تھے، بہت صاف صحیح اور دل کش انداز میں پڑھتے، حفظ جونپور میں حضرت مولانا مکی کے خاندان؎۲ میں رہ کر، جو ان کے

؎۱ سیدہ صالحہ بی قرآن مجید کی جید حافظ ہونے کے علاوہ خاندانی مجالس میں "صمصام الاسلام" (فتوح الشام) بڑے پر اثر اور جوش انگیز لہجہ میں پڑھتی تھیں، جس کا ذکر آگے آئے گا۔

؎۲ پورا نام مولانا ابوالخیر مکی تھا، مولانا ابوبکر صاحب فاروقی جونپوری ناظم شعبۂ دینیات (باقی ص۴۴ پر)

والدہی کا دست گرفتہ تھا، مکمل کیا تھا، عربی تعلیم متوسطات تک لکھنؤ میں حاصل کی تھی، صرف ونحو بڑی پختہ تھی، مطالعہ کا شوق عمر بھر رہا، عربی وانگریزی دونوں کی استعداد تھی، اور دونوں کی کتابیں لغت کی مدد سے مطالعہ میں رہتی تھیں، خط نہایت پاکیزہ تھا، اور معلوم ہوتا تھا کہ موتی پروئے ہیں، معاملات کے نہایت صاف، امانت داری اور صفائی معاملات میں خاندان میں مشہور تھے، اس وجہ سے ان کے پاس بکثرت امانتیں رہتی تھیں، کاہلی اور سستی کی جیسے ہوا بھی نہیں لگی تھی، ایک بڑی جائیداد کے مالک اور ضلع کے بڑے زمینداروں میں شمار ہونے کے باوجود، بڑے جفاکش، پابند اوقات اور مستعد تھے، چال سے بھی مستعدی اور عزم کا اظہار ہوتا، گھنٹوں کھڑے ہو کر کام کی نگرانی کرتے، وہی مسجد کے پنج وقتہ امام تھے، اور وہی اپنی جائیداد وزمینداری کے نگراں اور منتظم کار، مسجد میں کوئی دیکھتا تو معلوم ہوتا کہ ان کو دنیا اور جائیداد اور جاگیر سے کوئی سروکار نہیں، اور کھیتی باڑی کی نگرانی کرتا ہوا دیکھتا تو سمجھتا کہ شاید نمازوں کی پابندی بھی مشکل سے ہوتی ہو گی لیکن کیا مجال کہ ان میں سے کسی ایک چیز میں فرق آئے۔

تہذیب وشائستگی ان پر ختم تھی، چھوٹے اعزہ یا دوستوں کے لڑکے جو ان کی اولاد کے برابر تھے، آجاتے، اور وہ لیٹے ہوتے تو فوراً پاؤں سمیٹ لیتے

(باقی ص۴۳ کا) مسلم یونیورسٹی علی گڑھ انہی کے فرزند ارجمند تھے، مولانا مکی کے والد ماجد مولانا سخاوت علی جونپوری حضرت سید احمد شہیدؒ کے نامی گرامی خلفاء میں تھے، ۵۷ء کے بعد ہندوستان کے حالات سے دل برداشتہ ہو کر مکہ معظمہ چلے گئے تھے، وہیں انتقال ہوا، اور جنۃ المعلیٰ میں مدفون ہوئے، مولانا مکی کی ولادت وہیں ہوئی، اس لئے مکی کہلاتے تھے۔

اور بیٹھ جاتے، نوکروں اور مزدوروں کو بھی کبھی کسی درشت لفظ سے یاد نہ کرتے، ان کی زبان میں ڈانٹ ڈپٹ کا آخری لفظ "نامعقول" تھا، بالکل بے آزار انسان تھے، اور شاید ایذا رسانی اور دل شکنی کی صلاحیت فطری طور پر ان میں نہ تھی، ان کی موت پر میں نے ہندو، مسلمانوں، اور کاشتکاری میں مدد کرنے والوں کو یکساں سوگوار پایا، مجھے خوب یاد ہے کہ ان کو جب سپرد خاک کیا گیا تو غیر مسلم مزدوروں اور ہرواہوں[1] نے شرماتے اور ڈرتے ڈرتے کہا کیا ہم بھی میاں کی قبر پر آکر کھڑے ہو سکتے ہیں؟ یہ ان کے اندرونی جذبات کا اظہار تھا، ۳۱ رمئی ۱۹۳۸ء کو ان کا انتقال ہوا، اور خاندان اور بستی ایک بڑی بابرکت اور محبوب ہستی سے محروم ہو گئی"[2]

خاندان کی اس وقت سب سے محترم و مقتدر ہستی عم محترم مولوی سید خلیل الدین صاحب کی تھی، جن کو ان کے بھتیجے بھانجے، نواسے، پوتے سب "اباجی" کہتے تھے، بڑے بارعب، باوقار اس کے ساتھ شفیق، معاملہ فہم، منتظم، راسخ العقیدہ، اور خاندانی مسلک پر سختی سے کاربند ۱۳۱۲ھ / ۱۸۹۵ء میں والد صاحب مرحوم کے ساتھ گنگوہ حاضر ہوئے تھے، اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی سے بیعت کا شرف حاصل کیا تھا، اور آخر وقت تک اسی مسلک اور عقائد پر قائم رہے، ان کی وجہ سے خاندان کا بہت کچھ وقار قائم تھا، شہر رائے بریلی میں تکیہ انھیں کے نام سے موسوم "خلیل میاں کا تکیہ" کہلاتا تھا۔

اس دور میں خاندان کی بچیوں اور بیبیوں میں قرآن مجید کے حفظ کا خاص شوق، اور اس میں تنافس اور مسابقت کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا، میں نے اپنے بچپن میں جن کو دیکھا ہے

---

[1] کھیتی میں مدد کرنے والے مزدور، اور ہل چلانے والے۔ [2] "پرانے چراغ" حصہ دوم ص ۳۲۱-۳۲۳

ان میں مستورات میں پانچ بیبیاں حافظ تھیں، میری بڑی خالہ صاحبہ، والدہ، ممانی (اہلیہ حافظ سید عبید اللہ صاحب اور والدہ مولوی سید ابوالخیر صاحب) ایک پھوپھی، اور ایک حقیقی خالہ زاد بہن (والدۂ سید محمد مسلم حسنی سلمہٗ) ان میں سے ہر ایک نے اپنے کسی محرم سے (حقیقی بھائی یا کسی ایسے ہی عزیز سے جن سے پردہ نہیں تھا، قرآن حفظ کیا تھا، اور بہت صحیح اور بڑی حد تک تجوید کے اصول کے مطابق پڑھتی تھیں، بعض علمائے فرنگی محل کے فتوے کے مطابق تراویح میں جماعت کا اہتمام تھا، انھیں میں سے کوئی امام ہوتیں، باقی مقتدی، خاندان کے بزرگ مولوی سید خلیل الدین صاحب کو اس کا بڑا اہتمام تھا کہ یہ سب گھر کے اندر تراویح میں قرآن مجید سنائیں، نصف شب تک یا سحری تک یہ مبارک سلسلہ جاری رہتا، اور ان میں سے کئی ایک ایک پارہ سناتیں، ختم پر وہ دعوت کرتے تھے، مجھے اور کسی کا تراویح میں قرآن مجید کا سنانا یاد نہیں، اور اس اجتماعی ختم قرآن کے زمانہ میں میں بہت بچہ تھا، لیکن والدہ صاحبہ کے قرآن مجید سنانے کا سلسلہ میرے شعور کے بہت بعد تک جاری رہا، میں کبھی دروازہ میں کھڑا ہو کر سنتا، ایسا معلوم ہوتا کہ پانی برس رہا ہے صحت مخارج کے ساتھ روانی، پھر اس میں رقّت و دردِ نسوانی، نورٌ علیٰ نور۔

خاندانی تنازعات اور ان کا خاتمہ

میں نے جب شعور کی آنکھیں کھولیں تو اس وقت خاندان کا وہ تنازعہ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کوشش سے ختم ہو چکا تھا جس نے ایک دائمی مقاطعہ کی شکل اختیار کر لی تھی، یہ تنازعہ میرے نانیہالی بزرگوں، اور ندی کنارے رہنے والے عزیزوں میاں عبدالرشید صاحب مرحوم کی شاخ کے درمیان تھا، اس افسوسناک تنازعہ کے نتیجہ میں گھروں کی آمد و رفت بھی بند تھی، میرے دادیہال کے چونکہ اس گھرانے سے قریبی رشتے تھے، اور دادا صاحب کا مزاج

صلح کُل اور "مرنجان مرنج" تھا، اس لئے وہ اس نزاع اور اختلاف کے زمانہ میں بھی ایک دوسرے سے ملتے جلتے تھے، اور والد صاحب اور ان کی اولاد بھی کسی قدر اس معاملہ میں مستثنیٰ اور آزاد تھی، میرے شعور سے پیشتر کی بات ہے کہ والد صاحب مرحوم نے جن کے دل پر اس واقعہ کی سخت چوٹ تھی، اور جو ایک عالمِ دین کی حیثیت سے، اور حدیث و سیرت نبویؐ سے اشتغال، نیز اپنی افتادِ مزاج، اور محبت و رواداری کے اس خمیر کی وجہ سے جو ان کی طبیعت میں ودیعت تھا، اس صورت حال سے سخت بے چین تھے، آخر انھیں کی تحریک سے خاندان کے ایک معمر بزرگ سید قطب الدین صاحب کے بیچ میں پڑنے سے یہ تنازعہ ختم ہوا، اور دونوں شاخوں میں جو آپس میں بنی اعمام، اور ایک ہی دادا سید آیت اللہؒ بن شاہ علم اللہؒ کی اولاد تھے، میل ملاپ ہو گیا، والد صاحب نے اسی مقصد کے لئے ایک رسالہ "اصلاح" کے نام سے لکھا تھا جس میں قطع رحمی کے بارے میں قرآن و حدیث کی وعیدیں، اور ان کے دینی و دنیوی نقصانات کا ذکر کیا تھا، اور صلہ رحمی اور اصلاح ذات البین کے فضائل، ان کی ترغیبات اور اس سلسلہ کے عہد نبویؐ کے نہایت مؤثر واقعات لکھے تھے...... اس موضوع پر اس سے زیادہ مؤثر، اور جامع رسالہ کم سے کم میری نظر سے اردو عربی میں نہیں گزرا، اس رسالہ نے بھی ایک بڑے مصلح کا کام دیا۔[1]

لیکن جب میں نے ہوش سنبھالا تو ایک دوسرے تنازعہ اور مقاطعہ کا زمانہ تھا جس کی وجہ

---

[1] یہ رسالہ پہلی مرتبہ گلشن احمدی پریس لکھنؤ میں ۱۹۱۰ء-۱۹۱۱ء میں چھپا تھا، حال میں الحاج محمد نور نورولی صاحب، اور الحاج مولوی عبدالحفیظ صاحب سورتی نے اپنے والدین کے ایصال ثواب کی نیت سے دوبارہ چھپوایا، اور بڑے پیمانہ پر اس کی اشاعت کی گئی، بعض علاقائی زبانوں میں بھی اس کا ترجمہ ہوا، مکتبۂ اسلام ۳۷ گوئن روڈ سے مل سکتا ہے، اہل خیر کو اصلاحی مقصد سے اس کے چھپوانے اور علاقائی زبانوں میں اس کے ترجمہ کی مصنف کے ورثا کی طرف سے عام اجازت ہے۔

زمین و جائیداد کے کچھ جھگڑے، یا بعض عزیزوں کا طرزِ عمل تھا، یہ تنازعہ ہمارے نانیہالی تین[۳] - چار[۴] گھروں، اور خاندان کے ایک دوسرے بزرگ میاں سید نذیر احمد صاحب اور انکے فرزندوں کے درمیان تھا، جن کے مکانات بستی کی ابتدا میں جانب شمال مغرب واقع ہیں، یہ تنازعہ اس شدت کو پہونچ گیا تھا کہ کوئی ایک دوسرے سے ملنے اور تعلقات رکھنے کا روادار نہ تھا، بچوں کا بھی آپس میں ملنا اور گھر جانا پسند نہیں کیا جاتا تھا، لیکن کھیل ایک ایسی چیز ہے، جو ضوابط اور پابندیوں سے آزاد ہے، اور بچھڑوں اور بیگانوں کو ملانے والا ہے، ہم بچے ایک دوسرے کے ساتھ کھیلتے تھے، اور بے تکلف ملتے تھے، یہ تنازعہ بھی کچھ عرصہ کے بعد انقلاب زمانہ سے خود بخود تحلیل ہو گیا، اور وہ چیزیں بھی ختم ہو گئیں جو ما بہ النزاع تھیں۔

خاندان کی شاخ مقیم ٹونک اور اس کی خصوصیات

یہاں پر ایک حقیقت کا اظہار کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے خاندان کی دو بڑی شاخیں تھیں، ایک شاخ اپنے قدیم آبائی وطن دائرہ شاہ علم اللہؒ رائے بریلی میں مقیم تھی، دوسری شاخ وہ تھی، جو حضرت سید صاحب کی شہادت کے بعد نواب وزیر الدولہ مرحوم والی ریاست ٹونک کی دعوت پر ٹونک منتقل ہو گئی تھی، اس میں ان افراد خاندان کے ساتھ جو سید صاحب سے قریبی نسبت رکھتے تھے، جماعت مجاہدین کے بچے کھچے افراد اور ان کے متوسلین تھے، جو بالاکوٹ کی شہادت گاہ یا سندھ سے، یا پورب کے بعض حصوں سے ٹونک منتقل ہو گئے تھے، اور ان کی وجہ سے شہر کا وہ محلہ جہاں انھوں نے سکونت اختیار کی تھی، قافلہ کہلاتا تھا، رائے بریلی کی اس شاخ میں اگرچہ صحت عقائد، پابندی فرائض، اور بہت سی خوبیاں تھیں لیکن خاندان کی وہ شاخ جو ٹونک سے تعلق رکھتی تھی، اسلامی اخوت و مساوات، صلہ رحمی، تواضع اور سادگی،

ملازمین اور ماتحتوں سے مساویانہ برتاؤ اور اکرام میں نمایاں طور پر فائق تھی، یہ حضرت سید صاحب کی صحبت اور تربیت کا فیض، اور مجاہدین و مہاجرین کے اخلاق کا اثر تھا، رائے بریلی کی شاخ میں اس کے بالمقابل اودھ کی تہذیب اور زمینداری کے اثر نے اپنا رنگ دکھایا تھا، اس لئے جب ٹونک کے اعزہ اور بزرگ آتے تھے، تو ہم بچّوں کو اپنی کم سنی کے باوجود یہ فرق محسوس ہوتا تھا، خاص طور پر جب اخراج کے بعد ٹونک کی یہ دوسری شاخ بھی نقل مکانی پر مجبور ہوئی[1]، اور تکیہ آکر قیام کیا تو ہم لوگوں کو اس فرق کے زیادہ سمجھنے اور دیکھنے کا موقعہ ملا۔

---

[1] ۱۹۲۰ء یا ۱۹۲۱ء میں جب ہندوستان میں تحریک خلافت کا شباب تھا، قافلہ والوں کی ہمدردی اور جذبات اس تحریک کے ساتھ تھے، والیٔ ریاست (نواب ابراہیم علی خاں) کو قافلہ والوں سے اندیشہ و بدگمانی پیدا ہوئی، اور انھوں نے ان کی ریاست سے فوری اخراج کے احکام جاری کردیئے، جاگیریں اور جائیدادیں ضبط کرلیں، سادات قافلہ نہایت بے سروسامانی کے ساتھ، اس طرح کہ جو کپڑے بدن پر تھے وہ لے کر اپنے قدیم وطن رائے بریلی آگئے، یہاں کے اعزہ نے ان کو اپنے گھروں میں ٹھہرایا، ۱۹۳۲ء تک جب تک کہ اخراج کا حکم منسوخ نہیں ہوا، یہ حضرات اپنے اعزہ کے مقامات رائے بریلی، فتحپور، بھوپال وغیرہ رہے۔ ان اعزہ اور بزرگوں میں جو ٹونک چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور انھوں نے اپنے قدیم وطن میں پناہ لی، محترمی سید ابوبکر صاحب، سید محمد علی صاحب (علی میاں) (برادران خوردعم محترم مولانا سید طلحہ صاحب ایم، اے) خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جن کے اہل وعیال کے منتقل ہونے کی وجہ سے تکیہ کی آبادی اور رونق میں بیش بہا اضافہ ہوا، ان کے برادر بزرگ ابو حمزہ سید زبیر صاحب زیادہ تر اپنے موضع سن گاؤں ضلع فتحپور اور بھوپال میں رہے۔ یہاں تک محترمی سید اسمٰعیل صاحب وکیل اور حافظ سید محمد اسحٰق آئی۔ سی۔ ایس کا تعلق ہے، ان کا ننھیال تکیہ ہی پر تھا، اور ان کے ماموں ماسٹر سید محمد صاحب ندوی کا مکان موجود تھا، جس میں سید ابوبکر صاحب اور علی میاں قرابت قریبہ کی وجہ سے مقیم ہوئے، وہ دونوں اس وقت مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں زیر تعلیم تھے۔

مجھے خوب یاد ہے کہ ۲۱ء میں جب ٹونک کے یہ اعزہ جو یہاں کے خاندان سے کئی کئی رشتوں سے پیوست تھے، اور گویا ایک ہی جسم کے اجزاء تھے، جب اپنے قدیم وطن آئے تو عزیزوں نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا، جس کا جس سے زیادہ رشتہ تھا، اس کو اپنے گھر میں جگہ دی، عم محترم سید محمد اسمٰعیل صاحب جو حضرت سید صاحب کے حقیقی نواسے کے بیٹے تھے اور ٹونک میں (ولی عہد ریاست کے بعد) سب سے بڑی جاگیر انھیں کے پاس تھی، ہمارے گھر ٹھہرے کہ ہمیں لوگ ان کے سب سے قریبی عزیز تھے[1] اور ہمارا گھر ان کے ماموں کا گھر تھا، میں نے ان کی زبان سے کئی بار سنا ہے کہ ہم جب تکیہ آئے تو اچھے بھیا مرحوم (میرے والد محترم) نے مجھ سے کہا کہ "اسمٰعیل اگر تم ہمارے گھر ٹھہروگے تو احسان کروگے" اس میں غالباً حضرت سید صاحب کی نسبت کا احترام اور ان سے محبت و عقیدت کا جذبہ کام کر رہا تھا کہ میں نے اپنے خاندان میں عم محترم سید خلیل الدین صاحب اور اپنے والد صاحب سے زیادہ سید صاحب کا عزت و احترام، اور محبت و عقیدت کے ساتھ نام لیتے ہوئے کسی کو نہیں سنا،[2] والد صاحب مولانا حکیم سید عبدالحی" سید صاحب کا ذکر حضرت سید اور حضرت سید احمد شہید" سے کم الفاظ میں نہیں کرتے، اور لکھتے وقت یا نام لیتے وقت کیفیت وہ ہوتی تھی جو غالب نے اپنے شعر میں بیان کی ہے ؎

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لئے

مجھے یاد ہے کہ میں چھ سات سال کا تھا جب یہ حضرات تکیہ آئے، میری والدہ مرحومہ نے کہا کہ جاؤ تمہارے چچا آئے ہیں ان سے ملو، میں گیا تو دیکھا کہ ایک بڑے وجیہ، قوی الجثہ بزرگ (سید محمد اسمٰعیل صاحب) ہیں، انھوں نے مجھے دیکھا تو لپٹا لیا، پھر جب وہ ہمارے گھر میں رہنے لگے، (جہاں وہ اپنے مکان کی تعمیر تک رہے) تو ہر وقت کا رہنا سہنا، اور ملنا جلنا تھا، ہم اور برادر عزیز سید احمد الحسنی ساتھ کھیلتے تھے، اٹھتے بیٹھتے تھے، ان کے دونوں دوسرے بھائی بہن تکیہ پر پیدا ہوئے، اور سن شعور کو پہونچے۔

---

[1] سید محمد اسماعیل صاحب کی والدہ میرے دادا کی چچازاد بہن تھیں، اس لئے میرے والد اور عم محترم سید خلیل الدین صاحب تکیہ پر ان کے سب سے قریبی عزیز تھے۔ [2] سید خلیل الدین صاحب کے دادا سید سعید الدین صاحب حضرت سید صاحب کے براہ راست مرید، اور ان کے بھائی مولانا سید محمد ظاہر صاحب حسنی (جو میرے دادا کے حقیقی نانا تھے) سید صاحب کے خلفائے کبار میں سے تھے۔

بابِ دوم

بچپن کے بعض اہم واقعات، لکھنؤ کا قیام، کتابی دنیا، تحریکِ خلافت

بچپن کے بعض اہم واقعات

اس بچپن کی دوسری بات جو یاد آتی ہے، وہ اپنے حقیقی خالہ زاد اور رشتہ کے چچا زاد بھائی سید محمد احمد صاحب بیرسٹر کی شخصیت ہے، وہ ۱۹۱۵ء میں سیلاب سے کچھ پہلے انگلستان سے بیرسٹری پاس کر کے، اور فلسفہ میں ایڈمبرا یونیورسٹی سے ایم۔ اے کر کے آئے تھے، ان کی آمد پر اس چھوٹے سے خاندان، اور چھوٹی سی بستی میں بڑا استقبال اور اہتمام کیا گیا تھا کہ اس وقت شاید پورے ضلع میں کم سے کم مسلمان شرفاء اور زمینداروں کے خاندانوں میں شاید ہی کوئی یہ اعزاز حاصل کر کے آیا ہو، یہ تو میرے شعور سے پہلے کی بات ہے، میں نے اس مسرت اور استقبال کے قصے سنے ہیں، جو ان کے پہونچنے پر دیکھنے میں آیا، یہ زمانہ انگریزی اقتدار، اور اس کی تہذیب کے اقبال و عروج کا زمانہ تھا، ہر اس چیز کو عزت و مرعوبیت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، جس کا اس قوم اور ملک سے انتساب ہو، اس زمانہ میں انگلستان کو "ولایت" کے لفظ سے یاد کیا جاتا تھا، "فلاں آدمی ولایت سے آیا" وہ "ولایت کا پاس ہے" "ولایت میں ایسا ہوتا ہے" آج بھی کان میں یہ آوازیں گونج رہی ہیں کہ ملازم دروازے پر آواز دے رہے ہیں کہ

"صاحب" یہ مانگ رہے ہیں، "صاحب" یہ کہہ رہے ہیں، ان کا اپنے کتوں کے ساتھ شکار کو جانا اور بچوں اور عزیزوں کے جلوس کا ہمراہ ہونا آج بھی آنکھوں کے سامنے ہے، اس کا ذکر اس لئے بھی کیا گیا کہ اس سے اس زمانہ کی انگریزی تعلیم وتہذیب کے اثرات، اور اس قوم کے اقبال کا بھی اندازہ ہو جس کا سحر تحریک خلافت، اور تحریک آزادی تک دلوں اور دماغوں پر قائم رہا، اور جس سے مشکل سے کوئی کھاتا پیتا، اور پڑھا لکھا خاندان مستثنیٰ ہوگا۔

بھائی صاحب محمد احمد صاحب کے بعد ہمارے خاندان کیا بلکہ گھر کے دوسرے نوجوان جو تعلیم کے لئے ہندوستان سے باہر گئے میرے حقیقی ماموں زاد بھائی سید سراج النبی حسنی تھے، جو ۱۹۲۱ء میں عازم امریکہ ہوئے، اس وقت تک ریاست ہائے متحدہ امریکہ جانے کا شاید پورے ہندوستان میں بہت کم رواج ہوگا، اس لئے کہ ہندوستان میں صرف انگلستان ہی کی یونیورسٹیوں اور کالجوں کی سندیں معتبر اور ملازمتوں کے حصول کی ضامن تھیں، یہ معلوم نہیں ان کو امریکہ کا خیال کیسے آیا، ان کے اس سفر سے کچھ پہلے ہمارے ایک دوسرے عزیز بزرگ سید محمد عمر حسنی صاحب[۱] جرمنی، اور جاپان جا چکے تھے، اور وہاں سے انجینئرنگ کی

---

[۱] یاد بخیر عم محترم سید محمد عمر صاحب (برادر بزرگ مولانا سید طلحہ صاحب) اپنی اعلیٰ ڈگریوں اور جاپان، جرمنی کے قیام کے باوجود بڑی اعلیٰ صفات و اخلاق کے انسان، نہایت متواضع، بے نفس اور بے آزار بزرگ تھے، صلہ رحمی، حسن سلوک ان کی خاص صفت تھی، کچھ عرصہ تک اٹاوہ کے اسلامیہ اسکول میں استاد رہے، کچھ مدت مولانا آزاد کے "الہلال" اخبار میں کام کیا پھر جاپان و جرمنی جا کر انجینئرنگ کی اعلیٰ ڈگریاں لائے اور وہاں کی نامور اکاڈمیوں کے ممبر رہے، بھوپال، ٹونک اور جوناگڑھ میں اعلیٰ عہدوں پر کام کیا، ۱۹۴۱ء میں جوناگڑھ میں انتقال کیا "مشاہدات سائنس" ان کی ایک مفید تصنیف ہے۔

اعلیٰ ڈگریاں لائے تھے، لیکن ان کا قیام ٹونک میں تھا، اس لئے اس واقعہ کا زیادہ شعور نہیں، بھائی جان سراج کا جانا خوب یاد ہے، خاندان کے اعزہ کچھ دور تک بستی سے نکل کر ان کو پہونچانے گئے تھے، ہم بچے بھی تھوڑی دور تک ان کے ساتھ تھے، انھوں نے ڈٹروائٹ (DETROIT) اور نیویارک میں موٹر میکانک کی تربیت حاصل کی، فورڈ موٹر کمپنی میں بھی کام کیا، اور نیویارک کے ایک کالج سے کامرس کی ڈگری بھی لی، ان کی واپسی کا ذکر اپنی جگہ پر آئے گا۔[1]

خاندان کی اقتصادی حالت اور اس کے سدھار کی کوشش

اپنے شعور سے پہلے کی بات تو نہیں کہتا لیکن جب سے مجھے شعور آیا، میں نے یہ دیکھا کہ زمینداری (جو یوپی اور بہار میں بڑی عزت کی چیز سمجھی جاتی تھی) ایک ایسا قلیل المنفعت ذریعۂ معاش رہ گیا تھا جس میں سرگردانی اور پریشانی تو بہت تھی، فائدہ کم تھا، میرے ننہیال میں اچھی خاصی زمینداری تھی، اور ضلع کے اچھے زمینداروں میں اس کا شمار تھا، مجھے یاد ہے ۳۰-۲۹ء میں اس زمینداری کا صرف ایک موضع (بہرام پور ضلع فتحپور) اسّی ہزار میں فروخت ہوا تھا[2]، لیکن کچھ تو خود زمینداری کا کام نہ دیکھنے کی وجہ سے کچھ ضلعداروں کی نااہلی سے اور شاید بالواسطہ کاشتکاروں کے ساتھ زیادتی کی وجہ سے جو لگان نہیں دے سکتے یا دینا نہیں چاہتے تھے، میں نے اپنے خاندان کے ان گھروں میں، خوشحالی، اور زیادہ فراغت نہیں دیکھی،

لہ ہمارے ایک دوسرے عزیز و بزرگ حافظ سید اسحٰق حسنی صاحب آئی، سی، ایس سابق چیف سکریٹری مشرقی پاکستان حال مقیم کراچی کا سفر انگلستان بہت بعد کا اور میری آخری طالب علمی کا واقعہ ہے اس لئے اس کا یہاں ذکر نہیں کیا گیا، (۳۰ جنوری ۱۹۸۳ء کو ان کا کراچی میں انتقال ہوگیا) ٢ہ یہ خیال رہے کہ اُس وقت کا ایک روپیہ اِس وقت کے دس روپیوں کے برابر تھا۔

ویسے ضلع میں عزت و وجاہت تھی، لگان تو مشکل سے وصول ہوتا تھا لیکن مالگزاری سرکار میں ضرور داخل کرنی پڑتی تھی، جس کے لئے بعض اوقات قرض و رہن کی نوبت آجاتی۔

شاید انھیں حالات کے تقاضہ سے ۲۳ء میں خاندان کے بعض بزرگوں کو خیال ہوا کہ آمدنی کے کچھ اور شریفانہ ذرائع سوچے جائیں اور خاندان کے لوگوں کی شرکت میں کوئی منظم اور باقاعدہ کام شروع کیا جائے، اس سلسلہ میں ان کا ذہن اینٹوں کا بھٹّا لگانے کی طرف گیا، جس کا خاندان کے بعض لوگوں کو تجربہ تھا، اور ایک مرتبہ ۱۸ء میں ایسی کوشش ہو چکی تھی، زمین کی کمی نہ تھی، چنانچہ ریلوے لائن کے جنوبی جانب اپنی ہی زمینداری میں ایک بھٹّا (پجاوا) لگایا گیا، اس کے منیجر میرے چچا اور استاد مولوی سید عزیز الرحمن صاحب ندوی قرار پائے، مجھے یاد ہے کہ میں اس زمانہ میں صرف و نحو کی ابتدائی کتابیں پڑھتا تھا، اور تکیہ آیا ہوا تھا، روزانہ صبح ان کے پاس سبق لینے جایا کرتا تھا، اور آتے جاتے اس کا طریقۂ کار دیکھتا تھا، خاندان کے لوگوں کے حصص (SHARES) تھے، والد صاحب نے نقد کی صورت میں کوئی ترکہ نہیں چھوڑا تھا، راجہ صاحب پرتاب نیر کے ذمہ ان کی کچھ فیسیں باقی تھیں، بھائی صاحب نے اس سے اس کے کچھ (SHARES) خریدے، مجھے یاد ہے کہ میں نے اسی کی آمدنی سے ایک ہوائی بندوق (AIR GUN) اور ایک گھڑی خریدی تھی، کچھ عرصہ کے بعد (غالباً ۳۱-۳۲ء میں) اس بھٹّے کو نقصان کی وجہ سے بند کرنا پڑا، آمدنی کی ایسی کوششیں (کم سے کم میرے علم و شعور میں) اس خاندان کو راس نہیں آئیں اس لئے کہ تجارت کے لئے جو ذہنی صلاحیتیں اور تجربہ چاہیئے، اس کی خاندان میں کمی تھی۔

لکھنؤ کا ماحول اور بچپن، کتابوں کا شوق، اور پہلی تقریر

اب ہمارے ساتھ لکھنؤ چلئے جس کا رائے بریلی سے فاصلہ ۴۹ میل اور

کرایہ صرف چودہ[۱۴] آنے ہے[۱]، گاڑیوں میں کوئی بھیڑ بھاڑ نہیں ہوتی، عموماً لوگ تھرڈ کلاس میں آرام کے ساتھ سفر کرتے ہیں، گاڑیاں وقت پر چلتی ہیں، زمیندار لوگ اور خاص شرفاء انٹر کلاس[۲] میں سفر کرتے ہیں، سکنڈ اور فرسٹ کلاس میں صرف انگریز یا تعلقدار لوگ سفر کرتے ہیں، لکھنؤ اور رائے بریلی کے سفر میں اگرچہ صرف دو ڈھائی گھنٹے لگتے ہیں، لیکن بڑا اہتمام ہوتا ہے ناشتہ کا ساتھ جانا ضروری سمجھا جاتا ہے، ہم لوگوں کی آمد و رفت لکھنؤ رائے بریلی کے درمیان برابر رہتی ہے، خاص طور پر تقریبات کے موقعہ پر جو رائے بریلی ہی میں ہوتی ہیں، رائے بریلی آنا ضروری ہوتا ہے، اب میں اپنی ہی تحریر سے مدد لے کر لکھنؤ میں اپنے گھر کے ماحول، اور طرز معاشرت کا نقشہ پیش کرتا ہوں، ہمشیرہ مرحومہ سیدہ امت اللہ تسنیم صاحبہ کی وفات پر "پرانے چراغ" حصہ دوم کے لئے جو مضمون لکھا تھا اس کا ایک اقتباس پیش ہے۔

"لکھنؤ امین آباد کے اس محلہ میں جس کو اس وقت بازار جھاؤ لال کہتے تھے، اب اس کے سرے پر "محمد علی لین" کا پتھر لگا ہوا ہے، والد ماجد مولانا حکیم سید عبد الحی صاحب کا بالکل لب سڑک مکان اور مطب تھا، (اب بھی خدا کے فضل سے وہ مکان ہمیں لوگوں کے استعمال میں ہے) اسی میں ہمارا چھوٹا سا گھرانہ رہتا تھا، یہ ماں باپ، اور چار[۴] بھائی بہنوں پر مشتمل تھا، دو[۲] بھائی اور دو بہنیں، بڑے بھائی جو بعد میں ڈاکٹر حکیم مولوی سید عبد العلی صاحب بی، ایس، سی، ایم، بی، بی ایس ناظم ندوۃ العلماء کے نام سے نامور ہوئے، ان سے چھوٹی ایک بہن امت العزیز صاحبہ (والدہ عزیزان مولوی محمد ثانی، محمد رابع، محمد واضح سلمہم اللہ) اللہ ان کی عمر میں برکت عطا فرمائے کہ وہی اب ہمارے چھوٹے سے خاندان کی برکت اور

---

[۱] اب اس دور آزادی، اور حکومت خود اختیاری میں تھرڈ کلاس کا کرایہ ساٹھ[۶۰] روپے ہو گیا ہے۔

[۲] اب یہ کلاس منسوخ ہو گیا، اب صرف فرسٹ اور سکنڈ رہ گئے ہیں۔

بزرگوں کی یادگار ہیں، ان سے چھوٹی امت اللہ تسنیم صاحبہ جن کو خاندان میں عائشہ بی کی عرفیت اور نام سے سب جانتے ہیں، اور پکارتے تھے، اور جو اب خدا کے جوار رحمت میں پہونچ گئی ہیں، سب سے چھوٹا یہ راقم سطور تھا، جس کی عمر اس وقت چھ سال کی تھی، یوں تو گھر خدا کے فضل سے متعدد افراد خاندان مستقل و عارضی مہمانوں سے ہمیشہ بھرا رہتا تھا، اور اس کی وجہ سے گھر میں رونق اور چہل پہل کی کمی نہ تھی، قرب مسافت اور اصل وطن ہونے کی وجہ سے رائے بریلی سے بھی اعزہ کی آمد و رفت کا سلسلہ برابر جاری رہتا تھا، لکھنؤ کے بعض دیندار شریف گھرانوں سے بھی بالخصوص نواب سید نور الحسن خاں صاحب مرحوم بھوپالی (فرزند اکبر والا جاہ امیر الملک نواب سید صدیق حسن خاں صاحب بہادر) کے گھر سے عزیزانہ و برادرانہ مراسم تھے، اور آمد و رفت کا سلسلہ برابر جاری رہتا تھا، لیکن ایک باپ کی اولاد یہی چار بھائی بہن تھے۔

والد صاحب کا سارا وقت تصنیف و تالیف، مطب اور ندوۃ العلماء کی نظامت کے کاموں میں گذرتا تھا، وہ طبیعت کے بڑے یکسو، خاموش اور مشغول انسان تھے، الگ تھلگ ایک کمرہ میں رہتے تھے، سراپا شفقت و محبت ہونے کے باوجود ہم لوگ ان سے بے تکلف نہ تھے، جب خاندان کے کوئی بزرگ آجاتے تو اکثر ہم سب بھائی بہن جمع ہو جاتے اور ان کو ہنستا بولتا دیکھتے، بڑے بھائی صاحب لکھنؤ میڈیکل کالج میں زیر تعلیم تھے، اور میڈیسن کی تعلیم (خصوصاً اس زمانہ میں) ایسی محنت طلب تھی کہ ان کا سارا وقت مطالعہ اور تیاری، اور میڈیکل کالج کی آمد و رفت میں گذرتا تھا، میں یہ لکھنا بھول گیا کہ ہم چار بھائی بہنوں کے علاوہ اس مختصر خاندان کی ایک فرد ہماری بھاوج اہلیہ ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب تھیں، جو اپنی نیک دلی، بے نفسی، اور محبت کی وجہ سے گویا ہماری بہنوں ہی میں ایک اضافہ

کرتی تھیں، میری بڑی بہن کی شادی ہوگئی تھی، وہ اکثر اپنی سسرال رائے بریلی اور بھاوج صاحبہ اپنے میکہ ہنسوہ چلی جاتیں، اور کئی کئی مہینے بھی دونوں کا وہاں قیام رہتا، اس لئے زیادہ تر واسطہ اور یکجائی انھیں مرحومہ بہن سے تھی۔

ہمارا گھرانہ علماء و مصنفین کا گھرانہ ہے، والد صاحب اپنے زمانہ کے عظیم مصنفوں میں تھے، خاندانی و موروثی اثرات بڑے طاقتور ہوتے ہیں، وہ نسل در نسل منتقل ہوتے رہتے ہیں، اور بچوں اور بچیوں سب میں ان کے اثرات کم و بیش پائے جاتے ہیں، کچھ یہ آبائی اثر، کچھ والد صاحب کا ذوق و انہماک ہمارے سارے گھر پر یہ کتابی ذوق سایہ فگن تھا، کتب بینی کا یہ ذوق، ذوق سے بڑھ کر لت، اور بیماری کی حد تک پہونچ گیا تھا کہ کوئی چھپی ہوئی چیز سامنے آجائے تو اس کو پڑھے بغیر چھوڑ نہیں سکتے تھے، ہم بھائی بہنوں کو جو تھوڑے سے پیسے دست خرچ کے لئے ملتے، یا خاندان کے کوئی بزرگ جاتے ہوئے (اس زمانہ کے خاندانی رواج کے مطابق) بچوں کو روپیہ دے جاتے، اس کا ایک ہی محبوب مصرف تھا کہ اس سے کوئی کتاب خرید لی جائے۔

اس سلسلہ میں خود میری ایک دلچسپ کہانی سنتے چلئے کہ میرے پاس اس طرح کچھ پیسے آگئے، وہ ایک دو آنے سے زیادہ نہ تھے، میں اتنا چھوٹا تھا کہ مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کتاب کتب فروشوں ہی کے یہاں ملتی ہے، اور ہر چیز کی دکان الگ ہوتی ہے، میں امین آباد گیا، گھنٹہ گھر والے پارک کے سامنے بڑی دکانوں کی جو قطار ہے، اس میں کسی دوا فروش کی دکان پر پہونچا، غالباً "سالومن" کمپنی تھی، میں نے پیسے بڑھائے کہ کتاب دیجئے، دکان پر کام کرنے والے صاحب نے سمجھا کہ کسی شریف گھرانے کا بھولا بھالا بچہ ہے، کیمسٹ کی دکان پر کتاب کیا ملتی، دواؤں کی فہرست اردو میں تھی، انھوں نے وہی بڑھا دیا، اور پیسے بھی واپس کر دیئے، میں پھولے نہیں سماتا تھا کہ کتاب بھی مل گئی اور پیسے بھی واپس آگئے، خوش خوش گھر پہونچا، اور

اس سے اپنے چھوٹے سے اس کتب خانہ کو سجایا جو والد صاحب کے یہاں کی ان کتابوں سے بنایا تھا، جو ان کے لئے بیکار تھیں، اور وہ ردی میں ڈال دیتے تھے، یہی شوق میری دونوں بہنوں کا تھا، کتاب کے بغیر ان کو چین نہیں آتا تھا، اس زمانہ میں ایک کتاب فروش ہماری گلی میں آتے تھے، اور صدا لگاتے تھے، "ہرنی نامہ" "نور نامہ" "حلیمہ دائی کی کہانی" "معجزۂ آل نبیؐ" "میلاد نامہ" وغیرہ وغیرہ، ان کی صورت ابھی تک آنکھوں میں ہے، وہ ان کتابوں کے اشعار گا گا کر پڑھتے تھے، ادھر ان کی آواز کان میں آئی، ادھر ان دونوں بہنوں کی طرف سے حکم ملا کہ فلاں کتاب لے آؤ، دوڑا دوڑا گیا، اور کتاب خرید لایا، ہمارا گھرانہ عقائد و مسلک میں حضرت سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کا سختی سے پیرو تھا، اور ان کے اثرات ایسے رچ بس گئے تھے کہ بے اصل اور غیر مستند چیزیں جن سے عقائد میں خلل پڑتا ہو گھر میں بار نہیں پاتی تھیں، مردوں سے زیادہ عورتیں عقیدہ کے بارے میں سخت تھیں، اس لئے معجزۂ آل نبی جیسی کتابوں کا تو یہاں گذر نہ تھا، البتہ سیرت، بزرگوں کی حکایات، اور بے ضرر دلچسپ کتابیں، خواہ نظم میں ہوں یا نثر میں، ہاتھوں ہاتھ لی جاتی تھیں، ان کتابوں کی قیمت ہی کیا تھی، کسی کے دو پیسے کسی کے چار پیسے، بہت قیمت ہوئی تو ۲؍ آنہ، ۴؍ آنہ، دونوں بہنوں میں سے کسی نے ترنم کے ساتھ مزے لے لے کر پڑھنا شروع کیا، اور جب تک کتاب ختم نہ کر لی ان کو چین نہ آیا، اسی زمانہ کا سنا ہوا حضرت حلیمہ دائی کا قصہ آج تک دل پر نقش ہے، اس کے ابتدائی چار شعر یہ ہیں ؎

ایک عاشق تھی حلیمہ دائی — جس نے گھر بیٹھے یہ دولت پائی
وہ کچھ اس رمز سے آگاہ نہ تھی — اس کی قسمت میں یہ دولت تھی لکھی
نور اللہ کو لائی گھر میں — یعنی اس شاہ کو لائی گھر میں
واہ کیا طالع بیدار ملے — جس کو کونین کے سردار ملے

اس سیدھی سادی نظم میں جس کے کہنے والے کا نام بھی معروف نہیں، اس پاک محبت کے دل کی نرم سرزمین میں ابتدائی بیج ڈالے، پھر جب "سیرۃ ابن ہشام" میں یہ عزیز و لذیذ حکایت پڑھی جس میں راوی نے اپنے معمول سے زیادہ دراز نفسی سے کام لیا ہے۔ ع

لذیذ بود حکایت، دراز تر گفتم

تو وہ معصوم زمانہ جس پر اللہ کی ہزار رحمتیں ہوں یاد آگیا۔

کتابوں کی خریداری میں صرف اسی کتب فروش ہی کے ذخیرہ پر بس نہ تھی جس کی گٹھری وہ اپنے بغل میں داب کر لاتے تھے، بلکہ مجھے وقتاً فوقتاً حکم ملتا رہتا تھا، میں "صدیق بک ڈپو" سے جو ہمارے قریب سب سے بڑی کتابوں کی دکان تھی، ان کی انتخاب کی ہوئی کتابیں خرید لاؤں، یہ سب کتابیں جو کبھی نظم میں ہوتیں اور کبھی نثر میں، مشترک طور پر پڑھی جاتیں، اسی زمانہ میں سیرت پاک پر اردو کے چھوٹے بڑے رسالے پڑھے گئے، اور دل و دماغ میں پیوست ہو گئے، ان کے نام تو اب یاد نہیں، لیکن اتنا یاد ہے کہ ان کے پڑھنے سے اس زمانہ کے رواج کے مطابق مجھے میلاد یا سیرت کا جلسہ کرنے کا شوق ہوا، اپنے ہم سن بچوں کو مدعو کیا، اور ان کو دعوت دینے کے لئے خود گھر گھر گیا، انھیں بہنوں میں سے کسی نے میرے سر پر چھوٹی سی پگڑی باندھی، عمر یہی آٹھ، نو برس کی رہی ہوگی، انھیں کتابوں میں سے میں نے کوئی کتاب لے کر پڑھنی شروع کی، قابلیت کا یہ حال تھا کہ حضورؐ کے دادا سردار قریش عبد المُطَّلِبْ کو عبد المطلَب پڑھ رہا تھا، والد مرحوم خاموشی سے آکر ایک طرف اوٹ میں کھڑے ہو گئے تھے، ان کا دل یہ منظر دیکھ کر کتنا باغ باغ ہو رہا ہوگا کہ اللہ نے عشق نبویؐ کا ان کو حصۂ وافر عطا فرمایا تھا، اور اسی سے ان کی تحریروں میں آب و رنگ ہے، ان کے لئے کیا کم خوشی کی بات تھی کہ ان کا کم سن بچہ اس ذکر خیر میں مصروف ہے، جو ہر خیر و برکت کا سرچشمہ ہے اور اس طرح وہ خود

اپنا طالع بلند اور اپنا بخت بیدار کر رہا ہے ؎

حکایت از قدآں یار دل نواز کنیم

بایں بہانہ مگر عمر خود دراز کنیم

نعتوں میں سب سے زیادہ امیر مینائی اور محسن کاکوروی کی نعتیں ان بہنوں کی زبان پر جاری تھیں، خاص طور سے حضرت محسن کی مشہور نظم۔ ع

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل

بہت پڑھی جاتی تھی، کتابوں میں "مسدس حالی" گویا ورد زبان تھی، اور اس کا بڑا حصہ ان دونوں بہنوں کو تقریباً حفظ تھا، اس زمانہ میں شرفاء اور پڑھے لکھے لوگوں کا کوئی گھر بھی اس کتاب کے مطالعہ اور نغمہ خوانی سے خالی نہ تھا۔[1]

محلہ کا ماحول

ہمارا محلہ (بازار جھاؤلال) شہر کے ان چند گنے چنے محلوں میں تھا، جو صحیح العقیدہ لوگوں سے آباد تھا، اور جہاں لکھنؤ کی عام فضاء کے خلاف محفل میلاد، گیارہویں، محرم کے مراسم وغیرہ کا وجود نہیں تھا، اس کی وجہ کچھ تو اس محلہ میں رہنے والی قریشی برادری کے بزرگوں کا ان علماء سے تعلق تھا، جو ان رسوم کو ناپسند کرتے، اور اصلاحی خیالات رکھتے تھے، اس محلہ کے اس وقت کے چودھری منشی عبدالغنی صاحب (جو والد صاحب کے فدائی دوستوں اور حاضر باشوں میں تھے) حضرت مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی کے مواعظ میں شریک ہونے والوں میں تھے، دوسرا سبب والد صاحب کا طالب علمی کے زمانہ سے اس محلہ میں قیام،[2] صحیح الخیال علماء کی آمد و رفت، اور

[1] "پرانے چراغ" حصہ دوم ص ۳۴۱-۳۴۷ [2] اس کی تفصیل ملاحظہ ہو "حیات عبدالحی" ص ۵۵-۵۶ پر۔

ان میں سے بعض کی محلہ میں سکونت اور ندوہ سے قرب تھا، (جو اس زمانہ میں گولہ گنج، ماموں بھانجہ کی قبر کے قریب خاتون منزل میں تھا) غرض یہ محلہ ایک طرح سے عرف عام کے مطابق "وہابیوں" کا محلہ تھا، والد صاحب کا قیام جس مکان میں تھا، اس سے چند گز کے فاصلہ پر جانب شمال مسجد تھی، جو مسجد نوازی، یا یکہ یا والی مسجد کہلاتی تھی، اس میں برسوں والد صاحب نے جمعہ کے بعد وعظ کہا تھا، لکھنؤ میں جو چوٹی کے علماء آتے وہ والد صاحب یا ندوہ کے تعلق سے اس محلہ اور مسجد میں ضرور آتے، یہاں جمعہ اور پنج وقتہ جماعت کے امام بالعموم ہمارے خاندان کے ذی علم افراد، یا مشاہیر علماء ہوتے، منصب امامت پہلے والد صاحب سے متعلق تھا، پھر بھائی صاحب سے جب وہ دیوبند سے پڑھ کر آئے متعلق ہوا، برسوں شیخ محمد عرب پھر ان کے فرزند میرے استاد شیخ خلیل عرب امام رہے۔

منشی عبدالغنی صاحب مرحوم

جب منشی عبدالغنی صاحب کا نام آگیا ہے تو ان کا مختصر ذکر کرتا چلوں کہ وہ عجیب وضع دار، راسخ العقیدہ، خوش اوقات بزرگ تھے، عربی اور رسمی تعلیم کے لحاظ سے محض ناخواندہ، دستخط بھی غالباً ہندی میں کرتے تھے، لیکن دینیات، بالخصوص حدیث کی کتابوں کے سننے کا عمر بھر معمول رہا، اس کی وجہ سے ان کی دینی معلومات ایسی ہوگئی تھیں کہ چھوٹا موٹا عالم، اور مدرسہ کا نیا نیا فارغ ان کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا تھا، مجھے خوب یاد ہے کہ ایک بڑے مدرسہ کے تازہ فاضل ہماری مسجد میں آئے، اوقات صلوٰۃ میں سے کسی مسئلہ پر ان سے بحث ہوگئی، وہ ابوداؤد کا حوالہ دیتے تھے، تو یہ ترمذی کا، وہ مسلم کا ذکر کرتے تھے تو یہ بخاری کا، آخر میں انھیں کو چپ ہونا پڑا، اپنا لطیفہ سناتے تھے کہ میں ایک مرتبہ رام پور گیا، وہاں

مولانا محمد شاہ صاحب محدث سے ملنے چلا گیا، انھوں نے یہ سمجھ کر کہ یہ مولانا حکیم عبدالحی صاحب کے ہم نشینوں میں ہیں، اور عالموں کی صورت ولباس ہے، بڑے شوق سے اپنا کتب خانہ دکھانا شروع کیا، فرماتے تھے کہ میں نے کسی بات سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میں اَن پڑھ ہوں، آخر تک وہ اس غلط فہمی میں رہے کہ میں کتابوں، ان کی حیثیتوں اور درجوں سے واقف ہوں، نواب قطب الدین خاں کی "مشارق الانوار" مولانا خرم علی صاحب بلہوری کی "جارق الاشرار" "نصیحۃ المسلمین" ان کی محبوب کتابوں میں تھیں، جو وہ کسی سے پڑھوا کر سنتے رہتے تھے[1]، تکبیر تحریمہ ان کی شاید کبھی مہینوں میں فوت ہوتی ہو، اور تہجد کا ناغہ بھی شاید کبھی مہینوں میں ہوتا ہو، روزانہ کا معمول تھا کہ والد صاحب کے مطب میں آ کر بیٹھ جاتے ان کی باتیں غور سے سنتے، ان کی وفات کے بعد اپنا یہ وظیفہ بھائی صاحب کے مطب میں پورا کرتے، گھر کے بڑے خیر خواہ، اور عزیزوں سے بڑھ کر تعلق رکھنے والے تھے، سارے محلے اور برادری پر ان کا اثر تھا، اور کوئی کام ان کی مرضی کے خلاف نہیں ہو سکتا تھا، ان کے بڑے بھائی چودھری عبدالحمید صاحب اور دوسرے اہل برادری بھی ان کے ہم عقیدہ اور ہم مسلک تھے۔

اسی مسجد نوازی کے ایک حجرہ میں اس زمانہ کے موذن و امام حافظ محمد سعید صاحب رہتے تھے، جن کے یہاں صبح کو مکتب لگتا تھا، میری تسمیہ خوانی رائے بریلی میں ہو چکی تھی جو ہمارے چچا مولوی سید عزیز الرحمن صاحب ندوی نے کرائی تھی، اب اس مکتب میں داخل ہوا جو بالکل گھر سے متصل ہی تھا۔

---

[1] اکثر یہ خدمت مولوی محمد سلیم صاحب (ساکن گشنی ضلع سلطانپور) انجام دیتے تھے، جو اس مسجد کے مؤذن و خادم تھے، اور بعد میں تبلیغی مرکز کچہری روڈ منتقل ہو گئے تھے۔

بچپن کی کچھ یادیں

لکھنؤ اور رائے بریلی کے قیام کی مدت کا اگر موازنہ کیا جائے تو لکھنؤ کے قیام کی مدت واضح طریقہ پر رائے بریلی کے قیام سے زیادہ نکلے گی، اس کی وجہ یہ ہے کہ والد صاحب کا مطب اور ندوۃ العلماء سے تعلق کی وجہ سے مستقل قیام لکھنؤ ہی رہنا تھا، کبھی کسی تقریب میں شرکت کے لئے والدہ صاحبہ کا رائے بریلی جانا ہوتا تھا، اور کچھ دن رہ کر چلی آتی تھیں۔

قصبہ ہنسوہ ضلع فتحپور کے سفر

رائے بریلی کے علاوہ سفر کی دوسری منزل قصبہ ہنسوہ ضلع فتحپور تھا، جہاں والد صاحب کا اور بھائی صاحب کا ننہال اور ان کی سسرال تھی، اور سادات حسینی واسطی کی ایک معتبر شاخ وہاں صدیوں سے مقیم تھی، اور دینی و دنیوی وجاہت پر فائز، دینی وجاہت کا سبب حضرت مولانا سید عبدالسلام صاحب واسطی ہنسوی کی ذات گرامی تھی، جو حضرت شاہ احمد سعید صاحب مجددی کے اجل خلفاء میں سے تھے[1]، وہ اس پایہ کے بزرگ تھے، کہ جب دہلی کی خانقاہ مجددیہ واقعہ چتلی قبر مولانا شاہ احمد سعید صاحب، اور شاہ عبدالغنی صاحب ہر دو برادران کے حرمین ہجرت کر جانے کے بعد خالی ہوگئی، اور متوسلین نے حضرت شاہ عبدالغنی صاحب کو لکھا کہ یہ خانقاہ سونی ہے، تو انھوں نے لکھا کہ مولانا عبدالسلام صاحب کو ہنسوہ سے لے جاؤ، اور وہاں کی مسند پر بٹھاؤ، میں نے ہنسوہ کے قلمی ذخیرہ میں حضرت شاہ عبدالغنی صاحب کا دستی خط اور مولانا عبدالسلام صاحب کا جواب دیکھا ہے، دنیوی وجاہت کی وجہ بڑی زمینداری تھی،

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر" ج ہفتم، اور "حیات عبدالحی" ص ۳۸-۴۱

جس کے اصل مالک و منتظم مولانا عبد السلام صاحب کے حقیقی چچا زاد بھائی سید عبد العزیز صاحب (مولانا حکیم عبد الحی صاحب کے حقیقی ماموں تھے) ان دونوں اسباب سے اس خاندان کا پورے ضلع اور جوار میں بڑا احترام تھا، والد صاحب ان چند در چند رشتوں کی وجہ سے اس خاندان کے گویا فرزند اور چشم و چراغ تھے، اور قصبہ کا بچہ بچہ ان سے محبت کرتا تھا، وہ وہاں جا کر بہت مسرور نظر آتے، یہ بات ایسی نمایاں تھی کہ مجھے اپنی کم سنی کے باوجود اس کا احساس ہوا، میں نے ایک دن ان سے کہا کہ بابا آپ ہنسوہ میں آکر اتنے کیوں خوش ہوتے ہیں؟ فرمایا کہ عبید اور احمد سعید تمہارے کون ہیں؟ میں نے کہا کہ ماموں، فرمایا کہ تم وہاں جا کر خوش ہوتے ہو یا نہیں؟ میں نے اثبات میں جواب دیا، فرمایا کہ تکیہ تمہارے ماموں کا گھر ہے، اور ہنسوہ ہمارے ماموں کا گھر، مجھے اب بھی ان کے ساتھ ہنسوہ جانا، سکنڈ کلاس کا سفر، اور راستہ کے اسٹیشن ابھی تک یاد ہیں۔

والد صاحب مرحوم کے ساتھ ہنسوہ جانا تو ایک ہی آدھ بار یاد ہے، ویسے خاندانی تقریبات میں والدہ صاحبہ کے ساتھ بارہا جانا ہوا، یہ سفر بالعموم عم محترم مولوی سید عزیز الرحمٰن صاحب کی ہمراہی میں ہوتا تھا، پہلی منزل فتحپور ہوتی تھی، جہاں ہماری ایک حقیقی خالہ زاد بہن کا اس وقت قیام تھا، ان کے شوہر سید محمد معین عرف عبد اللہ میاں محکمۂ افیون میں (جو انگریزی دور حکومت میں ایک بڑا پر منفعت اور اہم محکمہ تھا) اچھے عہدہ پر تھے، وہ خود میری والدہ صاحبہ کے حقیقی ماموں زاد بھائی تھے، ان کے لڑکے سید محمد مسلم، اور سید حسن مثنیٰ میرے تقریباً ہم عمر تھے، اس لئے وہاں بڑی دل بستگی اور بے تکلفی رہتی، وہاں سے ہنسوہ ۷۔۸ میل رہ جاتا ہے، یہ سفر یکّوں سے ہوتا تھا، اس وقت عزیزوں کا محلہ جو "درگاہ" کہلاتا تھا، بڑا آباد اور پر رونق تھا، خاندان کے دو بزرگ اس وقت موجود تھے، ایک چچا

حافظ سید عبدالمغنی صاحب (فرزند حضرت مولانا سید عبدالسلام واسطیؒ) دوسرے حافظ سید زبیر احمد صاحب جو ہمارے چچازاد بھائی اور رشتہ کے بہنوئی بھی ہوتے تھے، ان کے تین بھائی سید محمد، سید احمد، اور سید ابو محمد تھے، آخر الذکر دونوں بھائی ندوہ میں پڑھتے تھے۔

اس وقت کی یہ بات خوب یاد ہے کہ چونکہ لوگ والد صاحب سے خوب واقف تھے، اور ان کو ایک عقیدت اور محبت تھی، میں ان کا فرزند تھا، اس لئے کوئی مجھ سے وعظ کہنے کی فرمائش کرتا، کوئی نبض دکھاتا، اور نسخہ پوچھتا، کہ والد صاحب عالم بھی تھے، اور طبیب بھی، میری عمر مشکل سے ۶۔۷ سال کی تھی، وعظ کی فرمائش پر میں قرآن شریف کی آیت :۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا۔ (سورۃ التحریم۔ ۶) اے ایمان والو بچاؤ اپنے آپ کو اور گھر والوں کو دوزخ سے۔

پڑھ کر اس کا ترجمہ کرتا، پھر کوئی نبض دکھاتا اور کہتا کہ حکیم جی نسخہ بتایئے، میں نسخہ بولتا، گل بنفشہ، گاؤزباں، عناب ولایتی، تخم خبازی، تخم خطمی، پرہیز پوچھنے پر شوربہ، پھلکا بتاتا[1]، یہ معلوم نہیں یہ سبق کس نے یاد کرایا تھا، والد صاحب کے مطب میں سیکھا تھا، یا کسی نے رٹا دیا تھا، اب جب کبھی دینی تعلیمی کونسل کے پلیٹ فارم سے دینی تعلیم کی ضرورت واہمیت پر تقریر کرتے ہوئے، اس آیت کو پڑھتا ہوں، تو بے اختیار وہ زمانہ یاد آجاتا ہے، اور دل حمد و شکر کے جذبات سے لبریز۔

---

[1] تمام قرائن و آثار اس بات پر دلالت کرتے تھے، کہ میں تکمیل تعلیم کے بعد طب پڑھوں گا، اور آبائی ذریعۂ معاش اختیار کروں گا، کچھ روز بھائی صاحب نے مطب میں بٹھایا بھی اور نسخے بھی لکھوائے، مولانا سید طلحہ صاحب سے طب کی ایک ابتدائی کتاب "نفیسی یا سدید" شروع بھی کی، مگر بھائی صاحب کو جلد اس کا اندازہ ہو گیا کہ مجھے طب سے مناسبت نہیں اس لئے اس کو موقوف کیا۔

والد صاحب مرحوم کے ساتھ

والد صاحب کا اصل انہماک تصنیف و تالیف میں تھا مطب اور ندوہ کی نظامت کے ضروری کام سے جو کچھ وقت بچتا وہ سب "نزہۃ الخواطر" کی تصنیف میں صرف ہوتا، مجھے ابھی تک یاد ہے کہ ہمارے مکان کے بالائی جنوبی مشرقی کمرہ میں جو سڑک کی طرف ہے' ان کی مسہری تھی، اس کے پاس آرام کرسی، اس آرام کرسی پر برابر وہ تحریر و تسوید میں مشغول رہتے، مجھے کم سنی کے باوجود ان کے ساتھ کھانا کھانے کا بہت شوق تھا، اس انتظار میں میں دیر تک بیٹھا رہتا، وہ غیر معمولی طریقہ پر کم خوراک تھے، لیکن غذا لطیف، سادہ مگر نفیس ہوتی، صبح ناشتہ میں بھی شرکت کرتا، جس میں صرف چائے' ایک آدھ بسکٹ اور تھوڑا سا دیسی مکھن ہوتا، پرانے دوستوں میں سے کوئی باہر سے آتا، تو اس کی پر تکلف دعوت کرتے، اور ہم لوگوں کی گویا موج ہو جاتی، والدہ صاحبہ کھانوں کی تیاری میں نہ صرف مشّاق بلکہ اختراعی ذہن رکھتی تھیں، مجھے اس زمانہ میں معلوم نہیں کہاں سے یہ شوق ہو گیا تھا کہ والد صاحب کسی مریض کو دیکھنے بھی جائیں تو میں ساتھ جاؤں، بعض اوقات تانگہ حرکت میں بھی آجاتا تو بھی میں سوار ہونے کی کوشش کرتا، شہر کے کسی رئیس یا ندوہ سے تعلق رکھنے والے معزز آدمی کے یہاں جانا ہوتا، تو میں بھی اپنے انھیں کپڑوں میں ساتھ ہو جاتا، اور والد صاحب بھی از راہ شفقت' اور مظاہر و تکلفات سے بری ہونے کی بناء پر مجھے ساتھ بٹھا لیتے، ایک آدھ مرتبہ میری ٹوپی درست کرنے کا بھی خیال آتا ہے۔

شہر میں سب سے زیادہ آمد و رفت نواب سید نور الحسن خاں کی کوٹھی بھوپال ہاؤس گھسیاری منڈی میں تھی، نواب صاحب کا (جو امیر الملک والا جاہ نواب سید صدیق حسن خاں صاحب مرحوم

کے فرزند اکبر تھے) تعلق والد صاحب سے دوستانہ نہیں برادرانہ و عاشقانہ تھا،[1] ہمارے گھر کے بڑے چھوٹے ان کو نور میاں کہتے تھے، شاید کوئی ہفتہ گذرتا ہو کہ والد صاحب یا والدہ صاحبہ کا کسی تقریب یا عنوان سے بڑی کوٹھی[2] نہ جانا ہوتا ہو، اس خاندان سے عزیزداری بھی تھی،[3] نواب صاحب مرحوم کی بیگم صاحبہ ہم لوگوں سے ایسا تعلق رکھتی تھیں، جیسے حقیقی پھوپھیوں یا خالاؤں کا ہوتا ہے[4]۔

نواب صاحب کے علاوہ والد صاحب کے مخصوص دوستوں اور پیر بھائیوں منشی سید محمد خلیل صاحب نہٹوری[5]، منشی رحمۃ اللہ صاحب[6] اور شاہ محمد خاں صاحب[7]، اور شیخ محمد عرب صاحب کے یہاں بھی آنا جانا تھا۔

نور میاں کی کوٹھی کے قریب ہی ہمارے بڑے حقیقی خالہ زاد بھائی سید محمد احمد صاحب بیرسٹر کی کوٹھی تھی، ہم لوگ وہاں بھی جاتے رہتے تھے، مجھے اس کم سنی میں بھی جب ۶۔ ۷ سال سے زائد

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو حاشیہ "گل رعنا" تذکرہ خواجہ میر درد ص ۱۷۶-۱۷۹ [2] نواب نور الحسن خاں مرحوم کے چھوٹے بھائی حسام الملک نواب سید علی حسن خاں کی کوٹھی لال باغ میں تھی، اور چھوٹی کوٹھی کہلاتی تھی، نواب صاحب موصوف ندوہ کے اہم ارکان میں سے تھے، والد صاحب کے انتقال پر وہی ندوۃ العلماء کے ناظم منتخب ہوئے۔ [3] نواب سید صدیق حسن خاں مرحوم کی حقیقی نواسی میرے قریبی رشتہ کے چچا سید عبد الرحمن صاحب عرف مانو میاں سے منسوب تھیں، اور ان کی حویلی بھی بڑی کوٹھی سے متصل تھی، [4] اس کا تفصیلی تذکرہ آئندہ صفحات میں آئے گا۔ [5] مفصل حالات کے لئے ملاحظہ ہو "پرانے چراغ" حصہ اول مضمون خاص [6] آپ والد صاحب کے بڑے مخلص دوستوں میں بڑے باوضع، دیندار اور مستقیم الاحوال لوگوں میں تھے، والد صاحب کے بعد بھائی صاحب اور ہم لوگوں کے ساتھ ویسا ہی تعلق قائم رکھا، بیعت کا تعلق غالباً مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلی سے تھا [7] آپ قائم گنج ضلع فرخ آباد کے شرفاء میں تھے، بیعت و ارادت حضرت گنج مراد آبادی سے تھی۔

عمر نہ تھی، پھولوں کا بڑا شوق تھا، میں ان کے چمن سے پھول توڑ کر لاتا، خوش ہوتا، ان چند گھروں کے علاوہ جن سے گونا گوں تعلقات تھے، والد صاحب کے ساتھ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے جلسۂ سیرت میں جو سال میں ایک مرتبہ بڑے اہتمام سے ہوتا تھا، اور مٹھائی تقسیم ہوتی تھی، اور کسی اہم رکن، بالخصوص نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کی آمد پر کسی استقبالیہ وغیرہ میں جانا یاد ہے، ایک مرتبہ والد صاحب کے ساتھ ہنسوہ جاتے یا آتے ہوئے شیخ وقت مولانا سید نجم الدین شاہ صاحب[1] کی خانقاہ فتحپور میں جانا یاد ہے، جو ایک ٹیلہ پر تھی، ابھی تک یاد ہے کہ انھوں نے کم سن بچہ کی تواضع مٹھائی سے کرنی چاہی، مٹھائی ایک نعمت خانہ میں تھی، اور اس میں تالا پڑا ہوا تھا، اور کنجی ان کے گھر کے کسی آدمی کے پاس تھی، مجھے اس آدمی کا تلاش کرانا اور اپنی بے چینی کہ شاید وہ نہ ملے ابھی تک یاد ہے، یہ یاد نہیں کہ اس میں کامیابی ہوئی یا نہیں، لیکن اس کی خوشی ہے کہ ایک کامل بزرگ و صاحب نسبت ہستی کی زیارت ہوگئی، اس موقعہ پر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ میں بچپن میں اکثر بیمار رہتا، پانی کسی برتن میں حضرت مولانا سید عین القضاۃ صاحب نقشبندی مجددی کی خدمت میں جاتا، اور وہ دم کرتے، اس طرح میں نے ان کا دم کیا ہوا پانی بہت پیا ہے، کیا عجب ہے کہ ان کے انفاس متبرکہ کا کوئی اثر حصہ میں آیا ہو۔

والد صاحب کا ماحول چونکہ بالکل علمی و تصنیفی تھا، وہ بکثرت اپنی ضرورت سے کتابیں منگواتے تھے، اور مصنفین بھی ان کو بھیجتے تھے، بہت سی کتابیں اور رسائل ایسے ہوتے تھے جن پر وہ ایک نظر ڈال کر ان کو وہ ایک طرف رکھ دیتے تھے، میں اس انبار سے (جو والد صاحب کے لئے بیکار تھا) رسالے، فہرستیں وغیرہ چھانٹ کر لے جاتا، صحن میں ایک کھلی الماری تھی،

[1] آپ حضرت مولانا سید عبدالسلام صاحب ہنسوی کے کامل اور ممتاز خلفاء میں سے تھے، مولانا بھی ان کی بہت تعریف کرتے تھے۔

اس میں ان کو سجانا، ایک چھوٹا سا بورڈ بنایا تھا جس پر لکھا تھا "کتب خانہ ابوالحسن علی" مجھے اب بھی یاد ہے کہ ایک مرتبہ میں رو رہا تھا یا کسی بات پر ضد کر رہا تھا، والد صاحب نے اپنے پیش کار مولوی سید عبدالغفور صاحب نشتر راسنھانوی ندوی مددگار ناظم ندوۃ العلماء کو بلایا تھا، وہ زینے پر کھڑے تھے والد صاحب نے "گل رعنا" کا مسودہ جو اس وقت مکمل ہوا تھا، ان کے حوالہ کیا، اور ہدایت کی کہ وہ مولوی سید سلیمان (مولانا سید سلیمان ندویؒ) کو اعظم گڑھ بھیج دیا جائے، مسودہ حوالہ کرتے ہوئے مجھ سے فرمایا کہ چپ ہو جاؤ، میں اس کتاب میں تمہارا نام چھپواؤں گا، خدا کی شان کہ آج ان کی وفات کے تقریباً ٦٠ برس کے بعد اس کی نوبت آ رہی ہے کہ "گل رعنا" کے پانچویں ایڈیشن کی اشاعت پر (جو زیر تیاری ہے) میرا اس کتاب پر تبصرہ اور "آب حیات" سے موازنہ بطور مقدمہ کے شائع ہو۔

والد صاحب کے مطب میں اگر کبھی ان کے کوئی خاص دوست، یا علماء و مشائخ میں سے کوئی ممتاز شخصیت آجاتی تو ان کی فرمائش، یا والد صاحب کی خواہش پر مجھے بلایا یا بلوایا جاتا، ایک مرتبہ مولانا سید تجمل حسین صاحب دیسنوی بہاری (جو حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادی کے عشاق اور اس سلسلہ کے مشائخ میں سے تھے) تشریف لائے، غالباً انھوں نے خود مجھے بلوایا، اور اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا پورا قرآن شریف مجھے عنایت فرمایا، جو ابھی تک ہمارے ذاتی کتب خانہ کی زینت و برکت ہے۔

۱۳۳۹ھ (۱۹۲۱ء) میں والد صاحب پر وجع مفاصل کا حملہ ہوا، جب والد صاحب وجع مفاصل کے حملہ کے بعد کچھ سنبھلے تو اس دور نقاہت اور ضعف میں نواب صاحب کی کوٹھی گھسیاری منڈی میں رات گذارنے کے لئے جایا کرتے تھے، میں ساتھ جاتا تھا، وہاں جانا اور وہاں کا نقشہ خوب یاد ہے، اسی زمانہ میں "گل رعنا" تصنیف فرمائی تھی۔

باقاعدہ تعلیم

میری بسم اللہ اگرچہ رائے بریلی میں ہوگئی تھی لیکن لکھنؤ ہی میں جہاں اصل قیام تھا، قرآن مجید ختم کیا، مجھے وہ ہلکی سی ضیافت یاد ہے، جو اس تقریب کی خوشی میں ہوئی تھی، میری مکتب نشینی تو مسجد نوازی میں ہوئی تھی، جب کچھ آگے بڑھا تو عم محترم مولوی سید عزیز الرحمن صاحب ندوی کے پاس جو دفتر ندوۃ العلماء واقع گولہ گنج میں کام کرتے تھے، جانا شروع کیا، جس کا فاصلہ ہمارے گھر سے میری عمر کے لحاظ سے زیادہ تھا، پل جھاؤلال کے نیچے سے ایک گلی جاتی تھی، اور خاتون منزل کے قریب ایک عمارت میں ندوہ کا دفتر اور کتب خانہ تھا، وہیں مولانا غلام محمد صاحب شملوی کا قیام رہتا تھا، جن سے بڑھ کر باوجاہت، خوش تقریر، سرگرم اور مخلص سفیر ندوۃ العلماء کو نہیں ملا، ان کا معمول تھا کہ مجھے اپنے پاس بلا لیتے، اور شملہ سے لائے ہوئے پھل، اور مربّے اور مٹھائیاں کھلاتے، ان کا یہ معمول والد صاحب کی وفات کے بعد تک رہا" رحمہ اللہ تعالے ورفع درجاتہ"

اردو بقدر ضرورت پڑھ لینے کے بعد جس کے نصاب میں زیادہ تر مولوی اسمٰعیل صاحب میرٹھی کی کتابیں تھیں، جن میں "سفینۂ اردو" ہم بھائی بہنوں کی گویا بیاض اور وظیفہ کی کتاب تھی، اور جس کی بہت سی نظمیں ہم لوگوں کو زبانی یاد ہوگئی تھیں، انجمن حمایت اسلام کی فارسی کی پہلی دوسری کتاب سے ہماری فارسی کی تعلیم شروع ہوئی، اس کے لئے شہر کے علماء کے ایک پرانے خاندان کے کہنہ مشق استاد مولوی محمود علی صاحب کا انتخاب ہوا، یہ خاندان غالباً ریاست نابھا سے آیا تھا، اس میں بڑے بڑے علماء اور خوش نویس گزرے ہیں، مولوی صاحب بڑے مہذب شفیق اور دیرینہ سال معلم تھے، اسی زمانہ میں خود والد صاحبؒ کی

تصنیف کی ہوئی کتابیں "تعلیم الاسلام" اور "نور الایمان" پڑھی، اور ان مولوی صاحب سے جو خود بھی خوش خط تھے، تختی اور کاغذ پر لکھنے کی مشق کی، جو اس زمانہ میں تعلیم کا ایک اہم جزء اور ضروری نصاب تھا۔

بھائی صاحب اپنی تعلیم میں مشغول اور منہمک نہیں بلکہ سرتاپا غرق تھے، انھوں نے عربی علوم کی تحصیل اور ندوہ اور دیوبند سے فضیلت حاصل کرنے کے بعد انگریزی شروع کی تھی، اور اب وہ مڈیکل کالج لکھنؤ کے تیسرے چوتھے سال میں تھے، اس وقت کالج انگریز پرنسپل کے انتظام میں تھا، اور اسٹاف میں متعدد انگریز پروفیسر ہوتے تھے، مڈیسن کی تعلیم پھر بھائی صاحب جیسے حقیقت پسند اور عالی ہمت کے لئے سخت مشغولیت کا سامان رکھتی تھی، اس لئے ان کے پاس کوئی زائد وقت نہ تھا، مجھے یاد ہے کہ میں ان کو ہمیشہ مطالعہ کرتے ہوئے دیکھتا، اور کبھی ان کے کمرہ میں چلا جاتا، تو یہ محسوس نہیں ہونے پاتا تھا کہ ان میں کوئی خاص شفقت یا ملاطفت کا مادّہ ہے، اس کا اندازہ تو مجھے والد صاحب کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد ہوا کہ اچانک ان میں انقلاب عظیم پیدا ہوا، اور باپ کی بلکہ بعض حیثیتوں سے ماں کی بھی شفقت اور دلداری ان میں آگئی۔

والد صاحب نہایت کم سخن، مجسم وقار و تمکنت تھے، اس لئے گھر پر ایک خاموشی اور سکون کی فضا طاری رہتی، اس پر سکون، بلکہ منجمد فضا میں حرکت و اہتزاز اس وقت پیدا ہوتا، جب ہماری پھوپھی صاحبہ، اور عم محترم مولانا سید طلحہ صاحب چھٹیوں میں لاہور سے آتے، یا ہمارے رشتہ کے دادا سید عبد اللہ صاحب تحصیلدار عرف ننھے میاں صاحب (فرزند حضرت مولانا خواجہ سید احمد نصیر آبادی) بھوپال سے آتے، اس وقت والد صاحب کو بولتے ہوئے، اور مجلس میں شرکت کرتے ہوئے دیکھتے، اور گھر میں خاص چہل پہل اور

رونق نظر آتی، نیچے کے کمرہ میں جو گلی کی طرف تھا، ہمارے ماموں زاد بھائی سید حبیب الرحمٰن اور ہنسوہ کے بعض چچازاد بھائی جو شہر کے کسی اسکول یا ندوہ میں زیر تعلیم تھے رہتے تھے'ان کی وجہ سے کبھی باہر کی ہوا کے جھونکے اندر آجاتے' اور شہر کے واقعات کا علم ہوتا۔

تحریک خلافت

میرے شعور کا آغاز ہی تھا، اور میری عمر ۸ سال کی ہو چکی تھی کہ تحریک خلافت کا لاوہ ہندوستان میں پھوٹ پڑا مسلمانوں کا کیا حسّاس اور تعلیم یافتہ ہندوؤں کا بھی کوئی گھر اس کی گونج اور صدائے بازگشت سے محروم نہیں رہا، ہندوستان ایک کوہ آتش فشاں بنا ہوا تھا مسجدوں، مجلسوں، گھروں' دکانوں اور خلوت و جلوت کہیں گویا اس گفتگو کے سوا کوئی گفتگو نہ تھی، ہمارا شہر لکھنؤ جو شروع سے سیاسی تحریکوں کا مرکز رہا ہے' اس تحریک میں بھی پیش پیش تھا، اس تحریک کے ایک بڑے رہنما مولانا عبدالباری صاحب اسی شہر کے رہنے والے تھے' جن کا دولت خانہ محل سرائے فرنگی محل' اس تحریک کے ہندو مسلم رہنماؤں کی لکھنؤ میں فرودگاہ تھی، خود گاندھی جی وہیں ٹھہرا کرتے تھے' اور مولانا محمد علی، شوکت علی کے تو وہ پیر تھے' بڑے چھوٹے' بوڑھے بچے' مرد عورت کی زبان پر یہ شعر تھا ؎

بولی اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو

شہر میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انگریزوں کی حکومت اٹھ گئی ہے' اور علی برادران اور گاندھی جی ہی کی حکومت ہے' پرنس آف ویلز کا لکھنؤ آنا بھی یاد ہے، میں کسی ضرورت سے گھر سے نکلا، دیکھا تو شہر میں ہو کا عالم ہے' بھرے بازار چلتی ہوئی سڑکیں ویران پڑی ہیں'

امین الدولہ پارک (جھنڈے والے پارک) میں ولایتی کپڑوں کو آگ لگائی جاتی تھی، جو لوگ ولایتی کپڑوں میں ملبوس ہوتے، وہ راستہ چھوڑ کر چلتے، اس زمانہ میں میں نے مولانا محمد علی اور گاندھی جی کو دیکھا، ہمارے بھائی سید حبیب الرحمن امین آباد ہائی اسکول میں پڑھتے تھے، ترک موالات کے اثر سے اسکول سے نکل آئے اور کسی نیشنل اسکول میں داخلہ لیا، جن لوگوں کو اعزازی یا امتیازی تمغے ملے تھے، اور ان پر انگریزی حکام کے نام یا انگریزی لکھی ہوئی تھی، ان کو پاؤں سے روندتے، اپنے عزیزوں اور محلہ والوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، ہزاروں آدمیوں نے انگریزی لباس بلکہ انگریزی معاشرت ترک کر کے دیسی لباس اور ہندوستانی معاشرت اختیار کر لی[1]، اور ان کی زندگی میں انقلاب آگیا۔

ہمارا خاندان بھی تحریک خلافت کا بالکل ہمنوا تھا، اور یہ بات خاندانی روایات، اسلامی حمیت اور خاندان کی تاریخ جہاد و غزوات کے عین مطابق تھی، والد صاحب اگرچہ نہایت خاموش، اور عزلت پسند تھے، لیکن تحریک خلافت کی تائید و حمایت میں انھوں نے بھی ایک اپیل شائع کی جس کا مجھے اپنے بچپن میں دیکھنا یاد ہے، اسی جذبہ کے ماتحت انھوں نے اس زمانہ میں اس گورنمنٹ گرانٹ کو بند کرا دیا، جو ندوہ کو ملتی تھی[2]، مولانا محمد علی مرحوم کی والدہ محترمہ بی اماں جب اپنے دورہ کے سلسلہ میں رائے بریلی آئیں تو والدہ صاحبہ سے ملنے اور تعزیت کرنے (جو ایام عدت میں تھیں) تکیہ تشریف لائیں، خاندان کے بزرگوں کا ان کو تخت پر بٹھا کر، اور خود اٹھا کر ہمارے گھر لانا ابھی آنکھوں کے سامنے ہے۔

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "پرانے چراغ" حصہ دوم کا مضمون مولانا محمد علی جوہر ص۱۱۱-۱۵

[2] ملاحظہ ہو "حیات عبد الحی" ص۱۸۶

الغائے خلافت کا منحوس اقدام

مسلمانان ہند کی تحریک خلافت سے دلچسپی، اور اس سلسلہ میں ان کی اسلامی حمیّت وغیرت بالکل حق بجانب تھی، خلافت ایک دینی منصب، اور اس کا قائم رکھنا مسلمانوں کا دینی فریضہ تھا، قرون اولیٰ کے مسلمان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ مسلمانوں کی زندگی کا کوئی مختصر سے مختصر سا وقفہ بھی "خلیفۃ المسلمین" کی موجودگی کے بغیر گذر سکتا ہے، خلافت عباسیہ کے آخری دور میں ایک معرکہ میں خلیفہ عباسی کی گمشدگی کی بناء پر پھر خلیفہ مستعصم باللہ کی شہادت پر چند سال ایسے گذرے کہ مسند خلافت خالی رہی، علامہ ابن کثیر (جو مؤرخ کے ساتھ جلیل القدر محدث بھی ہیں) اپنی شہرۂ آفاق تاریخ "البدایۃ والنہایۃ" میں اس زمانہ کے نئے سنہ کا آغاز کرتے ہیں تو لکھتے ہیں:۔

استہلت سنة ______ والمسلمون بلاخليفة (فلاں سنہ شروع ہوا اور مسلمان بغیر کسی خلیفہ کے ہیں) علامہ شبلی نے اپنی مشہور نظم میں...... جو ہنگامۂ بلقان کے نام سے کہی تھی، صحیح کہا تھا ؎

زوالِ دولتِ عثمان زوالِ ملک و ملت ہے
عزیزو! فکر فرزند و عیال و خانماں کب تک

لیکن بالآخر جو منصب جلیل وفات رسول ﷺ کے بعد سے کسی نہ کسی شکل میں اس وقت تک چلا آرہا تھا، اور عثمانیوں نے (اپنی ساری کمزوریوں، اور بہت سی قابل گرفت باتوں کے باوجود) اس کی شان و شوکت قائم رکھی تھی، اور یورپ کے دل پر اس کی دھاک بٹھا رکھی تھی، اور جو حرمین شریفین کی پاسبان و محافظ تھی، ۳۰ مارچ ۱۹۲۴ء ۱۳۴۱ھ میں اس کمال اتاترک کے

(جس کا ہندوستانی مسلمان اپنی ناواقفیت کی بناء پر عرصہ تک کلمہ پڑھتے رہے) ہاتھوں ایک گردش قلم وجنبش لب خاتمہ ہوگیا، اگر پوچھا جائے کہ عالم اسلام کے لئے آخری صدیوں کی طویل تاریخ میں منحوس ترین دن کون تھا؟ تو ایک باخبر اور حقیقت پسند مورخ اس کے سوا کوئی جواب نہیں دے سکتا کہ وہ مارچ ۱۹۲۴ئہ کی تاریخ تھی، جب قسطنطنیہ کی مجلس وطنی نے الغائے خلافت کا فیصلہ کیا، اور مقامات مقدسہ ہی نہیں مسلمانوں کی عزت وآبرو کا وہ مضبوط حصار ٹوٹ گیا، جس کو ترکوں نے اپنی قربانیوں، فوجی طاقت اور خلافت کے مقدس نام سے تعمیر کیا تھا۔

یہ فیصلہ مغربی طاقتوں، بالخصوص برطانیہ کے اشارے، بلکہ اصرار سے عمل میں آیا، تاریخ الدولۃ العثمانیہ کا فاضل مصنف ڈاکٹر علی حسون لکھتا ہے:۔

"انگلستان نے اس اعلان کے فوراً بعد ترکی کو بحیثیت ایک آزاد سلطنت کے تسلیم کیا، اور اس کی فوجیں ترکی کے حدود سے باہر نکل آئیں، برطانوی پارلیمنٹ کے ایک ممبر نے مجلس عوام (HOUSE OF COMMONS) میں اس کارروائی پر احتجاج کیا، اس کا جواب کرزن نے ان الفاظ میں دیا کہ "مسئلہ یہ ہے کہ ترکی کا ایسا زوال عمل میں آگیا ہے کہ اس کے بعد پھر اس کا عروج نہیں ہوگا، اس لئے کہ ہم نے اس کی روحانی ومعنوی طاقت (خلافت اسلامی) کو ختم کر دیا ہے"۔[1]

یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ لوزان کانفرنس میں برطانوی وفد کے صدر کرزن نے ترکی کو تسلیم کرنے کے لئے چار شرطیں رکھی تھیں، خلافت[1] اسلامی کا مکمل خاتمہ خلیفۃ[2] المسلمین کی جلاوطنی، ان[3] کے مال و جائیداد کی ضبطی، حکومت[4] کے لادینی (سیکولر) ہونے کا اعلان،

[1] تاریخ الدولۃ العثمانیہ ص۲۷۳ مطبوعہ مکتبہ اسلامی دمشق، بیروت۔

جس کو اگرچہ ترکی وفد نے اس وقت منظور نہیں کیا، لیکن کمال اتاترک کی کوششوں سے بالآخر ترکی پارلیمنٹ نے اس کو منظور کیا، اور مغربی طاقتوں کا (جن میں برطانیہ پیش پیش تھا) وہ خواب پورا ہوا، جو وہ عرصہ سے دیکھ رہی تھیں، اور خود ترکی قائد کے ہاتھوں (جس کو ترکی کا نجات دہندہ سمجھا جاتا ہے) یہ منصوبہ پورا ہوا، اور اقبال مرحوم کا یہ شعر صادق آیا ؂

چاک کر دی ترکِ ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی مسلم کی دیکھ اوروں کی عیّاری بھی دیکھ

جس وقت یہ منحوس واقعہ پیش آیا اس وقت میری عمر دس سال سے زائد نہ تھی، اس لئے مجھے اس واقعہ کی سنگینی، اور اس کے دوررس نتائج کا شعور نہیں ہو سکتا تھا، لیکن تحریک خلافت کا ذکر کرتے وقت جس کا جوش و خروش اور صاحبِ حمیّت مسلمانوں کی بے چینی اور تڑپ ابھی کل کی بات معلوم ہوتی ہے، ان جذبات و حقائق کے اظہار سے قلم باز نہیں رہ سکا، جن کا ادراک میرے اس وقت کی عمر اور شعور سے بالاتر تھا ؂

رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے

آواز بند ہونے پر بہنوں کو تشویش ہوئی، میرے استاد مولوی محمود علی صاحب جمعہ کی چھٹی ختم کر کے جو وہ اپنے گھر جھوائی ٹولہ میں گذارتے تھے، واپس آ گئے تھے، اور ایک حکیم صاحب اور والد صاحب کے ایک دوست بھی آ گئے، اور اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ وہ اس جہان فانی سے رحلت فرما چکے ہیں، یہ خبر بجلی کی طرح سارے شہر میں دوڑ گئی، اور محبین و معتقدین جوق در جوق آنے لگے، وہ نیچے مطب میں بیٹھے تھے، اور ان کی ہمدردی اور دل جوئی کا مرکز ایک کم سن بچہ تھا، جو اس کے سمجھنے سے قاصر تھا کہ دفعتًا یہ کیا ہو گیا، یہ تعزیت کرنے والے کس مرتبے اور حیثیت کے لوگ ہیں، اور ان کا کس طرح جواب دینا چاہیئے؟ کبھی کوئی شفقت سے اپنے پاس بٹھا لیتا کبھی کوئی سینہ سے لگا لیتا، کوئی سر پر محبت کا ہاتھ پھیرتا، آنکھیں اشک بار اور دل مضطرب تھے، جو اس تعزیت کا سب سے زیادہ مستحق، اور اس کا شکریہ ادا کرنے کے لئے سب سے زیادہ موزوں تھا، وہ یہاں سے ایک ہزار میل پر (مدراس میں) تھا اور اس پورے قصّہ سے بے خبر تھا، اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کی تفصیل "حیات عبدالحیٔ" میں پڑھی جا سکتی ہے۔

بھائی صاحب کی شفقت و سرپرستی کا دور

بھائی صاحب جنھوں نے یہ خبر اتفاقیہ بمبئی میں والد صاحب کے ایک دوست سے سنی تھی، جب لکھنؤ واپس ہوئے، اور رائے بریلی پہونچے تو سیدھے قبر پر گئے، میں بھی ساتھ ہو لیا، ان کا قبر پر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونا اس وقت آنکھوں کے سامنے ہے اور کل کی بات معلوم ہوتی ہے، بس اسی وقت سے ان کے اندر ہم سب لوگوں نے ایک انقلاب محسوس کیا، اب وہ نرے بڑے بھائی نہ تھے، جو اپنی تعلیم کی تکمیل میں ہمہ تن مشغول، یکسو اور

باب سوم

والد صاحب کی وفات، گھر کی تعلیم و تربیت، شیخ خلیل عرب کے یہاں عربی تعلیم کا آغاز، اردو زبان و ادب کا مطالعہ، ماحول اور دلچسپیاں، عربی ادب و زبان کی تکمیل

والد صاحب کی وفات

۱۵؍جمادی الآخر ۱۳۴۱ھ (۲؍فروری ۱۹۲۳ء) جمعہ کا دن تھا کہ لکھنؤ کا یہ دور اور عمر بلکہ اپنے چھوٹے سے اس خاندان کی تاریخ کا زریں ورق اچانک پلٹ گیا، اور گھر کی بساط ہی الٹ گئی، والد صاحب مرحوم نے چند گھنٹوں کی علالت کے بعد جان جان آفریں کے سپرد کی[1]۔ اس کو تقدیری بات کہئے کہ اس وقت ان کے پاس تنہا میں ہی ۹-۱۰ برس کا بچہ تھا، والد صاحب نے انتقال سے تھوڑی دیر پہلے سنترے منگوائے تھے، (غالباً تسکین و فرحت حاصل کرنے کے لئے) جب وہ سنترے آئے تو بجائے خود تناول فرمانے کے میری طرف اشارہ کیا کہ اس کو دے دو، میری خوش قسمتی کہ میں نے بغیر کسی کی ہدایت یا ان کے اشارے کے ان کے پاؤں دابنے شروع کئے، ان کا ذکر قلبی جاری تھا۔

---

[1] واقعہ کی تفصیل "حیات عبدالحی" (ص۲۲۷-۲۳۰) میں ملاحظہ ہو۔

گھر کے قصوں سے بے تعلق و فارغ تھے، اب وہ ہم چھوٹے بھائی بہنوں کے شفیق باپ، اور والدہ صاحبہ کے ایک سعادت مند فرزند بلکہ خادم تھے، میں نے ان سے صرف شفقت پدری کا اظہار ہوتے نہیں دیکھا، بلکہ شفقت مادری کا بھی صاف صاف ظہور ہوتا تھا، یہاں پر والد صاحب کے دوستوں میں سے صرف نواب سید علی حسن خاں مرحوم کے (نواب سید نور الحسن خاں والد صاحبؒ کی وفات سے پانچ سال پہلے وفات پا چکے تھے) اس تعزیت نامہ کی چند سطریں پیش کی جارہی ہیں، جو انھوں نے میرے نام لکھا تھا، اور اس میں میرے سن و سال کی پوری رعایت ہے۔

"تم اپنے دل میں یہ خیال نہ کرو کہ بابا[1] نہیں ہیں، تو ہم کیونکر اور کس طرح پڑھیں گے میں نے سنا ہے کہ تم پریشان ہو کر لوگوں سے یہ کہتے ہو، خدا کے فضل سے تمہارے بڑے بھائی جو بڑے قابل، بڑے فاضل ہیں، تمہاری تعلیم کا بہت اچھا انتظام کریں گے، علاوہ اس کے اس وقت سب لوگوں کی توجہ اور نگاہیں تمہاری طرف ہیں بس تم ہرگز ہرگز نہ گھبراؤ، خدا چاہے گا تو تم بہت اچھی طرح اور بڑے آرام و آسائش سے پڑھو گے، آخر میں دعا کرتا ہوں کہ خدا تمہاری عمر دراز کرے کہ خاندان کا نام روشن کرو[2]"

تکیہ کا عبوری قیام، اور والدہ صاحبہ کی تربیت

والد صاحبؒ کے انتقال کے بعد ہمارے خاندان کے لکھنؤ رہنے کا کوئی مسئلہ نہ تھا، مطب، اور ندوہ کی نظامت دونوں والد صاحبؒ کے ساتھ گئیں، بھائی صاحب میڈیکل کالج

[1] میں اپنے والد صاحبؒ کو بابا ہی کہتا تھا، [2] پورا خط "حیات عبدالحیؒ" میں ملاحظہ ہو ص ۲۳۴-۲۳۶

کے چوتھے سال میں تھے، گھر میں کوئی جائیداد اور ذریعۂ آمدنی نہ تھا، اس لئے خود ان کی تعلیم کی تکمیل، اور لکھنؤ کے قیام میں سخت مشکلات حائل تھے، اللہ تعالیٰ نواب نورالحسن خاں صاحب مرحوم کی بیگم صاحبہ اور ان کے صاحبزادوں سید ظہورالحسن، سید نجم الحسن صاحبان کو اپنے شایان شان بدلہ دے، اور ان کی قبروں کو نور سے بھرے کہ انھوں نے عزیزوں سے بڑھ کر محبت و تعلق کا ثبوت دیا، اور اپنی کوٹھی پر قیام کی پیش کش کی، لکھنؤ کا مکان جو شروع سے کرایہ پر تھا چھوڑ دیا گیا تھا، ہوسٹل کے مصارف کی استطاعت نہ تھی، بھائی صاحب نے اس مخلصانہ و محبانہ پیش کش کو قبول کیا، یکسوئی اور انہماک کے ساتھ مطالعہ کرنے کے لئے ان حضرات نے اپنی عالی شان کوٹھی کا ایک حصہ جو کوٹھی سے علیحدہ بھی تھا، بھائی صاحب کے حوالہ کر دیا، جہاں وہ عزیز کتب خانہ بھی منتقل ہو گیا، جو بازار جھاؤلال کے مکان میں ابھی تک امانت تھا، اس خاندان نے تا اختتام تعلیم بھائی صاحب کو اپنا مستقل مہمان بلکہ فرد خاندان بنا لیا، اور ان میں اور اپنی عزیز اولاد میں کوئی فرق نہیں رکھا، والدہ صاحبہ، بہنیں اور میں والد صاحب کی وفات ہی کی شب میں رائے بریلی منتقل ہو گئے تھے۔

میری فارسی تعلیم کا سلسلہ جاری تھا، لکھنؤ میں جو مولوی صاحب پڑھاتے تھے، وہ وہیں رہ گئے، یہاں میں نے اپنی فارسی تعلیم بھائی صاحب کی ہدایت سے جاری رکھی، عم محترم سید محمد اسماعیل صاحب اچھے فارسی داں تھے، ان سے بوستاں پڑھتا تھا، حساب سکھانے اور اردو عبارت نویسی کی مشق کے لئے قریبی گاؤں لوہانی پور سے ماسٹر محمد زماں خاں صاحب آتے تھے جو اس موضع کے شریف پٹھانوں میں سے تھے، اور عدالت رائے بریلی میں ملازم تھے، میرے بڑے ماموں زاد بھائیوں نے بھی اپنے اپنے وقت میں ان سے پڑھا تھا، خال محترم مولوی حافظ سید عبیداللہ صاحب نے میرے ٹیوشن کا انتظام کر دیا تھا۔

گھر میں کسی بڑے مرد کے نہ ہونے کی وجہ سے والدہ صاحبہ ہی میری نگرانی، اخلاقی و دینی تربیت کی ذمہ دار تھیں، مجھے قرآن مجید کی بڑی بڑی سورتیں انھوں نے اسی زمانہ میں یاد کرائیں، باوجود اس کے کہ ان کی شفقت خاندان میں ضرب المثل تھی، اور والد صاحب کے انتقال کی وجہ سے وہ میری دل داری اور ایک حد تک ناز برداری قدرتاً دوسری ماؤں سے زیادہ کرتی تھیں، لیکن دو باتوں میں بہت سخت تھیں، ایک تو نماز کے بارے میں مطلق تساہل نہیں برتتی تھیں، میں عشاء کی نماز پڑھے بغیر کبھی سو گیا، خواہ کیسی ہی گہری نیند ہو اٹھا کر نماز پڑھواتیں، اور نماز پڑھے بغیر ہرگز سونے نہ دیتیں، اسی طرح فجر کی نماز کے وقت جگا دیتیں اور مسجد بھیجتیں، اور پھر قرآن مجید کی تلاوت کے لئے بٹھا دیتیں، دوسری بات جس میں وہ قطعاً رعایت نہ کرتیں، اور اس میں ان کی غیر معمولی محبت و شفقت حائل نہ ہوتی یہ تھی کہ اگر میں خادم کے لڑکے یا کام کاج کرنے والے غریب بچوں کے ساتھ کوئی زیادتی، ناانصافی کرتا، یا حقارت اور غرور کے ساتھ پیش آتا، تو وہ نہ صرف مجھ سے معافی منگواتیں، بلکہ ہاتھ تک جڑواتیں، اس میں مجھے کتنی ہی اپنی ذلت اور خفت محسوس ہوتی مگر وہ اس کے بغیر نہ مانتیں، اس کا مجھے اپنی زندگی میں بہت فائدہ پہونچا، اور ظلم و تکبر و غرور سے ڈر معلوم ہونے لگا، اور دل آزاری، اور دوسروں کی تذلیل کو کبیرہ گناہ سمجھنے لگا، اس کی وجہ سے مجھے اپنی غلطی کا اقرار کر لینا ہمیشہ آسان معلوم ہوا۔[ا]

والدہ صاحبہ کی تربیت کے اس انداز کا ذکر کرتے ہوئے ایک تجربہ اور مشورہ کے طور پر اس کا بھی ذکر کر دینے کو جی چاہتا ہے کہ بچوں کے مذہبی و اخلاقی اٹھان اور ان کے اس قابل ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے اپنے دین کی کوئی خدمت لے یا قبولیت عطا فرمائے،

[ا] "ذکر خیر" ص ۴۷-۴۸ باختصار

گھر میں کسی بڑے مرد کے نہ ہونے کی وجہ سے والدہ صاحبہ ہی میری نگرانی، اخلاقی و دینی تربیت کی ذمہ دار تھیں، مجھے قرآن مجید کی بڑی بڑی سورتیں انھوں نے اسی زمانہ میں یاد کرائیں، باوجود اس کے کہ ان کی شفقت خاندان میں ضرب المثل تھی، اور والد صاحب کے انتقال کی وجہ سے وہ میری دل داری اور ایک حد تک ناز برداری قدرتاً دوسری ماؤں سے زیادہ کرتی تھیں، لیکن دو باتوں میں بہت سخت تھیں، ایک تو نماز کے بارے میں مطلق تساہل نہیں برتتی تھیں، میں عشاء کی نماز پڑھے بغیر کبھی سو گیا، خواہ کیسی ہی گہری نیند ہو، اٹھا کر نماز پڑھواتیں، اور نماز پڑھے بغیر ہرگز سونے نہ دیتیں، اسی طرح فجر کی نماز کے وقت جگا دیتیں اور مسجد بھیجتیں، اور پھر قرآن مجید کی تلاوت کے لئے بٹھا دیتیں، دوسری بات جس میں وہ قطعاً رعایت نہ کرتیں، اور اس میں ان کی غیر معمولی محبت و شفقت حائل نہ ہوتی یہ تھی کہ اگر میں خادم کے لڑکے یا کام کاج کرنے والے غریب بچوں کے ساتھ کوئی زیادتی، ناانصافی کرتا، یا حقارت اور غرور کے ساتھ پیش آتا، تو وہ نہ صرف مجھ سے معافی منگواتیں، بلکہ ہاتھ تک جڑواتیں، اس میں مجھے کتنی ہی اپنی ذلت اور خفت محسوس ہوتی مگر وہ اس کے بغیر نہ مانتیں، اس کا مجھے اپنی زندگی میں بہت فائدہ پہونچا، اور ظلم و تکبر و غرور سے ڈر معلوم ہونے لگا، اور دل آزاری، اور دوسروں کی تذلیل کو کبیرہ گناہ سمجھنے لگا، اس کی وجہ سے مجھے اپنی غلطی کا اقرار کر لینا ہمیشہ آسان معلوم ہوا۔[1]

والدہ صاحبہ کی تربیت کے اس انداز کا ذکر کرتے ہوئے ایک تجربہ اور مشورہ کے طور پر اس کا بھی ذکر کر دینے کو جی چاہتا ہے کہ بچوں کے مذہبی و اخلاقی اٹھان اور ان کے اس قابل ہونے میں کہ اللہ تعالیٰ ان سے اپنے دین کی کوئی خدمت لے یا قبولیت عطا فرمائے،

---

[1] "ذکر خیر" ص ۴۷-۴۸ باختصار

دو چیزوں کا بڑا دخل ہے' ایک یہ کہ (وہ اپنی عمر کے مطابق) ظلم اور دل آزاری سے محفوظ رہیں' اور کسی دکھے دل کی آہ یا مظلوم کی کراہ ان کے مستقبل پر اثر نہ ڈالے، دوسرے یہ کہ ان کی غذا غصب و حرام اور مشتبہ مال سے پاک رہے' بظاہر اللہ تعالےٰ نے اس عاجز کے ساتھ ان دونوں چیزوں کا انتظام فرمایا، میرا دادیہال جائیداد و املاک اور مشترک مال و حقوق سے عرصہ سے محفوظ تھا، والد صاحب کی آمدنی خالص طبی پیشہ کی رہین منت تھی' ویسے بھی اللہ تعالےٰ نے نہ صرف مشتبہ مشکوک مال سے بچایا، بلکہ بدعات و رسوم کے کھانوں سے بھی۔

اس سلسلہ میں ایک واقعہ یاد آگیا، میں اپنے گھر کی ایک بڑی بوڑھی انّا کے ساتھ جو پڑھی لکھی نہ تھیں، اپنی پھوپھی کے پاس خالص ہاٹ (رائے بریلی کا ایک محلہ) جا رہا تھا، راستہ میں کہیں غریبوں کو کھانا کھلایا جا رہا تھا (جو چالیسویں یا صدقہ کا کھانا تھا) بڑی بی نے جن کے ساتھ میں جا رہا تھا وہ کھانا لیا، اور وہیں بیٹھ کر کھانے لگیں' میں بچہ تھا، میرے بھی منہ میں پانی بھر آیا اور میں نے شرکت کرنی چاہی، انھوں نے کہا بیٹا! یہ تمہارے کھانے کا نہیں، اور انھوں نے مجھے کھانے نہیں دیا، یہ غالباً گھر کے ماحول' اور احتیاط کی اس فضا کا نتیجہ تھا جس کو وہ دیکھا کرتی ہوں گی۔

اسی زمانہ میں ہمارے خاندان میں ایک بڑا اچھا دستور تھا کہ جہاں کوئی ایسا غمناک واقعہ پیش آتا، دل دکھے ہوئے ہوتے' یا کوئی پریشانی کی بات ہوتی تو "صمصام الاسلام" سنی جاتی، یہ مشہور مؤرخ واقدی کی مشہور کتاب "فتوح الشام" کا پچیس ۲۵ ہزار اشعار میں ترجمہ ہے' یہ ترجمہ اور نظم ہمارے ہی خاندان کے ایک بزرگ' میرے والد صاحب کے حقیقی پھوپھا منشی سید عبد الرزاق صاحب کلامی کی لکھی ہوئی ہے' جوش و خروش سے بھری ہوئی، درد و اثر میں ڈوبی ہوئی جنگ کا نقشہ ایسا کھینچتے کہ دل جوش سے اچھلنے لگتے ہیں'

اور نبض تیز ہو جاتی ہے، شہادت کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ خود راہ خدا میں جان دینے کے لئے دل بے تاب ہو جاتا ہے، اور صحابۂ کرام، اور مجاہدین کے غم کے سامنے آدمی اپنا غم بھول جاتا ہے، میری بڑی خالہ مرحومہ صالحہ بی جو قرآن مجید کی بھی حافظ تھیں، یہ منظوم فتوح الشام بڑے پُراثر اور دلکش لہجہ میں پڑھتی تھیں، اور پڑھتے پڑھتے کتاب ان کو بہت رواں ہو گئی تھی، عموماً عصر کے بعد یہ مجلس ہوتی، بچے بھی کبھی اپنی ماؤں کے پاس کھیلتے کھیلتے یا کسی پیغام کے لئے آجاتے، اور بے ارادہ کچھ دیر ٹھہر کر سنتے، کبھی با ارادہ بیٹھ جاتے، اور کبھی مائیں اپنے پاس بٹھا کر سننے کا موقعہ دیتیں، پھر جب اس میں لطف آنے لگتا تو کھیل چھوڑ کر اس مجلس میں شریک ہوتے۔[1]

مایوس کن بچپن

یہاں پر بلا تکلف اس حقیقت کا اظہار کرنا بھی ضروری ہے کہ میرا بچپن بڑا غیر درخشاں بلکہ مایوس کن اور ہندی محاورہ "ہونہار بِروا کے چکنے چکنے پات" کے بالکل برعکس تھا، میری عمر کے اور خاندان کے بچوں میں بھی عام طور پر جتنا شعور اور سلیقہ پایا جاتا تھا، وہ بھی مجھ میں نظر نہیں آتا تھا، قدرتی طور پر والدہ صاحبہ کو اس کا رنج تھا، اور خاندان کی عزیز خواتین، اور بعض بزرگ بھی اس احساس کو اپنے تبصروں سے تازہ اور زندہ کرتے رہتے تھے، اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ انھوں نے دل کھول کر میری اصلاح و تربیت حصول علم اور قبولیت و کامیابی کے لئے دعائیں مانگنے کو اپنا وظیفہ اور ورد بنا لیا، پھر اللہ نے ان کی زبان سے نظم و نثر میں جو کچھ نکلوایا اس کی مثال اس دور میں مشکل سے ملے گی، فرماتی تھیں کہ ایسی پریشانی

---

[1] "ذکر خیر" ص۴۶ اور "مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں" ص۱۵۷

کے زمانہ میں میاں (میرے نانا صاحب رحمۃ اللہ علیہ) کو میں نے خواب میں دیکھا کہ وہ اس پرانے خواب کو یاد دلا رہے ہیں، جس میں انھوں نے "فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ" کی بشارت سنی تھی، اور فرما رہے ہیں کہ تم اس قدر کیوں پریشان ہو؟ میں سمجھتا ہوں کہ مجھے جو دو حرف آئے، اور خدا کے نیک اور مقبول بندوں سے جو قرب کی دولت اور ان کی شفقت اور دعاؤں کی نعمت حاصل ہوئی، وہ انھیں مضطربانہ دعاؤں کی برکت ہے۔

"أَمَّن يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَاءَ الْأَرْضِ"

اس زمانہ میں جب میں کچھ لکھنے کے قابل ہوا تو والدہ صاحبہ مجھے تاکید کرتی تھیں کہ میں جب کچھ لکھوں تو "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کے ساتھ "اللھم اتنی بفضلك افضل ما تؤتی عبادك الصالحین" (اے اللہ مجھے اپنے فضل سے وہ افضل سے افضل چیز عطا فرما جو تو اپنے نیک بندوں کو عطا فرمایا کرتا ہے) بھی لکھوں، اس کی عادت مجھے عرصہ تک رہی اور اب بھی دعا کرتے وقت اکثر یہ دعا یاد آجاتی ہے۔

ایک قابل ذکر واقعہ

خاندان کے چھوٹے سے دائرہ اور ماحول کا ایک قابل ذکر واقعہ ۱۹۲۵ء میں میرے حقیقی ماموں زاد بھائی سید سراج النبی حسنی کے امریکہ سے واپسی کا ہے، ان کی آمد پر ان کے چچا زاد اور ہمارے ماموں زاد بھائیوں اور عزیز نوجوانوں نے استقبال کا بڑا اہتمام کیا تھا، کئی روز سے جھنڈیاں بن رہی تھیں، اور پھاٹک تیار ہو رہے تھے، خاندان کے بزرگ اور جو بچے آ جا سکتے تھے، وہ اسٹیشن لینے گئے، بارش کی وجہ سے دریا بڑھا ہوا تھا، اور

عام راستہ پر پانی آگیا تھا، اس لئے ان کو باہر باہر سے لانا پڑا، یہ ہمارے چھوٹے سے خاندان میں ایک تاریخی دن تھا، اور ہم سب نوجوان اور لڑکے بہت خوش تھے، یہ شکر و مسرت کی بات ہے کہ ہمارے یہ دونوں بھائی (سید محمد احمد صاحب بیرسٹر اور سید سراج النبی حسنیؒ) انگلستان اور امریکہ سے اپنے عقائد کو محفوظ، اور اپنے دین کو صحیح سلامت لے کر واپس آئے تھے، نماز اور تلاوت قرآن کے پابند، بزرگوں کا ادب اور دین کا احترام کرنے والے تھے، معلوم ہوا کہ یہ دونوں (مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کی زبان میں) "یاجوجی" ملکوں اور شہروں میں بھی نماز و روزے کے پابند رہے، اور اپنے عقیدے پر قائم و استوار، بھائی جان سراج کی آمد پر ان کے نوجوان بھائیوں نے کھیل وغیرہ کے مختلف پروگرام رکھے تھے، کئی روز اس چھوٹی سی بستی میں بڑی چہل پہل رہی۔

لکھنؤ میں نواب نورالحسن خاں مرحوم کی کوٹھی پر قیام

بھائی صاحب مرحوم کو جب لکھنؤ کے قیام میں اطمینان حاصل ہوا تو انھوں نے جلد ہی مجھے اپنے پاس بلالیا، بوستاں پڑھنے کا سلسلہ اب یہاں اپنے چچا سید عبدالرحمن صاحب سے جاری ہوگیا، جن کی اسی احاطہ میں کوٹھی تھی، سید ظہورالحسن صاحب اور سید نجم الحسن صاحب کے لڑکے سید حبیب الحسن مرحوم، سید انوارالحسن، اور سید قمرالحسن (بارك الله فی حیاتهم) میرے تقریباً ہم عمر تھے، کسی سے ایک دو سال کی بڑائی چھوٹائی تھی، ساتھ کھیلتے، ساتھ کھاتے، اور کبھی کبھی کشتی بھی لڑتے، ان کی دادی صاحبہ جن کو ہم سب لوگ بیگم صاحبہ کہنے کے عادی تھے، اور باوجود ان کی تفہیم و تعلیم کے پھوپھی اماں یا کچھ اور کہنے کی عادت نہ پڑی، ہم سب کو ایک نظر سے دیکھتیں، بلکہ عرصہ تک انھوں نے مجھے اور

حبیب بھائی کو جو بالکل ہی ہم عمر تھے، گرمیوں میں چمن میں حوض کے پاس جہاں آرام کرتی تھیں، قریب ہی لٹایا، مجھے یاد ہے کہ ہم اور یہ سب بھائی ایک دن ناشتہ کر رہے تھے، وہ تشریف لائیں اور مجھے مخاطب کر کے کہنے لگیں کہ علی! جب ہم تمہارے گھر آتے تھے تو ہم نے بارہا تم کو اپنی والدہ سے کہتے سنا کہ بی بی (میں والدہ کو اسی طرح یاد کرتا تھا) فلاں چیز بکنے آئی ہے، پیسہ دے دیجئے، اب تم مجھ سے کیوں نہیں فرمائش کرتے؟ میں چپ ہو گیا، یہ کہہ کر انھوں نے بٹوہ کھولا اور پانچ روپے کا نوٹ نکال کر دیا، (جو اس زمانہ میں پچاس روپے کے برابر ہے) اور فرمایا کہ جو تمہارا جی چاہے خریدو، اور کھاؤ، اسی طرح ایک مرتبہ تشریف لائیں، اور مزاحاً کہا کہ علی! اب تم بڑے ہو گئے ہو، اب تم سے پردہ کرنا چاہئے، میں اس کو حقیقت سمجھا، اور کچھ خفیف سا ہوا، فرمانے لگیں بیوقوف ہو، اپنے پوتوں کا نام لیا فرمایا کیا میں حبیب سے پردہ کروں گی، انوار سے پردہ کروں گی؟ یہ مادرانہ اور بزرگانہ شفقت ان کی ہم بھائی بہنوں کے ساتھ اخیر دم تک رہی۔

اس کوٹھی میں رہنے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ آنکھوں کے زنگار پھٹ گئے، اور دولت و امارت سے کبھی آنکھیں خیرہ نہیں ہوئیں، اس لئے کہ اس کا اعلیٰ سے اعلیٰ مظہر اس کوٹھی میں دیکھ لیا، میرے سامنے ہی ایک مرتبہ بیگم صاحبہ بھوپال نواب سلطان جہاں آئیں اور ہم بچوں کے سر پر ہاتھ رکھا، نان پارہ کی رانی قمر زمانی بیگم اور دوسرے رئیس گھرانوں کی بیبیاں اور رؤسا آتے اور مہمان ہوتے، سید ظہور الحسن صاحب کا حلقۂ احباب وسیع تھا، وہ ٹینس کے ممتاز پلیر تھے، اور اس رشتہ سے مسلم اور غیر مسلم لکھنؤ یونیورسٹی کے بعض پروفیسر صاحبان، وکلاء، اور شہر کے رؤسا آتے، کوٹھی کے صحن ہی میں ٹینس کورٹ تھا، اور کوٹھی کے ایک حصہ میں بلیرڈ روم، اس لئے نئے تعلیم یافتہ، اور مرفّہ الحال طبقہ کے لوگوں کو بھی

خوب دیکھا، اودھ کی تہذیب، لکھنؤ کے آداب، ریاست کی امارت و شوکت، اور نوابوں کے ٹھاٹ سب سامنے آئے، اور کوئی چیز اجنبی نہیں رہی۔

اس ماحول میں بھائی صاحب دو باتوں کا خاص اہتمام رکھتے تھے، ایک یہ کہ نماز جماعت کے ساتھ پابندی سے پڑھتا ہوں، کبھی ایسا ہوا کہ وہ میڈیکل کالج سے واپس آئے جو بالعموم مغرب بعد ہوتی تھی، اور پوچھا ظہر، عصر، مغرب کی نمازیں پڑھی تھیں، میں نے اثبات میں جواب دیا، ان کو کچھ شبہ ہوا تو تینوں نمازیں دوبارہ پڑھوائیں، دوسرے یہ کہ میں کوٹھی کے ملازموں کے پاس (جن کی بڑی تعداد تھی) زیادہ نہ بیٹھوں اور بے تکلف نہ ہوں، نیز یہ کہ کوئی ناول وغیرہ کسی سے لے کر نہ پڑھوں، وہ ہمارے اس ذاتی کتب خانہ میں سے خود کتابیں انتخاب کر کے دیتے، اور مطالعہ کرواتے، ان کتابوں میں سے سب سے پہلی کتاب جو انھوں نے پڑھنے کو دی وہ "سیرت خیر البشر" تھی، اس کے بعد غالباً "رحمۃ للعالمین" مطالعہ میں آئی۔

ہماری خاندانی روایات اور ورثہ کا تقاضہ تھا کہ میں فارسی تعلیم کی تکمیل کروں، اور اس کی ادب و شاعری کی آخری کتابیں "یوسف زلیخا" "رقعات ابوالفضل" "سکندر نامہ" "نثر ظہوری" وغیرہ کم سے کم ضرور پڑھوں، فارسی میں رقعہ نویسی کی بھی مشق کروں کہ اس کا سلسلہ میرے بھائی صاحب تک جاری رہا تھا، اور والد صاحب عرصہ تک بھائی صاحب کو فارسی ہی میں خطوط لکھتے تھے، میں نے اپنی تعلیم کی تکمیل کے بعد بھی ان کو کابل کے مشہور شاعر محمد سرور خاں گویا سے بڑی روانی کے ساتھ فارسی میں گفتگو کرتے ہوئے سنا ہے لیکن بھائی صاحب کو (جو قدیم و جدید تعلیم کے جامع، اور زمانہ پر وسیع اور گہری نظر رکھتے تھے)...... معلوم تھا کہ اب ہندوستان میں فارسی کا ورق الٹ رہا ہے، اور عربی زبان کا دور جلد آنے والا ہے، انھوں نے

میری فارسی تعلیم یہیں پر ختم کرادی، میں ان کی پسندیدہ کتاب "اصول فارسی" (مصنفہ مولانا محمد فاروق چریاکوٹی) پڑھ چکا تھا، اور مجھے فارسی میں اتنی شُدبُد ہو گئی تھی، کہ اس کی مدد سے بعد میں تصوف اور تذکرے کی کتابیں "مکتوبات امام ربانی" اور "ازالۃ الخفاء" وغیرہ کا مطالعہ آسانی سے کرسکوں، انھوں نے ایک طرف مجھے انگریزی کی ایک ریڈر شروع کرائی، دوسری طرف عربی کے لئے اپنے دوست اور عربی زبان کے بے مثال استاد شیخ خلیل ابن محمد ابن حسین یمنی بھوپالی کے سپرد کیا، یہ خاندان دو پشتوں سے ہمارے خاندان کا استاد چلا آرہا تھا، میرے والد صاحب ان کے دادا علامہ حسین ابن محسن انصاری کے حدیث میں، اور ان کے والد شیخ محمد کے ادب میں شاگرد تھے۔

عربی تعلیم کا آغاز

عربی تعلیم کا آغاز غالباً ۱۹۲۴ء کے آخری حصہ میں ہوا، ہمارے بزرگ چچا سید خلیل الدین صاحب بغرض علاج بازار جھاؤلال میں ایک مکان کرایہ پر لئے مقیم تھے، ازراہ محبت انھوں نے مجھے اپنے ساتھ رکھ لیا تھا، بھائی صاحب نے جب عرب صاحب سے مجھے عربی شروع کرانے کے لئے کہا تو انھوں نے ایک دن کاپی پر ماضی کی گردان فَعَلَ۔ فَعَلَا۔ فَعَلُوا لکھ کر دی اور کہا کہ یاد کرکے لے آؤ، اس کے چند دن بعد ہی انھوں نے اپنی محبوب نصابی کتاب "المطالعۃ العربیۃ"[1]

[1] یہ کتاب مصر کی وزارت تعلیم کی طرف سے "المطالعۃ المصریۃ" کے نام سے تیار کرائی گئی تھی، مشرقی بنگال کے عربی کے کوئی پروفیسر مصر سے اس کو لائے، اور "المطالعۃ العربیۃ" کے نام سے اس کو لیتھو میں شائع کیا یہ جدید ریڈروں کے طرز پر لکھی گئی تھی، اور اس میں بچوں کے سن و سال کے مطابق گرد و پیش سے تعلق رکھنے والے اسباق تھے، مثلاً اس کا پہلا سبق تھا، بقرتی (میری گائے) عرب صاحب کو اخیر تک یہ کتاب بہت عزیز تھی، اور ان کے عربی نصاب کی یہ بنیادی کتاب تھی۔

شروع کرادی، اس وقت عرب صاحب بازار جھاؤلال کی اسی گلی میں ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے، اور لکھنؤ یونیورسٹی میں عربی کے استاد تھے، میرے ایک ہی رفیق درس ان کے چھوٹے بھائی حسین ابن محمد تھے، ہم دو طالب علموں کی یہی ایک جماعت تھی، دو ہونے کی وجہ سے ہم میں سے ہر ایک کو عرب صاحب کی توجہ اور قدرت تدریس کا پچاس۵۰ فی صدی حصہ رسدی کے طور پر میسر ہوا، جو طالب علموں کی بڑی خوش قسمتی ہوتی ہے، اب بڑی جماعتوں میں پانچ دس فی صدی سے زیادہ حصہ کسی کے حصہ میں نہیں آتا، مختصر جماعت ہونے کی وجہ سے عرب صاحب ہم لوگوں کی رگ رگ سے واقف ہو گئے، وہ ہر ایک کی کمزوری اور ہر ایک کا امتیاز سمجھتے تھے، عرب صاحب کے ادبی و ذوقی امتیاز، اور تعلیمی و تدریسی کمال کے متعلق مجھے اس "آپ بیتی" میں زیادہ لکھنا نہیں کہ "پرانے چراغ" حصہ اول میں ان پر ایک مستقل مضمون ۲۰-۲۱ صفحے کا آچکا ہے۔[1]

میری تعلیم کا سلسلہ جاری رہا، روزانہ ایسے وقت میں کہ عرب صاحب یونیورسٹی سے پڑھا کر آچکے ہوں، پیدل گھسیاری منڈی سے بازار جھاؤلال جاتا، اور مغرب کے قریب واپس آتا، بعض مرتبہ ایسا ہوا کہ مجھے آنے میں دیر ہوئی، تو بھائی صاحب جو ابھی پیدل میڈیکل کالج سے گھسیاری منڈی پہونچے تھے، میری تلاش کے لئے نکل گئے، میں ایک طرف سے گھسیاری منڈی پہونچا، اور دوسری طرف سے وہ عرب صاحب کے یہاں، جب معلوم ہوا کہ میں جا چکا ہوں، واپس آگئے، میری انگریزی تعلیم کا سلسلہ تو برائے نام، لیکن عربی تعلیم کا سلسلہ پورے انہماک اور سرگرمی کے ساتھ چلتا رہا، عرب صاحب کا اپنا ایک اجتہادی نصاب تھا، جس میں مصر کی نصابی نو تالیف کتابیں "الطریقة المبتکرة ۱-۴" "مدارج القراءة ۱-۳" "کلیلة ودمنة" "مجموعة من النظم والنثر للحفظ والتسمیع" شامل تھا، چند ہی دن بعد انھوں نے

---

[1] "پرانے چراغ" حصہ اول ص ۲۰۷-۲۲۸

عربی میں بولنا لازم کردیا، اردو بولنے پر دو پیسے یا ایک آنہ کا جرمانہ ہوتا تھا، جو ہم لوگوں کو اکثر ادا کرنا پڑا، صرف نحو کے سلسلہ میں زیادہ زور مشق، صحیح پڑھنے، اور وجوہ اعراب سمجھنے اور بتانے پر تھا، انشاء کی مشق بھی تھی، سبق پڑھنے کا طریقہ یہ تھا کہ ہم لوگ پورا سبق تیار کرکے لائیں، اور ان کو سنادیں، "كليلة ودمنة" میں خاص طور پر اس کا اہتمام تھا، میرا نسخہ بہت سقیم تھا، اس کی تصحیح بھی کرنی پڑتی تھی، سبق بھی تیار کرنا پڑتا تھا، نحو کے ابتدائی مسائل کے لئے انھوں نے میرے ہی ایک ہمنام ابوالحسن الضریر کی چھوٹی سی کتاب "الضریری" پڑھائی، جس میں تقریباً نحو کے سب مسائل آگئے ہیں، جن کی عملاً ضرورت ہوتی ہے، لیکن اس میں فقہ النحو یا فلسفۃ النحو بالکل نہیں ہے، صرف نحو کی قدیم نصابی کتابوں میں سے میں نے "میزان" "منشعب" "صرف میر" "نحو میر" "پنج گنج" اپنے چچا مولوی سید عزیز الرحمن صاحب سے پڑھی، جو بڑی محنت اور نگرانی سے ان کتابوں کو پڑھاتے تھے، اور جن کے یہاں تساہل وتسامح کا کوئی خانہ نہ تھا، جب کچھ زیادہ دنوں کے لئے رائے بریلی آتا تو اس عربی کتاب کا حصہ بھی ان سے پڑھتا رہتا جو عرب صاحب کے یہاں زیر درس ہوتی تھی، "مجموعة من النظم والنثر" میں حصۂ نثر کو بھی زبانی یاد کرنا اور سنانا پڑتا تھا، ان ابتدائی کتابوں کے بعد عربی زبان کے قدیم معیاری کتابوں کے پڑھنے کی نوبت آئی، مثلاً "نہج البلاغۃ" "مقامات حریری" "دلائل الاعجاز" اور "عشر قصائد" عرب صاحب کے طرز تعلیم پر تفصیل سے ان کے تعارفی مضمون میں لکھا جاچکا ہے، صرف اتنا ہی ٹکڑا نقل کیا جاتا ہے کہ :۔

"اپنے ذوق ونظر کو اپنے طلبہ تک منتقل کردینے، اور ان کے رگ وریشہ میں اتار دینے کی عجیب وغریب قابلیت، زیر درس کتاب میں جان ڈال دینے، فن کا صحیح ذوق پیدا کردینے اور مصنف کا ہم زبان اور ہم مذاق بنادینے کی ان میں وہ بے نظیر قدرت تھی،

جو ہزاروں میں سے کہیں کسی ایک استاد اور ماہر فن میں ہوتی ہے، یہ قابلیت کسبی نہیں بلکہ وہبی ہے۔

...... عربی زبان و ادب کا ذوق سلیم و ذوق صحیح، پھر اس ذوق کے منتقل کرنے کی وہ قابلیت جو عرب صاحب میں دیکھی وہ نہ صرف ہندوستان (جو صدیوں سے عربی کے مذاق سلیم سے ناآشنا اور صحیح طریقۂ تعلیم سے محروم ہے) بلکہ ممالک عربیہ کے اعلیٰ علمی و عربی حلقوں میں بھی شاذونادر ہی شاید پائی جائے[1]۔"

توفیق الٰہی

عرب صاحب سے پڑھنے کے زمانہ میں ایک امتحان پیش آیا، جو دیکھنے میں تو معمولی واقعہ تھا، لیکن میرے کم سے کم عربی تعلیم اور زبان و ادب کے حصول میں کامیابی کے سلسلہ میں فیصلہ کن اثر رکھتا تھا، ہوا یہ کہ میرے انگریزی کے استاد خلیل الدین صاحب ہنسوی نے جن کا عرب صاحب بڑا لحاظ کرتے تھے، ان سے میرے ایک ایسے طرز عمل کی شکایت کی جس سے ان کو اپنی اہانت کا احساس ہوا تھا، یہ احساس محض غلط فہمی پر مبنی تھا کہ میں نے یہ کہنے کے بعد کہ آج فلاں عذر کی وجہ سے میرے لئے سبق پڑھنا مشکل ہے، دروازہ ذرا زور سے بند کیا، عرب صاحب اس سے بہت متاثر ہوئے، اور انھوں نے بھائی صاحب سے اجازت لی کہ آج وہ میری اچھی طرح تنبیہ کریں گے، ان کے مزاج میں قدرے حدّت بھی تھی، اس واقعہ نے ان کو مشتعل کر دیا، انھوں نے مجھے اس پر اتنا زدوکوب کیا،

---

[1] "پرانے چراغ" حصہ اول ص۲۱۳ بہ ترمیم خفیف۔

گو اس جرم اور واقعہ کی نوعیت سے بہت بڑھ گیا، بعد میں ان کو اس کا احساس ہوا کہ اس میں کچھ بے اعتدالی ہوگئی، جس کے لئے مجھ سے معذرت بھی کی، شدہ شدہ یہ خبر والدہ صاحبہ کو رائے بریلی پہونچی، انھوں نے مجھ سے دریافت کیا، اور کہا کہ معلوم ہوا ہے کہ عرب صاحب نے تم کو بہت مارا، اللہ تعالیٰ نے اس وقت توفیق دی، اور میں نے عرب صاحب کی پوری وکالت اور ان کی طرف سے مدافعت کی، اور ان کو اس تنبیہ و تادیب میں بالکل حق بجانب قرار دیا، والدہ صاحبہ مطمئن ہوگئیں، اور میری تعلیم کا سلسلہ جاری رہا، میں سمجھتا ہوں کہ میرے اس سعادت مندانہ رویہ نے جو محض توفیق الٰہی کا نتیجہ تھا، مستقبل میں میرے لئے عربی زبان وادب کا ذوق پیدا ہونے، اور اس کے ذریعہ سے دین و علم کی خدمت کرنے کا فیصلہ کرا دیا، اگر صورت حال اس کے برعکس ہوتی، اور میں اپنے کو بری اور مظلوم قرار دیتا، اور اپنے محسن و مربی استاد کو حدود سے تجاوز کرنے والا، تو شاید معاملہ برعکس ہوتا، اور میں ہمیشہ کے لئے ان کے فیض تعلیم اور عربی زبان وادب میں کامیابی سے محروم کر دیا جاتا "ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ رَبِّي لِيَبْلُوَنِي أَأَشْكُرُ أَمْ أَكْفُرُ"

ایک لطیفہ اور امتحان

میں اور رفیق مکرم حسین ابن محمد عرب ایک روز عرب صاحب سے پڑھ رہے تھے "کلیلہ و دمنہ" کا سبق ہو رہا تھا کہ عرب صاحب نے جو یونیورسٹی سے ابھی آئے تھے، چائے کی فرمائش کی، گھر میں سے آواز آئی کہ شکر نہیں ہے، عرب صاحب نے اسی وقت ایک روپیہ حسین صاحب کو نکال کر دیا کہ شکر لے آؤ، وہ سیر بھر شکر لائے، جو غالباً اس وقت دو ڈھائی آنے کی ملتی ہوگی، اور ریزگاری واپس کی، تھوڑی دیر کے بعد عرب صاحب نے کہا کہ بقیہ پیسے کیا ہوئے؟

انھوں نے کہا کہ بھائی جان ابھی میں نے ریزگاری دی تھی، دیکھا تو وہاں کہیں نظر نہیں آئی، عرب صاحب بہت ناراض ہوئے کہا کہ یا تو میں تھا، یا علی، یا تم، آخر ریزگاری کہاں گئی؟ معلوم ہوتا ہے تیری عادت خراب ہوگئی، حسین برابر کہتے رہے کہ میں نے ابھی ریزگاری واپس کی تھی، لیکن اس کا کہیں پتہ نہیں تھا، پھر سبق شروع ہوگیا، ہم لوگ چلے گئے، بات آئی گئی ہوگئی۔

ایک دن میں نے کتاب کھولی "کلیلہ ودمنہ" کے جس ایڈیشن میں میں پڑھتا تھا وہ بڑے سائز کا موٹے ٹائپ کا تھا، اور کتاب ڈھیلی جلد کی تھی، میں نے دیکھا کہ سب ریزگاریاں کتاب کے سیون میں ایک قطار کی طرح رکھی ہوئی ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ حسین نے بھول کر یا عرب صاحب نے میری کتاب پر رکھ دیں، جو کہیں سے کھلی ہوئی تھی، ہوا سے ورق الٹ گیا، اور ریزگاری اس میں رہ گئی، جب اتفاقاً وہ ورق الٹا گیا، تو ریزگاری موجود تھی، میں تھوڑی دیر سوچتا رہا کہ کیا کروں؟ ڈر معلوم ہوتا تھا کہ عرب صاحب کو مجھ پر شبہ ہوگا کہ میں نے ریزگاری چھپالی تھی، اس کے بعد کچھ خیال ہوا، اور واپس کر رہا ہوں لیکن اللہ نے توفیق اور ہمت دی، اور میں نے سارا قصہ بیان کیا، اور ریزگاری پیش کی، یہ تو معلوم نہیں کہ عرب صاحب کو یقین آیا کہ نہیں لیکن انھوں نے ریزگاری لے لی، اور کچھ فرمایا نہیں، اللہ تعالیٰ کی اس توفیق پر شکر کرتا ہوں، اور جب یہ واقعہ یاد آتا ہے تو ہنسی بھی آتی ہے۔

اردو زبان وادب اور بعض مفید کتابوں کا مطالعہ

یہ میری بڑی خوش نصیبی تھی کہ ابتدائے عمر اور عربی تعلیم کے آغاز ہی کے زمانہ میں میں نے اردو زبان وادب کی معیاری کتابیں پڑھ لیں، دین کے جن داعیوں اور علماء کو

آغاز عمر میں اپنے ملک کی زبان و ادب کے مطالعہ اور اس کا ذوق پیدا کرنے کا موقعہ نہیں ملتا، یا بڑی عمر میں وہ ان کا مطالعہ کرتے ہیں' ان کو دین کی مؤثر دعوت دینے' اور دینی حقائق کی تفہیم و تعلیم میں' نیز جدید تعلیم یافتہ طبقے میں دینی مقاصد کو دل نشین کرنے میں دقّت پیش آتی ہے' اور ان کی انشاء و تحریریں وہ طاقت اور دل آویزی نہیں ہوتی جس کی اس عہد میں ضرورت ہے۔

رائے بریلی کے قیام میں جو کبھی کبھی طویل ہو جاتا تھا، میرے ہاتھ میں مولانا شبلی مرحوم کی "الفاروق" آگئی، مطبع نامی کانپور کی چھپی ہوئی سراپا تصویر، پڑھی اور کئی بار پڑھی، عم محترم مولانا سید طلحہ صاحب کی صحبت اور مجلسوں میں "آب حیات" سے تعارف ہوا، سُنی اور بار بار پڑھی یہاں تک کہ اس کے بہت سے مضامین مستحضر ہو گئے، اشخاص، شعراء اور ان کا کلام دماغ پر اس طرح نقش ہو گئے، جس طرح بچپن کی دیکھی ہوئی چیزیں اور سنی ہوئی باتیں ذہن پر مرتسم ہو جاتی ہیں' اور ان کا دماغ پر کوئی بار نہیں ہوتا۔

"گل رعنا" گھر کی کتاب تھی' اس کو اتنے بار پڑھا کہ اردو شاعری کی تاریخ اور شعراء کے متعلق اتنے معلومات ہو گئے کہ اس موضوع پر مجلس میں گفتگو کرنے اور گفتگو میں حصہ لینے کی استعداد پیدا ہو گئی۔

میرے ماموں زاد بھائی حافظ سید حبیب الرحمٰن جامعہ ملیہ میں پڑھتے تھے' ان کو اردو شعر و شاعری کا بڑا شوق تھا، ان کا ایک خاص ذوق یہ تھا کہ بچوں سے اساتذہ کے اشعار کا مطلب پوچھتے' اور اردو میں تقریر و تحریر کے مقابلے کرواتے، اس سلسلہ میں خاص طور پر مومنؔ غالبؔ، ذوقؔ، اور لکھنؤ کے شعراء میں سے آتشؔ اور امیرؔ مینائی کے کلام سے ان کو خاص ذوق تھا، چنانچہ ان کے اشعار سننے اور ان کا مطلب بیان کرنے کے سلسلہ میں دماغ پر زور ڈالنے، اور مشکل اشعار کے سمجھنے کی عادت پڑی، شعر فہمی اور ذوق آفرینی میں ان کے بڑے بھائی

مولوی سید ابوالخیر صاحب برقؔ کا بھی حصہ ہے، جو لکھنؤ کی زبان کے عاشق، محاورات، اور الفاظ کی تذکیر و تانیث میں سند اور استاد کا درجہ رکھتے تھے، خود بھی شعر کہتے تھے، اور اچھے کہتے تھے۔

اس زمانہ میں مشاعروں کا بڑا زور تھا، ہمارے چھوٹے گاؤں میں کئی مشاعرے ہوئے، دیکھا دیکھی میں نے بھی کچھ موزوں کرنے کی کوشش کی، مگر اللہ تعالیٰ بڑے بھائی صاحب کو جزائے خیر دے کہ انھوں نے بہت سختی سے روک دیا، اور یہ شغل بے حاصل جاری نہ رہ سکا۔

رائے بریلی میں گھر میں بعض عزیزوں کا ذخیرۂ کتب تھا، جس میں مولوی محمد حسین آزادؔ کی "نیرنگ خیال" بھی تھی، عمر کے اس ابتدائی دور اور زبان و ادب کے اس ابتدائی ذوق میں آزادؔ کی نثر کا جو نثر فنی کا ایک مرصّع نمونہ ہے، بہت اثر پڑا، بہت دنوں تک "نیرنگ خیال" اور "آب حیات" کی تقلید میں بہت سے صفحے سیاہ کئے، جو اپنی کم سوادی کے باوجود فائدے سے خالی نہیں رہے، یہ زمانہ ہر چھپی ہوئی چیز کے پڑھنے کے مرض کا تھا، ہر قسم کی چیزیں پڑھیں مولانا شبلی مرحوم، مولانا حالیؔ اور مولوی نذیر احمد، شررؔ مرحوم، اور رتن ناتھ سرشار کی بھی چند کتابیں پڑھیں، میرے ماموں مولوی حافظ سید عبید اللہ صاحب کے یہاں مولانا آزاد کے شہرۂ آفاق اخبار "الہلال" کے کئی سال کے فائل تھے، وہ بھی ذوق و شوق سے پڑھے اور ان کے زورِ قلم اور جوشِ بیان کا طبیعت نے پورا اثر قبول کیا، کہتے ہیں کہ کوئی پڑھی ہوئی چیز خواہ بھلا دی جائے بیکار اور بے اثر نہیں رہتی، اپنا اچھا بُرا اثر ضرور کرتی ہے، اس لئے اس کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ نقش آنکھوں سے آگے نہیں بڑھنے پائے، لیکن ان کا کوئی خاص اثر یاد نہیں آتا۔

اردو مضمون نویسی میں ابتدائی اثر والد مرحوم کی کتاب "یاد ایام" کا تھا، جو سنجیدہ

زبان کا ایک شگفتہ نمونہ ہے اور جس میں تاریخ کی متانت کے ساتھ زبان کا بانکپن بھی موجود ہے جو میرے علم میں مصنف "گل رعنا" اور مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کی تحریر کا مشترک جوہر ہے اس طرز پر میرا پہلا مضمون جواب یاد آتا ہے "اندلس" پر تھا۔[1]

اس زمانہ کا یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ میں نے شبلی بک ڈپو (جو لکھنؤ میں اس وقت لاٹوش روڈ پر مولوی کلیم احمد صاحب بہرائچی ندوی کا تجارتی مکتبہ تھا) کی فہرست میں سیرت کی ایک کتاب "رحمۃ للعالمین" مصنفہ قاضی محمد سلیمان صاحب منصور پوری کا نام پڑھا، پڑھتے ہی طبیعت میں ایسا انجذاب ہوا کہ میں نے اس کا آرڈر دے دیا، کتاب آئی، تو اس وقت والدہ صاحبہ کے پاس وی، پی چھڑانے کے لئے پیسے نہ تھے، انھوں نے مجبوری کا اظہار کیا، میں نے اس پر رونا شروع کر دیا، والدہ صاحبہ نے مجبور ہو کر کہیں سے اس کا انتظام کیا، اور وی، پی چھڑالی، میں نے اس کتاب کو بڑے ذوق وشوق، اور عقیدت ومحبت کے ساتھ پڑھا، کم کتابوں نے دل ودماغ پر ایسا گہرا اثر ڈالا ہوگا، جتنا اس کتاب نے، مصنف کا اخلاص اور ان کی قوت ایمانی، اور داعیانہ رنگ تھا، اور سیرت کے واقعات کی سادگی اور اثر انگیزی کہ دل ودماغ میں ایک کرنٹ سا دوڑ گیا، اس کتاب کو اپنی محسن ومربی کتابوں میں سمجھتا ہوں، اور اس کے مصنف کے لئے رفع درجات اور قبولیت کی دعا کرتا ہوں۔

بازار جھاؤلال کا دوبارہ قیام

سنہ ۱۹۲۵ء تھا کہ بھائی صاحب نے مڈیکل کالج کے آخری سال کا امتحان دیا، اور کامیاب

---

[1] "مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں" ص ۱۶۱-۱۶۳ بہ ترمیم واضافہ "یاد ایام" دوبارہ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کی طرف سے پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی کے گرانقدر مقدمہ اور تذکرۂ مصنف (مرتبہ فرزندان مصنف مرحوم) کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔

ہوئے، نومبر ۱۹۲۵ء میں انھیں ایم۔بی۔بی۔ایس کی ڈگری مل گئی، اب وہ باقاعدہ مطب کرنے کے لئے تیار ہوگئے تھے، جنوری ۱۹۲۶ء سے گوئن روڈ لکھنؤ پر (والد کے قدیم مطب کے قریب) مطب کا آغاز کردیا، اور قریب ہی بازار جھاؤلال کی اسی گلی میں جس کے سرے پر ہمارا لب سڑک قدیم مکان تھا، ایک چھوٹا سا مکان کرایہ پر لیا، یہ عرب صاحب کے اس مکان سے بالکل بالمقابل اور متصل ہی تھا جس میں ان کا خانگی مدرسہ تھا، اور ہم سب پڑھتے تھے، اس لئے تعلیم میں اور بھی آسانی ہوئی۔

ندوۃ العلماء کا جلسہ کانپور

۵،۶،۷، نومبر ۱۹۲۶ء کی تاریخوں میں ندوہ کا سالانہ جلسہ کانپور میں تھا، بھائی صاحب جو اس وقت نائب ناظم تھے، مجھے اپنے ساتھ کانپور لے گئے، اور وہیں جلسہ کے مہمانوں کی قیامگاہ حلیم مسلم ہائی اسکول[1] کی عمارت میں چھوڑ آئے، بھائی صاحب مطب کے بعد روزانہ آتے تھے، اور جلسوں میں شرکت کر کے چلے جاتے تھے، تین چار دن وہیں مستقل مقیم رہا، اس وقت مشاہیر ہند میں سے متعدد شخصیتوں کی پہلی بار زیارت ہوئی، حاذق الملک حکیم اجمل خاں تو صدر ہی تھے، مولانا محمد علی جوہر، اور مولانا ظفر علی خاں کو پہلی بار دیکھا اور سنا، علماء اور مصنفین میں سے مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی، قاضی محمد سلیمان صاحب منصور پوری (مصنف رحمۃ للعالمین) مولانا ابو عبد اللہ محمد سورتی، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں شیخ الجامعہ، جو بعد میں صدر جمہوریۂ ہند ہوئے، اور کتنے علماء، ادباء، شعراء کا دیدار ہوا، کسی سے بات کرنے کی بھی نوبت آئی، میں عرب صاحب کی تعلیم و تربیت کے فیض سے عربی بولنے لگا تھا، کچھ میرا

[1] حال حلیم مسلم ڈگری کالج۔

ضرورت بے ضرورت عربی بولنا، کچھ میری ازرق برق شیروانی جس کے پورے تانے بانے میں "ملبوس العافیۃ" کے خوبصورت نقوش چمکتے تھے[۱] کہ میں بھی ایک مرکز توجہ بن گیا، اس جلسہ میں ایک مدنی ادیب و شاعر شیخ سعدالدین برّادہ[۲] بھی شریک تھے، ان کو کبھی کبھی کسی سے راستہ پوچھنے اور بات کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی، تو میں اپنی ٹوٹی پھوٹی عربی سے ان کی مدد کرتا، معزز مہمانوں میں مشہور ہو گیا کہ ۱۲-۱۳ سال کا ایک لڑکا یہاں آیا ہوا ہے، جو بے تکلف عربی بولتا ہے، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم نے جو نئے نئے جرمنی سے آئے تھے، انھوں نے اور مولانا ابوعبداللہ محمد سورتی صاحب نے مجھے دیکھنے کی خواہش کی، اور اپنے کمرے میں بلایا، مجھ سے امتحاناً کچھ سوالات بھی کئے اور میں نے اپنی سمجھ کے مطابق جواب دیا۔

کانپور کے اس اجلاس ندوۃ العلماء کی روئیداد دیکھی تو معلوم ہوا کہ اس میں میر غلام بھیک نیرنگ (بانی انجمن تبلیغ اسلام انبالہ) ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا احمد سعید صاحب ناظم جمیعۃ العلماء ہند دہلی، مولانا عبدالرحیم صاحب (ریواڑی) مفتی انوار الحق صاحب (ڈائرکٹر تعلیمات بھوپال) خان بہادر مولوی بشیر الدین صاحب ایڈیٹر "البشیر" اٹاوہ، اور مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی ایڈیٹر "سچ" بھی شریک تھے، یہ سب ہندوستان کے نامور لوگوں میں سے تھے، اس لئے قدرتاً ان سب پر نظر پڑی ہوگی، اور ان میں متعدد حضرات کی تقریر بھی سنی ہوگی۔

۱ے یہ کپڑا بغداد کا بنا ہوا تھا، اور والد صاحب کو کسی نے سورت میں تحفہ میں دیا تھا۔

۲ے یہ سید عبدالجلیل برّادہ مشہور مدنی ادیب و شاعر کے صاحبزادہ تھے، جو ادب عربی کے علامۂ وقت شیخ محمود الترکزی الشنقیطی کے شاگرد رشید تھے۔

اس وقت کا ماحول اور دلچسپیاں

بازار جھاؤلال کے اسی دوبارہ قیام کے زمانہ میں (۱۹۲۶ء سے ۱۹۲۸ء) مجھے ہاکی کھیلنے کا شوق کیا لت ہوئی، قریب ہی روشن الدولہ کچہری کے عقب میں راجہ نواب علی روڈ پر ایک کھلا میدان تھا، جہاں اب اسٹیٹ ریڈ کراس سوسائٹی کی عمارت ہے، وہاں ایک کلب قائم تھا، اس میں میں اور بھائی ابوبکر[1] کھیلنے جانے لگے، ابوبکر شروع سے ہاکی کے اچھے کھیلنے والوں میں تھے، اور بعد میں تو وہ لکھنؤ یونیورسٹی کے ممتاز کھلاڑیوں، اور ٹورنامنٹ میں حصہ لینے والی ٹیم کے ممتاز کھلاڑیوں میں شمار ہوتے تھے، میں متوسط درجہ کے کھیل سے آگے نہ بڑھ سکا، اس میں میری اس بے وقت عقلیت کو بھی دخل تھا، جو کھیل کی روح کے سخت منافی اور اس میں ترقی کرنے سے مانع ہے، یعنی گول کرنے نہ کرنے، اور جیتنے نہ جیتنے کی اہمیت اور جوش کا فقدان، اس کلب میں آنے جانے سے مجھے (جس کا زمانہ ابھی تک تکیہ کے ماحول، یا بھوپال ہاؤس کی فضا میں گذرا تھا) باوجود کم سنی کے اندازہ ہوا کہ اسکولوں کالجوں، اور محلوں کا ماحول، اور اس وقت کا مسلم معاشرہ کتنا فاسد ہو چکا ہے، اس کلب میں زیادہ تر قریب کے محلہ پیر جلیلوں اور گولہ گنج کے نوجوان اور لڑکے شریک ہوتے تھے، جن میں ایک تعداد شیعہ سنّی لڑکوں، اور ایک تعداد کرسچین لڑکوں کی بھی تھی، میں ان کی زبان سے ایسے الفاظ نکلتے ہوئے سنتا تھا، جو اخلاقی بگاڑ اور معاشرہ کے فساد بلکہ تعفّن کی غمازی کرتے تھے، بعض اوقات وہ ہم دونوں کو آتے ہوئے دیکھ کر خاموش ہو جاتے، پھر بھی کان میں ان کی باتیں پڑتی رہتی تھیں، میری عمر کا یہ زمانہ جو عربی اصطلاح میں "مراہقہ فکری وجسمانی" کا زمانہ تھا، بڑا آزمائشی

---

[1] مولوی سید ابوبکر حسنی ایم۔ اے حال اسسٹنٹ پروفیسر نہرو یونیورسٹی دہلی جو میرے عم زاد بھائی اور بچپن کے ساتھی ہیں۔

اور ایک حد تک تاریک زمانہ تھا، اور اقبال کے الفاظ میں (قدرے ترمیم کے ساتھ) ؂

نشستم با نکویانِ فرنگی
ازاں بے سوز تر روزے ندیدم

خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی سے استفادہ

اسی زمانہ میں بھائی صاحب کی دعوت پر ان کے رفیق درس اور دوست خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی استاد التفسیر جامعہ ملیہ اسلامیہ لکھنؤ تشریف لائے، اور ہمارے گھر ٹھہرے، بھائی صاحب کے کہنے پر انھوں نے مجھے آخری پارہ کی کچھ سورتیں پڑھائیں، یہ میرا مولانا عبیداللہ صاحب سندھی کے طرز تفسیر و فکر سے پہلا تعارف تھا جس کی وجہ سے میں نے حضرت مولانا احمد علی صاحب کے درس میں (جس کا شرف مجھے تین چار سال کے بعد حاصل ہونے والا تھا) اجنبیت محسوس نہیں کی۔

خواجہ عبدالحی صاحب کے نام بکثرت اخبارات و رسائل آتے تھے، ان کی صحبت و مجلس بھی بڑی معلومات افزا اور مفید تھی، اسی زمانہ میں مولانا ظفر علی خاں کے شہرۂ آفاق اخبار "زمیندار" بالخصوص اس کے سنڈے ایڈیشن سے دلچسپی پیدا ہوئی، ہفتہ بھر ہمیں اس کا انتظار رہتا، مولانا کی نظم جو صفحۂ اول پر ہوتی تھی، مزے لے لے کر پڑھتا، اور ان کی قادر الکلامی خوش نوائی، اور جوش کلام سے مسحور ہوتا، بھائی آفتاب احمد (جو اب حکیم عبدالقوی صاحب مدیر "صدق" کے نام سے معروف ہیں) مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے بھتیجے بھی عرب صاحب کے یہاں پڑھنے آنے لگے تھے، وہ خاندانی طور پر مولانا محمد علی کے مداح اور فدائی تھے، اور میں مولانا ظفر علی خاں کا حامی اور وکیل، عرب صاحب کے مکان کی جنوبی دیوار کے نیچے کھڑے ہو کر

ہم لوگ دیر تک مناظرہ اور مباحثہ کرتے، میں مولانا ظفر علی خاں کی رجز خوانی کرتا، وہ مولانا محمد علی کی قصیدہ خوانی۔

اسی زمانہ میں ہم کو ہاکی اور فٹ بال کے میچ اور ٹورنامنٹ دیکھنے کا شوق کیا، ایک سودا پیدا ہوا، اس زمانہ میں B.Y گراونڈ پر جو چھتر منزل کے بالمقابل دریا کے دوسرے پار ندوہ کے راستہ میں پڑتی تھی، بڑی دھوم دھام کے ٹورنامنٹ ہوتے تھے، جس میں رام لعل کپ کے ٹورنامنٹ خاص طور پر مشہور تھے، ہم لوگ صبح سے اس کے منتظر رہتے تھے، اور وہاں سے آکر دیر تک کھیلنے والوں پر تبصرہ ہوتا، مجھے اب خوب اندازہ ہوتا ہے کہ ایسے شوق (بے ضرر ہونے کے باوجود) تعلیمی انہماک اور ذہنی یکسوئی پر کتنے اثر انداز ہوتے ہیں۔

مولانا سید طلحہ صاحب سے علمی فائدہ

اس زمانہ میں خاص طور پر رائے بریلی کے قیام میں عم محترم مولانا سید طلحہ صاحب سے پڑھنے کی نوبت آئی، وہ صرف و نحو کے استاد ہی نہیں امام تھے، اور خاص طور پر اس کی مشق کرانے میں ان کو ید طولیٰ حاصل تھا، صحیح عبارت پڑھنے اور صرف نحو کے ضروری مسائل کے جزو دماغ بن جانے میں ان کا بڑا دخل ہے، وہ ادبی نحوی صرفی غلطی، عبارت کا غلط پڑھنا معاف نہیں کرتے تھے، اور کئی کئی دن تک اس پر طنز فرماتے، اور چٹکیاں لیتے رہتے، جس کی وجہ سے بڑا چوکنا اور ہوشیار رہنا پڑتا تھا، عربی زبان وصرف و نحو کے علاوہ ان سے اور بہت سے علمی فوائد حاصل ہوئے، اور ذہنی تربیت ہوئی، تاریخی شعور پیدا ہوا، اور اس متنوع ثقافت میں سے کچھ حصہ ملا، جس میں ان کو اپنے باکمال معاصرین میں بھی امتیاز حاصل تھا، میں "پرانے چراغ" حصہ اول میں تفصیل کے ساتھ ان پر لکھ چکا ہوں[1]۔

[1] پرانے چراغ حصہ اول صہ ٢٢٩-٢٥٦

یہ وہ زمانہ تھا کہ کسی قسم کا دینی ذوق، اور کسی بزرگ کی صحبت حاصل نہ تھی، نہ زبان وادب یا کھیل کے سوا کسی، پڑے سے ذوق یا دلچسپی تھی، نہ شہر میں کوئی دینی دعوت یا تحریک تھی، جس سے کچھ اصلاح وتربیت، اور دینی مشغولیت ہوتی، کبھی شہر میں مولانا محمد علی، کبھی مولانا آزاد کی آمد کے سلسلہ میں سیاسی اور قومی جلسے ہوتے، اسی زمانہ میں ان دونوں حضرات اور مولانا ظفر علی خاں کو دیکھنے اور سننے کا موقعہ ملا[1]۔

لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ

۱۹۲۷ء کے اگست کے مہینہ کی ابتدائی تاریخیں تھیں، میں رائے بریلی آیا ہوا تھا، وہاں عم محترم مولانا سید طلحہ صاحب سے (عرب صاحب کی ہدایت اور نصاب کے مطابق) تعلیم کا سلسلہ جاری کئے ہوئے تھا، دن کے ۱۱-۱۲ بجے ہوں گے کہ اچانک بھائی صاحب لکھنؤ سے تشریف لائے، اور والدہ صاحبہ اور پھوپھا صاحب سے کہا کہ علی کو لکھنؤ لے جانا ہے، یہ لکھنؤ یونیورسٹی کے درجہ فاضل ادب میں داخل ہوں گے، میری عمر اس وقت چودہ ۱۴ سال کی رہی ہو گی، میں تو "کالمیت فی ید الغسال" تھا، شفیق بھائی، اور مشفق استاد خلیل عرب صاحب جو فیصلہ کرتے اس میں چون وچرا کی گنجائش نہ تھی، لیکن یہ فیصلہ بھائی صاحب کے مذاق کے خلاف تھا، (کہ وہ یونیورسٹیوں کے مشرقی امتحانات دینے کے طبعاً خلاف تھے) اور غالباً انھوں نے عرب صاحب کے رجحان اور اصرار پر کیا، جو لکھنؤ یونیورسٹی میں M.A-B.A کے کلاسز کو عربی پڑھاتے تھے، اور یونیورسٹی کے عربی امتحانات کو (جن کے ذریعہ انگریزی امتحانات وملازمتوں کی راہ ہموار ہوتی ہے) افادیت کے قائل تھے، بہرحال میں

---

[1] ملاحظہ ہو "پرانے چراغ" حصہ دوم مضمون مولانا محمد علی جوہر، اور مولانا ابوالکلام آزاد۔

اگلے دن بھائی صاحب کے ساتھ لکھنؤ گیا، بھائی صاحب نے میری نئی شیروانی بنوائی اور میں ۸ راگست ۱۹۲۷ء یا کسی قریبی تاریخ کو داخلہ کے امتحان کے لئے یونیورسٹی پہونچا، بھائی ابوبکر بھی امیدواروں میں تھے، مجھے یاد ہے کہ ان سب امیدواروں میں جو باہر کھڑے تھے، میں سب سے کم سن اور تعلیمی لحاظ سے سب سے فروتر تھا، عام طور پر یہ امیدوار مدارس عربیہ کے فاضل اور باریش نوجوان تھے، یونیورسٹی کے ایک طرار طالب علم نے تو مجھے دیکھ کر یہاں تک فقرہ چست کیا کہ صاحبزادہ تمہاری والدہ نے تم کو کیسے یہاں آنے کی اجازت دی؟ امتحان کے بورڈ میں شمس العلماء مولانا حفیظ اللہ صاحب مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء، ڈاکٹر زبیر صدیقی صدر شعبۂ عربی، اور مولوی علی اصغر صاحب استاد شعبہ بیٹھے تھے، میرے سامنے "رسائل ابی بکر الخوارزمی" رکھی گئی، اور میں نے بڑی آسانی کے ساتھ عبارت پڑھی، معنی بیان کئے، اور سوالات کے جوابات دیئے، اور میرا داخلہ ہوگیا، لیکن اس داخلہ کے اور درجہ میں حاضری کے باوجود، زیر درس کتابوں کا سبق عرب صاحب کے یہاں جاری تھا، اور اصلاً وہی مفید، استعداد آفریں اور دلچسپ تھا، اس میں چند دوسرے ہم درجہ طلباء بھی شریک ہوتے تھے۔

فاضل ادب کا نصاب پرانا تھا، کتابوں کے انتخاب اور ترتیب میں بنیادی مشورہ شیخ خلیل عرب صاحب کا تھا، جو پورے شعبۂ عربی پر چھائے ہوئے تھے، غیر مسلم اسٹاف تک ان کا احترام کرتا تھا، اور صدر شعبہ بھی ان سے استفادہ کرتے، اس درجہ کی تفصیل کی ضرورت نہیں، کئی کتابیں میری پڑھی ہوئی تھیں، مشکل صرف دو چیزیں تھیں، ایک فن عروض جس کی کتاب "محیط الدائرۃ" داخل تھی، اس فن سے نہ اس وقت مناسبت تھی، نہ اب ہے، دوسرے دقیق نحوی مسائل اور اصطلاحات اور ان کی موشگافیاں،

میری کل جمع پونجی نحو کے علمی مسائل، فہم اور مشق تھی، اپریل ۱۹۲۸ء کی ابتدائی تاریخوں میں سالانہ امتحان ہوا، میرے پرچے سب بہت اچھے ہوئے، خاص طور پر انشاء اور مضمون نگاری کا پرچہ، میرا عربی اردو خط بھی اچھا تھا، لیکن جب نتیجہ نکلا تو سب کو یہ سن کر حیرت ہوئی کہ میں ناکام رہا، معلوم ہوا کہ حماسہ کے پرچہ میں جو مولانا فضل حق صاحب رامپوری (پرنسپل مدرسہ عالیہ رامپور) کے پاس تھا، اور جس میں کئی ایسے نحوی سوالات تھے، جو میری دسترس سے باہر تھے، فیل ہوا ہوں، شعبہ کے واقفین نے بتایا کہ اگر میں اس پرچہ میں صرف پاس ہو جاتا تو بھی درجہ میں فرسٹ آتا، اس ناکامی کا صدمہ مجھے، بھائی صاحب، عرب صاحب اور خاص طور پر والدہ صاحبہ کو ہوا، لیکن شاید اس میں بھی حکمت الٰہی تھی کہ مجھے ناکامی کا تجربہ کرنے اور اس کو برداشت کرنے کا موقعہ ملا، اور دوبارہ محنت و جانفشانی کے لئے مجبور ہوا۔

اگلے سال اپریل ۱۹۲۹ء میں جو امتحان ہوا، تو اس کی پوری تلافی ہوگئی، اور میں اپنے درجہ میں فرسٹ ڈویژن فرسٹ آیا، میں وظیفہ کا بھی مستحق ہوا، اور گولڈ مڈل کا بھی، وظیفہ جس کے لئے اسی شعبہ کے کسی اور درجہ میں داخلہ کی شرط تھی، اور میں اسی مصلحت سے فاضل حدیث میں داخل ہو گیا، مجھے سال بھر ملا، پڑھنے والوں کو یہ معلوم کر کے حیرت ہوگی کہ یہ آٹھ روپے ماہوار کا اعزازی وظیفہ تھا، گولڈ مڈل میری قسمت میں نہ تھا کہ اس سال اتفاقاً کسی تعلقہ دار نے اس کے لئے یونیورسٹی میں رقم نہیں جمع کرائی، مجھے اس کے پانے کی حسرت ہی رہ گئی، غالباً اس کی قیمت سو روپے سے زائد نہ ہوتی ہوگی، اس وقت اگر کوئی پیشین گوئی کرتا کہ تمہیں اس کے بجائے کسی زمانہ میں سب سے بڑی قابل احترام حکومت (سعودی عرب) کی طرف سے فیصل ایوارڈ کی شکل میں وہ بیش قیمت طلائی تمغہ ملے گا، جس کی قیمت سے یونیورسٹی کے اس تمغہ کو کوئی نسبت نہیں تو کوئی باور نہ کرتا، لیکن "بفعل اللہ ما یشاء و یحکم ما یرید"۔

ستبدی لك الأيام ما كنت جاهلا ويأتيك بالأخبار من لم تزوّد

ويأتيك بالأخبار من لم تبع له بتاتاً ولم تضرب له وقت موعد

اسی سال دسمبر ۱۹۲۹ء کو یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد (CONVOCATION) میں گورنر یو۔پی سر مالکم ہیلی نے سندیں تقسیم کیں، اور میں نے بھی اپنے بھتیجوں سید ابوبکر وغیرہ کے ساتھ سند لی، اور یہ ستم ظریفی میری زندگی میں پیش آکر رہی کہ عربی ادب اور زبان کی سند ایک انگریز حاکم، اور دشمن اسلام قوم کے فرد سے لی جائے، لیکن ہر چیز کو اپنے زمانہ وماحول کے پیمانے سے ناپنا چاہیئے، اس ماحول میں یہ چیز معیوب نہیں سمجھی جاتی تھی، اور اقبال کا یہ شعر بھی شاید کان میں نہیں پڑا تھا ؎

مرا از شکستن چناں عار ناید
کہ از دیگراں خواستن مومیائی

فاضل حدیث کا امتحان تو میں نے بغیر مطالعہ اور محنت کے دے دیا، اور کامیاب ہوا، لیکن اس وقت اتنا احساس پیدا ہو گیا تھا کہ اس کی سند نصف صدی گذر جانے کے بعد بھی آج تک نہیں لی۔

ایک محرومی

اس وقت اسلاف کی زندہ یادگار، اور ایک عالم ربّانی ہمارے خاندان میں موجود تھے، جن کا اسم گرامی مولانا سید محمد امین نصیر آبادی ہے، وہ ہماری نصیر آباد کی جدّی شاخ میں تھے، بیعت تو شاید بچپن میں شیخ وقت حضرت مولانا سید خواجہ احمد صاحب نصیر آبادی سے کی تھی، مگر سلوک کی تعلیم ہمارے نانا حضرت مولانا شاہ سید ضیاء النبی صاحب سے حاصل کی تھی،

اپنے عہد کے ممتاز ترین حامی سنت اور ماحی بدعت تھے اور "من رأی منکم منکراً فلیغیرہ بیدہ فمن لم یستطع فبلسانہ ومن لم یستطع فبقلبہ وذلک أضعف الایمان" کے حکم کی تعمیل میں وہ اس کے پہلے جزء تغییر بالید ہی پر عمل کرنے کی کوشش کرتے تھے، دونوں بعد کے درجوں کی نوبت کم ہی آتی ہوگی، ضلع رائے بریلی، سلطانپور، پرتاب گڑھ، اعظم گڑھ میں ان کی ذات سے بڑی اصلاح ہوئی، ہزاروں آدمی شعائر اسلام کے پابند، سنتوں پر کاربند، اور بدعات سے تائب و مجتنب ہوئے، اللہ تعالیٰ نے بڑی وجاہت اور قبولیت عطا فرمائی تھی، اور انھوں نے اپنے حلقۂ ارادت میں ایک چھوٹی سی شرعی حکومت قائم کرلی تھی، جس میں شریعت ہی کا قانون چلتا تھا۔[1]

حیرت کی بات یہ ہے کہ مولانا کی وفات جمادی الآخرہ ۱۳۴۹ھ (۱۹۳۱ء) میں ہوئی جب میں سن شعور کو پہونچ چکا تھا، اور عربی تعلیم ہو رہی تھی، نصیر آباد رائے بریلی سے صرف دس کوس کی مسافت پر واقع ہے، اور قدیم وطن اور اعزہ کا مسکن، مگر معلوم نہیں کیوں بزرگوں کو یہ خیال نہیں ہوا کہ مجھے ان کی خدمت میں بھیجیں اور میں ان کی دعائیں لوں، یقین ہے کہ اگر میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتا، تو بڑی شفقت فرماتے، اس لئے کہ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے علاوہ قرابت اور ہم جدی کے مداح تھے، اس کو یاد کرتا ہوں، تو اپنی اس محرومی پر افسوس کرتا ہوں۔

---

[1] تفصیلی حالات و کمالات کے لئے ملاحظہ ہو کتاب "یادگار سلف" از مولانا نجم الدین صاحب اصلاحی مطبوعہ دار المصنفین اعظم گڑھ۔

بابِ چہارم

لاہور کا تاریخی سفر، علامہ تقی الدین الہلالی کی آمد دارالعلوم ندوۃ العلماء میں، برادرِ معظم کی علمی و ذہنی رہنمائی، انگریزی تعلیم کا انہماک اور اس سے علیحدگی، لاہور اور دیوبند کا قیام

لاہور کا تاریخی سفر

میری امتیازی کامیابی کی خبر میری پھوپھی صاحبہ (اہلیہ مولانا سید طلحہ صاحب) نے لاہور میں سنی تو والدہ صاحبہ کو لکھا کہ علی کو (اس کامیابی اور انعام کی خوشی میں) لاہور بھیج دیجئے، والدہ صاحبہ اور بھائی صاحب نے منظور فرمالیا، اور میں مئی کی کسی آخری تاریخ یا جون ۱۹۲۹ء میں اپنے ایک بزرگ عزیز مولوی سید ابراہیم صاحب ندوی ایم۔ اے کی معیت میں جو دارالترجمہ حیدرآباد میں کام کرتے تھے، لاہور روانہ ہوا، لاہور اس وقت برّصغیر کا سب سے بڑا ثقافتی، ادبی اور صحافتی مرکز تھا، اردو کے درجنوں اخبار و رسائل نکلتے تھے، "زمیندار" کا توطوطی بولتا تھا، "نیرنگ خیال" "ہمایوں" وغیرہ موقر ادبی رسائل بھی نکلتے تھے، سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ شاعرِ مشرق حکیم اسلام ڈاکٹر محمد اقبال کا شہر تھا۔

یہ میرا پہلا دُور کا سفر تھا، وہ مسرت وابتہاج ابھی تک نہیں بھولا، جو روانگی کے دن دل میں موجزن تھی، یہ سفر میری زندگی میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے، مولانا

سید طلحہ صاحب نے مجھے ہر طبقہ کے اہل کمال سے ملایا، اس وقت میری عمر پندرہ یا سولہ سال کی تھی، انھوں نے مجھے جہاں علامہ اقبال سے ملایا، اور لاہور کی مشہور علمی شخصیتوں سے میرا تعارف کرایا، وہاں رستم زماں گاما پہلوان سے بھی ملایا، اسی سفر میں پہلی مرتبہ حفیظ جالندھری کے ساتھ مجلس اور کھانے میں شرکت کی، اور انھوں نے میری فرمائش پر بعض نظمیں سنائیں، مشاہیر علم و ادب میں حافظ محمود خاں شیرانی (والد اختر شیرانی و مصنف "پنجاب میں اردو") علامہ تاجور نجیب آبادی، پروفیسر شاداں بلگرامی، خواجہ دل محمد، پروفیسر عبدالباسط، خواجہ سلیم، عبدالرحمن چغتائی، میر سید ممتاز علی کے نام یاد آتے ہیں۔

اس وقت لاہور کے ادبی حلقوں میں "گل رعنا" کا جو چند سال پہلے شائع ہوئی تھی، بہت چرچا تھا، اکثر جگہ میرا تعارف مصنف "گل رعنا" کے فرزند کی حیثیت سے کیا جاتا تھا، اور کہیں ان الفاظ میں کہ یہ بچہ بے تکلف عربی لکھتا بولتا ہے، علامہ اقبال کے یہاں مجھے یہ کہہ کر پیش کیا گیا کہ یہ مصنف "گل رعنا" کے فرزند ہیں، اور انھوں نے آپ کی بعض نظموں کا عربی نثر میں ترجمہ کیا ہے[1]، مولانا طلحہ صاحب نو وارد عزیزوں کو مشاہیر سے ملانے اور تاریخی اور قابل دید مقامات کی سیر کرانے میں بڑے فیاض و فراخ دل اور مستعد تھے، اس کے لئے اکثر خود وقت نکالتے، اور اپنی وسیع معلومات سے اس سیر و سیاحت میں چار چاند لگا دیتے، میں نے اس سفر میں ان کی بدولت جو کچھ سیکھا اور دیکھا اس سے اپنی پوری زندگی میں فائدہ اٹھایا، ان کا احسان کبھی نہیں بھول سکتا کہ وہی حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ سے تعارف و تعلق کا ذریعہ بنے، اور ان کی شفقتوں، اور خصوصی توجہات کی سعادت حاصل ہوئی، جس کا میری زندگی پر بہت گہرا اور دیرپا نقش ہے، اور اس بنیاد پر اگلے سال

[1] اس وقت میں نے اقبال کی نظم چاند کا ترجمہ کیا تھا، اور علامہ مرحوم نے اس کو ملاحظہ فرمایا تھا۔

ان کے درس میں شرکت کے لئے خصوصی طور پر سفر اختیار کیا، اور یہ تعلق یوماً فیوماً بڑھتا گیا۔[۱]

ایک صائب مشورہ

اسی سفر میں ایک روز مولانا سید طلحہ صاحب نے جو اورنٹیل کالج لاہور میں عربی کے استاد تھے، اپنے کالج کے پرنسپل مولوی محمد شفیع صاحب سے مجھ کو ملایا، جن کو وہ مسٹر شفیع کہتے تھے، اور بعد میں وہ خان بہادر پروفیسر ڈاکٹر مولوی محمد شفیع ایم۔ اے کینٹب ڈی، او، ایل، کے نام اور لقب سے مشہور ہوئے، اور پاکستان بن جانے کے بعد ان کو ستارۂ پاکستان کا اعزاز ملا، مولوی محمد شفیع صاحب ان فضلاء اور اساتذہ میں جو برطانوی یونیورسٹیوں سے عربی اور اسلامی علوم پڑھ کر آئے تھے، اور کالجوں اور یونیورسٹیوں میں درس و تدریس کا کام کر رہے تھے، امتیازی مقام رکھتے تھے، ان کی عربی کی استعداد بھی پختہ تھی، شاید اس میں ان کی مکتبی یا مدرسی تعلیم کو دخل ہو، لیکن ضابطہ اور نظام کے بڑے پابند اور اپنے حلقۂ رفقائے کار، اور ماتحت عملہ میں کسی قدر خشک، اور کھرّے مشہور تھے، پھوپھا صاحب نے ان سے کہا کہ اس بچہ کے عربی مضامین دیکھئے، اور اس کی تعلیم کے متعلق مشورہ دیجئے کہ یہ کون سی لائن اختیار کرے، مولوی صاحب نے کہا کہ اس طرح نہیں، آج رات کھانا آپ ساتھ کھائیں، میں اطمینان سے ان کی انشاء دیکھوں گا، اور رائے دوں گا، لوگوں کو تعجب ہوا کہ مولوی صاحب عام طور پر اتنے اخلاق نہیں برتتے۔

رات کو ان کے مکان پر ہم لوگ پہونچے، انھوں نے دلچسپی کے ساتھ میری تحریریں پڑھیں، اس کے بعد کہا کہ میری رائے یہ ہے کہ یہ عربی ہی کو اپنا موضوع بنائیں اور اسی میں

---

[۱] پرانے چراغ حصہ اول ص ۲۴۱ مضمون مولانا سید طلحہ حسنی ایم، اے مرحوم

ترقی کریں، صرف ضرورت بھر کی فرنچ سیکھ لیں کہ اس میں اسلامیات کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے، لیکن اصلاً عربی ہی سے اشتغال رکھیں، اور اسی میں کمال پیدا کریں، یہ مشورہ اکثر ماہرین تعلیم اور کالجوں، یونیورسٹیوں میں پڑھنے پڑھانے والوں کی رائے سے مختلف تھا، جو میرے لئے انگریزی تعلیم حاصل کرنے اور I.C.S کے لئے تیار ہونے کا مشورہ دیتے تھے، جس کی سارے ہندوستان میں دھاک بیٹھی ہوئی تھی، اور سب سے زیادہ اس کی ملازمت کو قابل احترام اور قابل رشک سمجھا جاتا تھا، بعد میں جب خدا نے مجھے اپنے اس علمی سفر کو جاری رکھنے، اور عربی زبان سے اشتغال کی توفیق عطا فرمائی، اور میں پاکستان بننے کے بعد پہلی مرتبہ لاہور گیا تو مولوی صاحب اس وقت پنجاب یونیورسٹی سے ریٹائر ہو کر اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے کام کے نگراں تھے، مجھ سے "نزہۃ الخواطر" کے سلسلہ میں کبھی کبھی خط و کتابت ہوئی تھی، اور وہ "سیرت سید احمد شہیدؒ" کے ذریعہ مجھ سے غائبانہ واقف تھے، میں ان سے خاص طور پر ملنے گیا، وہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور کے احاطہ میں انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے دفتر میں تشریف رکھتے تھے، میں نے ان سے اس مشورہ کا ذکر کیا، جس کو وہ بھول چکے تھے، قدرتاً وہ خوش ہوئے، اور الحمدللہ انھوں نے اپنے مشورہ کے صائب ہونے کی تصدیق کی۔

دارالعلوم کے درس حدیث میں

لاہور سے واپسی پر میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں شیخ الحدیث مولانا حیدر حسن خاں صاحب[1] ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ کے درس حدیث کا باقاعدہ طالب علم بن گیا، یہ مبارک سلسلہ

[1] مولانا کے حالات و کمالات کے لئے "پرانے چراغ" کے مضمون "شیخ الحدیث مولانا حیدر حسن خاں صاحب ٹونکی" (ص۱۸۳-۲۰۶) کا مطالعہ کیا جائے۔

جولائی ۱۹۲۹ء سے شروع ہوگیا، میں نے مولانا سے دارالعلوم میں صحیحین (بخاری و مسلم) اور ابوداؤد، ترمذی حرفاً حرفاً پڑھی، کچھ حصہ بیضاوی کا بھی علیحدہ سے پڑھا، اور کچھ سبق منطق کے بھی مولانا نے اپنے شوق سے پڑھائے، دو سال میں نے مولانا کے ساتھ ہی ان کے کمرہ میں جو دارالحدیث بھی تھا، شب و روز قیام کیا، ٹونک کے قدیم خاندانی تعلقات، پھر والد صاحب سے خصوصی تعلق (کہ دونوں ہم استاد، اور سہیل یمانی امام حدیث شیخ حسین بن محسن انصاری یمنی بھوپالی کے عزیز شاگرد تھے، اور والد صاحب ہی کی طلب و اصرار پر مولانا نے دارالعلوم کی خدمت تدریس قبول کی تھی) مجھ پر مربیانہ، بلکہ پدرانہ شفقت رکھتے تھے، کھانے پینے میں بھی ساتھ تھا، حساب کتاب بھی میرے پاس رہتا تھا، آنے جانے میں بھی معیت و ہم رکابی حاصل رہتی تھی، تدریس حدیث کا طرز خالص محدثانہ و محققانہ تھا، محدثین یمن کی خصوصیات کا حامل، اور شیخ حسین کے درس کا عکس، درس میں طالب علموں سے مراجعت، تحقیق، تلاش و جستجو کا پورا کام لیتے، ان کو محض سامع نہیں رہنے دیتے تھے، کتابوں میں سے حوالہ نکالنے، کتب رجال، اور جرح و تعدیل میں مواد تلاش کرنے اور مسئلہ لکھنے میں بھی شریک رکھتے، جس سے طلبہ کی نظر وسیع اور تجربہ عملی ہوتا، وہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کے مجاز تھے، نماز میں رقت و خشیت کا غلبہ ہوتا، اور آخر شب میں طویل نوافل اور طویل سجود کا معمول جس میں گریہ غالب ہوتا، زندگی کی سادگی، شاگردوں اور ساتھیوں کے ساتھ مساوات اور ہر کام میں شارکت ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی، جس میں افغانی نسل و خون کے علاوہ ٹونک کی معاشرت کو بھی بہت دخل تھا، میری حدیث کی تعلیم سر تا پا ان کی شفقت، اور مہارت فن کی رہین منت ہے، مولانا عام طور پر جن فضلاء کو حدیث کی سند عنایت فرماتے، اس کی کتابت اپنے کسی خوش خط شاگرد سے کرواتے اور دستخط فرما دیتے، میں نے بھی یہ خدمت انجام دی، لیکن مجھے سند عطا فرمانے کا

ارادہ کیا تو باوجود نقل و کتابت سے عدم مناسبت کے اور اس کے کہ لکھنے میں بہت دیر لگتی تھی، مجھے سند اپنے قلم سے لکھ کر (جس میں غالباً پورا دن لگ گیا) عنایت فرمائی، جو شفقت خاص اور عنایت خاص کی دلیل تھی، فالحمد للہ علی ذلک۔

اگرچہ دارالعلوم ندوۃ العلماء سے میرا تعلق خاندانی اور موروثی تھا، اور میرا دماغ، فکر و طرز فکر، اور ثقافت اسی کے سانچہ کی ڈھلی ہوئی ہے، لیکن میرا علمی استفادہ اور خوشہ چینی ۲۹-۱۹۲۸ء میں اس وقت شروع ہوئی جب میری فقہ کی تعلیم اس درسگاہ کے ایک قدیم تر اور مقبول و محبوب استاد مولانا شبلی صاحب جیراجپوری اعظمی کے یہاں شروع ہوئی، پھر اس میں تسلسل و استحکام اس وقت پیدا ہوا، جب میں مولانا حیدر حسن خاں صاحب کے حلقۂ درس میں باقاعدہ داخل ہوا، میرے اکثر ندوی دوست اور رفیق کار اسی دور کے رفیق اور مولانا کے درس کے ساتھی ہیں، مولانا مسعود عالم ندوی (جن کا تفصیلی ذکر بعد میں آئے گا) اور مولانا عبدالقدوس ہاشمی (حال مقیم کراچی) تو مجھ سے سینیر تھے، مسعود صاحب سے عربی مجلات، اور عربی ذوق کے ناتے تعارف ہوا، اور وہ یوماً فیوماً بڑھتا چلا گیا، یہاں تک کہ ہم دونوں قریب ترین دوست و رفیق، اور عزیز بھائی معلوم ہونے لگے، مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی، مولانا محمد ناظم صاحب ندوی (سابق مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء و شیخ جامعہ عباسیہ بھاولپور) مولانا محب اللہ صاحب ندوی ایم، اے علیگ (حال مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء) مولانا مصطفیٰ کریم M.Sc. مولوی حبیب احمد ندوی مرحوم، حافظ عبدالشکور صاحب سیوانی، مولوی بضاعت حسین مرحوم، مولوی ابو یوسف صاحب مرحوم مولوی مطلوب الرحمٰن نگرامی مرحوم، مولانا سید محمد عبدالغفار صاحب ندوی نگرامی حال استاد دارالعلوم، مولانا محمد اویس صاحب ندوی نگرامی مرحوم، مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب ندوی

مولوی سید رئیس احمد صاحب جعفری ندوی سید ابو بکر حسنی وغیرہ سب اسی دور کے ساتھی اور رفیق درس ہیں۔

خاندانی ذخیرۂ کتب سے واقفیت

ہمارے گھر میں کئی پشتوں سے ایک قیمتی ذخیرۂ کتب چلا آرہا تھا جس میں بعض اہم خاندانی مخطوطات، غیر مطبوعہ قلمی کتابیں، اور مشاہیر کے خطوط، سندات وفتاویٰ کا اتنا بڑا ذخیرہ تھا، جو کسی کے شخصی ذخیرۂ کتب (PRIVATE COLLECTION) میں مشکل سے ہوگا، ہمارے بزرگ اس ذخیرہ کو سینہ سے لگائے رہے، اور سیلابوں اور نقل مکانی میں اس کی حفاظت کرتے رہے، بھائی صاحب مرحوم کی بڑی خواہش اور تاکید تھی کہ میں اس کی دیکھ بھال کرتا رہوں، شاید ان کا مقصد یہ تھا کہ اس طرح مجھے اپنے خاندانی تبرکات، اور علمی مطبوعات ومخطوطات سے واقفیت حاصل ہوگی، اور میں ان کی قدر وحفاظت کر سکوں گا، میں اپنی نوعمری اور ادبی ذوق کی بناء پر پرانی قلمی کتابوں کی ورق گردانی، اوران کے مطالعہ سے گھبراتا تھا، بھائی صاحب مرحوم نے جب میرا تساہل دیکھا تو والدہ صاحبہ کو لکھا کہ وہ مجھے اس کی تاکید کریں، والدہ صاحبہ مرحومہ کا غالباً ۱۹۲۹ئ یا ۱۹۳۰ئ کا لکھا ہوا ایک طویل خط "ذکر خیر" میں درج کیا گیا ہے[1] اس کا ایک اقتباس یہاں پیش ہے:۔

"علی! ایک نصیحت اور کرتی ہوں، بشرطیکہ تم عمل کرو، اپنے بزرگوں کی کتابیں کام میں لاؤ، اور احتیاط لازم رکھو، جو کتاب نہ ہو، وہ عبدؔ[2] کی رائے سے خرید و، باقی وہ کتابیں کافی ہیں، اس میں تمہاری سعادت مندی ظاہر ہوگی، اور کتابیں برباد نہ ہوں گی اور بزرگوں کو خوشی ہوگی، اس سعادت مندی کی مجھے بے حد خواہش ہے کہ تم ان کتابوں کی

---

[1] ص ۵۱-۵۴ [2] بھائی صاحب کی عرفیت۔

خدمت کرو۔"

مثل مشہور ہے کہ "کوئلوں کی دلالی میں ہاتھ کالے" ان کتابوں کے اٹھانے رکھنے اور ورق گردانی سے میری واقفیت عامہ میں بھی اضافہ ہوا، اور خاندانی ذوق، اور اسلاف کی خدمات دینی و علمی سے بھی شناسائی ہوئی، مطبوعات میں تاریخ ہند و تراجم علماء، اور تذکرے وسوانح کا بڑا ذخیرہ تھا، اس لئے کہ والد صاحب کو "نزہۃ الخواطر" کی تالیف کے سلسلہ میں ان کی ضرورت پڑتی رہتی تھی، اور جو لوگ ان کی اس مشغولیت سے واقف تھے، وہ ایسی کتابیں ان کو بھیجتے رہتے تھے، جن سے ان کے اسلاف کا تذکرہ محفوظ اور کتاب میں شامل ہو جائے، ان کتابوں پر سرسری نظر ڈالنے سے بھی مجھے بہت نفع ہوا، اور ہندوستان کی اسلامی و دینی تاریخ سے ذوق و شغف پیدا ہو گیا، جو بعد میں بہت کام آیا۔

زندگی کا ایک موڑ

۱۹۳۰ء تھا، اور رمضان کا زمانہ، میں تعطیل میں رائے بریلی آیا ہوا تھا، اور پورے انہماک کے ساتھ حدیث کے مطالعہ میں مشغول رہنا چاہتا تھا کہ میرے بڑے بھانجے سید محمود حسن (ولد سید رشید احمد صاحب مرحوم، و برادر اکبر عزیزان محمد ثانی و محمد رابع و واضح سلمہا) کے گردے یا مثانہ میں شدید تکلیف ہوئی، بھائی صاحب نے ان کو مع ہمشیرہ صاحبہ لکھنؤ بلا لیا، اور کنگ جارج میڈیکل کالج کے یورپین وارڈ میں داخلہ کرا کے آپریشن کا انتظام کیا، یہ میجر آپریشن تھا، جو کالج کے سرجری کے پروفیسر، اور لکھنؤ کے مشہور سرجن ڈاکٹر بھاٹیہ نے کامیابی کے ساتھ کیا، کم سن مریض کے ساتھ جس کی عمر نو ۹ سال کی تھی، مجھے اور ہمارے ایک عزیز برادر محترم معین الدہر صاحب کو رکھا گیا، رات کو مریض کے پاس ہی رہنا ہوتا تھا،

عزیز موصوف سب سے زیادہ مجھ سے مانوس تھا، اس لئے مجھی کو آواز دیتا، اور تکلیف کی شکایت کرتا، بعض اوقات رات کا بڑا حصہ جاگتے، اور نرسوں کو بلانے میں گزر جاتا، اسپتال کا سارا ماحول، انسان کی کمزوری، صحت کی بے وفائی، اور زندگی کی بے ثباتی کا منظر اور قوی دلائل پیش کرتا تھا، اس سے طبیعت میں جو ابھی تک صرف لکھنے پڑھنے اور ادبیات سے مانوس تھی، ایک تغیر پیدا ہوا، جس کو انابت سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے، اس قیام نے جو ایک طرح کا مجاہدہ بھی تھا، ایک خانقاہی ماحول، اور بزرگوں کی صحبت کا کام دیا، طبیعت میں اپنی اصلاح و ترقی، اور تعلق باللہ کا ایک ہلکا سا شعور پیدا ہوا، اسی حالت میں عید آئی جو بڑی مسافرانہ حالت میں گزری، ان سب حالات نے قلب و دماغ پر گہرا اثر ڈالا، عزیز موصوف الحمدللہ صحت یاب ہو کر تو نکلے ہی اسپتال خود تیماردار کے لئے ایک چھوٹا سا دارالشفا بن گیا۔

والدہ صاحبہ کی آنکھ کے موتیا بند (CATARACT) کے آپریشن کے سلسلہ میں بھی دو مرتبہ اسپتال کے پرائیویٹ وارڈ میں کئی کئی ہفتے رہنے کی نوبت آئی اس سے ان کی خدمت کا موقعہ بھی ملا، اور اسپتال کی فضا سے وہ فائدہ بھی پہونچا جس کا اوپر ذکر ہوا۔

علامہ تقی الدین ہلالی کی آمد

اسی زمانہ کا ایک اہم، بلکہ تاریخ ساز واقعہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں عربی زبان و ادب کے محقق عالم، علم آموز اور ذوق آفریں استاد علامہ تقی الدین ہلالی مراکشی کی آمد ہے، علامہ موصوف عربی زبان کے ان گنے چنے اساتذہ اور فضلاء میں ہیں، جو سند کا درجہ رکھتے ہیں، ان کے اس امتیاز کے لئے اتنی شہادت کافی ہے، کہ جب علامہ سید رشید رضا مدیر "المنار" اور

علامہ امیر شکیب ارسلان مصنف "حاضر العالم الإسلامی" کا نحو و عربیت کے کسی مسئلہ میں اختلاف ہوتا تو دونوں ہلالی صاحب کو حَکَم (ثالث) بناتے[1]، ہلالی صاحب اس زمانہ میں ملک عبدالعزیز ابن سعود والئ حجاز سے کسی بات پر اختلاف ہو جانے کی بناء پر اپنے دوست مولانا عبدالمجید حریری کے پاس مدن پورہ بنارس میں مقیم تھے، شیخ خلیل عرب صاحب ان کے علم و فضل سے واقف تھے، انھوں نے بھائی صاحب اور مولانا سید سلیمان ندوی سے ان کا تعارف کرایا، اور ان کو دارالعلوم بلانے کا مشورہ دیا، بھائی صاحب اور سید صاحب نے اس سے کُلّی اتفاق کیا، دارالعلوم میں اس سے پہلے متعدد عرب فضلاء نے تدریس کی خدمت انجام دی ہے، مثلاً علامہ محمد طیّب مکّی رام پوری، شیخ محمد ابن حسین یمنی بھوپالی، انھوں نے شیخ کو لکھنؤ آنے کی دعوت دی، وہ تشریف لے آئے، میں جمعہ کے دن اپنی مسجد نوازی میں نماز پڑھنے گیا تو دیکھا کہ وہ برجستہ جمعہ کا خطبہ دے رہے ہیں، ان کا قیام ہمارے استاد ہی کے یہاں تھا، میں مولانا سید طلحہ صاحب کی معیت میں حاضر ہوا، وہ عربی کیا بولتے تھے، منہ سے پھول جھڑتے تھے، "الأغانی" (ابو الفرج الاصفہانی) "الامامۃ والسیاسۃ" (ابن قتیبہ دینوری) کی زبان بولتے ہوئے انھیں کو سنا، مولانا سید طلحہ صاحب، اور مولانا عبدالرحمٰن کاشغری (جو دارالعلوم میں ادب کے استاد اعلیٰ تھے) ان سے لغت کی تحقیق، نحو کے بعض مسائل، اور بعض الفاظ کے معنی پوچھتے، اور وہ جس چیز کی ان کو تحقیق نہ ہوتی صاف کہہ دیتے کہ "لا أدری"، ان کو دارالعلوم میں جانا، اور رجسٹر پر دستخط کرنا تھا، مجھے ان کے رفیق و خادم کی حیثیت سے جانا پڑا، اور انھوں نے باقاعدہ تدریس کا چارج لے لیا[2]، اور گویا دارالعلوم،

---

[1] ملاحظہ ہو امیر شکیب ارسلان کی کتاب السید رشید رضا أو إخاء اربعین سنۃ۔

[2] ہلالی صاحب کا تقرر ۱۴ ستمبر ۱۹۳۰ء کی ابتدا سے ایک سو پچیس (۱۲۵) روپے ماہوار کے مشاہرہ پر ہوا تھا۔

اوراس کے حلقۂ فضلاء میں عربی کی بہار آگئی،حقیقتاً شیخ خلیل عرب صاحب نے جو کام شروع کرایا تھا، اور ہندوستان میں عربی زبان و ادب کی تعلیم کے صحیح طریقے، اوراس کا صحیح ذوق پیدا کرنے کا جو دور شروع کیا تھا، ہلالی صاحب کے ہاتھوں اس کی تکمیل ہوئی، میں نے بے ضابطہ طریقہ پر توان سے بہت استفادہ کیا، روزانہ ان کی خدمت میں حاضری دیتا، اوران کی صحبتوں مجلسوں سے فائدہ اٹھاتا، لیکن باقاعدہ طریقہ پر دیوان نابغہ ان سے پڑھا، اوران کے افادات نوٹ کئے، "شرح شذور الذہب" کی ایک جماعت میں بھی جس کو وہ اپنے گھر میں پڑھاتے تھے، شریک ہوا، ان کی ایک تصنیف کردہ ناتمام تفسیر بھی ان سے پڑھی، بھائی صاحب اور عرب صاحب کے تعلق کی وجہ سے وہ مجھ پر خاص شفقت فرماتے تھے، اور استفادہ کا موقعہ دیتے تھے، مولانا مسعود عالم صاحب ندوی، مولانا محمد ناظم صاحب ندوی نے ان سے خاص طور پر فائدہ اٹھایا، اوران کے ممتاز شاگردوں میں ہوئے۔[1]

۱۹۳۱ء کے آخر میں انھوں نے بنارس، اعظم گڑھ، اور مئو و مبارک پور کا ایک سفر کیا، جس کا مقصد ان مقامات کے فضلاء اور احباب سے ملنا تھا، اپنی معیت وہم رکابی کے لئے انھوں نے میرا انتخاب کیا، اور میں نے اس سفر سے (جس میں شب و روز ان کی صحبت رہتی تھی) بہت فائدہ اٹھایا، اسی سفر میں دارالمصنفین اعظم گڑھ میں سید صاحب کی ایک مجلس میں دارالعلوم ندوۃ العلماء سے ایک عربی رسالہ "الضیاء" کے اجراء کا مشورہ ہوا، جس کے سرپرست و نگراں سید صاحب اور ہلالی صاحب مقرر ہوئے، اور ایڈیٹر ہمارے محترم دوست

---

[1] ہلالی صاحب سے فائدہ اٹھانے والوں میں برادر عزیز سید احمد الحسنی (حال مقیم لاہور) کا بھی بڑا حصہ تھا، وہ اپنی کم سنی کی وجہ سے ہلالی صاحب کے گھر میں آتے جاتے تھے، اور کاموں میں ان کی مدد کرتے تھے، اس لئے عربی بول چال میں بے تکلفی اور طلاقت، اور عربی لہجہ میں ان کو امتیاز حاصل ہو گیا۔

مولانا مسعود عالم صاحب ندوی۔

محرم ۱۳۵۱ھ (مئی ۱۹۳۲ء) سے اس رسالہ کا اجراء ہوا، جس سے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے تعارف وشہرت کے علاوہ عربی کے اچھے مضمون نگاروں کی ایک ٹیم تیار ہوگئی، اور ہندوستان میں عربی صحافت کا اصلی دور شروع ہوا" الضیاء" تو تین سال جاری رہ کر بند ہوگیا، لیکن اسی کے تخم تھے کہ بعد میں" البعث الاسلامی"" الرائد" رسالے دارالعلوم سے اپنے اپنے وقت میں نکلے اور کامیاب ومقبول ہوئے۔

بھائی صاحب کی تعلیم وتربیت کے خاص انداز، اور میری عربی مضمون نگاری وانشاء

اللہ تعالیٰ نے بھائی صاحب کو تعلیم وتربیت کا فطری اور خداداد ملکہ عطا فرمایا تھا، اور اس میں وہ نئے نئے طریقے اختیار کرتے تھے، وہ چاہتے تھے کہ میرا حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی ذات اور ان کی سیرت ودعوت سے گہرا تعلق پیدا ہو کہ ہمارے اجداد انھیں کے سلسلہ کے حلقہ بگوش اور اس میں صاحب اجازت تھے، اور ہماری جدّی شاخ کا ان سے بہت گہرا ربط تھا، اسی زمانہ میں رسالہ "توحید" میں جو مولانا سید محمد داؤد صاحب غزنوی کی ادارت میں امرتسر سے نکلتا تھا، مولوی محی الدین صاحب قصوری کا ایک سلسلۂ مضامین "ہندوستان کا مجاہد اعظم" یا" مجدد اعظم" کے نام سے نکلا تھا جس میں پہلی مرتبہ حضرت سید صاحب کی حیات ودعوت کو سلیقہ اور نئے اسلوب کے ساتھ پیش کیا گیا تھا، یہ پرچہ عم محترم مولوی سید خلیل الدین صاحب کے یہاں آتا تھا، بھائی صاحب نے مجھے اس کے عربی ترجمہ کی ہدایت کی، اور مشورہ دیا کہ پہلے میں تاریخ وسیر کی مستند اور سلیس کتابیں دیکھ لوں، اور ان کی خاص خاص تعبیرات اور مطالب کے طریق ادا جس کی تاریخ اور سوانح میں ضرورت پڑتی ہے، نوٹ کر لوں، میں نے اس غرض

کے لئے ابن الاثیر کی "الکامل" دیکھی، اور خاص خاص الفاظ و محاورے نوٹ کرتا گیا، اس کے بعد مجھے ترجمہ میں بڑی آسانی ہوئی۔

میں نے اس کا ترجمہ تیار کر لیا تھا کہ اسی زمانہ میں شیخ تقی الدین ہلالی تشریف لے آئے، میں نے ان کو دکھایا، انھوں نے برائے نام تصحیح کی، اور مجھ سے کہا کہ اگر تم چاہو تو میں تمہارا یہ مقالہ علامہ سید رشید رضا کو "المنار" میں اشاعت کے لئے بھیج دوں، لیکن یاد رکھنا کہ ان کی نظر بڑی خوردہ گیر ہے، اور ان کے یہاں صحت کا معیار بہت بلند، اچھے اچھے لکھنے والوں کی تحریروں میں وہ سقم نکالتے ہیں، میں نے بخوشی اس کو منظور کیا، اور انھوں نے اپنے ایک تعارفی خط کے ساتھ علامہ موصوف کو میرا مقالہ بھیج دیا، انھوں نے نہ صرف اس کو شائع کیا، بلکہ لکھا کہ اگر صاحب مقالہ چاہیں تو میں اس کو الگ رسالہ کی شکل میں بھی طبع کر سکتا ہوں۔ ع

کلاہ گوشۂ دہقاں بآفتاب رسید

اس سے بڑھ کر ایک ہندی نوعمر طالب علم کا کیا اعزاز ہو سکتا تھا کہ اس کا رسالہ علامہ سید رشید رضا مصر سے شائع کریں، تھوڑے عرصہ میں "ترجمۃ الامام السید احمد بن عرفان الشہید" کے عنوان سے وہ رسالہ چھپ کر آگیا، اور میری خوشی کی کوئی حد نہ رہی، میری عمر اس وقت ۱۶ سال کی رہی ہوگی، یہ میری پہلی تصنیف ہے، جو نہ صرف ہندوستان بلکہ مصر سے شائع ہوئی۔[1]

جب بھائی صاحب کی علمی و ذہنی تربیت کا ذکر آگیا ہے تو یہ لطیفہ بھی سنتے چلئے کہ غالباً ۲۷ء یا ۲۸ء میں انھوں نے مجھے مکہ سے نکلنے والے عربی اخبار "أم القرى" کا ایک شمارہ دیا، ملک عبدالعزیز ابن سعود کی نئی نئی حکومت حجاز میں قائم ہوئی تھی، اس شمارے میں باہر سے آنے والے حجاج کے لئے ہدایتیں تھیں کہ وہ اس طرح کے انجکشن اور ٹیکے لے کر آئیں،

[1] مضمون جمادی الآخرہ ۱۳۴۶ھ (سنہ ۱۹۳۰ء) میں تیار ہو گیا تھا، رسالہ کی شکل میں مصر میں ۱۳۵۰ھ میں شائع ہوا۔

اوران باتوں کا لحاظ رکھیں، بھائی صاحب نے یہ مضمون دیا کہ اس کا ترجمہ کرکے "زمیندار" میں بھجوا دو، میں نے آسانی سے ترجمہ کرلیا، اور وہ "زمیندار" میں ابوالحسن علی پسر مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب سابق ناظم ندوۃ العلماء کے نام سے شائع ہوا، اسی زمانہ میں برادرم مولوی ابوبکر صاحب کے ساتھ پنجاب میل سے (جو بہت پرانی گاڑی ہے اور اب امرتسر میل کہلاتی ہے) رائے بریلی سے لکھنؤ جارہا تھا، عمر ۱۳ سال کی ہوگئی ہوگی، راستہ میں ایک ٹی، ٹی، آئی نے (اس وقت کرو سسٹم نیا نیا رائج ہوا تھا) ہمارا ٹکٹ چیک کیا، ٹکٹ آدھے تھے، ٹی، ٹی، آئی صاحب نے عمر معلوم کرنے پر کہا کہ آپ کو اب پورا ٹکٹ لینا چاہئے تھا، لائیے اتنی پنالٹی دیجئے، اور اتنا فرق، میں نے کہا میں ذرا مشورہ کرلوں، اتنے میں میں نے "زمیندار" کا پرچہ نکالا، مسافر بیکار بیٹھے ہوتے ہیں، پرچہ نے گشت کرنا شروع کیا، یہاں تک ٹی، ٹی، آئی صاحب کی بھی باری آئی، وہ اخبار دیکھ رہے تھے کہ میں ان کے پاس گیا، اور میں نے اپنے مضمون کی طرف متوجہ کرکے کہا کہ یہ مضمون میرا ہے، اتفاق سے وہ مسلمان تھے اور وردی کی وجہ سے اندازہ نہیں ہورہا تھا، انھوں نے کہا کہ کیا تم مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب کے بیٹے ہو؟ میں نے اثبات میں جواب دیا، انھوں نے کہا کہ میں ندوہ کا پرانا طالب علم ہوں، وہ میرے زمانہ میں ندوہ کے ناظم تھے، جاؤ تم سے کچھ نہیں لوں گا، اس طرح اپنے اس مضمون کی برکت، اور تھوڑی سی زیرکی سے ہم دونوں جرمانہ سے بچ گئے۔

انگریزی تعلیم کا انہماک اور والدہ صاحبہ کی فکر و پریشانی

میری انگریزی تعلیم کا سلسلہ عربی کے ساتھ آہستہ آہستہ جاری تھا، ہمارے ہی محلہ میں خلیل الدین صاحب ہنسوی رہتے تھے، جن کے ہمارے ہنسوہ کے عزیزوں سے اور بھائی صاحب سے

برادرانہ تعلقات تھے، وہ اگرچہ ڈاک خانہ (DEAD LETTER OFFICE) میں ملازم تھے لیکن پرانے زمانہ میں تعلیم پانے کی وجہ سے ان کی انگریزی بڑی اچھی تھی، اور پڑھانے کا ملکہ تھا، انھوں نے انگریزی پڑھانے کے لئے وقت دیا تھا، رائے بریلی جاتا تھا، تو اپنے بڑے ماموں سید احمد سعید صاحب سے انگریزی پڑھتا تھا، جنھوں نے انگریزوں سے انگریزی پڑھی تھی، اور انگریزی محاورات اور روزمرہ پر ان کو بڑی قدرت تھی، جب دارالعلوم میں قیام رہنے لگا تو وہاں کے انگریزی کے مشّاق استاد ماسٹر محمد سمیع صدیقی صاحب (ایم، اے، ایل، ٹی) سے انگریزی کا سلسلہ جاری رکھا، بعد میں ۱۹۲۹ء میں محمد الفاروقی صاحب ایم، اے، ایل ایل بی کے پاس پڑھنے کے لئے جانے لگا، جو لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے استاد تھے، اور بعد میں سیتاپور گورنمنٹ اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہوگئے تھے، فاضل ادب پاس کرلینے کے بعد میٹرک پاس کرنے کا خیال پیدا ہوا، جو اس وقت کے ماحول اور فضا کے تقاضوں کے بالکل مطابق تھا، انگریزی زبان اور تعلیم کا اقبال اپنے عروج پر تھا، ابھی چند دن پہلے ہمارے خاندان کے ایک اور عزیز حافظ سید اسحاق حسنی جن کا I.C.S. (انڈین سول سروس) میں انتخاب ہوگیا تھا، اس شعبہ کی تربیت حاصل کرکے لندن سے آئے تھے، اور ہمارے خاندان میں اس کی دھوم مچی ہوئی تھی، میرے اور برادرم ابوبکر کے علاوہ (جو فاضل ادب کے بعد اب ایک انگریزی اسکول میں داخل ہوگئے تھے) خاندان کے سب لڑکے انگریزی ہی تعلیم حاصل کررہے تھے، عرب صاحب بھی اس کی ضرورت اور افادیت کے قائل تھے، اور چاہتے تھے کہ عربی داں نوجوان انگریزی پڑھیں، اور اس کے ذریعہ سے دین کی خدمت اور تبلیغ کریں۔

یہی زمانہ تھا، جب مجھ پر انگریزی پڑھنے کا دورہ پڑا، اور اس کا بخار چڑھا، میں نے میٹرک کے کورس کی کتابیں خریدلیں، ریاضی محلہ کے ایک استاد سے پڑھنی شروع کی، انگریزی

فاروقی صاحب کے یہاں پڑھنے جاتا تھا، جب وہ لکھنؤ سے منتقل ہوگئے تو میں نے بطور خود مطالعہ کرنا شروع کیا، اور اپنے شوق سے انٹرمیڈیٹ کے معیار کی کتابیں (جواب شاید بی اے کے معیار کی ہوں گی) ڈکشنری سے حل کر کے مطالعہ کرنے لگا، ابھی امتحان میں بیٹھنے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ والدہ صاحبہ کو (غالباً بھائی صاحب کے ذریعہ) میرے اس انہماک کا علم ہوا، انھوں نے مجھے بڑے مؤثر اور درد مندانہ خط لکھے جن کے کچھ نمونے میں نے ان کے تذکرہ "ذکر خیر" میں "چند تربیتی خطوط" کے عنوان سے دیئے ہیں[1] صرف ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

"علی! تم کسی کے کہنے میں نہ آؤ، اگر خدا کی رضامندی حاصل کرنا چاہتے ہو، اور میرے حقوق ادا کرنا چاہتے ہو، تو ان مردوں پر نظر کرو جنھوں نے علم دین حاصل کرنے میں عمر گزار دی، ان کے مرتبے کیا تھے، شاہ ولی اللہ صاحب، شاہ عبدالعزیز صاحب، شاہ عبدالقادر صاحب، مولوی محمد ابراہیم صاحب[2]، اور تمہارے بزرگوں میں خواجہ احمد صاحب[3] اور مولوی محمد امین صاحب[4]، جن کی زندگی اور موت اس وقت قابلِ رشک ہوئی، کس شان و شوکت کے ساتھ دنیا برتی، اور کیسی کیسی خوبیوں کے ساتھ رحلت فرمائی، یہ مرتبے کیسے حاصل ہو سکتے ہیں، انگریزی مرتبے والے تمہارے خاندان میں بہت ہیں، اور ہوں گے، مگر اس مرتبہ کا کوئی نہیں، ...... علی! اگر میرے سو اولادیں ہوتیں تو میں یہی تعلیم دیتی، اب تم ہی ہو، اللہ تعالیٰ میری خوش نیتی کا

---

[1] ص ۱۵۱-۵۴ [2] اس سے مراد مولانا ابو محمد ابراہیم صاحب آروی، مشہور اہل حدیث عالم ہیں، جو ہمارے نانا سید شاہ ضیاء النبی صاحب کے مرید، اور بڑے ربانی، حقانی عالم تھے

[3] مولانا سید خواجہ احمد صاحب نصیر آبادی (ملاحظہ ہو راقم کی کتاب "کاروان ایمان و عزیمت")

[4] مولانا سید محمد امین صاحب نصیر آبادی اپنے جوار اور عہد کے مشہور شیخ و مصلح (وفات ۱۲۲۹ھ)

پھل دے کہ سنو کی خوبیاں تم سے حاصل ہوں، اور میں دارین میں سرخ رو اور نیک نام ہوں، اور صاحبِ اولاد کہلاؤں، آمین ثم آمین یارب العالمین"۔[1]

والدہ صاحبہ کی دعائے نیم شبی، اور آہ سحر گاہی کا اثر تھا، کہ میرا دل اچانک انگریزی کی مزید تعلیم سے اُچاٹ ہوگیا، اور میں نے کورس کی ساری کتابیں زبردستی لوگوں کے گلے لگائیں مگر اس غیر معتدل اور بحرانی مصروفیت کا یہ اثر ہوا کہ تھوڑے وقت میں میں نے انگریزی کی ضروری استعداد پیدا کرلی، اور میں اپنے علمی و تصنیفی کاموں میں، اور بعد میں انگلستان اور امریکہ کے سفر میں اس سے کام لے سکا، اس کے بعد شاید مجھے انگریزی پر محنت کرنے کا موقعہ نہ ملتا، انگریزی کی اتنی استعداد پیدا ہوگئی کہ میں ان کتابوں کا آسانی سے مطالعہ کرسکا جو اسلامیات کے موضوع پر اور تاریخ پر لکھی گئی ہیں، اور میں اس سے ابھی تک فائدہ اٹھا رہا ہوں۔

مولانا مدنی کا قیام

ہم اپنے گلی کے اس چھوٹے سے مکان میں چار برس کے قریب رہے، اسی عرصہ میں بھائی صاحب حج بیت اللہ کو گئے، اور بخیریت واپس آئے، اور میں نے عرب صاحب کے یہاں کی تعلیم ختم کی، بھائی صاحب کا مطب اب الحمد للہ اچھا چلنے لگا تھا، آمدنی میں بھی اضافہ تھا، اور خاندان کے افراد میں بھی، ہم لوگوں کی نظر اس قدیم مکان پر برابر رہی جس میں ہمارا بچپن اور بھائی صاحب کی جوانی گذری تھی، اور جس سے والد صاحب کی طویل سکونت کی وجہ سے ایک جذباتی تعلق تھا، اتفاق سے وہ خالی ہوا، اور بھائی صاحب نے اس کو کرایہ پر لے لیا۔

---

[1] ذکر خیر ص۵۳

اسی دوران میں بھائی صاحب نے حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی سے بیعت اور ارادت کا تعلق قائم کر لیا تھا، مولانا کو بھائی صاحب سے بہت جلد اتنا تعلق اور اعتماد پیدا ہو گیا، کہ لکھنؤ میں (جہاں مختلف سیاسی اجتماعات و تقریبات کی وجہ سے ان کا بکثرت تشریف لانا ہوتا تھا) ان کے مکان کو مستقل قیام گاہ بنا لیا، اس معمول اور وضعداری میں سخت سے سخت حالات میں بھی فرق نہیں آیا، اس سے پہلے ۱۹۲۸ء میں لکھنؤ کی آل پارٹیز کانفرنس میں مولانا کی زیارت ہوئی تھی، اب اس قیام کی وجہ سے جس کی نوبت جلد جلد آتی تھی، اور بعض مرتبہ کئی کئی دن قیام رہتا تھا، مولانا کو بہت قریب سے دیکھنے، اور گھر کا سب سے چھوٹا با شعور فرد ہونے کی وجہ سے خدمت کرنے کا موقعہ ملا، باطنی کمال، اور روحانی مرتبے کا ادراک نہ اس وقت تھا، نہ اب ہے، لیکن اتنا یاد ہے کہ مولانا کے آنے سے گھر میں ایک خاص رونق و برکت محسوس ہوتی تھی جس کو "نورانیت" سے تعبیر کر سکتے ہیں یہاں تک کہ سادے کھانے میں بھی (جس کے لئے مولانا کی بڑی تاکید تھی، اور اگر کوئی تکلف کی چیز پکتی تھی تو احتجاج فرماتے تھے) عجیب لذت و ذائقہ محسوس ہوتا تھا، مولانا بھی مجھ پر بہت شفقت فرمانے لگے تھے، اور جیسا کہ ایک مرتبہ بھابھی صاحبہ (والدۂ عزیزی سید محمد حسنی مرحوم) نے ذکر کیا، مولانا نے بھائی صاحب کو میرا خاص خیال رکھنے کی ہدایت فرمائی تھی، یہ پہلی دینی و روحانی شخصیت تھی جس سے میں متعارف اور متاثر ہوا، اور الحمد للہ بعد میں اس میں اضافہ ہی ہوا، اور وہ عقیدت و محبت ابھی تک قائم ہے، مجھے یاد ہے کہ یہ تاثر مولانا کی تقریروں یا دوسرے کمالات کی بنا پر نہیں تھا جن کا اندازہ اس وقت میرے لئے مشکل تھا، ان کی شخصیت میں ایسی کشش معلوم ہوتی، اور دل اس طرح کھنچتا کہ بے اختیار پاؤں پکڑ لینے، اور ہاتھوں کو بوسہ دینے کو جی چاہتا، بعد میں جب کچھ عرصہ تک تلمذ اور صحبت کا

شرف حاصل ہوا، تو اس میں مزید اضافہ اور استحکام پیدا ہوا۔

عربی اخبارات اور رسائل کا مطالعہ اور انشاء و تحریر کی مشق

بھائی صاحب عربی اخبارات و رسائل کے مطالعہ کے بڑے شائق تھے، شاید ہندوستان میں اس وقت چند ہی آدمی بلادِ عربیہ کے اخبارات سے واقف ہوں گے، اور ان کے مطالعہ کا اہتمام کرتے ہوں گے، جب سے وہ حج ۱۳۴۴ھ ۱۹۲۶ء سے آئے تھے، مکہ مکرمہ کا اخبار "أم القریٰ" ان کے نام جاری تھا، اس مکان میں منتقل ہونے کے بعد، انھوں نے ایک ندوی فاضل مولوی سید سعید اشرف صاحب سے جو لکھنؤ کے مشہور اردو اخبار "ہمدم" میں عربی سے اردو میں ترجمہ کا کام کرتے تھے، یہ طے کر لیا تھا کہ وہ عربی اخبارات پڑھنے اور ان سے کام لینے کے بعد ان کو پہونچا دیا کریں گے، مولوی سعید اشرف صاحب کے ذریعہ جو اخبارات بھائی صاحب کے پاس آتے تھے، ان میں دمشق سے نکلنے والا "فتی العرب" اور فلسطین سے نکلنے والا "الجامعة الإسلامية" یاد ہے، ان دونوں اخبارات کی عربی بڑی اچھی اور طاقتور ہوتی تھی، خاص طور پر "الجامعة الإسلامية" (جو مفتی امین الحسینی صاحب کا ترجمان تھا) کے افتتاحیے بڑے طاقتور، فصیح و بلیغ، اور آتشیں قلم کے لکھے ہوئے ہوتے تھے، اور "الہلال" کے مولانا آزاد کے قلم کے لکھے ہوئے افتتاحیوں کی یاد تازہ کرتے تھے، میں اگرچہ عربی ادب کی آخری کتابیں پڑھ چکا تھا، لیکن ان اخبارات کے سمجھنے میں مجھے دقّت پیش آتی تھی، اس میں بھائی صاحب نے مدد و رہنمائی فرمائی، وہ جدید تعبیرات و اصطلاحات کی تشریح فرماتے، اور میں رفتہ رفتہ ان کو بلا تکلف پڑھنے لگا، اور مجھے اس سے انشاء و تحریر میں بڑی مدد ملی کہ اخبارات میں تنوع بھی ہوتا ہے اور تکرار بھی، ان دونوں اخباروں کے

ایڈیٹر فصیح اللسان، صحیح التعبیر اور عربی پر بڑی قدرت رکھنے والے اہل قلم واخبار نویس تھے۔

اس وقت دارالعلوم کی جمعیۃ الاصلاح کے دارالمطالعہ میں "المنار" "الھلال" "المقتطف" "مجلۃ الزھراء" "المجمع العلمی" "العرفان" وغیرہ رسائل آتے تھے، مولانا مسعود عالم صاحب ندوی کی دوستی ورفاقت کی وجہ سے میں بھی ان کو بڑے شوق سے پڑھتا تھا، ہلالی صاحب آئے تو انھوں نے استاد محب الدین الخطیب کے ہفتہ وار رسالہ "الفتح" کا تعارف کرایا، اور اس کے منگوانے اور پڑھنے کی ترغیب دی، اس رسالہ میں اس وقت کے بلند پایہ اسلامی الفکر اہل قلم (امیر البیان امیر شکیب ارسلان وغیرہ) مضمون لکھتے تھے، اس رسالہ کے مطالعہ سے جو ادب عالی اور فکر اسلامی کا جامع تھا، ہم لوگوں کو بڑا فائدہ پہونچا، مسعود صاحب نے بھی اور میں نے بھی لکھنا شروع کیا، اکبر الہ آبادی مرحوم پر میرا طویل مضمون کئی قسطوں میں شائع ہوا، جس میں ان کے مغربیت اور انگریزی تعلیم پر تنقید کے اشعار کا ترجمہ اور اس کا پس منظر پیش کیا گیا تھا، اور بھی وقتاً فوقتاً مضمون نکلتے رہے، اس وقت تک ہمارا مطالعہ اور رجحان ایسے ادبی دائرہ میں محدود تھا جس میں اسلامی خیالات کی جھلک، اور دینی حمیت کی آمیزش تھی، لیکن قلم اور اسلوب کا رخ ابھی دعوت کی طرف نہیں ہوا تھا، نہ مطالعہ میں وسعت اور خیالات میں عمق پیدا ہوا تھا "الضیاء" نے اس ذوق اور تحریری مشق پر مہمیز کا کام کیا، اور اس سے قلم میں روانی، اور فکر میں جولانی پیدا ہوئی لیکن اس وقت بھی تحریر میں داعیانہ اور اقدامی عنصر پورے طور پر شامل نہیں ہوا تھا، یہ ۱۹۴۰ء کے بعد کی بات ہے، جس کا تفصیل سے تذکرہ آئے گا۔

"الضیاء" کے تبادلہ میں مصر وشام ولبنان اور عراق کے موقر ادبی واسلامی رسائل ومجلات، اور بعض مرتبہ بلند پایہ مصنفین کی کتابیں تبصرے کے لئے آتی تھیں، اور سب سے پہلے

مسعود صاحب اور میں اور رفیق عزیز و مکرم مولانا محمد ناظم صاحب ندوی ان کا مطالعہ کرتے تھے، ہلالی صاحب کی صحبت اور ان رسائل و مجلات کے مطالعہ اور نئی کتابوں کی وجہ سے مصر و شام کے ادباء، اہل قلم، اور صاحب اسلوب ادیب (جو ایک مخصوص دبستان کے مالک اور رہنما تھے) ہمارے لئے ایسی جانی بوجھی، اور دیکھی برتی شخصیتیں بن گئیں، جیسے ہندوستان کے ادیب و اہل قلم، ہماری مجلسوں میں ان پر تبصرہ بھی ہوتا، اور تنقید بھی، موازنہ بھی، اور محاکمہ بھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں جب ۱۹۵۱ء میں مصر گیا تو میرے لئے وہاں کوئی نئی دریافت، یا انکشاف کا معاملہ نہ تھا، اور نہ کسی کو دیکھ کر میری آنکھیں خیرہ، اور ذہن مرعوب ہوا، اور یہ اس ادبی اسلامی صاحب شعور ماحول کا فیض تھا جس کا حکمت الٰہی نے پہلے سے انتظام کر دیا تھا۔

لاہور اور دیوبند کا قیام

۱۹۳۰ء ۱۹۳۱ء کے درمیان میں دو مرتبہ لاہور حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ سے استفادہ کے لئے گیا، ۱۹۳۰ء میں جب گیا تو اتفاق سے وہ زمانہ ان کے منظّم درس (علماء کلاس کا جو شعبان سے شروع ہو کر ذی قعدہ تک رہتا تھا، اور جس میں مدارس عربیہ کے فضلاء شریک ہوتے تھے، اور باقاعدہ امتحان ہوتا تھا) کا زمانہ نہیں تھا، لیکن مولانا نے مجھے خصوصی وقت دیا، اور میں نے سورہ بقرہ کا ابتدائی حصہ پڑھا، اس درس میں میرے صرف ایک ساتھی برادر عزیز سید احمد الحسنی تھے، اگلے سال غالباً ۱۹۳۱ء میں میں "حجۃ اللہ البالغہ" کے درس میں شرکت کے لئے لاہور آیا، اس میں باقاعدہ شرکت کر کے امتحان دیا اور کامیاب ہوا[1]، اسی زمانہ میں میں نے مولانا سے

---

[1] تفصیل کے لئے "پرانے چراغ حصہ اول" صـ ۱۴۲-۱۴۴ ملاحظہ ہو۔

بیعت وارادت کا شوق ظاہر کیا، لیکن مولانا نے بجائے اپنے (از راہ تواضع و اخلاص جو ان کا نمایاں وصف تھا) مجھے ایک تعارفی خط دے کر اپنے شیخ[1] حضرت خلیفہ غلام محمد صاحب بہاول پوری کی خدمت میں دین پور (ضلع خان پور) بھیج دیا[2]، خط میں غالباً میرا خاندانی تعارف اور حضرت سید صاحب کا تذکرہ تھا، حضرت خلیفہ صاحب نے جن کی عمر اس وقت نوے سے اوپر تھی، اور پنجاب اور ہندوستان کے مشائخ اور اہلِ نظر کی نظر میں (جن میں حضرت تھانوی، مولانا مدنی، اور حضرت رائے پوری رحمہم اللہ سب شامل ہیں) بڑے عالی مرتبہ شیخ اور صاحبِ نسبت بزرگ تھے، اور مولانا مدنی کو بھی ان سے اجازت حاصل تھی (جس کا انھوں نے خود مجھ سے تذکرہ کیا) مجھے یاد نہیں کہ میں نے اپنے عرب و عجم کے سفر میں ان سے بڑھ کر کسی کا پُرنور چہرہ دیکھا ہو، حضرت خلیفہ صاحب نے مجھے از راہ عنایت و شفقت بیعت فرمالیا، اور کچھ ذکر قلبی بھی تلقین کیا[3]، یہ ۱۹۳۱ء کا واقعہ ہے، اگلے سال ۱۳۵۱ھ / ۱۹۳۲ء میں میں مولانا مدنی کی خدمت میں دیوبند حاضر ہوا۔

دیوبند کا قیام

۱۹۳۲ء میں مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی کسی تشریف آوری کے موقع پر بھائی صاحب نے (جن کو میری تربیت و اصلاح، اور دینی ترقی کا بڑا اہتمام رہتا تھا) مجھے مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ

---

[1] مولانا کی اصل بیعت سلسلۂ قادریہ راشدیہ کے جلیل القدر شیخ اور مجاہد بزرگ حضرت سید تاج محمود صاحب امروٹی سے تھی لیکن مولانا کا تعلق خلیفہ صاحب سے (جو ان کے شیخ کے پیر بھائی تھے) بالکل مرید و مسترشد کا تھا، وہ ان دونوں حضرات کا ذکر یکساں طریقہ پر اپنے شیخ و مرشد کی طرح کرتے تھے۔

[2] اس سلسلہ کے تعارف کے لئے ملاحظہ ہو "پرانے چراغ" حصہ اول، تذکرہ حضرت مولانا احمد علی صاحب ص ۱۴۶-۱۴۸

[3] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "پرانے چراغ" ص ۱۴۹-۱۵۰

کی خدمت میں خاص طور پر پیش کیا، میں نے کچھ اپنے حالات عرض کئے، مولانا نے بھائی صاحب کو مشورہ دیا کہ مجھے ان کے پاس دیوبند بھیج دیا جائے تعلیمی سال جو تمام مدارس عربیہ میں شوال سے شروع ہوتا ہے نصف سے زیادہ ہو چکا تھا، اور میرے بارے میں مولانا کا منشاء باقاعدہ طالب علم بننے کا تھا بھی نہیں، صرف کچھ دن ساتھ رہنے کا تھا، میں ربیع الاول یا ربیع الثانی ۱۳۵۱ھ (جولائی، اگست ۱۹۳۲ء) کو دیوبند حاضر ہوا، مولانا نے اپنے ہی پاس ٹھہرایا، اس وقت تعلیم اور درس حدیث اپنے نقطۂ عروج پر تھا، مولانا کے یہاں بخاری اور ترمذی ہوتی تھی، میں نے اس میں باقاعدہ شرکت شروع کر دی، بھائی صاحب کو جب اس کا علم ہوا تو انھوں نے مجھے ہدایت کی کہ اب جب میں طویل قیام کر رہا ہوں تو اپنے کھانے کا مطبخ میں باقاعدہ انتظام کر لوں، میں نے مولانا سے اس کی اجازت لی تو کسی قدر ناگواری اور مجبوری کے ساتھ اس کی اجازت دی لیکن فرمایا کہ ناشتہ ساتھ ہی ہوا کرے گا، میں مولانا کے دولت خانہ سے منتقل ہو کر دار الشفا کے کمرہ میں ٹھہر گیا، جو متصل ہی تھا۔

مولانا نے جاتے ہی مجھے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کا ایک رسالہ غالباً "تقریر دل پذیر" مطالعہ کے لئے دیا، نیز مولوی سید طفیل احمد صاحب منگلوری کی کتاب "حکومت خود اختیاری" پڑھنے کو دی، درس حدیث کے علاوہ جس سے مولانا کی قوت تدریس اور شان محدثیت کا اظہار ہوتا تھا، اور پوری فضا پر نورانیت اور سکینت کا سایہ معلوم ہوتا تھا میں نے مولانا سے قرآن مجید کی بعض مشکل آیات کے سمجھنے کے لئے خصوصی وقت مانگا، مولانا نے مجھے جمعہ جمعہ وقت دیا، جس میں مولانا کے اس وقت کے سیاسی دوروں کی وجہ سے اکثر ناغے ہو جاتے تھے، پھر بھی استفادہ کا موقع ملا، اور مولانا کے تدبر قرآن کا اندازہ ہوا۔

مولانا کا دسترخوان اس وقت بھی غالباً ہندوستان کا اگر وسیع ترین دسترخوان نہیں تو

چند وسیع ترین دستر خوانوں میں سے تھا، اور ع

بریں خوان یغما چہ دشمن چہ دوست!

کا نظارہ نظر آتا تھا، ہندوستان کے مختلف صوبوں سے علماء و زعماء بکثرت آتے تھے، جن میں ابوالمحاسن مولانا محمد سجاد صاحب بہاری خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جن کا کئی کئی روز قیام رہتا تھا، درس کی کیفیت یہ تھی، تعلیمی سال کے آخری مہینوں میں (تعلیمی اوقات کے علاوہ) بعد عصر بھی درس، بعد عشاء بھی درس، جو دیر رات تک جاری رہتا، بعد فجر بھی درس، اس درس کے ساتھیوں میں مولانا معراج الحق صاحب حال صدر مدرس دارالعلوم، اور مولانا سید صبغۃ اللہ صاحب بختیاری سے خاص روابط پیدا ہو گئے تھے، کھانا اپنے ایک ہم وطن حاجی محمد سعید صاحب نصیر آبادی کے ساتھ ہوتا تھا، جو قاری اصغر علی صاحب کی درسگاہ میں مقیم تھے، تاریخی معلومات کے لئے لکھتا ہوں کہ اس وقت کھانے کی فیس جس میں دونوں وقت گوشت ہوتا تھا، ۵؎ روپے ماہوار تھی، اتفاق سے مولوی حبیب اللہ صاحب فرزند حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری بھی اس وقت دارالعلوم کے طالب علم تھے، مولانا کے تعلق کی وجہ سے ان سے بھی خاص ربط تھا۔

دارالعلوم کے اس چار ماہ کے قیام میں (شعبان کے اوائل میں میں چلا آیا) میری دل بستگی کا سامان، اور میرے انس و عقیدت کا مرکز مولانا مدنی کی ذات تھی، اور اصل مناسبت انھیں سے تھی، مجھے یاد ہے کہ وہ صبح کبھی اپنے خاص لہجہ میں مجھ سے مخاطب ہوتے اور فرماتے "کہیے مولوی علی میاں صاحب! آج اخبار میں آپ نے کیا پڑھا؟" تو مجھے دن بھر اس کا مزہ آتا رہتا، اور دل مسرت سے معمور بلکہ مخمور رہتا، بقول شاعر ؎

بہر تسکین دل نے رکھ لی ہے غنیمت جان کر　　　جو بوقت ناز کچھ جنبش ترے ابرو میں تھی

میں نے کئی سال کے بعد (جب میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں خدمت تدریس پر مامور تھا) دیوبند سے نکلنے والے ایک عربی رسالہ میں ایک مضمون "صلتی بمولانا حسین أحمد المدنی، أو صفحۃ من صفحات حیاتی" کے عنوان سے لکھا تھا، جس میں اپنے قلبی تاثرات، اور علمی مشاہدات کا ذکر کیا تھا۔[1]

میرے دیوبند پہونچنے کے بعد ہی مولانا مدنی نے میرا مولانا اعزاز علی صاحب سے جن کی شخصیت مولانا کے بعد دارالعلوم میں سب سے محترم اور مرکزی شخصیت تھی، سے خصوصی تعارف کرا دیا، اس زمانہ میں مولانا کی توجہ اور تحقیق سے ملا علی قاری کی مشہور کتاب "شرح نقایہ" (جس کو مولانا "شرح وقایہ" پر ترجیح دیتے تھے) تازہ تازہ شائع ہوئی تھی، اور مولانا نے طلبہ کی ایک خصوصی جماعت کو خصوصی طور پر اس کے پڑھنے کے لئے وقت دیا تھا، از راہ شفقت مجھے بھی اس حلقہ میں شامل فرما لیا، اور مجھے اس درس سے بہت فائدہ ہوا، مولانا اس وقت سے مجھ پر بہت شفقت فرمانے لگے تھے، اور یہ شفقت آخر تک قائم رہی، جب میری کتاب "مختارات" چھپ کر ان کے پاس پہونچی تو بعض حاضرین مجلس سے بلند الفاظ میں جو نوعمر مصنف کے لئے سند اور شہادت کا درجہ رکھتے ہیں، اس کا تعارف اور تعریف فرمائی، مولانا ایک مثالی استاد تھے، جو طلبہ پر شفقت، کثرت درس و مطالعہ، پابندی اوقات، اور احترام و وقار میں علمائے سلف، اور اساتذۂ پیشین کا تقریباً آخری نمونہ تھے۔

اسی زمانۂ قیام دیوبند میں حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیری ایک مرتبہ ڈابھیل سے تشریف لائے، اور اپنے دولت خانہ (محلہ خانقاہ) میں قیام فرمایا، بھائی صاحب نے ہدایت کی تھی کہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوں، اور ان کا سلام پہونچاؤں، میں نے

---

[1] یہ مضمون رسالہ "البعث الاسلامی"......... میں بھی شائع ہوا ہے۔

سلام پہونچایا، تو انھوں نے پہچان لیا، اور خیریت وحالات دریافت کئے، غالباً دو تین بار ان کی عصر کی مجلس میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔

جب دار العلوم میں امتحانات کی تیاری شروع ہوئی، اور کتابیں ختم کے قریب پہونچیں تو میں دیوبند سے واپس آگیا، دیوبند ہی سے میں نے ارادہ کرلیا تھا کہ لاہور جاکر حضرت مولانا احمد علی صاحب سے ان کے درس تفسیر کی (جو اس وقت پورے ہندوستان میں اپنے طرز کا یکتا اور یگانہ درس تھا) تکمیل کروں گا۔

لاہور کا قیام اور حضرت مولانا احمد علی صاحب کے درس کی تکمیل

۱۳۵۱ھ کے شعبان کے آخر یا رمضان کے اوائل میں (۱۹۳۲ء کے غالباً دسمبر میں) میں نے لاہور کے لئے رخت سفر باندھا، اور مدرسہ قاسم العلوم کا باقاعدہ طالب علم بن گیا، اس درس میں جس میں پورا قرآن مجید پڑھایا جاتا تھا، صرف مدارس عربیہ کے فارغین یا منتہی طلبہ شریک ہوتے تھے، اور یہ علماء کلاس کہلاتی تھی، آخر شعبان سے شروع ہوکر وسط ذی قعدہ تک اس کا سلسلہ جاری رہتا، میں جب پہونچا ہوں تو اس درجہ میں پچاس کے قریب طلبہ تھے، جن میں اکثریت دار العلوم دیوبند کے فضلاء کی تھی، انھیں میں ہمارے درس حدیث کے ساتھی مولانا سید صبغۃ اللہ بختیاری بھی تھے، یہ درس بڑی محنت، اور قوی حافظہ کا طالب تھا، کہ ہر رکوع کا خلاصہ، اور اس کا ماخذ یاد کرنا پڑتا تھا، اور نیا درس شروع ہونے سے پہلے پچھلے درس کا امتحان ہوتا تھا، اور جس کی جس رکوع کی باری آجائے، اس کو اس کا خلاصہ مولانا سندھی کے مقرر کئے ہوئے لفظوں میں اور اس کا قرآنی ماخذ سنانا پڑتا تھا، میرا حافظہ خاندانی طور پر کمزور ہے، اس لئے مجھے بڑی محنت پڑی، پھر لاہور کی سردی،

اور میری جسمانی کمزوری' اور ہوسٹل کے بجائے گھر کے کھانے اور زندگی کی عادت' لاہور کا قیام اچھا خاصہ مجاہدہ تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے مدد فرمائی، اوائل ذی قعدہ ۱۳۵۱ھ، اور شروع مارچ ۱۹۳۳ء میں امتحان ہوا، مولانا کی دعوت پر خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی دہلی سے کاپیاں جانچنے کے لئے آئے' تقدیری بات کہ انھوں نے مجھے سب سے زیادہ نمبر دیئے جو غالباً ستر یا اس سے کچھ اوپر تھے' رفقاء نے جو سب مدارس کے فضلاء تھے' ایک احتجاجی جلسہ کیا' جس میں ممتحن صاحب پر نمبر دینے میں ناانصافی' اور جانبداری کا الزام لگایا، اس پر حضرت مولانا احمد علی صاحب نے خود کاپیوں کے دیکھنے کا اعلان کیا قسمت کی بات کہ جب انھوں نے کاپیاں دیکھیں تو سب شرکائے امتحان کے نمبروں میں تھوڑا تھوڑا اضافہ کیا، اور میرے نمبر بڑھا کر اٹھانوے ۹۸ کر دیئے، ۱۵ ذی قعدہ ۱۳۵۱ھ ۱۲ مارچ ۱۹۳۳ء کو مدرسہ قاسم العلوم میں جو ہم لوگوں کی قیام گاہ تھی' اور جو انجمن خدام الدین دروازہ شیرانوالہ لاہور کے زیر نگرانی و سرپرستی تھا، تقسیم اسناد کا جلسہ منعقد ہوا، مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ مولانا کی خاص دعوت پر تشریف لائے' اور اپنے دست مبارک سے وہ سند عطا فرمائی' جس کا عربی مضمون علامہ سید انور شاہ کشمیری کا ترتیب دیا ہوا ہے' آخر میں خود ان کے' مولانا مدنی کے' اور مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی' اور حضرت مولانا احمد علی صاحب امیر انجمن خدام الدین لاہور کے مبارک دستخط ہیں۔

لاہور کا دوبارہ قیام

۱۹۳۴ء کے غالباً اپریل کے مہینہ میں مولانا کی ہدایت و ایماء پر میں کچھ دن ان کی صحبت و تربیت میں رہنے' اور یکسوئی کے ساتھ ذکر و شغل کرنے کے لئے لاہور حاضر ہوا،

میری پھوپھی صاحبہ جو ماں کی طرح شفیق تھیں، اور عم محترم مولانا سید طلحہ صاحب وہیں ہیرا منڈی میں مقیم تھے، گویا میرا گھر ہی تھا، لیکن مولانا نے ہدایت فرمائی کہ میں شاہی مسجد کے کسی حجرہ میں علیحدہ رہوں، کھانا بھی گھر سے آجایا کرے، مطالعہ اور علمی اشتغال سے بھی حتی الامکان احتراز کروں، صرف حاجی عبدالواحد صاحب کو عربی کا ایک سبق پڑھا دینے کی اجازت تھی، جو مولانا ہی سے بیعت وارادت کا تعلق رکھتے تھے، فورٹ سنڈیمن (بلوچستان) میں ایک اچھے تعلیمی عہدہ پر تھے، کچھ ہی سال پہلے B.A کے امتحان میں وہ انگریزی زبان وادب میں پورے پنجاب میں فرسٹ آئے تھے، جبکہ امتحان میں انگریز اور انگلو انڈین بھی شریک ہوتے تھے، وہ بڑے بلند دینی عزائم اور جذبات رکھتے تھے ان کی تکمیل کے لئے وہ عربی اور دینی علوم کی تحصیل کے لئے جامع ازہر مصر جانا چاہتے تھے، مولانا نے ان کو مصر جانے کے بجائے دارالعلوم ندوۃ العلماء جانے کا مشورہ دیا، اتفاق سے میں انھیں دنوں میں مولانا کی طلبی پر لاہور آیا، تو مولانا نے ان کو میرے سپرد کر دیا، میں لاہور تقریباً تین مہینے رہا، وہاں سے جب آخر جون میں لکھنؤ آیا، تو گرمیوں کی تعطیل کے خاتمہ کے بعد (جو اس وقت دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ہوتی تھی) میرا دارالعلوم میں تدریس پر تقرر ہوگیا، اور اگست ۱۹۳۴ء سے میں نے کام شروع کر دیا۔

باب پنجم

دار العلوم ندوۃ العلماء سے باضابطہ تعلق اور تعلیم و تدریس کے دس سال

دار العلوم میں بحیثیت استاد و مدرس

۱۹۳۴ء میں میری عمر بیس سال کی ہو چکی تھی، باضابطہ و منظّم حصول تعلیم کی مدّت ختم ہو چکی تھی، اب مطالعہ و محنت کا زمانہ تھا جس کی کوئی انتہا نہیں، اور حقیقتاً منظّم تعلیم نصاب درس وغیرہ، مطالعہ، غور و تدبر، اور متقدمین کی محنتوں سے استفادہ اور گلستان علم کی خوشہ چینی کی صلاحیت ہی پیدا کرنے کے لئے ہے، وہ حقیقتاً دشت علم کی سیّاحی کے آغاز کا نام ہے، منزل نہیں ہے، اسی لئے بعض اہلِ نظر نصابِ درس کی تکمیل کرنے والے کے لئے "فارغ" کے لفظ کا استعمال بے محل اور غلط فہمی پیدا کرنے والا لفظ سمجھتے تھے۔

ایک خوددار انسان کی ضروریات (خصوصاً جب وہ شباب کی منزل میں قدم رکھ چکا ہو) کھانے، کپڑے، اور ضروریاتِ زندگی کی تکمیل تک محدود نہیں، اگرچہ بھائی صاحب کی برادرانہ نہیں بلکہ پدرانہ شفقت و خبر گیری، اور شفیق و جاں نثار ماں کی محبت سے (جن کو اپنے والد صاحب کے ترکہ میں تھوڑی سی زمینداری، اور ضلع فتحپور میں ایک مسلّم موضع بھی ملا تھا) زندگی کی بنیادی اور حقیقی ضرورتیں پوری ہو جاتی تھیں، لیکن ادھر دو تین سال سے اپنے

"برسرِکار" نہ ہونے اور باضابطہ اور آزاد وسیلۂ معاش نہ رکھنے کا احساس بڑھتا جارہا تھا، لوگوں کی زبانوں کو بھی بند نہیں کیا جاسکتا، اور اس میں کسی شریف خاندان اور بہتر سے بہتر ماحول کا استثناء نہیں، بعض اوقات طنزیہ جملے اور عزیزوں کی تنقیدیں بھی سننی پڑتی تھیں، مزید برآں ۴۔۵ مہینے کے بعد اسی سال سردیوں میں میری شادی بھی ہونے والی تھی، اس کے لئے بھی اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے، اور باعزت ذریعۂ معاش پیدا کرنے کی ضرورت تھی۔

۱۹۳۱ء کے آخر میں میں جب شیخ تقی الدین الہلالی کی ہم رکابی میں اعظم گڑھ گیا، اور کئی روز دارالمصنفین میں قیام رہا تو وہاں کی پرسکون اور علم پرور فضا دیکھ کر منہ میں پانی بھر آیا، اور شدت سے یہ تقاضا پیدا ہوا کہ بقیہ زندگی یہیں صرف کردوں، اور مولانا سید سلیمان ندوی کی سرپرستی و نگرانی میں مطالعہ اور تصنیف و تالیف کا کام کروں، اور کم سے کم معاوضہ پر بھی (جو میرے ذہن میں اس وقت کے معیار زندگی اور اشیاء کے نرخ کے مطابق بیس۲۰ پچیس۲۵ سے زیادہ نہ تھا) قناعت کروں، میں نے اپنی اس خواہش کا اظہار اپنے استاد ہلالی صاحب سے کیا جو میری عربی کی صلاحیت سے اچھی طرح واقف تھے، ہلالی صاحب نے غالباً سید صاحب سے ذکر کیا، انھوں نے سید صاحب کے اس خواہش پر ردّعمل اور جواب کا حوالہ تو نہیں دیا، لیکن انھوں نے مجھ سے کہا کہ "تمہارے لئے دارالعلوم زیادہ موزوں جگہ ہے" اس سے میں سمجھا کہ سید صاحب نے معذرت فرمادی، اور یہ بات قرینِ قیاس بھی تھی کہ اس وقت تک میری کسی قابلِ ذکر تحریری اور تصنیفی صلاحیت کا اظہار نہیں ہوا تھا، اور دارالمصنفین ایک بلند پایہ تصنیفی اور تحقیقی ادارہ تھا، لیکن حقیقت میں اس میں حکمت الٰہی تھی۔

ع کہ خواجہ خود روشِ بندہ پروری داند

مجھے اگر دار المصنفین میں قبول کر لیا جاتا تو میری زندگی کا سانچہ کچھ اور ہوتا، اور میری تمام سرگرمیاں، اور ٹوٹی پھوٹی صلاحیتیں تصنیف و تالیف ہی کے دائرہ میں محدود رہتیں۔

ہمارے دار المصنفین ہی کے چند روزہ قیام کے دوران سید صاحب کو ندوہ سے ایک عربی رسالہ کے اجرا کا خیال آیا جس کا میدان پورے ہندوستان میں خالی تھا، اس کی ادارت کے لئے قرعۂ فال قدرتی طور پر ہمارے فاضل و لائق دوست مولانا مسعود عالم صاحب ندوی کے نام پڑا کہ ان سے زیادہ نہ صرف ہمارے حلقہ میں بلکہ سارے ہندوستان میں اس کام کے لئے کوئی موزوں نہ تھا، محرم ۱۳۵۱ھ مئی ۱۹۳۲ء سے اس رسالہ "الضیاء" کا اجرا ہوا، میں رسالہ کا ایک مستقل مضمون نگار بن گیا، اور ایک طرح سے اعزازی طور پر شریک ادارت اور رفیق کار قرار پایا، اس رسالہ کے ذریعہ میری ناچیز و محدود انشائی و ادبی صلاحیت، اور خلیل عرب صاحب اور ہلالی صاحب کے تعلیم و صحبت کا فیض و اثر ندوۃ العلماء کے ذی علم ارکان اور صاحب ذوق ذمہ داروں کے سامنے آیا، لیکن میرا حصہ رسالہ کی تحریر و ترتیب میں جزوی اور وقتی تھا، میرا اس سے ضابطہ کا کوئی تعلق نہ تھا، اسی زمانہ میں میرے بعض اہم مضامین "الأدب النبوی" اور "لسان العصر الشاعر الاکبر حسین الہ آبادی" شائع ہوئے، آخر الذکر مضمون استاد محب الدین خطیب کے رسالہ "الفتح" اور "الضیاء" میں بالاقساط شائع ہوا۔

شاید یہ سلسلہ عرصہ تک چلتا اور میں اسی طرح سے آزادانہ خدمت انجام دیتا رہتا اور تدبیر الٰہی سے سلسلۂ معاش کا کوئی اور ذریعہ پیدا ہوتا کہ اچانک ایک لطیفۂ غیبی پیش آیا، اور میرا دار العلوم ندوۃ العلماء سے باضابطہ تعلق پیدا ہو گیا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۹۳۴ء کی ابتدا۔۔۔ میں ہلالی صاحب دار العلوم سے علیحدہ ہو کر زبیر (عراق) چلے گئے، اور وہاں مستقل سکونت اختیار کر لی، مسعود صاحب پر

یہ جدائی بہت شاق گذری کہ ان کو ابھی اپنے فاضل استاد سے بہت کچھ حاصل کرنا تھا، انھوں نے اس کا عزم کرلیا کہ وہ دارالعلوم سے چھٹی لے کر کچھ عرصہ کے لئے ہلالی صاحب کے پاس "زبیر" میں قیام کریں گے، اور ان سے مزید استفادہ کریں گے، میں لاہور میں تھا، اور جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، حضرت مولانا احمد علی صاحب کی ہدایت کے مطابق شاہی مسجد کے ایک حجرہ میں مقیم تھا کہ اچانک مسعود صاحب کا یہ خط میرے نام آیا، خط پر، محرم ۱۳۵۳ھ[1] کی تاریخ پڑی ہوئی ہے:-

"ہلالی صاحب زبیر میں قیام پذیر ہیں، میرا ارادہ ہو رہا ہے کہ ایک سال کے لئے ہو آؤں، ڈاکٹر صاحب[2] راضی ہیں، اور پوری تائید کے ساتھ، مسعود صاحب[3] پہلے متأمل تھے، مگر رات راضی معلوم ہوتے تھے، مگر ان کا پہلے مطالبہ یہ ہے کہ علی میاں کو بلا کر "الضیاء" سپرد کر دو، اس کے بعد رخ کر سکتے ہو، سید صاحب کو خط لکھا ہے، اب صرف ان کے جواب کا انتظار ہے، اگر حسب توقع انھوں نے اجازت دے دی تو میرا سفر صرف آپ کے اختیار میں رہے گا، ادارت و ترتیب کا آپ ذمہ لے لیں، دوڑ دھوپ کا کام کوئی اور صاحب کرلیں گے۔"

مجھے ابھی تک اپنی اس عجلت اور بے صبری پر ندامت ہے، لیکن ایک تاریخی واقعہ اور اظہارِ حقیقت کے طور پر لکھ رہا ہوں کہ میں نے مسعود صاحب کو (جو میرے بے تکلف دوست تھے) لکھا کہ میرے حالات ایسے نہیں ہیں کہ میں بلا معاوضہ کام کرسکوں، اس لئے اس مسئلہ پر بھی غور کرنا ہوگا، انھوں نے لکھا کہ یہ تو ظاہر بات ہے، اس خدمت کا معاوضہ ضرور

---

[1] مطابق ۲۳ / اپریل ۱۹۳۴ء [2] ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب ناظم ندوۃ العلماء۔

[3] مولانا مسعود علی ندوی ناظم دار المصنفین اعظم گڑھ، ورکن انتظامی ندوۃ العلماء۔

طے کیا جائے گا، آپ اطمینان رکھیں، خدا کی قدرت و حکمت کہ یو، پی کی حکومت نے خفیہ پولیس کی رپورٹ پر مسعود صاحب کا (جو اپنے سیاسی خیالات کے لحاظ سے سخت نیشنلسٹ واقع ہوئے تھے) پاسپورٹ منظور نہیں کیا، لیکن یہ واقعہ میرے دار العلوم سے باضابطہ تعلق کی تمہید اور ذریعہ بن گیا، مولانا مسعود علی صاحب ندوی جو دار العلوم کی مسجد کی تعمیر کے سلسلہ میں مہینوں سے قیام پذیر تھے، اور اس شب و روز کے قیام سے دار العلوم کے فضلاء، فرزندوں اور عملہ سے ذاتی طور پر واقف ہوگئے تھے، اسی کے ساتھ وہ اپنی بیدار مغزی، انتظامی قابلیت، اور وسیع تجربہ کی بناء پر چاہتے تھے، کہ دار العلوم کے تدریسی و تربیتی و انتظامی نظام کی رگوں میں نیا خون آئے، اور دیرینہ سال، کہنہ مشق اور قابل احترام اساتذہ کی موجودگی میں جن پر "کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ" کا ہمہ گیر قانون ہر طبقہ کی طرح جاری و ساری ہے، جگہ لینے والے پیدا ہوں، اور سکنڈ لائن (SECOND LINE) تیار رہے، اس سلسلہ میں ان کی نظر جن نوجوان فضلاء پر خاص طور پر تھی، اور جو اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے، یہ ناچیز بھی تھا[1]، چنانچہ جلسۂ انتظامی منعقدہ ۱۵ جولائی ۳۴ء میں مولانا مسعود علی صاحب نے تدریس پر میرے تقرر کی تجویز پیش کی، بھائی صاحب (بھائی ہونے کی وجہ سے خاموش رہے) سید صاحب کی تائید، اور ارکان کے اتفاق آراء سے یہ تجویز منظور ہوگئی، اور میرا تدریس پر للعہ روپیہ ماہوار پر تقرر ہوگیا[2]، اور یکم اگست ۱۹۳۴ء سے

---

[1] میرے علاوہ ان کی خاص نظر رفیق محترم مولانا حافظ محمد عمران خاں ندوی، مولانا عبد السلام قدوائی ندوی، مولانا محمد ناظم ندوی، مولوی حبیب احمد ندوی پر تھی، اور یہ سب یکے بادیگرے دار العلوم میں مختلف ذمہ داریوں پر فائز ہوئے۔ [2] اس وقت متوسط اساتذہ کی تنخواہوں کی یہی شرح تھی، سب سے بڑی تنخواہ مہتمم دار العلوم کی تھی، جو ایک سو پچیس ۱۲۵ سے زائد نہ تھی۔

بحیثیت استاد تفسیر و ادب میں نے کام شروع کر دیا۔

ذہنی توارد اور فکری ہم آہنگی

ندوۃ العلماء کی تحریک اصلاح نصاب اور دینی تعلیم کی ترقی اور اس کو عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق بنانے (تطویر) کی مہم کوئی محدود مقامی اور وقتی تحریک نہ تھی، وہ ایک مستقل "دبستان فکر" تھا، جو عقائد صحیحہ سے لے کر تعلیمی نظریہ، تاریخ کے خاص تصور، تہذیب و ثقافت، علم و ادب کے خاص معیار سب کو اپنے وسیع دامن میں لئے ہوئے تھا، اکتوبر، نومبر ۱۹۷۵ء میں جب ندوۃ العلماء کا وہ پچاسی سالہ تعلیمی جشن منعقد ہوا، جو اپنی مقصدیت اور افادیت، مختلف طبقات کی نمائندگی اور عرب فضلاء و اہل فکر کی اتنی بڑی تعداد کی شرکت کی وجہ سے (جو اس سے پہلے اس برصغیر میں دیکھنے میں نہیں آئی تھی) ایک یادگار اور تاریخی اجتماع تھا، اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ندوۃ العلماء کے مسلک کو موقر شرکائے اجلاس کے سامنے واضح، اور آئندہ نسلوں کے لئے متعین کر دیا جائے، تاکہ کسی قسم کا التباس باقی نہ رہے تو راقم سطور نے ندوۃ العلماء کے محرک اول (مولانا سید محمد علی مونگیریؒ) اور ان کے روشن ضمیر رفقائے کار اور بانیان ندوۃ العلماء کی تحریروں اور تقریروں، ان کے مسلک و خیالات، اور ان کے مقاصد و دلی جذبات کو سامنے رکھ کر تحریک ندوۃ العلماء کی فکری بنیادوں، اس کے اعتقادی اور فکری حدود اربعہ، اور اس کے نمایاں خط و خال کو اپنے الفاظ میں پیش کرنے کی کوشش کی، اور اس تحریر کو دارالعلوم کے صدر دروازہ پر نمایاں طریقہ پر مرتسم کر دیا گیا، جو ابھی تک باقی ہے، چونکہ قارئین کرام کو اس سرگزشت کے تحریر کرنے والے کے ساتھ ابھی مسلسل کئی سال تک ندوۃ العلماء

کی اسی طویل شاہ راہ پر گامزن رہنا پڑے گا، اس لئے یہیں پر اس کی روح اور اس کے خمیر وضمیر سے واقف ومانوس ہونے کی ضرورت ہے، اس لئے یہ تحریر بجنسہٖ یہاں نقل کی جاتی ہے:۔

"دین وعقائد کے معاملہ میں ندوۃ العلماء کے مسلک کی بنیاد دین خالص پر ہے، جو ہر قسم کی آمیزش اور آلائش سے پاک، تاویل اور تحریف سے بلند، ملاوٹ اور فریب کی دسترس سے دور، اور ہر اعتبار سے مکمل اور محفوظ ہے۔

دین کے فہم اور اس کی تشریح اور تعبیر میں اس کی بنیاد اسلام کے اولین اور صاف وشفاف سرچشموں سے استفادہ اور اس کی اصل کی طرف رجوع پر ہے۔

اعمال واخلاق کے شعبہ میں دین کے جوہر ومغز کو اختیار کرنے، اس پر مضبوطی سے قائم رہنے، احکام شرعیہ پر عمل، حقیقت دین اور روح دین سے زیادہ قربت اور تقویٰ وصلاح باطن پر ہے۔

تصور تاریخ میں اس کی بنیاد اس پر ہے کہ اسلام کے ظہور اور عروج کا دور اول سب سے بہتر اور قابل احترام دور، اور وہ نسل جس نے آغوش نبوت اور درسگاہِ رسالت میں تربیت پائی، اور قرآن وایمان کے مدرسہ سے تیار ہو کر نکلی، سب سے زیادہ مثالی اور قابل تقلید نسل ہے، اور ہماری سعادت ونجات اور فلاح وکامرانی اس بات پر منحصر ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ اس سے استفادہ کریں، اور اس کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کریں۔

نظریۂ علم وفلسفۂ تعلیم میں اس کی اساس اس پر ہے کہ علم بذات خود ایک اکائی ہے، جو قدیم وجدید، اور مشرق ومغرب کے خانوں میں تقسیم نہیں کی جاسکتی اگر اس کی کوئی تقسیم ممکن ہے، تو وہ تقسیم صحیح اور غلط، مفید اور مضر، اور ذرائع اور

مقاصد کے اعتبار سے ہوگی، استفادہ اور افادہ اور ترک و قبول کے شعبہ میں اس کا عمل اس حکیمانہ نبوی تعلیم پر ہے کہ "حکمت مومن کا گمشدہ مال ہے، جہاں بھی وہ اس کو پائے وہ اس کا سب سے زیادہ مستحق ہے" نیز قدیم حکیمانہ اصول "خُذْ ما صفا وَدَعْ ما كدر" پر (یعنی جو صاف و نظیف ہو اس کو لے لو، اور جو آلودہ و کثیف ہو اس کو چھوڑ دو۔)

اسلام کے دفاع اور عصر حاضر کی لادینی قوتوں کے مقابلہ میں اس کی اساس اس ارشاد ربّانی پر ہے :۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ۔ (سورۃ الانفال۔۶۰)	ان کے مقابلہ کے لئے جتنی قوت تم سے ممکن ہو سکے تیار کرو۔

دعوت الی اللہ، اسلام کے محاسن و فضائل کی تشریح، اور ذہن و عقل کو اس کی حقّانیت و صداقت پر مطمئن کرنے میں اس کا عمل اس حکیمانہ وصیت پر ہے کہ :۔

كلّموا الناس على قدر عقولهم أتريدون أن يكذب الله ورسوله[1]۔	لوگوں سے ان کی عقلوں کا خیال رکھتے ہوئے گفتگو کرو، کیا تم چاہتے ہو کہ خدا اور رسول کو جھٹلا دیا جائے؟

عقائد و اصول میں وہ جمہور اہل سنت کے مسلک کی پابندی، اور سلف کے آراء و تحقیقات کے دائرہ میں محدود رہنا ضروری سمجھتا ہے، فروعی و فقہی مسائل کے بارے میں اس کا مسلک و اصول یہ ہے کہ حتی الامکان اختلافی مسائل کو چھیڑنے

[1] وصیت حضرت علی کرم اللہ وجہہ۔

اور ہر ایسے طرزِ عمل سے احتراز کیا جائے جس سے باہمی منافرت بڑھے اور امت کا شیرازہ منتشر ہو، سلف صالحین سے حسنِ ظن رکھا جائے اور ان کے لئے عُذر تلاش کیا جائے، اسلام کی مصلحت اجتماعی کو ہر مصلحت پر ترجیح دی جائے۔

مختصراً یہ کہ وہ حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ (م ۱۱۷۶ھ) کے علمی و فکری، اور کلامی و فقہی مدرسۂ فکر سے زیادہ قریب اور ہم آہنگ ہے، اس لحاظ سے ندوۃ العلماء ایک محدود تعلیمی مرکز سے زیادہ ایک جامع اور کثیر المقاصد دبستان فکر اور مکتبِ خیال ہے۔"

اس تحریک کے ساتھ جو ندوۃ العلماء کے دینی مسلک، اس کے نظریۂ علم و تاریخ اور طریق فکر سے متعلق ہے اپنی ہی ایک تحریر کے اقتباس کا اضافہ کیا جاتا ہے جس سے اس ثقافت کی وسعت و تنوع کا اندازہ ہوتا ہے، جو بانیان ندوۃ العلماء کا شعار اور اس کے فضلاء کے لئے باعث افتخار ہے، یہ اقتباس راقم کے اس مقدمہ سے ماخوذ ہے جو نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی (جو ندوۃ العلماء کے بانیوں اور فکری رہنماؤں میں سے تھے) کی سوانح حیات مرتبہ مولوی شمس تبریز خاں کے لئے لکھا گیا تھا، مسلمانوں نے ہندوستان میں پہونچ کر جس اسلامی ہندی تہذیب و ثقافت کو وجود بخشا تھا، اس کا تعارف کراتے ہوئے مقدمہ نگار نے لکھا تھا:۔

"اس تہذیب و ثقافت میں شکوہ بھی ہے، اور تواضع بھی، جلادت بھی ہے اور مروت بھی، گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی، صلابت بھی ہے اور رقّت بھی، استقامت بھی ہے اور رواداری بھی، اس کی قلمرو میں علوم شریعت و حکمت بھی ہیں، اور ادب و شاعری بھی، فقر و درویشی بھی ہے، اور نفاست و ذوق لطیف بھی، اس کی

دلچسپی کے میدان قلعے بھی ہیں، اور کتب خانے بھی، مدرسے بھی ہیں، اور خانقاہیں بھی، تحقیق و تصنیف کے حلقے بھی ہیں، اور مشاعرے بھی، اس میں ثقاہت بھی ہے، اور ظرافت بھی، سخت جانی بھی ہے، اور سبک روحی بھی، اس کے اظہارِ خیال اور اظہارِ کمال کا ذریعہ عربی بھی ہے، اور فارسی بھی، اردو بھی ہے، اور ہندی بھی۔"[1]

میرا ذہنی سانچہ جس کی تشکیل میں دادیہالی اور نانیہالی اثرات، خاندانی ماحول اور روایات، تین پشتوں کے تصنیفی اور ادبی ذوق، حضرت سید احمد شہیدؒ کے خاندان و جماعت سے انتساب کے نتیجہ میں قلب و نظر کی وسعت اور دین کی حمایت و حمیّت، پھر سب سے بڑھ کر اپنے برادر بزرگ و مربّی مولوی حکیم ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب (جنھوں نے قدیم و جدید تعلیم کی بہترین خصوصیات کو اپنے اندر جذب کیا تھا، اور جو مشرقی و مغربی علوم کے مجمع البحرین تھے جن کے متعلق کہنا صحیح ہوگا "مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ") کی صحبت و تربیت نے برابر کا حصہ لیا تھا، اپنی علمی بے بضاعتی اور کم حیثیتی کے باوجود جو اس سن و سال کا قدرتی تقاضہ بھی تھا، ندوۃ العلماء کے اس دینی و فکری مزاج، اور جس ثقافت کا وہ نمائندہ اور علم بردار تھا، اس سے فطری مناسبت رکھتا تھا، اس لئے اس کو اپنے کو اس ماحول میں فٹ کرنے کے لئے کوئی ذہنی ہجرت اور کوئی طویل سفر کرنا نہیں پڑا، اس کو محسوس ہوا کہ وہ اپنے ہی گھر کے ایک گوشہ یا ایک کمرہ سے منتقل ہو کر دوسرے گوشہ اور کمرہ میں آگیا ہے، اس میں اس بات کو بھی دخل تھا کہ اس کا ذہنی و علمی نشو و نما شروع سے ندوہ ہی کے ماحول میں ہوا تھا، اور بچپن ہی سے اس کے کان میں وہ باتیں پڑی تھیں جو اس کو ندوہ کی تاریخ سے واقف، اس کے جلیل القدر بانیوں سے آشنا، اور اس کے خیالات سے مانوس کرتی تھیں، اس کے

---

[1] صدر یار جنگ (مقدمہ ص۱۱)

مربی اور ولی نعمت برادر بزرگ، اس کے محبوب و شفیق استاد شیخ خلیل عرب اور اس کی ایک طرح کے ذہنی تربیت کرنے والے اور اس کے ایک دوسرے استاد و اتالیق مولانا سید طلحہ صاحب سب ندوہ ہی کے تعلیم یافتہ اور خوشہ چین تھے۔

ان فکری و علمی مناسبتوں اور قدیم رشتوں کے علاوہ دار العلوم میں بحیثیت استاد و معلّم کے آنے میں اللہ کی یہ بھی بڑی حکمت تھی کہ اس ماحول میں مجھے آزادی سے کام کرنے، اپنی ٹوٹی پھوٹی صلاحیتوں سے کام لینے اور ان کو ترقی دینے کا جو موقعہ تھا، وہ کسی اور درسگاہ میں ملنا مشکل تھا، ندوۃ العلماء کے ناظم میرے بڑے بھائی ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب تھے، معتمد تعلیم مولانا سید سلیمان ندوی تھے، جو والد صاحب کے تلمذ اور بھائی صاحب سے محبت و اتحاد کے رشتہ سے ایک خاندانی بزرگ کی حیثیت رکھتے تھے، دار العلوم کے مہتمم و شیخ الحدیث میرے شفیق استاد مولانا حیدر حسن خاں صاحب تھے، نیابت اہتمام اور دفتر کی سربراہی میرے رفیق درس اور دوست مولانا حافظ محمد عمران خاں ندوی کرتے تھے، اساتذہ و مدرسین میں متعدد میرے درس کے ساتھی اور دیرینہ دوست و رفیق تھے، مثلاً مولانا مسعود عالم صاحب ندوی، مولانا محمد ناظم صاحب ندوی، شیخ محمد العربی، کچھ عرصہ کے بعد مولانا عبد السلام صاحب قدوائی ندوی، مولانا ابو اللیث صاحب اصلاحی ندوی[1]، اور مولانا محمد اویس صاحب ندوی بھی اس گروہ میں آکر شامل ہو گئے، اس لئے یہاں تعلیم و تدریس کا فرض انجام دینے، طلبہ سے قریبی رابطہ رکھنے، اور اگر کبھی ذہن میں آئے تو کوئی نیا تعلیمی تجربہ کرنے، بلکہ نصاب کے بارے میں بھی حقیر معروضات پیش کرنے اور مشورہ دینے میں کوئی انتظامی دقّت اور دفتری اور حاکمانہ رکاوٹ حائل نہیں تھی۔

---

[1] حال امیر جماعت اسلامی ہند۔

تدریس و تعلیم کا آغاز

مجھے دار العلوم میں آنے پر متوسط اور بعض اونچے درجوں کی کتابیں پڑھانے کو ملیں، ان میں سے اکثر سبق مولانا عبد الرحمن صاحب کاشغری ندوی کے یہاں ہو رہے تھے، جو دار العلوم کے ایک ممتاز فاضل اور عربی زبان کے ماہر، ادیب و شاعر تھے[1] جہاں تک یاد ہے پہلے سال مجھے درجۂ ششم میں پڑھانے کے لئے قرآن مجید کے ابتدائی دس پارے، ترمذی شریف کا نصف ثانی خضری کی "تاریخ الامم الاسلامیۃ" کا پہلا حصہ، "حماسہ" کا باب الادب والنسیب و المراثی ملا، غالباً ابتدائی درجات میں مصر کی عربی ریڈر "القراءۃ الرشیدۃ" یا کامل کیلانی کی "حکایات الأطفال" کا کوئی حصہ بھی تھا کہ یہ دونوں کتابیں اس وقت کے نصاب میں داخل تھیں، میرا قیام دار العلوم کی مرکزی عمارت کے مغربی جنوبی ناتمام برجی سے متصل اس کمرہ میں تھا، جس میں پہلے دار العلوم کے نامور مہتمم شمس العلماء مولانا حفیظ اللہ صاحب بندولی (تلمیذ رشید فخر المتاخرین مولانا عبد الحی صاحب فرنگی محلی) عرصہ تک مقیم رہ چکے تھے، اسی کمرہ میں مولانا مسعود عالم صاحب ندوی بھی تھے[2]، اور

---

[1] ان کا عربی کا مجموعۂ کلام "الزہرات" کے نام سے شائع ہو چکا ہے، جس پر رفیق محترم مولانا مسعود عالم ندوی صاحب کا فاضلانہ مقدمہ ہے، "الضیاء" میں "أمثال اللغتین" کے عنوان سے عربی و اردو کی ضرب المثلوں کے تقابل و موازنہ پر کئی قسطوں میں ان کا فاضلانہ سلسلۂ مضامین نکلا تھا، طویل مدت تک دار العلوم میں تدریسی خدمت انجام دینے کے بعد وہ مدرسۂ عالیہ کلکتہ پھر پاکستان بننے پر مدرسۂ عالیہ ڈھاکہ منتقل ہو گئے، اور وہیں انتقال کیا۔

[2] مولانا کا تقرر بحیثیت مدرس ۱۲ر جولائی ۱۹۳۵ء سے ہوا، اس سے پہلے وہ صرف "الضیاء" کی ادارت و تحریر کے ذمہ دار تھے، اعزازی طور پر ادب و انشاء کے بعض گھنٹے ان کو دیئے جاتے تھے

ان کی وجہ سے وہ ہماری رہائش گاہ بھی تھا، اور "الضیاء" کا دفتر بھی، ہم دونوں میں ایسا اتحاد تھا کہ گویا بڑے چھوٹے بھائی اور جگری دوست اور ہمدم و دمساز تھے، درجہ ششم میں مجھے جو جماعت ملی تھی، ان میں متعدد طلبہ ذہین و ذی استعداد تھے، اور اکثریت مجھ سے عمر میں بڑی یا قریب قریب ہم عمر تھی، وہ ایک فاضل و کہنہ مشق استاد (مولانا کاشغری) سے قرآن شریف کا یہ حصہ پڑھ رہے تھے، یہ حصہ بھی بکثرت آیات احکام اور کلامی و فقہی مباحث پر مشتمل تھا، اس لئے مجھے محنت و مطالعہ، اور اپنے کو اس اہم درس کا اہل ثابت کرنے کی ضرورت تھی، مولانا مسعود عالم صاحب از راہ ہمدردی و اخلاص طلبہ کے تاثرات معلوم کرتے رہتے تھے، اور چاہتے تھے کہ میں ناکام ثابت نہ ہونے پاؤں، طلبہ نے فی الجملہ اطمینان کا اظہار اور کسی قدر تعریف بھی کی، لیکن مہذب طریقہ پر اشارہ کیا کہ زیادہ وسیع مطالعہ کی ضرورت ہے، مسعود صاحب نے مجھے اس تاثر سے آگاہ کر دیا، اور میں کتب خانہ سے تفسیر کی قدیم بڑی کتابیں اور اہم و بنیادی مآخذ لے آیا، ان میں سے بعض تفسیریں مثلاً "کشاف" "معالم التنزیل بغوی" و "مدارک" تقریباً لفظاً لفظاً پڑھیں، جدید تفاسیر میں سے "تفسیر المنار" پھر مولانا آزاد کی "ترجمان القرآن" سے پورا استفادہ کیا، تدریس اور طلباء کے سوالات کے جواب میں علامہ آلوسی کی "روح المعانی" سے سب سے زیادہ مدد ملی، جدید معلومات اور تقابلی مطالعہ کے سلسلہ میں مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی سے خط و کتابت شروع کی اور ان سوالات کے حل میں ان سے مدد لی، اس کے لئے کئی بار دریاباد حاضر ہوا، اور مولانا سے استفادہ کیا، اور انہماک کے ساتھ ان کا مطالعہ اور درس کی بہتر تیاری شروع کر دی، اور خدا کا شکر ہے کہ سال ختم ہونے سے پہلے میں طلبہ کو پورے طور پر مطمئن کرنے پر قادر ہو گیا۔

دارالعلوم کی عمومی فضا

اس وقت ہلالی صاحب کے قیام کے نتیجہ میں، نیز" الضیا" کے اجراء اور ان نوجوان اساتذہ کے اثر سے (جو طلبہ سے براہ راست رابطہ رکھتے تھے، اور ان کے پاس طلبہ کو مانوس و متاثر کرنے کی زیادہ صلاحیت تھی) پورے دارالعلوم پر عربی زبان وادب، انشاء و خطابت، اور اردو ادبیات و تاریخ کے مطالعہ کی فضا چھائی ہوئی تھی، اور یہی ذوق غالب تھا" الضیاء" کے تبادلہ میں مصر، شام، و عراق کے مشہور و معیاری رسائل، مصر کا" المنار" و" الفتح" شام کا " العرفان" اور لبنان کا" الصفا" اور اس کے علاوہ استاد احمد حسن الزیات کا" الرسالہ" ڈاکٹر احمد امین کا" الثقافہ" (جس میں مصر کے نامور و منتخب ادباء و اہل قلم کے مضامین شائع ہوتے تھے) آتا تھا، ہندوستان کا واحد عربی مجلّہ ہونے کی وجہ سے بعض نامور مصنفین کی عربی کتابیں بھی تبصرے کے لئے آتی تھیں، اس وقت ہمارا یہ چھوٹا سا کمرہ، اور محدود ماحول بحر ہند کا ایک عربی جزیرہ بنا ہوا تھا، اس مطالعہ اور فضا کی بدولت میں مصر و شام کے اہل قلم و صاحب اسلوب ادیبوں، اور اپنا مستقل دبستانِ فکر رکھنے والے فضلاء و اہل فکر سے اتنا ہی واقف اور مانوس ہو گیا، جیسے ہندوستان کے ادباء و شعراء، اور ناقدین و مفکرین سے واقف تھا، بلکہ بعض خصوصیات کی بناء پر ان غیر ملکی ادیبوں اور اہل فکر و قلم سے اس وقت زیادہ واقف تھا، ہم لوگ بے تکلف ان کے محاسن اور ان کی کمزوریوں اور ذہنی و دینی بے راہ روی پر تبصرہ کرتے تھے، اور ان کے درجوں و مراتب کی تعیین کرتے تھے، اس کا فائدہ مجھے پورے طور پر اس وقت محسوس ہوا جب میں ۱۹۵۱ئ میں مصر گیا، وہاں میرے لئے کوئی شخصیت نئی، سحر انگیز، اور مرعوب کن نہ تھی، نہ مجھے وہاں کسی نئی حقیقت کا

انکشاف ہوا، باہر کے ان ملکوں میں (جن کی تہذیب و ترقی و علم کا طلسم دل و دماغ پر چھایا ہوا ہوتا ہے) دین کے ایک داعی اور خادم کے لئے یہ بات بڑی اہمیت و افادیت رکھتی ہے کہ وہ وہاں جانے سے پہلے وہاں کے ادب و انشاء کا تنقیدی مطالعہ کر چکے ہوں، اور وہاں کے رگ و ریشہ سے واقف ہو چکے ہوں۔

اسی زمانہ کا دلچسپ واقعہ ہے کہ انجمن الاصلاح میں عربی کا ایک بڑے معرکہ کا ادبی مباحثہ ہوا، جس کا موضوع تھا "من هو اكبر رجل في العالم الإسلامي" (عالم اسلام کی سب سے بڑی شخصیت کون ہے؟) نوعمر مقررین جوش و خروش اور سنجیدگی و اصرار کے ساتھ اس بحث میں حصہ لے رہے تھے، گویا عالم اسلام کی سب سے بڑی شخصیت کا انتخاب اسی وقت کرنا ہے، اور اس کے سر پر خلافت باعظمت کا تاج رکھنا ہے، اس بحث میں شام کے ایک اخبار نویس محمود خیر الدین دمشقی بھی (جو ان دنوں آئے ہوئے تھے) شریک تھے مسعود صاحب کے رجحان، اور اس وقت کے صدر اجلاس (راقم سطور) کے فیصلہ نے امیر شکیب ارسلان کا پلڑا بھاری کر دیا، اور حاضرین کی اکثریت نے ان کے حق میں فیصلہ کیا، ہم لوگوں نے تازہ تازہ اس وقت "حاضر العالم الاسلامی" کا مطالعہ کیا تھا اور "الفتح" میں امیر کے ولولہ انگیز اسلامی مضامین پڑھتے تھے، اس لئے وہی ہمارے دل و دماغ میں رچے بسے ہوئے تھے، اس جلسہ کی صدائے بازگشت مصر میں بھی سنی گئی، امیر شکیب ارسلان نے مسعود صاحب کو ذاتی خط لکھا، جس میں اپنے نادیدہ معتقدین کے حسن ظن کا شکریہ ادا کیا لیکن صفائی سے لکھا کہ یہ جامہ حقیقتاً عصر حاضر کے نامور مجاہد، غازی عبد الکریم الریفی کے قامت بلند پر راست آتا ہے، جنھوں نے اپنی خداداد جنگی قابلیت اور عبقریت سے فرانس اور اسپین کے چھکے چھڑا دیئے، امیر مرحوم نے اپنی کتاب "السيد رشيد رضا واخاء اربعين سنة"

(علامہ سید رشید رضا، یا چالیس سال کی اخوت و محبت) میں اس جلسہ کا تذکرہ کیا ہے، اس سے ہم لوگوں کی اس وقت کی ذہنی سطح اور ذوق و مطالعہ کا اندازہ ہو سکتا ہے۔[1]

شادی

اسی سال ۱۹۳۴ء کے نومبر میں میری شادی میری حقیقی ماموں زاد بہن سید احمد سعید صاحب کی صاحبزادی، حضرت سید شاہ ضیاء النبیؒ کی پوتی، اور منشی سید عبدالرزاق صاحب کلامی مرحوم صاحب "صمصام الاسلام" (منظوم ترجمہ "فتوح الشام") کی نواسی سے ہوئی مولانا حیدر حسن خاں صاحب نے نکاح پڑھایا، بھائی صاحب نے ازراہ شفقت، اور اس احساس کے ماتحت کہ والد صاحب نہیں ہیں، ولیمہ کا انتظام اعلیٰ پیمانہ پر اور بڑی فراخ دلی اور خوشی کے ساتھ کیا۔

عربی تعلیم کا ایک نیا تجربہ

عربی زبان کی اس عمومی فضا، شیخ تقی الدین الہلالی کے طرز تعلیم کا (جو زبان کی تعلیم میں کسی دوسری زبان سے مدد لینے کو اصولاً غلط سمجھتے تھے) استاد محمد العربی کی شب و روز کی معیت کا اثر تھا کہ ہم لوگوں کو خیال آیا کہ عربی زبان کی تعلیم کا بطرز مستقیم (DIRECT METHOD) کے اصول پر تجربہ کیا جائے، بھائی صاحب کی اجازت اور ہمت افزائی اور مہتمم صاحب کی منظوری سے درجہ اول کے طلبہ کی ایک جماعت ہمارے حوالہ کی گئی، ایک جماعت دارالعلوم کے چند معمر و محترم استادوں نے قدیم طرز پر پڑھانے کے لئے، اور ایک جماعت کو مولانا

---

[1] ملخصاً از "پرانے چراغ" حصہ اول ص ۲۲۴-۲۲۵

ابو اللیث صاحب اصلاحی ندوی نے مولانا حمید الدین صاحب فراہیؒ کے طرز پر تعلیم دینے کے لئے منتخب کیا، آخر میں بھائی صاحب نے آکر تینوں جماعتوں کا امتحان لیا، اور ہماری جماعت کو پہلا نمبر دیا، اس طرز تعلیم سے طلبہ کو فائدہ ہوا، لیکن اس سے زیادہ فائدہ ہم پڑھانے والوں کو ہوا، اور اس سے عربی زبان میں طلاقت و روانی، اور بولنے اور تقریر کرنے کی مشق ہوئی، جو ان خدمتوں کی بنیاد بنی، جو دعوت کے میدان میں فضل خداوندی سے نصیب ہوئیں۔

کچھ افتاد طبیعت اور کچھ فضا کا اثر کہ اس وقت اپنے درجوں کے طلبہ سے ایسا انس و ربط پیدا ہو گیا تھا، جو افادہ و استفادہ کے لئے شرط ہے "گھول کر پلا دینے" کا جذبہ جو اپنے شفیق استاد شیخ خلیل عرب سے ملا تھا، اس وقت سینہ میں موجزن تھا، ضوابط و قواعد نپے تلے وقت اور مقام کی کوئی قید نہ تھی، طلبہ کو ہر طرح سے مشق کرانے اور عربی سکھانے کا اہتمام رہتا تھا، اور اس کے لئے ہم لوگ نئے نئے طریقے اختیار کرتے تھے، اور ذہنی اپج سے کام لیتے تھے، اس سلسلہ میں استاد محمد العربی سے جو شیخ تقی الدین الہلالی کے چھوٹے بھائی تھے، بڑی مدد ملتی تھی۔

دوسرے اسباق و مضامین

جہاں تک دوسرے مضامین کی تعلیم کا تعلق تھا، الحمد للہ اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال رہی، مولانا حیدر حسن خاںؒ ترمذی کے طلبہ سے ان کا تاثر دریافت کرتے رہتے، ایک مرتبہ انھوں نے طلباء کے تاثرات معلوم کر کے اپنے اطمینان اور خوشنودی کا اظہار فرمایا، میں نے ایک درجہ میں منطق بھی پڑھائی، جدید و قدیم منطقی اصطلات و اصول (مثلاً دلالت مطابقی، دلالت تضمنی، دلالت التزامی) کی مثالیں روزمرہ کی چیزوں اور مشاہدات سے

دینا تھا، اس میں ڈپٹی مولوی نذیر احمد صاحب کی کتاب "مبادی الحکمۃ" سے مدد اور رہنمائی ملی، غالباً اگلے ہی سال سے تاریخ ادب عربی کا گھنٹہ مستقل طور پر میرے ہی حصہ میں آگیا، خصوصاً درجہ ہفتم میں استاد احمد حسن الزیّات کی "تاریخ الأدب العربي" داخل تھی، یہ میرا پسندیدہ اور مانوس موضوع تھا، میں نے مسلسل کئی سال تک اس کا درس دیا، دارالعلوم سے تدریسی تعلق کے آخری سالوں میں میں نے کئی سال صحیح بخاری کی کتاب الوحی، کتاب الایمان اور کتاب العلم بھی پڑھائی، الحمد للہ اس میں خوب جی لگا، اور اندازہ ہوا کہ اگر مجھے مطالعہ اور محنت کا موقعہ ملے تو بخاری شریف اچھی طرح پڑھالوں گا، الحمد للہ ایک سال مکمل بخاری پڑھانے کا آغاز ہوا، لیکن اپنے سفروں کی کثرت اور نظر کی کمزوری سے (جس کا احساس باریک حواشی اور دقیق شروح دیکھنے کے زمانہ میں ہوا) اس کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا، اس کا ابھی تک افسوس ہے، ان کتابوں کے علاوہ ایک سال کچھ عرصہ تک "حجۃ اللہ البالغہ" بھی پڑھائی۔

دارالعلوم کی فضا، اور اپنے بانی اور معماروں سے ناآشنائی

افسوس ہے کہ اس وقت دارالعلوم میں کوئی دینی و دعوتی فضا موجود نہ تھی، اور اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ خود ہم اساتذہ کا ذوق و ذہن جن کا طلبہ پر اثر تھا، دعوتی نہیں بنا تھا، ہم میں سے جو لوگ دینی ذوق رکھتے بھی تھے، اور خوش اوقات اور پابند معمولات تھے ان میں بھی تعدیہ کی صلاحیت، اور طلبہ میں دینی و اصلاحی جذبہ پیدا کرنے کی طاقت نہ تھی، ساری فضا پر علمی و ادبی تحریری و تقریری ذوق سایہ فگن تھا، دارالعلوم کے ماحول میں سب سے بڑی مثالی (IDEAL) شخصیت جو قابل اقتداء و تقلید سمجھی جاتی تھی، اور جو طلباء کا منتہائے پرواز و تخیل تھا، وہ مولانا شبلیؒ کی ذات تھی، انھیں کو دارالعلوم کا اصل بانی اور

معمار سمجھا جاتا تھا، اس میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں کہ مولانا شبلی کا ندوہ کے علمی و ادبی مزاج کی تشکیل میں بنیادی اور شاید سب سے بڑا حصہ ہے، اور ان کا اسلوب تحریر اس وقت تک سنجیدہ اور علمی خیالات کے ادا کرنے کے لئے سب سے زیادہ موزوں اور اس وقت تک زندہ و تابندہ ہے، اور بظاہر ابھی عرصہ تک رہے گا۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس تاریخی مسلّمہ حقیقت کا انکار کیا جائے کہ تحریک ندوۃ العلماء مولانا محمد علی مونگیری کا تخیل اور ان کے دل کی آواز تھی، وہی اس کے داعیٔ اول اور بانی اصلی ہیں، نیز ندوہ کے ذریعہ جو ثقافت وجود میں آئی اور وہ جس کا داعی اور حامل ہے، اس میں مولانا شبلی، مولانا حکیم سید عبدالحی، صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی اور فخر ندوہ مولانا سید سلیمان ندوی کا بھی حصہ ہے، اور یہ سب اس کے بہترین مظہر اور نمونہ تھے، ایک فرع کے اپنی اصل سے منقطع ہو جانے، اور اپنے بانیِ اول اور محسنوں کو نہ صرف فراموش کر دینے بلکہ اس نسبت سے استنکاف اور عار محسوس کرنے کے جو غلط اور فطری اثرات پیدا ہوتے ہیں، اور اس سے جو بے برکتی آتی ہے، وہ اس دور میں محسوس ہوتی تھی، مولانا سید سلیمان ندوی جن کا دینی رجحان تیزی کے ساتھ ترقی کر رہا تھا، اور جن کے تمام علمی کمالات آزادانہ فکر و نظر، وسیع مطالعہ اور قوت تنقید پر ہر حال میں طبعی و خاندانی شرافت غالب تھی، اور جنھوں نے ندوہ کے دور اول میں جب مولانا محمد علی اس کی نظامت اور رہنمائی کے مسند پر متمکن تھے، تعلیم حاصل کی تھی، اس حقیقت کو محسوس کرنے لگے تھے، اور اس نکتہ کی طرف وقتاً فوقتاً توجہ دلاتے تھے، مجھے خوب یاد ہے کہ ایک مرتبہ درسگاہ کی شمالی سیڑھیوں سے اترتے ہوئے مجھ سے فرمایا کہ مولوی علی صاحب[1]! ہر ادارہ کی کوئی

---

[1] سید صاحبؒ مجھے اسی طرح خطاب فرماتے تھے۔

ایک یا چند معیاری شخصیتیں ہوتی ہیں، جو طلبہ اور نوجوانوں کے لئے نمونہ اور اسوہ (IDEAL) کا کام دیتی ہیں، اور جن کی تقلید میں فخر محسوس کیا جاتا ہے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے لئے سرسید، نواب محسن الملک نواب وقار الملک آئیڈیل ہیں (غالباً اس موقعہ پر دوسرے نمبر پر دیوبند کا بھی نام لیا لیکن مجھے یاد نہیں وہاں کی کن شخصیتوں کا ذکر کیا) آپ لوگ یہاں دار العلوم کے طلبہ کے سامنے بھی آئیڈیل لائیے، تاکہ وہ اس کی تقلید کریں، یہاں چار شخصیتیں آئیڈیل کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں، مولانا سید محمد علی مونگیریؒ، مولانا شبلیؒ، آپ کے والد ماجد مولانا سید عبد الحیؒ، نواب سید علی حسن خاںؒ، پھر فرمایا آپ کے والد صاحب ان سب کے کمالات کے جامع اور سب کے نمائندہ تھے، وہ روحانیت بھی رکھتے تھے، عالم بھی تھے، اردو اور عربی کے ادیب بھی تھے، اور بلند پایہ مصنف بھی، آپ ان کو طلبہ کے سامنے آئیڈیل کے طور پر پیش کریں، ممکن ہے، مرورِ زمانہ سے الفاظ میں ردوبدل ہوگیا ہو، لیکن مفہوم یہی تھا، مگر صورت حال یہ تھی کہ میں تو نسبتِ فرزندی کی وجہ سے یہ فرض انجام نہیں دے سکتا تھا، اور اگر دیتا تو اثر نہ ہوتا، اساتذہ میں سوائے مولانا عبد السلام صاحب قدوائی کے کوئی اس حقیقت سے آشنا، اس کا معترف، اور محفلوں میں اس کا تذکرہ کرنے والا نہیں تھا، اس کا نتیجہ تھا کہ ہر ذہین طالب علم (مولانا شبلی کی تقلید میں) مصنّف، مؤرخ، ادیب و ناقد بننے ہی کا خواب دیکھتا تھا، اور قدیم اداروں، نصاب و نظام، اور باہر کی شخصیتوں سے یا تو بے خبر تھا، یا ان کے بارے میں کسی قدر حقارت آمیز خیالات رکھتا تھا، بھائی صاحب بھی اس صورتِ حال سے بہت دل گیر تھے، اور دینی و روحانی شخصیتوں، اور علمائے ربّانی سے طلبہ کا ربط قائم کرنا چاہتے تھے، مگر سالہا سال کے اثر کو جس کی جڑیں بڑی گہری تھیں، چند سال میں مٹایا نہیں جاسکتا تھا، نہ اس وقت کوئی ایسی دینی دعوت

وتحریک سامنے آئی تھی، جو یہاں کے نوجوانوں کو مانوس و متاثر کرسکتی اور جس سے ربط و تعلق کا مشورہ دیا جاسکتا۔

طلباء کی بعض خصوصیات

اس وقت کے طلبہ میں اگرچہ کسی قدر آزادروی، دینی تساہلی، اور اسکول و کالج کے طلبہ کی نقل کا جذبہ تھا، لیکن اعلیٰ خاندانوں سے تعلق رکھنے، کھاتے پیتے مسلمان گھرانوں کے فرزند ہونے، جن میں پرانی تہذیب و روایات چلی آرہی تھیں، نیز بہار، اور یوپی کے ان ذہین خاندانوں سے نسبت رکھنے کی وجہ سے جن میں اپنے اپنے دور میں بڑے بڑے علماء، مشائخ اور اہل کمال پیدا ہوئے ہیں، شرافت، ذہانت، سنجیدگی اور شائستگی، خودداری، بڑوں کا پاس و لحاظ، استادوں کا ادب تھا، اور وہ بتذل اور گھٹیا باتوں سے احتراز کرتے تھے، نیچے درجہ کا طالب علم اونچے درجہ کے طالب علم کا چھوٹے موٹے استاد کی طرح لحاظ کرتا تھا، بڑے درجے کا طالب علم چھوٹے درجے کے طالب علم کو بے تکلف ٹوک دیتا تھا، تھوڑی محنت سے بھی بہتر نتیجہ حاصل کرنے کی صلاحیت تھی، باہر کی بڑی بڑی شخصیتوں سے آنکھ جھپکتی نہ تھی، اور اہلِ دُوَل اور اصحابِ جاہت کا رعب زیادہ نہیں پڑتا تھا، بہر حال جیسا کہ تجربہ و فلسفہ ثابت کرتے ہیں کہ خیر محض اور شر محض کا وجود نہیں، وہ دور جہاں اپنے ساتھ کچھ کمزوریاں رکھتا تھا، جس کے کچھ تاریخی، اجتماعی اور تمدنی اسباب تھے، ویسے کچھ ایسی خوبیاں بھی رکھتا تھا، جو اس دور میں اپنی بہت سی دینی و علمی ترقیات و خصوصیات کے ساتھ نظر نہیں آتیں۔

ڈاکٹر امبیڈکر کو دعوتِ اسلام اور سفر بمبئی

مجھے دار العلوم میں کام شروع کئے ہوئے ایک ہی سال ہوا تھا، اور میری عمر مشکل سے ۲۱ سال تھی کہ اکتوبر ۱۹۳۵ء میں میرے شفیق استاد شیخ خلیل عرب صاحب، اور برادر محترم ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب نے حکم دیا کہ میں بمبئی جاؤں، اور ڈاکٹر امبیڈکر کو جن کے متعلق اخبارات میں چرچا تھا کہ وہ اپنے اور اپنی قوم (پس ماندہ اقوام) (DEPRESSED CLASSES) کے لئے صحیح مذہب کی تلاش میں ہیں، اور جلد کسی مذہب کے قبول کرنے کا فیصلہ کرنے والے ہیں، عرب صاحب اور بھائی صاحب کا اصلی فطری ذوق غیر مسلموں میں تبلیغ کا تھا، اور دونوں اپنے اپنے دائرے میں، اور اپنے اپنے طرز کے مطابق یہ کام کرتے رہتے تھے، وہ دونوں پس ماندہ اقوام اور اچھوتوں میں مساوات کی اسلامی تعلیم کے مظاہرہ کا موقعہ ڈھونڈھتے رہتے تھے، اور جب موقعہ ملتا تو اس سے فائدہ اٹھاتے، معلوم نہیں کیوں دونوں کی نظر انتخاب اس عظیم اور نازک کام کے لئے مجھ پر پڑی، ڈاکٹر امبیڈکر اس وقت بمبئی کے لا کالج کے پرنسپل تھے، سیاسی وقانونی حلقوں میں روشناس ہو چکے تھے، اور اچھوتوں کے لیڈر سمجھے جاتے تھے، خیال کیا جاتا تھا کہ اس سلسلہ میں وہ جو بھی اقدام کریں گے، اس کے دوررس سیاسی، اخلاقی و معاشرتی اثرات ہوں گے، اور اس کا ہندوستان کے سیاسی نقشہ اور مستقبل پر گہرا اثر پڑے گا، ہندوستان کے مختلف مذاہب، عیسائیت، بُدھ مت، اور اسلام کے پیرو اپنے اپنے حوصلے اور نقطۂ نظر کے مطابق اس "ہُما" کو شکار کرنے کی فکر میں پڑ گئے، اس میں سب سے بڑی ذمہ داری مسلمانوں کی تھی، جو اس کام کے لئے خدا کی طرف سے مامور، اور جن کا دین، دینِ دعوت، دینِ انسانیت اور دینِ اخوّت و مساوات تھا، مجھے معلوم نہیں، کہ اس وقت کن کن اداروں، اور

کن شخصیتوں کی طرف سے ان کو اسلام کے حلقہ میں لانے کی کوشش کی گئی، اتنا یاد آتا ہے کہ ریاست حیدرآباد کی طرف سے بھی کوشش ہوئی، مجھے بھی عرب صاحب کی صحبت و تربیت اور بھائی صاحب کے جذبہ و شوق کی وجہ سے اس کام سے کچھ مناسبت تھی، اور اس کو سب سے بڑی سعادت اور عبادت سمجھتا تھا لیکن اس کے لئے جن اہلیتوں اور صلاحیتوں کی جس اثر انگیز پُرکشش شخصیت و وجاہت اور انگریزی زبان پر قدرت کی ضرورت تھی، میں ان سے عاری تھا جسمانی حیثیت سے نحیف و لاغر، سن و سال کے لحاظ سے نوعُمر، لباس اور ظاہری ٹیپ ٹاپ کے لحاظ سے غیر مؤثر، لیکن میرے لئے تعمیل ارشاد کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، میں انگریزی کی کچھ تبلیغی کتابیں اور رسائل جو زیادہ تر سیرت کمیٹی پٹی[1] کی شائع کی ہوئی تھیں، اور غالباً پکتھال صاحب کا ترجمۂ قرآن لے کر بمبئی روانہ ہوگیا۔

میں نے اس وقت تک لاہور کے علاوہ کوئی طویل سفر نہیں کیا تھا بمبئی میرے لئے ایک جدید و عظیم اور مولانا دریابادی کی اصطلاح میں "یاجوجی" شہر تھا، میں وہاں سوائے شرف الدین کتبی صاحب کے جن کا مکتبہ قیمہ بھنڈی بازار میں عربی کتابوں کا واحد مکتبہ تھا، کسی سے واقف نہ تھا، میرے رفیق کار مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی، اور مولوی رئیس احمد صاحب جعفری عرصہ تک اخبار "خلافت" میں کام کر چکے تھے، اور خلافت ہاؤس میں ان کا قیام رہ چکا تھا، مولانا عبدالسلام صاحب کو جب معلوم ہوا کہ میں بمبئی جا رہا ہوں تو انھوں نے مولانا محمد عرفان صاحب کو جو آل انڈیا خلافت کمیٹی کے سکریٹری اور خلافت ہاؤس کے

---

[1] سیرت کمیٹی پٹی جس کے روح رواں عبدالمجید قریشی صاحب تھے اور جو اپنا ایک آرگن "ایمان" کے نام سے نکالتی تھی، اس زمانہ کی بڑی مستعد اور کارکن جماعت اور دعوتی ادارہ تھا۔

ناظم اعلیٰ تھے، ایک تعارفی خط لکھدیا، خوش قسمتی سے اس وقت میرے ایک دوست ورفیقِ درس مولانا ابراہیم عمادی "خلافت" میں کام کرتے تھے، اور خلافت ہاؤس ہی میں مقیم تھے، بمبئی پہونچ کر میں سیدھا خلافت ہاؤس پہونچا، جو بولین بائی کلّہ میں واقع ہے، مولانا عرفان صاحب نے مجھے خلافت ہاؤس میں ٹھہرایا، اور مولانا عمادی صاحب نے اپنا مہمان بنالیا، لیکن میں جب کسی سے اس مہم کا ذکر کرتا تو اس کو ہنسی آجاتی اور مجھ کو سر سے پاؤں تک دیکھتا کہ۔ ع

اس حوصلہ کو دیکھئے، اور ان کو دیکھئے

میں نے بڑی احتیاط اور رازداری کے ساتھ ڈاکٹر امبیدکر کے مکان کا پتہ پوچھا، معلوم ہوا کہ دادر میں ان کا بنگلہ ہے، اس وقت بمبئی میں ٹرام چلتی تھی، میں ان انگریزی دعوتی رسائل کو جو لکھنؤ سے لایا تھا، ساتھ لے کر ٹرام پر سوار ہوگیا، دادر اتر کر ان کے بنگلہ پر پہونچا، صبح ۷-۸ بجے کا وقت ہوگا معلوم ہوا کہ وہ ہوا خوری (WALK) کے لئے گئے ہوئے ہیں، انتظار کے کمرہ میں میں نے دیکھا کہ ملاقات کے لئے آنے والے بہت سے حضرات قطار در قطار بیٹھے ہوئے ہیں، میں نے سوچا ان اہم ملاقاتیوں اور آنے والوں میں میں ان کی نظر میں کیا جچوں گا، اور وہ میری طرف کیا توجہ کریں گے لیکن اللہ کا نام لے کر میں بیٹھ گیا، تھوڑی دیر میں وہ مکان میں داخل ہوئے، دوہرا بدن، میانہ قد، رنگ کھلتا ہوا، ہاتھ میں چھڑی، مجمع پر ایک طائرانہ نظر ڈالی، اور مجھے اشارہ کیا کہ آپ آیئے، وہ مجھے اوپر لے کر اپنے ریڈنگ روم میں پہونچے اور بیٹھنے کا اشارہ کیا، میں نے دیکھا کہ میز پر جو کتابیں تھیں، ان میں پکتھال صاحب کا ترجمۃ القرآن بھی تھا، جس میں نشانی رکھی ہوئی تھی، جس سے معلوم ہوتا تھا کہ یہاں تک پڑھا ہے، میں نے اپنی گفتگو کا نقشہ (پلان) بنالیا تھا،

میں اپنی حیثیت اور قابلیت سے واقف تھا، اس لئے میں نے طے کر لیا تھا کہ میں ایک سیدھے سادے مسلمان، اور خالص داعی کی حیثیت سے صاف صاف گفتگو کروں گا، جس میں کسی سیاسی، معاشرتی ترغیب کی آمیزش نہ ہوگی، میں نے گفتگو کا آغاز کیا، اور کہا، ڈاکٹر صاحب! آپ سے مختلف مذاہب کے بڑے بڑے لوگ ملے ہوں گے، اور انھوں نے اونچی اونچی باتیں کہی ہوں گی، میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ کو اپنی اور اپنی برادری (COMMUNITY) کی نجات کی فکر ہے، اور خلوص کے ساتھ صحیح مذہب کی تلاش ہے، تو میں آپ کو اسلام کی دعوت دیتا ہوں، اور اس کے لئے کوئی رشوت یا ترغیب، یا لالچ نہیں دیتا، پوری گفتگو تو یاد نہیں، لیکن گفتگو کی روح اور جان یہی تھی، انھوں نے بڑی سنجیدگی اور احترام کے ساتھ میری بات سنی اور جواباً کہا کہ معاملہ بڑا سنجیدہ اور غور طلب ہے، میں مطالعہ بھی کر رہا ہوں اور غور بھی، اس کے بعد میں کوئی فیصلہ کروں گا، میں یہ لکھنا بھول گیا کہ چلتے وقت عرب صاحب نے میرے کان میں کہا تھا کہ اگر بات اس پر آ کر رک جائے، کہ ہم لوگوں کو رشتہ کون دے گا؟ تو کہہ دینا کہ ایک خالص عربی النسل شریف انصاری خاندان ہے، وہ آپ کو بیٹی دینے کو تیار ہے، اور میں تم کو اجازت دیتا ہوں کہ تم میری طرف سے وعدہ کر لینا، مجھے یاد ہے کہ عرب صاحب نے بڑے رقت انگیز طریقہ پر یہ بات کہی تھی، اور وہ اس کے لئے ضرور تیار ہو جاتے، میں نے جب دیکھا کہ اب مزید گفتگو کی گنجائش نہیں، تو وہ انگریزی کا لٹریچر پیش کیا، اور ان سے درخواست کی کہ اس کا مطالعہ ضرور کریں، انھوں نے مجھے احترام کے ساتھ رخصت کیا، اور میں چلا آیا، اب یہ تقدیری بات ہے، اور "إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ" کی تفسیر معلوم ہوتی ہے کہ اس اعلان کے بعد انھوں نے اپنی اور اپنی کمیونٹی کے لئے بدھ مت کا انتخاب کیا، غالباً ان کو اپنی زندگی ہی میں اپنی اس انتخاب کی غلطی اور "کوہ کندن و کاہ

برآوردن" کے انجام کا احساس ہوگیا، اور اگر ان کو نہیں ہوا تو ان کی (COMMUNITY) اور پڑھے لکھے صاحب فکر اچھوتوں کو اب شدّت سے یہ احساس پیدا ہوگیا ہے کہ اس تبدیلی سے ان کی تقدیر نہیں بدلی جیسا کہ مسٹر V.T. RAJSHEKAR کی کتاب AMBEDKAR AND HIS CONVERSION کے مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے' اس موقعہ پر وہ خط درج کیا جاتا ہے جو میں نے اس ملاقات کے بعد بھائی صاحب کو لکھا تھا کہ اب وہ ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے :۔

۲۲ رجب دوشنبہ ۱۳۵۴ھ	خلافت ہاؤس، بائی کلہ، اولین بمبئی

(۲۱ اکتوبر ۱۹۳۵ء)

برادر محترم مدظلہ العالی ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

میں کل یکشنبہ کو ۱۱ بجے کے قریب بمبئی پہونچا، خلافت ہاؤس میں قیام کیا، عبدالسلام[1] صاحب نے مولانا عرفان[2] کے نام خط دے دیا تھا، یوں بھی وہ آپ سے بخوبی واقف ہیں' عمادی[3] صاحب دارالعلوم کے ایک ساتھی وہاں موجود ہیں' ان سے بہت سہولت ہوئی، اور اب بالکل گھر کی طرح ہے، کھانے اور ناشتہ کا وہیں انتظام ہے ـــــ

کل ہی شام کو شرف الدین صاحب کی دکان پر آیا، عبدالصمد[4] صاحب نے کہا کہ ڈاکٹر گور[5] گئے تھے' انھوں[6] نے دوسرے روز ۸½ بجے بلایا، دوسرے روز گئے، تو کہہ دیا کہ میں مصروف ہوں' ملاقات نہیں ہوسکتی، عبدالصمد صاحب نے کہا کہ میں نے

---

[1] مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی [2] تحریک خلافت کے ممتاز رہنما، اور مولانا محمد علی جوہر کے خاص معتمد' [3] مولانا ابراہیم عمادی ندوی سابق استاد بیگ محمد ہائی اسکول بمبئی اور متعدد نصابی کتابوں کے مصنف [4] مالک مطبع قیمہ و شرف الدین بک ڈپو [5] ایک نو مسلم ڈاکٹر [6] ڈاکٹر امبیدکر۔

انگریزی میں ایک طویل خط لکھا ہے، خلاصہ سنایا تو معقول اور موثر معلوم ہوا، خلافت ہاؤس میں معلوم ہوا کہ مولانا عرفان بھی ملنے گئے تھے، اور زیادہ توقع لے کر نہیں آئے میں ان باتوں سے دل شکستہ اور مایوس تو نہیں ہوا لیکن فکر پیدا ہوگئی، زیادہ فکر اس کی تھی کہ اگر ملنے سے انکار یا عذر کر دیا تو پھر دروازہ ہی بند ہو جائے گا، اور یہاں آنا بالکل بیکار ہوگا، میری کوئی حیثیت نہیں اور نہ وسائل ہیں، اغلب یہی ہے کہ نہ ملیں، یوں بھی لوگ بہت پریشان کرتے ہوں گے، اور بیسیوں ملنے جاتے ہوں گے تار ہی پڑھنے کی فرصت نہ ہوگی۔

آج صبح جانے کا قصد کیا، مولانا عرفان سے پتہ پوچھا تو انھوں نے کہا کہ ملنا بیکار ہے، میں اللہ کا نام لے کر چلا، یہاں سے ایک اسٹیشن آگے "دادر" بمبئی کے مضافات میں ہے، وہیں ان کا مکان ہے، تلاش کے بعد ان کا مکان ملا، میں کوئی ویزٹنگ کارڈ نہیں لے گیا تھا، اس لئے خیال ہوا کہ آج صرف مکان دیکھ کر اور ملنے کا مناسب وقت دریافت کرکے آجاؤں گا، مگر اندر گیا، تو معلوم ہوا کہ آج ہی ۱۱ بجے ڈاکٹر صاحب[۱] احمد آباد جا رہے ہیں، حسن اتفاق پر خدا کا شکر ادا کیا اور انتظار میں بیٹھ گیا، میرے ساتھ ۸-۱۰ اچھوت اور منتظر تھے، میں نے پوچھا، آپ لوگ ہریجن ہیں؟ انھوں نے کہا، ہاں، میں نے کہا، کیا ڈاکٹر صاحب مہاتما جی[۲] سے ملنے جا رہے ہیں، انھوں نے کہا نہیں، ہم لوگ اور ہیں، مہاتما جی اور، کچھ دیر کے بعد ڈاکٹر صاحب آگئے، مجھ سے پوچھا کیا کام ہے؟ پھر اوپر آنے کے لئے اشارہ کیا، کمرہ میں گیا تو دیکھا کہ میز پر کتابیں ڈھیر ہیں، جیسے ابھی کوئی پڑھ کر گیا ہے، ان میں قرآن مجید کا

---

[۱] ڈاکٹر امبیدکر۔ [۲] مہاتما گاندھی۔

ترجمہ از علامہ عبداللہ یوسف علی "آئیڈیل پرافٹ" اور کئی کتابیں تھیں، جس سے معلوم ہوتا تھا کہ مطالعہ کرتے ہیں، میں نے کتابیں دیں اور کہا کہ میں لکھنؤ سے خاص آپ سے ملنے آیا ہوں، اور جو کچھ اس وقت سمجھ میں آیا کہا، میں نے کہا کہ یہ تاریخ میں پہلا موقعہ ہے، اور شاید آخری، اگر یہ موقعہ نکل گیا تو پھر کبھی ہاتھ نہ آئے گا، پوری قوم کو آپ نجات دے سکتے ہیں، صرف سیاسی حیثیت سے اس مسئلہ پر غور نہ کیجئے، بلکہ مذہبی حیثیت سے بھی، مسلمان اس گئی گذری حالت میں بھی بڑے سے بڑا امتحان دے سکتے ہیں، پھر عرب صاحب کا پیغام پہونچایا، آپ کا بھی ذکر کیا، ڈاکٹر صاحب نے گفتگو توجہ سے سنی اور کہا کہ یہ میرا اکیلے کا مسئلہ نہیں، پوری اچھوت قوم کا ہے، جلدی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا، ان کی متحدہ رائے معلوم ہونی چاہیئے، میں نے کہا کہ انھوں نے ہر جگہ ناسک کے فیصلہ سے اتفاق کیا ہے، اور آپ پر اعتماد ظاہر کیا ہے، آپ کی رائے یقیناً مؤثر ہوگی، لکھنؤ کانفرنس کی رپورٹ آپ نے پڑھی ہوگی، کہا کہ ہاں! آج ہی اخبارات میں پڑھی ہے، میں جلسہ طلب کروں گا، اور مشورہ کرلوں گا، اس کے بعد میں نے اسلام میں مساوات پر مختصر سی گفتگو کی اور انھوں نے توجہ سے سنی، میں نے کہا کہ میں آپ ہی کے لئے یہاں ٹھہرا ہوا ہوں، جو خدمت میرے اور میرے خاندان کے لائق ہو فرمایئے، آپ کب تک واپس آئیں گے؟ کیا میں اس وقت تک ٹھہروں، کہا کہ پہلی دوسری نومبر تک واپس آؤں گا، آپ کے ٹھہرنے کی ضرورت نہیں، جو فیصلہ ہوگا سب کو اس کی اطلاع ہو جائے گی، ـــــ یہ خلاصہ ہے ہماری گفتگو کا۔

چند باتوں کا میں نے خاص طور سے لحاظ کیا۔ (۱) آدمی سنجیدہ اور معقول ہے،

(۲) اسلام کا اچھا مطالعہ کر رہا ہے، (۳) قوم کو اس پر بہت اعتماد ہے ـــــ وہاں سے نکلا تو ہریجنوں میں سے دو چار آدمی میرے پاس آئے، اور بڑے اشتیاق سے پوچھا کہ کیا گفتگو ہوئی؟ میں نے کہا کہ آپ لوگوں کا کیا بچار ہے؟ کہا کہ جو ڈاکٹر صاحب فرمائیں، انھیں تو اچھوتوں کی خدمت کرنی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں نے فریضۂ تبلیغ ادا کر دیا، اور اللہ کی حجت تمام ہو چکی، اب یہ اس کی اور قوم کی قسمت پر ہے، لیکن اس کے فیصلہ کا انتظار نہیں کرنا چاہئے، اور اس سے پورے طور پر مطمئن نہیں ہونا چاہئے، مسلمانوں کو اپنا کام کرنا چاہئے، پہلا کام یہ ہے کہ دیہاتوں اور گاؤں میں، اور ہر جگہ سب سے پہلے ان کو اپنی حالت کا احساس دلانا چاہئے، اور اس کی اچھی تدبیر یہ ہے کہ ڈاکٹر کی ناسک والی تقریر ان کی زبان میں شائع کر کے تقسیم کی جائے، اس کے بعد اسلام میں مساوات وغیرہ پر تبلیغی مضامین تقسیم کئے جائیں، اور اس سے بڑھ کر عملاً مل کر اور دورہ کر کے کام کیا جائے، یہ کام فوراً شروع ہو جانا چاہئے، اگر ابھی رائے ہو تو ایک مضمون گجراتی میں ترجمہ کرا کے یہاں اور خصوصاً ناسک میں تقسیم کر دیا جائے، اس کے لئے واپسی میں میں خود ناسک چلا جاؤں گا، اگر اب آپ یہاں میرا ٹھہرنا مفید نہ سمجھیں تو کرایہ اور نیز کچھ تھوڑی سی رقم طباعت کے لئے بھیج دیجئے، عرب صاحب کو بھی خط دکھا دیجئے گا، یا مضمون سنا دیجئے، مولوی محمد علی[1] مدراس میں ہیں، اور محی الدین صاحب قصور میں ہیں، جواب جلد دیجئے۔

آپ کا
علی

---

[1] مولوی محمد علی قصوری ایڈوکیٹ اور مولوی محی الدین قصوری فرزندان مولانا عبدالقادر قصوری، جو غیر مسلموں میں تبلیغ و دعوت کے کام سے بڑی دلچسپی لے رہے تھے، اور فراخ دلی سے خرچ بھی کرتے تھے۔

اس مہم سے فارغ ہو کر میں ہفتہ عشرہ اور بمبئی رہا، لیکن چند دن کے بعد مجھ پر ملیریا کا حملہ ہوا، اور لوگوں نے کہا کہ اب تم واپس چلے جاؤ، ورنہ یہ بخار پیچھا نہیں چھوڑے گا، میں لکھنؤ روانہ ہو گیا، لیکن عجیب بات ہے کہ غالباً دو سال تک جب یہ تاریخیں آتیں تو مجھ پر ملیریا کا حملہ ہوتا، پھر آخر بھائی صاحب نے انٹی ملیریا کورس پورا کرایا، اس سے اس بخار سے نجات ملی۔

لکھنؤ پہونچکر دو اطلاعیں ملیں، ایک بڑی خوش کن اور مسرت افزا، اور ایک غم آگیں اور افسوس ناک، خوش کن اطلاع تو برادر زادہ عزیز محمد الحسنی کی ولادت کی خبر تھی، میرے لکھنؤ پہونچنے سے پانچ ہی سات روز پہلے ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۵ء (۱۷ رجب ۱۳۵۴ھ کو) ان کی ولادت ہوئی تھی، افسوس ناک خبر میرے حقیقی ماموں زاد بھائی سید محمد مصطفےٰ مرحوم کی اچانک وفات تھی، جو غالباً سانپ کے کاٹنے سے واقع ہوئی تھی، وہ مجھ سے تین چار سال بڑے تھے، اور حقیقی بھائیوں کی طرح ہم لوگ ساتھ رہے، اور کھیلے تھے۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ کی خدمت میں سپاس نامہ

اکتوبر میں سید صاحب شدید طور پر علیل ہوئے، علالت نے بہت طول کھینچا، اہل تعلق اور نیاز مندوں کو تشویش پیدا ہوئی، بھائی صاحب بھی عیادت اور طبی مشورہ کے لئے اعظم گڑھ گئے، ہم نوجوان استاد (میں، مولانا عبد السلام صاحب ندوی، مولانا مسعود عالم صاحب ندوی وغیرہ) بھی حاضر خدمت ہوئے، اللہ تعالےٰ نے فضل فرمایا، اور سید صاحب صحت یاب ہوئے، وہ جب سفر کے قابل ہوئے تو مارچ ۱۹۳۶ء میں تبدیلی آب و ہوا کے لئے دہرہ دون کا قصد کیا، اور اس سلسلہ میں لکھنؤ تشریف لائے، ہم نیاز مندوں نے مشورہ کیا کہ اس تقریب میں ہم لوگ جلسہ کریں،

اور اپنی مسرت اور شکر کا اظہار سید صاحب کی خدمت میں عربی میں سپاس نامہ پیش کرنے کی تجویز ہوئی، مشورہ میں طے پایا کہ طلبائے دار العلوم کی طرف سے سپاس نامہ مولانا مسعود عالم صاحب لکھیں، اور اساتذہ کی طرف سے میں، ہم لوگوں نے بڑے شوق اور دلچسپی سے سپاس نامے لکھے، میں نے اپنے سپاس نامہ میں اس کی خاص رعایت کی کہ سید صاحب کی تمام اہم تصنیفات کا نام، ان کی فہرست پیش کئے بغیر تلمیحات میں آجائے، اور اس میں بحمد اللہ میں کامیاب رہا، ان کو خطاب بھی پیرایۂ بیان بدل بدل کر کیا گیا، یہ سپاس نامہ اب بھی دار المصنفین میں کسی جگہ آویزاں ہے، ہم نے کوشش کی کہ لکھنؤ کے معززین اہل ذوق کا چیدہ مجمع ہو، چنانچہ اس میں اودھ چیف کورٹ کے مسلمان جج، اور سر برآوردہ وکلاء سے لے کر علمائے فرنگی محل اور ندوۃ العلماء کے ارکان انتظامی موجود تھے، سید صاحب نے سپاس ناموں کے جواب میں اردو میں ایک برمحل اور مؤثر تقریر فرمائی، یہ ایک بڑا پاکیزہ شستہ اور شائستہ جلسہ تھا، جو ہماری ندریسی زندگی کی ایک یادگار ہے۔

مسلم ایجوکیشن کانفرنس کی جبلی میں

اسی ۱۹۳۶ء میں علی گڑھ میں مسلم ایجوکیشن کی جُبلی منعقد ہوئی، جس کے روح رواں اور سرپرست ہمارے اور سب کے بزرگ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی آنریری سکریٹری کانفرنس تھے، ندوہ کی طرف سے جس وفد نے اس میں شرکت کی تھی، اس میں میں بھی تھا، یہ میرا غالباً علی گڑھ کا پہلا سفر تھا، میرا قیام مولانا ابوبکر صاحب فاروقی جون پوری ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی کے یہاں تھا، جن سے ہمارے دو تین پشتوں کے خاندانی اور روحانی روابط تھے، ان کے والد محترم مولانا ابوالخیر محمد مکی صاحب

میرے نانا صاحب (حضرت سید شاہ ضیاء النبیؒ) کے بہت محبوب اور عزیز مرید تھے، اور اس رشتہ سے ہمارے سب ماموں زاد بھائی ان کو ابوبکر چچا، اور ہم بھائی بہن ابوبکر ماموں کہتے تھے، مولانا ابوبکر صاحب کے دادا حضرت مولانا سخاوت علی جون پوری حضرت سید صاحب کے خلفاء میں تھے، ہمارے خاندان کے شیخ و بزرگ حضرت مولانا سید خواجہ احمد صاحب نصیر آبادی ان کے شاگرد تھے، مولانا ابوبکر صاحب کی تکیہ پر برابر آمد و رفت رہتی تھی، اور وہ جب آجاتے تھے، تو مسرّت اور رونق کی ایک لہر دوڑ جاتی تھی، میرے شفیق ماموں مولوی حافظ سید عبید اللہ صاحب مرحوم نے انھیں کے گھر پر ٹھہر کر جونپور میں قرآن شریف حفظ کیا تھا، اور ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی، ان سب رشتوں اور یگانگتوں کی بنا پر ان کا گھر بالکل اپنا گھر تھا، میں نے وہیں قیام کیا، نواب صدر یار جنگ مرحوم نے جب اس پر شکایت اور بزرگانہ عتاب فرمایا کہ میں ان کے یہاں نہیں ٹھہرا، تو میں اخیر میں کچھ وقت کے لئے حبیب منزل چلا گیا تھا۔[1]

ہم لوگوں کا خاص تعلق جُبلی کے شعبہ مدارس عربیہ کے جلسے سے تھا، جس کی صدارت حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ نے فرمائی تھی، مولانا ابوبکر صاحب کی خیر مقدمی تقریر کا یہ فقرہ ابھی تک یاد ہے کہ "ابھی آپ کو نوجوانوں کے چھپے ہوئے ٹخنوں کی شکایت ہے، وہ وقت قریب ہے کہ آپ کو نوجوانوں کے کھلے ہوئے گھٹنوں کی شکایت ہوگی" ان کا اشارہ ہندوستان کے آنے والے انقلاب، اور اس ہندوانہ تہذیب کی طرف تھا، جو اس انقلاب کے جلو میں آرہی تھی، اور ان کی یہ پیشین گوئی پوری ہوئی، میں نے اس جُبلی میں متعدد نامور شخصیتوں کی زیارت کی جنھوں نے مختلف شعبوں کے جلسوں کی صدارت کی، ان میں ڈاکٹر سر ضیاء الدین، پروفیسر الیاس برنی یاد ہیں۔

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "پرانے چراغ حصہ دوم" تذکرہ مولانا شروانیؒ۔

باب ششم

"سیرت سید احمد شہیدؒ" کی تصنیف کا آغاز، حضرت تھانوی کی مجالس
بعض اہم سفر و واقعات، کلام اقبال سے دلچسپی

ٹونک کا سفر، اور "سیرت سید احمد شہیدؒ" کی تصنیف کا آغاز

اب وہ زمانہ اور مبارک موقعہ آیا جو میری زندگی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے، بلکہ ایک نئے اور مبارک دور کا آغاز، اوپر گذر چکا ہے کہ ۱۹۳۱ء میں حضرت سید احمد شہیدؒ کی شخصیت اور تجدیدی کارنامہ کے تعارف میں میرا عربی رسالہ "ترجمۃ السید الامام السید احمد الشہیدؒ" کے نام سے علامہ سید رشید رضا نے قاہرہ سے شائع کیا تھا، اس رسالہ سے حضرت سید صاحب کے حالات کے مطالعہ کا مبارک سلسلہ شروع ہوا، مجھے سب سے زیادہ جس تحریر نے سید صاحب کی شخصیت سے متعارف اور متاثر کیا وہ والد صاحب مرحوم کے "دہلی اور اس کے اطراف" کا سفرنامہ اور روزنامچہ تھا، جو ایک قلمی رسالہ کی شکل میں ان کے مسودات میں محفوظ تھا، جس کا نام انھوں نے "ارمغانِ احباب" رکھا تھا، پہلے اس کو سید صاحب نے "دہلی اور اس کے اطراف" کے عنوان سے اپنے رسالہ "معارف" میں بالاقساط شائع کیا، پھر اسی نام سے مکتبۂ انجمن ترقی اردو کی طرف سے دہلی سے شائع ہوا۔

مولانا مسعود عالم صاحب مرحوم اپنے مسلک و خیالات اور صادق پور پٹنہ کے اثر سے سید صاحب اور ان کی جماعت کے بڑے معتقد تھے، اور اس بارے میں خاصا جوش اور حمیت رکھتے تھے، ان سے اکثر اس کا تذکرہ رہتا کہ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی سیرت اور ان کے کام کے تعارف پر نئے علمی اسلوب اور طرز پر لکھنے کی ضرورت ہے، اخیر میں یہ طے ہوا کہ میں ان کی سوانح اور تاریخ کا کام کروں اور وہ ان کی تحریک اور جماعت کا تعارف کرائیں۔

اسی زمانہ (۱۹۳۶ء) میں گرمیوں کی تعطیل میں مولانا حیدر حسن خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ

نے مجھے اور دارالعلوم کے دو دوسرے استادوں شیخ محمد العربی، اور ماسٹر محمد سمیع صدیقی صاحب کو اپنے ساتھ ٹونک چلنے کی دعوت دی، میرے لئے تو اس سفر میں یوں بھی کشش تھی کہ ٹونک ہمارے خاندان کا دوسرا وطن اور قریبی عزیزوں کا مسکن تھا، اور ہمارے خاندان کی ایک پوری شاخ (غالباً بڑی شاخ) وہاں موجود تھی، میں نے بھائی صاحب کی اجازت پر یہ دعوت قبول کر لی اور مئی ۱۹۳۶ء کی کسی ابتدائی تاریخ کو مولانا کے ساتھ ٹونک روانہ ہو گیا، میرے اگرچہ بہت قریبی اعزہ ٹونک کے سب سے بڑے محلے قافلہ میں رہتے تھے، لیکن اصلاً میرا قیام مولانا کے دولت خانہ پر رہا، ویسے کئی کئی وقت اپنے اعزہ کے یہاں مہمان رہتا جن میں سب سے قریب بزرگ عم محترم سید محمد اسماعیل صاحب تھے جو حضرت سید صاحب کے حقیقی نواسہ کے صاحبزادے تھے، جو ہمارے ہی گھر میں برسوں رہ کر اخراج کا حکم (جس کا تذکرہ اوپر آچکا ہے) ختم ہونے پر ٹونک آچکے تھے، ان کے علاوہ ایک بڑی محبت کرنے والی چچی اہلیہ سید عبدالحفیظ صاحب مرحوم تھیں، جو حضرت سید صاحبؒ کے دوسرے نواسہ کے صاحبزادے حافظ سید محمد یونس صاحب مرحوم کی بیٹی اور مولانا سید محمد عرفان صاحب اور مولانا محمد مصطفےٰ[1] کی بھتیجی تھیں، ان کی بزرگانہ شفقت کی وجہ سے اکثر ان کا مہمان رہتا ان ہی کے گھر سے مجھے حضرت سید صاحب کے حالات و وقائع کا سب سے زیادہ مستند و ضخیم مرقع "وقائع احمدی" کئی جلدوں میں ملا جو سیرت سید احمد شہیدؒ کے بعد کے اڈیشن کا بہت بڑا ماخذ ہے، اس سفر میں میں نے ٹونک کی خوب سیر کی اور اسی سفر میں میں نے

---

[1] مولانا سید عرفان صاحب اور مولانا سید مصطفےٰ صاحب حضرت سید صاحب کے پس ماندگان بلکہ پورے خاندان کے ممتاز بزرگوں میں تھے، علم، اخلاص، تورع و تقویٰ، انابت و خشیت اور اتباع سنت میں سید صاحب کی نسبت کا اثر تھا، مفصل تذکرہ "نزہۃ الخواطر" جلد ۸ میں ملاحظہ ہو۔

بندوق کے نشانہ کی مشق[1] اس کے ایک مشہور استاد اور ماہر صاحبزادہ عبدالرحمٰن خاں صاحب سے کی جو نواب صاحب ٹونک کے داماد تھے۔

اسی سفر میں ایک دن جب میں مولانا کے ساتھ دریائے بناس کے کنارے ٹھہرا ہوا تھا، جہاں سید صاحبؒ، اور ان کے پاکباز مجاہدین نے بارہا وضو کیا ہوگا، صبح کے سہانے وقت طلوعِ آفتاب سے پہلے ایک پتھر پر بیٹھ کر دریا میں پاؤں ڈال کر "سیرت سید احمد شہیدؒ" کا مقدمہ لکھا جس پر مئی ۱۹۳۶ء کی تاریخ پڑی ہوئی ہے اور جو "سید صاحب کی سیرت پر ایک اجمالی نظر" کے عنوان سے کتاب میں شامل ہے، یہاں پر اس مضمون کا ایک ٹکڑا نقل کئے بغیر آگے نہیں بڑھا جاتا، اس سے اس نوعمر مصنف کے طرزِ تحریر اور اندازِ فکر کا بھی اندازہ ہوگا:۔

"کیفیاتِ ایمانی کے جاں نواز جھونکے تاریخ اسلام میں بارہا چلے ہیں، لیکن ایمان ویقین اور خلوص وللّٰہیت کی ایسی بادِ بہاری ہمارے علم میں کم سے کم اس ملک میں اس سے پہلے نہیں چلی، نہ اس سے پہلے اتنے بڑے پیمانے پر عزم وتوکل، جوشِ جہاد، ایمان واحتساب، شوقِ شہادت اور یقینِ آخرت کے ایسے نمونے دیکھنے میں آئے، آدم گری اور مردم سازی، اصلاح وانقلاب کے ایسے محیّر العقول واقعات بھی اصلاح وتربیت کی تاریخ میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔"[2]

یہ بڑا مبارک آغاز تھا، اور اس سے میری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے، مجھے خود

---

[1] ٹونک سے واپسی پر تعطیلات میں (رائے بریلی میں) اکثر بندوق لے کر شکار کو نکل جاتا اور صبح کا نکلا شام کو واپس آتا، بعد میں اس شغل بے حاصل کو جس میں وقت بہت صرف ہوتا تھا ترک کر دیا۔

[2] سیرت سید احمد شہید جلد اول ص ۵۴

اندازہ نہ تھا کہ یہ اقدام خود میری زندگی میں انقلاب انگیز بلکہ عہد آفریں ثابت ہوگا، اور یہ کتاب ہندوستان میں اتنی مقبول اور دینی حلقہ میں میرے تعارف اور بزرگوں کے یہاں قرب کا ذریعہ بنے گی بقول شاعر ؂

حکایت از قدآں یار دل نواز کنیم
باین بہانہ مگر عمر خود دراز کنیم

تعطیل گرما کے اختتام پر جون کی آخری تاریخوں میں ٹونک سے واپسی ہوگئی، راستہ میں مولانا نے ہمیں جے پور اور آمبیر[1] کی خوب سیر کرائی اور میں سیرت سید احمد شہید کی تکمیل کا عزم اور تحفہ لے کر لکھنؤ واپس ہوا۔

ناگپور اور مدراس کا سفر

دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مالی حالت اس زمانہ میں بڑی سقیم تھی، پہلی تاریخ کو تنخواہیں بھی مشکل سے تقسیم ہو پاتیں اور بعض وقت ایک دو، دو مہینے کی تنخواہیں بھی قرض ہو جاتیں، مجھے یاد ہے کہ ایک زمانہ میں بھائی صاحب کے حکم سے میں اور دارالعلوم کے ایک استاد مولوی خلیل احمد صاحب جامعی لوکو شاپ ریلوے کے دروازہ پر جا کر کھڑے ہو جاتے اور جو لوگ ہفتہ کا چھٹا لے کر آتے، ان سے ندوہ کے لئے چندہ مانگتے، کوئی چار آنہ، کوئی آٹھ آنہ دیتا، ہندوستان کے لوگوں کو اس اہم ادارہ کی طرف توجہ نہیں تھی، معلوم نہیں، کس طرح ندوہ کے ذمہ دار اور کارکن اس کا کام چلاتے تھے، واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے دیوبند اور علی گڑھ کا سمجھنا آسان تھا کہ ایک خالص قدیم دینی تعلیم کا مرکز تھا، دوسرا خالص جدید دنیاوی تعلیم کا، لیکن ندوہ کی افادیت اور ضرورت کا سمجھنا ان لوگوں کے لئے دشوار تھا، جن کی دینی و علمی و فکری سطح زیادہ بلند نہیں تھی،

[1] راجگان جے پور کا قدیم پایۂ تخت۔

اور جو اس عہد انقلاب اور اس کی ضرورتوں پر نظر نہیں رکھتے تھے، کچھ کوتاہی اس میں ندوہ کے ذمہ داروں کی بھی تھی، جنھوں نے عوام سے براہ راست رابطہ پیدا کرنے اور ان کو اس کی افادیت سے واقف کرانے کی کوشش نہیں کی، اس کے سالانہ اجلاس جو کسی مرکزی مقام پر ہوتے تھے، اور جس میں ملک کے مشاہیر علماء، زعماء، خطباء جمع ہوتے تھے، اور ندوہ کے مقاصد، اور اس کے نظام و نصاب کی خصوصیات پر روشنی ڈالی جاتی تھی، ۱۹۲۷ء کے اجلاس امرتسر کے بعد سے بند تھے، کچھ ان غلط فہمیوں کا بھی اس میں دخل تھا، جو ندوہ کی طرف سے دینی حلقہ میں پائی جاتی تھیں یا پیدا کرائی گئیں تھیں، کچھ ندوہ کے فضلاء کی ذمہ داری بھی تھی کہ انھوں نے (باستثناء چند) پختہ دینداری اور اپنی افادیت اور ضرورت کا نقش لوگوں کے دماغوں پر قائم نہیں کیا تھا، بہرحال کچھ بھی اسباب ہوں ندوہ عوام و خواص کے تغافل کا شکار اور مالی بحران میں مبتلا تھا، آفریں ہے ان مخلص ذمہ داروں اور کارکنوں کی ہمت اور استقامت کو جو ان صبر آزما حالات میں اس کو چلا رہے تھے، اور ان کو اس سب کے باوجود اس کی افادیت و ضرورت کے بارے میں تردد پیدا نہیں ہوا تھا۔

اس ضرورت کے احساس کی بنا پر بھائی صاحب کی رائے ہوئی کہ مولانا حیدر حسن خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور چند اساتذہ مدراس کا سفر کریں، جو ہندوستان میں مسلمانوں کا ایک بڑا تجارتی مرکز، اور خاص طور پر چمڑے کی منڈی ہے، اس کا محرک یہ بھی ہوا کہ چند دن پہلے مدراس کے مشہور تاجر چرم اور رئیس نواب سی عبدالحکیم شمالی ہند کی طرف آئے تھے، اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو ایک بڑا عطیہ دیا تھا، وہ ندوہ بھی آئے اور دارالعلوم کا معائنہ بھی کیا، خیال تھا کہ وہ وفد کی پذیرائی کریں گے، اور کوئی بڑا عطیہ دیں گے، ان کے علاوہ کچھ پنجابی تاجر بھی تھے، جو پڑھے لکھے اور حالات سے باخبر تھے، اور سید محمد جمیل صاحب نے

(جو وہاں اکاؤنٹنٹ جنرل کے عہدہ پر رہ چکے تھے) تعارفی خط بھی لکھ دیئے تھے، بہر حال ایک وفد جس کے سربراہ ہمارے مہتمم اور شیخ الحدیث مولانا حیدر حسن خاں صاحب اور ارکانِ وفد مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب ندوی، مولانا عبد السلام صاحب قدوائی اور یہ ناچیز تھا یکم مئی ۱۹۳۷ء کو مدراس کے لئے روانہ ہوا، ہماری پہلی منزل بھوپال تھی، جہاں مجھے اپنے بعض ایسے عزیزوں سے ملنے کا اتفاق ہوا جن کو کبھی دیکھا نہ تھا، یا بہت بچپن میں دیکھا تھا، دوسری منزل ناگپور تھی، جو اس وقت اچھوتوں اور غیر مسلموں میں تبلیغ کا بڑا مرکز تھا، ناگپور میں اس وفد کو کچھ کامیابی حاصل ہوئی، ناگپور میں نواب صدیق علی خاں اور بیرسٹر یوسف شریف صاحب سے ملاقات ہوئی جو پہلی کانگریسی وزارت میں منسٹر بھی رہے تھے۔

وہاں کی انجمن اسلام کے اسکول نے وفد کو استقبالیہ بھی دیا، اور ہم لوگوں کو اپنی یونین کا فیلو بھی بنایا، ایک دن خان بہادر ولایت اللہ صاحب نے (جو موجودہ نائب صدر جمہوریہ جسٹس ہدایت اللہ صاحب کے والد تھے، اور کلکٹری کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے تھے) ہم لوگوں کو شام کی چائے پر بلایا، وہ اکبر الہ آبادی مرحوم کے طرز پر شعر کہتے تھے، انھوں نے اپنا کلام بھی سنایا، ایک دن عبد اللطیف صاحب نے بھی مدعو کیا جو وہاں سشن جج تھے، غالباً ہمارے اودھ ہی کے رہنے والے تھے، ان کی بیگم صاحبہ ہمارے استاد خلیل عرب صاحب کے عزیزوں میں تھیں، جج صاحب دینی ذوق رکھتے تھے، انھوں نے بعض مسائل پر گفتگو کی، ایک میمن خاتون نے جن کی جوتوں کی دکان تھی ندوہ کو ایک عطیہ دیا جو اس سفر کا سب سے بڑا عطیہ تھا۔

تیسری اور آخری منزل مدراس تھی، جہاں توقع کے مطابق کامیابی نہیں ہوئی، ہمارا قیام سرائے میں تھا، ہم میں سے کئی آدمیوں کی (کھانے کے نظام کے ٹھیک نہ ہونے کی وجہ سے)

طبیعت بھی خراب ہوگئی، قیام کو مختصر کیا گیا اور ہم لوگ ہفتہ عشرہ ٹھہر کر واپس آگئے، مدراس میں مولانا ابوالجلال صاحب ندوی سے ملاقات ہوئی میں اُن کا نام سنتا تھا، مگر ابھی تک ان کو دیکھا نہیں تھا، ہم لوگوں کا قیام سی عبدالحکیم صاحب کی بنائی ہوئی، سرائے یا مسافر خانہ میں تھا، اہل مدراس کو اس وفد کی آمد کا علم زیادہ نہیں ہوا اور انھوں نے اس کا کچھ زیادہ نوٹس نہیں لیا، افسوس ہے کہ ان کو مولانا حیدر حسن خاں صاحب جیسے جلیل القدر عالم و محدث کے اس شہر میں تشریف لانے کی اہمیت بھی معلوم نہیں ہوئی جو اپنی علمی اور اخلاقی بلندی اور طویل خدمت حدیث کے علاوہ شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ سے براہ راست ارادت و اجازت کی نسبت رکھتے تھے۔

مولانا تھانوی کی لکھنؤ تشریف آوری اور ان کی مجالس

اگست ۱۹۳۸ء میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ بغرض علاج لکھنؤ تشریف لائے اور چالیس روز قیام فرمایا، یہ نہ صرف اہل لکھنؤ بلکہ دور و نزدیک کے اضلاع کے لئے بھی ایک نعمت غیر مترقبہ تھی کہ مولانا عرصہ سے سفر ترک فرما چکے تھے، اور طالبین و مخلصین کے لئے تھانہ بھون جانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، مگر اب کنواں خود پیاسوں کے پاس آگیا تھا، اور معالج روحانی جسمانی علاج کے لئے مریضوں کے پاس بھیج دیا گیا تھا، بھائی صاحب مرحوم نے جو ایسے مواقع کی قدر و قیمت خوب جانتے تھے، اور خاندانی طور پر مولانا کے معتقد اور ان کے کمال کے قائل تھے، ایک طالب علم کی طرح اس "مدرسہ" میں جو بعد ظہر مولوی محمد حسن صاحب (مالک انوار المطابع لکھنؤ) کے مکان اور بعد عصر

"مسجد خواص" میں لگتا تھا، حاضری دینی شروع کی، مجھے بھی وہ التزاماً اپنے ساتھ لے جاتے تھے، قسمت سے اس وقت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی کا رسالہ "القول المنصود" زیر طبع تھا، اور مولانا کی توجہ اور دلچسپی کا مرکز بنا ہوا تھا، اس میں طویل طویل عربی کی عبارتیں تھیں، وصّی بلگرامی صاحب نے تصحیح و مقابلہ کا کام میرے سپرد کر دیا، اس تقریب سے مولانا سے اور قرب و حضوری کا موقعہ ملا، ۱۵ ستمبر ۱۹۳۸ء کو مولانا خود اپنی خواہش سے "مسجد خواص" سے پیدل چل کر ہمارے مکان پر تشریف لائے، اور بھائی صاحب کے مطب میں تھوڑی دیر تشریف رکھ کر اس خصوصیت کا اظہار فرمایا جو سارے علماء و مشائخ دیوبند کو حضرت سید احمد شہیدؒ کے خاندان سے رہی ہے۔

علامہ اقبال سے آخری ملاقات

۱۹۳۴ء۔۱۹۳۵ء تک میں علامہ اقبال کے کلام و پیام کا زیادہ گرویدہ و شیفتہ نہیں تھا، میں اس وقت تک صرف بانگ درا سے آشنا تھا، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، میں نے ان کی چاند والی نظم کا عربی میں ترجمہ کیا تھا، اور انھوں نے مئی ۱۹۲۹ء میں میرے پہلے سفر لاہور کے موقع پر اس کو ملاحظہ بھی فرمایا تھا، لیکن جب میری نظر ان کے بعد کے کلام "ضرب کلیم" پر پڑی جس کو میں لکھنؤ کے "مکتبہ دانش محل" سے خرید کر لایا تھا تو میری آنکھیں کھل گئیں اور میں ان کے کلام کی بلندی اور تاثیر سے مسحور ہو گیا، لیکن "بال جبریل" پڑھ کر اس سے زیادہ متاثر ہوا، اس میں خیالات کی رفعت و جدّت کے ساتھ ترنّم اور حلاوتِ جرس زیادہ تھی، پھر "اسرار خودی" اور "رموز بیخودی" "مثنوی" "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" "پیامِ مشرق" اور بعد میں "جاوید نامہ" اور "زبور عجم" کا مطالعہ کیا اور ذہن و قلب نے ان کا وہ اثر

قبول کیا جو کسی معاصر شخصیت کا (جہاں تک ادب و شاعری و فکر کا تعلق ہے) اثر قبول نہیں کیا تھا۔

اقبال سے تاثر کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ معاصر اہلِ قلم و اہلِ علم کی علمی تحقیقات و فتوحات اور پیش رفت اور مواد و معلومات کے ماخذ ہم کو معلوم تھے، اور کم و بیش ہماری اس پر نظر تھی، اور اس میں کسی نوع کی شرکت (سن و سال اور علم و مطالعہ کے تفاوت کے ساتھ) ہم کو بھی حاصل تھی، اندازہ ہوتا تھا کہ محنت و مطالعہ، پیش کرنے کے سلیقہ، اور کہنہ مشقی سے ہم بھی اس منزل کو پہونچ سکتے، یا اس کی سرحد کو چھو سکتے ہیں، لیکن اقبال کے افکار و خیالات، ان کے سوز و ساز کا سرچشمہ ہماری دسترس سے باہر تھا اور ہم ان کو پڑھ کر یا سن کر محسوس کرتے تھے کہ یہ کیسی اور عالم کے خیالات ہیں، اور اس کا تعلق ذہانت، علم اور وسعت مطالعہ سے نہیں "فیضان" سے ہے ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اس موقعہ پر ان چند سطور کا نقل کر دینا بے محل نہ ہوگا جو میں نے "روائع اقبال" میں اپنے اقبال کے کلام سے فریفتگی کی توجیہ میں لکھی تھیں:۔

"اقبال کو پسند کرنے کے اسباب بہت سے ہو سکتے ہیں اور ہر شخص اپنی پسند کے مختلف وجوہ بیان کر سکتا ہے، انسان کی پسند کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ وہ کسی فن پارے کو اپنے خوابوں کا ترجمان اور اپنے دل کی زبان پانے لگتا ہے، انسان بہت خود بین و خود پسند واقع ہوا ہے، اس کی محبت اور نفرت، تمناؤں اور دلچسپیوں کا مرکز و محور، بڑی حد تک اس کی ذات ہی ہوتی ہے، اس لئے اسے ہر وہ چیز اپیل

کرتی ہے، جو اس کی آرزوؤں کا ساتھ دے سکے اور اس کے احساسات سے ہم آہنگ ہو جائے، میں بھی اپنے کو اس کلیہ سے الگ نہیں کرتا، میں نے کلام اقبال کو عام طور پر اسی لئے پسند کیا ہے کہ وہ میری پسند کے معیار پر پورا اترتا اور میرے جذبات و محسوسات کی ترجمانی کرتا ہے، وہ میرے فکر و عقیدہ ہی کے ساتھ ہم آہنگ نہیں بلکہ اکثر میرے شعور اور احساسات کا بھی ہمنوا بن جاتا ہے۔

سب سے بڑی چیز جو مجھے ان کے فن کی طرف لے گئی وہ بلند حوصلگی، محبت اور ایمان ہے جس کا حسین امتزاج ان کے شعر اور پیغام میں ملتا ہے، اور جس کا ان کے معاصرین میں کہیں پتہ نہیں لگتا، میں بھی اپنی طبیعت اور فطرت میں انھیں تینوں کا دخل پاتا ہوں، میں ہر اس ادب اور پیغام کی طرف بے اختیار آ بڑھتا ہوں جو بلند نظری، عالی حوصلگی اور احیائے اسلام کی دعوت دیتا اور تسخیر کائنات اور تسخیر انفس و آفاق کے لئے اُبھارتا ہے، جو مہر و وفا کے جذبات کو غذا دیتا اور ایمانی شعور کو بیدار کرتا ہے، جو محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور ان کے پیغام کی آفاقیت و ابدیت پر ایمان لاتا ہے۔

میری پسند اور توجہ کا مرکز وہ اسی لئے ہیں کہ وہ بلند نظری محبت اور ایمان کے شاعر ہیں، ایک عقیدہ، دعوت اور پیغام رکھتے ہیں، اور مغرب کی مادّی تہذیب کے سب سے بڑے ناقد اور باغی ہیں، وہ اسلام کی عظمتِ رفتہ اور مسلمانوں کے اقبال گذشتہ کے لئے سب سے زیادہ فکرمند، تنگ نظر قومیت و وطنیت کے سب سے بڑے مخالف اور انسانیت و اسلامیت کے عظیم داعی ہیں۔[1]"

[1] ماخوذ از "نقوش اقبال"۔ ص ۳۳، ۳۴

حسن اتفاق سے مولانا مسعود عالم صاحب بھی اسی کے نخچیر اور اسی زلف (فکر و معنی) کے اسیر تھے ؎

تم ہوئے ہم ہوئے کہ میر ہوئے
سب اسی زلف کے اسیر ہوئے

ہم ایک دوسرے کو اقبالؔ کا کلام سناتے، اس کا لطف و ذوق لیتے، کبھی کسی عربی رسالہ میں ٹیگور کا ذکر بلند الفاظ میں دیکھتے یا ان کے کسی نظم کا ترجمہ نظر سے گذرتا (اس وقت تک مصر کے نوجوان ادیب و ناقد سید قطب تک ٹیگور کے بڑے قائل اور معترف تھے، اور ان کے کلام کو مشرق کی روحانی شاعری اور غیر مادّی و حسّی حقائق کی ترجمانی کا شاہکار سمجھتے تھے) تو ہم لوگوں کے مزاج میں اس سے سخت برہمی و آشفتگی پیدا ہوتی، اور طبیعت میں اس کا جوش اٹھتا کہ عالم عربی سے اقبالؔ کا تعارف کرایا جائے، مسعود صاحب کہتے تھے کہ مجھے شعر و نظم کے ترجمہ سے کچھ زیادہ مناسبت نہیں ہے، یہ کام آپ کیجئے، میں ان کا تعارف کراؤں گا، اور ان کے کلام پر تبصرہ کروں گا، ہم دونوں نے اس کا عزم کیا، مسعود صاحب کے بعض مضامین "الفتح" میں شائع ہوئے اور میری کوشش کی تکمیل کئی سال کے بعد "روائع اقبال" کی شکل میں سامنے آئی جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

اقبال کے کلام کی مستی اور سرشاری کا یہی زمانہ تھا کہ مجھے پنجاب کا ایک سفر پیش آگیا، غالباً مدرسۃ البنات جالندھر کی دعوت و تحریک پر (اس وقت مولوی عبدالحق صاحب کے فرزند عزیز گرامی عبیدالحق خاں دارالعلوم میں پڑھتے تھے) میں نے جالندھر کا سفر کیا وہاں سے لاہور گیا، جس کی کشش کے اسباب و ترغیبات بہت سی تھیں، میری پھوپھی صاحبہ اور عم محترم مولانا سید طلحہ صاحب وہاں تھے، حضرت مولانا احمد علی صاحب بھی تشریف رکھتے

تھے، ۱۶؍رمضان ۱۳۵۶ھ ۲۲؍نومبر ۱۹۳۷ء کو مولانا سید طلحہ صاحب کی معیت میں علامہ مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا، اس موقع پر میرے عزیز بھائی سید ابراہیم حسنی بھی ساتھ تھے کئی گھنٹے نشست رہی "دل را بہ دل رہیست" معلوم نہیں کیا بات ہے کہ علامہ مرحوم نے غیر معمولی طریقہ پر بڑا وقت دیا، باوجود علالت کے (جو آخری علالت ثابت ہوئی) ان کی طبیعت میں اول سے آخر تک بڑا انبساط اور شگفتگی رہی، ان کو طویل مرض کی نقاہت تھی، اور ان کے خادم خاص علی بخش چاہتے تھے کہ یہ مجلس برخاست ہو اور وہ آرام کریں، انھوں نے کئی مرتبہ آکر اس کی درخواست کی، مگر ہر مرتبہ علامۂ مرحوم نے اس کو نظر انداز کیا اور گفتگو میں منہمک رہے، اس موقعہ پر مولانا مدنیؒ کا تذکرہ بھی آیا، میں نے مولانا کی مدافعت اور صفائی میں کچھ عرض کیا، عجیب بات ہے کہ ڈاکٹر صاحب جو قومیت متحدہ کی تردید میں کچھ عرصہ پہلے اپنے مشہور شعر کہہ چکے تھے، سن کر خاموش ہو گئے اور کوئی لفظ تنقید کا نہیں فرمایا، میں نے اس مجلس کی روئداد واپسی پر "عارف ہندی کی خدمت میں چند گھنٹے" لکھ کر جالندھر سے نکلنے والے رسالہ "پیغام" کو دے دی اور وہ اس میں شائع ہوئی "روائع اقبال" اور اس کے اردو ترجمہ "نقوش اقبال" میں اس کا خلاصہ آگیا ہے، آخر میں ہم ہی لوگوں نے مناسب سمجھا کہ اجازت لی جائے اور علامہ کو آرام کا موقع دیا جائے، مجھے اس کے اگلے دن سفر بھی کرنا تھا، اور رمضان کا مہینہ تھا، ہم لوگ رخصت ہوئے، یہ آخری ملاقات تھی، اس ملاقات کے صرف پانچ مہینے بعد ۲۱؍اپریل ۱۹۳۸ء کو انھوں نے اس دنیا سے رحلت فرمائی۔

میں اس وقت سیرت سید احمد شہید کا اچھا خاصا کام کر چکا تھا، میں اس کا مسودہ اپنے ساتھ لے گیا تھا، خیال تھا کہ میں علامہ اقبال سے اس پر مقدمہ لکھنے کی درخواست

کروں گا، شائدان کی علالت کے خیال سے یا اس خیال سے کہ مسودہ ان کے پاس چھوڑنا پڑے گا اور میرے پاس اس کی نقل نہیں ہے، میں نے یہ خیال ترک کر دیا اور ان سے اس کا ذکر بھی نہیں کیا، اور شائد یہ اچھا ہوا کہ اس پر مقدمہ لکھنا مولانا سید سلیمان ندوی کے لئے مقدر تھا، اور انھوں نے ایسا مقدمہ لکھا جو خود ان کی تحریروں میں ایک خاص رنگ اور امتیاز رکھتا ہے۔

پٹنہ کا سفر

۱۹۳۸ء کو مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا انچاسواں[۴۹] اجلاس پٹنہ میں منعقد ہو رہا تھا، جس کی صدارت شیر بنگال مولوی فضل حق صاحب چیف منسٹر بنگال کو کرنی تھی، ہمارے رفیق گرامی اور مخلص دوست مولانا مسعود عالم صاحب چند مہینے پہلے (۱۹۳۷ء کے آخر میں) بعض ناگزیر اسباب کی بنا پر دار العلوم چھوڑ کر اخبار "مدینہ" کی ادارت کے لئے بجنور چلے گئے تھے، وہاں چھ سات مہینے رہ کر پھر دار العلوم آئے، اور صرف دو مہینے قیام کر کے خدا بخش لائبریری بانکی پور پٹنہ کے مرتب فہرست (CATALOGUER) ہو کر پٹنہ منتقل ہو گئے، اس کانفرنس میں ندوۃ العلماء کی نمائندگی کے لئے میرا انتخاب ہوا، میرے لئے اپنے قدیم دوست اور رفیق کار کی وہاں موجودگی تنہا باعث کشش تھی، میں بڑے شوق اور خوشی کے ساتھ پٹنہ گیا اور انھیں کا مہمان ہوا، کانفرنس میں شرکت کی، ایک نشست میں مولانا مسعود عالم صاحب کا مضمون لائبریری کے تعارف میں، میں نے ہی پڑھ کر سنایا (مولانا کی زبان میں قدرے لُکنت تھی) یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلم لیگ کے اثر اور پاکستان کی تحریک کی بنا پر مسلمان ایک بحرانی کیفیت میں مبتلا تھے، اور ان کے مزاج میں کسی ایسے

خاموش تعمیری اور سنجیدہ مجلس اور تقریر کو زیادہ دیر تک برداشت کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی تھی جس میں سیاسی جوش وخروش اور جذباتی غذا،۔۔۔اور جارحانہ لہجہ اور رجز خوانی نہ ہو، چنانچہ اس مضمون کو بھی بڑی بے دلی اور ناخوشگواری کے ساتھ سنا گیا، اور بعض گوشوں سے آواز آتی رہی کہ اب ختم کیجئے، مجھے یاد ہے کہ مولانا احمد سعید صاحب (ناظم عمومی جمیعۃ العلمائے ہند) جیسے خوش تقریر اور کامیاب مقرر (جن کو ہندوستانی مسلمانوں نے سحبان الہند کا خطاب دیا تھا) جب تقریر کے لئے کھڑے ہوئے اور خطبۂ مسنونہ کے بعد پہلا لفظ کہا تو نعرہ بازی اور ہوٹنگ شروع ہو گئی، جب انھوں نے قرآن شریف کی آیات وخطبہ مسنونہ شروع کیا لوگ خاموش ہوئے، اور جیسے ہی انھوں نے مجمع کو خطاب کیا پھر ہنگامہ شروع ہوا، نواب صدر یار جنگ مولانا شروانی (جنرل سکریٹری کانفرنس) نے اس پر ناگواری کا اظہار بھی کیا اور احتجاج بھی، لیکن کوئی اثر نہیں ہوا، سامنے کی بنچوں پر مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا سید مناظر احسن گیلانی، مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب تشریف رکھتے تھے، وہ بھی یہ تماشہ دیکھتے رہے، اور مسلمانوں کی اس کھلی جذباتیت پر دل ہی دل میں کڑھتے رہے، ایک صاحبِ نظر جس کی قوموں، ملتوں اور تحریکوں کی تاریخ اور لوگوں کی نفسیات پر نظر ہے، اس کو خطرہ کی گھنٹی سمجھ سکتا تھا، اور نتیجہ نکال سکتا تھا کہ یہ ملت جذبات کی رو میں آسانی سے بہہ جائیگی، میں نے اس سفر کا کچھ حال "پرانے چراغ" کے مضمون نواب صدر یار جنگ مولانا شروانی میں لکھا ہے۔

میں نے پٹنہ کے اس سفر سے ایک دوسرا فائدہ اٹھایا، صادق پور کی زیارت کی جس کا نام بچپن سے بہت عقیدت واحترام سے سنتا تھا جو سید صاحب کی شہادت کے بعد ان کی تحریک کا سب سے بڑا مرکز تھا، اور جس نے اس مقصد کے لئے سب سے زیادہ

خاموش تعمیری اور سنجیدہ مجلس اور تقریر کو زیادہ دیر تک برداشت کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی تھی جس میں سیاسی جوش وخروش اور جذباتی غذا... اور رجارحانہ لہجہ اور رجز خوانی نہ ہو، چنانچہ اس مضمون کو بھی بڑی بے دلی اور ناخوشگواری کے ساتھ سنا گیا، اور بعض گوشوں سے آواز آتی رہی کہ اب ختم کیجئے، مجھے یاد ہے کہ مولانا احمد سعید صاحب (ناظم عمومی جمیعۃ العلمائے ہند) جیسے خوش تقریر اور کامیاب مقرر (جن کو ہندوستانی مسلمانوں نے سحبان الہند کا خطاب دیا تھا) جب تقریر کے لئے کھڑے ہوئے اور خطبۂ مسنونہ کے بعد پہلا لفظ کہا تو نعرہ بازی اور ہوٹنگ شروع ہوگئی، جب انھوں نے قرآن شریف کی آیات وخطبہ مسنونہ شروع کیا لوگ خاموش ہوئے، اور جیسے ہی انھوں نے مجمع کو خطاب کیا پھر ہنگامہ شروع ہوا، نواب صدر یار جنگ مولانا شروانی (جنرل سکریٹری کانفرنس) نے اس پر ناگواری کا اظہار بھی کیا اور احتجاج بھی لیکن کوئی اثر نہیں ہوا، سامنے کی بنچوں پر مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا سید مناظر احسن گیلانی، مولانا ابو المحاسن محمد سجادؒ صاحب تشریف رکھتے تھے، وہ بھی یہ تماشہ دیکھتے رہے، اور مسلمانوں کی اس کھلی جذباتیت پر دل ہی دل میں کڑھتے رہے، ایک صاحب نظر جس کی قوموں ملتوں اور تحریکوں کی تاریخ اور لوگوں کی نفسیات پر نظر ہے، اس کو خطرہ کی گھنٹی سمجھ سکتا تھا، اور نتیجہ نکال سکتا تھا کہ یہ ملت جذبات کی رو میں آسانی سے بہہ جائیگی، میں نے اس سفر کا کچھ حال "پرانے چراغ" کے مضمون نواب صدر یار جنگ مولانا شروانی میں لکھا ہے۔

میں نے پٹنہ کے اس سفر سے ایک دوسرا فائدہ اٹھایا، صادق پور کی زیارت کی جس کا نام بچپن سے بہت عقیدت و احترام سے سنتا تھا جو سید صاحب کی شہادت کے بعد ان کی تحریک کا سب سے بڑا مرکز تھا، اور جس نے اس مقصد کے لئے سب سے زیادہ

قربانیاں دیں، خوش قسمتی سے اس وقت تک مولانا یحییٰ علی صاحب کے فرزند مولوی موسیٰ صاحب حیات تھے، ان کی زیارت کی، اس خاندان کے ایک باخبر فرد مولوی عبدالغفار صاحب سے بہت قیمتی و مفید معلومات حاصل ہوئے، مولانا یحییٰ علی صاحب کا وہ خط بھی دیکھا جو انھوں نے خواب میں زیارت نبویؐ کے بعد اپنے فرزندوں اور عزیزوں کے نام (پورٹ انڈمان سے) لکھا تھا، ڈاکٹر عظیم الدین صاحب اور مولانا حکیم عبدالخبیر صاحب کی خدمت میں بھی حاضری ہوئی اور مجالس رہیں، ان سب موقعوں پر مولانا مسعود عالم صاحب میرے رہبر اور رفیق رہتے تھے، اور وہی ذریعۂ تعارف تھے۔

مسلم یونیورسٹی کے لئے دینیات کے کورس کی ترتیب اور مسلم یونیورسٹی میں مختصر قیام

۱۹۳۸ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ دینیات کے صدر مولانا سید سلیمان اشرف صاحب کی طرف سے اخبارات میں اعلان شائع ہوا کہ مسلم یونیورسٹی کے بی۔اے کلاس کے لئے دینیات کی ایسی کتاب کی ضرورت ہے جس میں بنیادی عقائد، ضروری مسائل، سیرت نبویؐ اور تاریخ اسلام کے وہ سب ضروری معلومات ہوں جو اس سطح اور معیار کے نوجوان طلباء کے لئے ضروری ہیں، یہ بھی اعلان تھا کہ اگر یہ کتاب معیار پر پوری اتری تو پانچ سو روپیہ معاوضہ پیش کیا جائے گا۔

میں نے بھی توکلاً علی اللہ مولانا کی خدمت میں اس کی تالیف کی پیش کش کردی اور وہ منظور ہوگئی، غالباً اس میں ندوہ میں مدرّسی اور میرے والد صاحب کی نسبت کا بھی دخل ہو گا جن سے مولانا نہ صرف واقف تھے، بلکہ مدّاح تھے، میں نے غالباً دو تین مہینے میں یہ کتاب تیار کرکے بھیج دی، مولانا نے پسند فرمایا، لیکن مولانا ابوبکر صاحب

ناظم دینیات کی وساطت سے مجھے یہ پیغام بھجوایا کہ میں کچھ روز کے لئے علی گڑھ چلا آؤں مولانا کتاب کے بعض مضامین کے بارہ میں گفتگو فرمائیں گے، اور اگر کسی ترمیم و اضافہ کی ضرورت ہوئی تو یہ کام آسانی سے ہو سکے گا، میں ڈیڑھ دو مہینے کے لئے علی گڑھ گیا، مولانا ابوبکر صاحب نے اپنے دفتر دینیات میں جو سرسید ہال کی جامع مسجد کے مشرقی جنوبی گوشہ میں تھا (اور غالباً اب بھی ہے) مجھے ٹھہرایا، میں انہیں کا مہمان تھا، شام کو مولانا سلیمان اشرف صاحب کی مجلس میں حاضر ہوتا اور بعض بعض مضامین پر تبادلۂ خیال کرتا، مجھے ان کے وسیع و طویل تدریسی تجربہ، ان کے گرانقدر مشوروں اور رہنمائی سے بڑا فائدہ ہوا، وہ غیر معمولی طور پر ذہین اور خوددار واقع ہوئے تھے، یونیورسٹی کے بڑے سے بڑے ذمہ دار (وائس چانسلر سے لے کر اعلیٰ پروفیسروں تک) سے مرعوب نہ تھے، بلکہ وہی ان کی خدمت میں نیاز مندانہ و شاگردانہ حاضر ہوتے، مؤدب بیٹھتے اور ان کی ان اداؤں کو نہ صرف برداشت کرتے بلکہ ان کا لطف لیتے، معلوم ہوتا تھا کہ مولانا سارے علمائے دین کی طرف سے جدید تعلیم کے سب سے بڑے مرکز میں علماء کے وقار و احترام کا نقش قائم کرنے اور جدید طبقہ سے بعض اوقات جو طنز و استہزا دیکھنے میں آتا اس کا جواب دینے کا فرض کفایہ ادا کرنے کے لئے یہاں تشریف رکھتے ہیں۔[1]

پانچ سو (۵۰۰) روپیہ کی رقم اس وقت اشیاء کے نرخ اور ارزانی کے پیش نظر میری حیثیت اور یافت کے مقابلہ میں بڑی گرانقدر رقم تھی، گویا اس زمانہ کے پانچ ہزار، مجھے اس کے اظہار میں کوئی باک نہیں کہ اتنی بڑی رقم سے جو مجھے اس سے پہلے کبھی حاصل نہیں ہوئی تھی،

---

[1] ان خصوصیات کے لئے ملاحظہ ہو پروفیسر رشید احمد صدیقی کی کتاب "گنجہائے گرانمایہ" کا مضمون "مولانا سید سلیمان اشرف صاحب"۔

مسرت و عزت محسوس ہوئی، مولانا سید سلیمان ندوی نے از راہ شفقت اپنے دو خطوط میں اس پر بکرّر مبارکباد دی[1]۔

مولانا ابوبکر محمد شیث صاحب فاروقی

ان دنوں مولانا ابوبکر محمد شیث صاحب فاروقی ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی کو اور قریب سے اور دیر تک دیکھنے کا موقع ملا کہ ان کا مہمان ہی نہ تھا، ایک عزیز فرد خاندان بھی تھا، وہ میرے نانا صاحب کے مُرید اور میرے شفیق ماموں کے مخلص دوست، ندوہ کے رکن انتظامی، اور ہمارے گھر کے بچہ بچہ سے واقف تھے، میں نے ان کی جیسی دل آویز اور جامع شخصیت کم دیکھی ہے، وہ اس تہذیب اور اس قدیم نظامِ تعلیم و تربیت کا دل کش نمونہ تھے، جس کی خصوصیت علم و عمل کی جامعیت، ثقافت کی وسعت و تنوّع، خوش ذوقی، و سبک روحی تھی، وہ تمام علوم قدیمہ میں قدم راسخ رکھتے تھے، صاحب نظر فقیہ تھے، اعلیٰ درجہ کے ہیئت و ریاضی داں تھے، (یونیورسٹی کی دھوپ گھڑی اور تقویم کا تیار کرنا انھیں کا کام تھا) فارسی اور اردو شاعری کا اعلیٰ مذاق رکھتے تھے، اور بکثرت اشعار ان کو یاد تھے، "مغز نغز" کے نام سے مثنوی مولانا روم کا انھوں نے انتخاب شائع کیا ہے، علم مجلسی اور واقفیتِ عام میں ایسے امتیاز خاص کے مالک تھے کہ یونیورسٹی کے اعلیٰ پروفیسران ان کی مجلس میں شریک ہونا نہ صرف باعث سعادت بلکہ ذریعہ اضافۂ معلومات سمجھتے، اس سب کے ساتھ اپنے خاندانی مسلک و روایات (سید شہیدؒ کے مسلک توحید، اتباع سنت اور ردّ بدعت) میں بے لچک تھے، اور اس میں مداہنت یا مروّت گوارہ نہ تھی، خودداری، مہمان نوازی اور "الید العلیا خیرٌ من الید السفلیٰ" پر عمل کرنے میں انھوں نے علمائے سلف

[1] ملاحظہ ہو "پرانے چراغ" حصہ اول

اور شرفائے ماضی کی یاد تازہ کردی تھی، اِن یگانہ خصوصیات اور متضاد صفات کی وجہ سے وہ پوری یونیورسٹی کے حلقہ میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، اس میں مولانا سلیمان اشرف بھی ان کے شریک تھے (لیکن اس فرق کے ساتھ کہ مولانا ابوبکر صاحب احترام کے ساتھ محبوب و ہردل عزیز بھی تھے) مسلم یونیورسٹی کے احاطہ میں شاید یہ میرا طویل ترین قیام ہو، قیام بھی بالکل مرکزی حصہ (S. S. HALL) میں مسجد کے حجرہ میں تھا، مولانا ابوبکر صاحب کے یہاں کھانے کے وقت جاتا تو یونیورسٹی کا احاطہ طے کر کے باب اسحٰق سے نکل کر ذکاء اللہ روڈ جاتا، جہاں مولانا کا مکان تھا، اس وقت کا احساس یہ ہے کہ طلباء میں تہذیب اور علماء کا احترام تھا، ایسا کم اتفاق ہوا ہوگا کہ مجھے سلام میں سبقت کا موقعہ ملا ہو، طلباء دیکھتے ہی السلام علیکم کہتے، میں نے اپنی اس آمد و رفت میں جو دن میں کم سے کم تین مرتبہ ہوتی، کوئی طنزیہ فقرہ یا کوئی پھبتی نہیں سنی، بخلاف لکھنؤ یونیورسٹی کے ہوسٹلوں کے (جہاں سے اکثر دارالعلوم جاتے ہوئے گزرنا ہوتا تھا) کہ وہاں سے ہم جیسے لوگوں کا گزرنا دعوت مذاق دیتا تھا۔

مسلم لیگ اور خاکسار تحریک کا جوش و خروش

یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلم لیگ کی تحریک (جس کا چودھری خلیق الزماں صاحب کی وجہ سے جو ہمارے قریب ہی رہتے تھے، لکھنؤ ایک بڑا مرکز تھا) اپنے شباب پر تھی، جمیعۃ العلماءٗ اور خاص طور پر مولانا مدنیؒ کے اس سے اختلاف اور کانگریس میں شامل ہونے کی وجہ سے اس میں علماء کی تحقیر و مخالفت کا عنصر شامل ہو گیا تھا، رفتہ رفتہ اس کا رُخ عام طبقۂ علماءٗ کی طرف پھر گیا تھا، پارکوں میں، ہوٹلوں اور چائے خانوں میں طنز و تضحیک کا مشغلہ تھا،

ہمارا گھر مولانا مدنی کی لکھنؤ کی قیامگاہ ہونے کی وجہ سے جمعیۃ العلماء کے ہم خیالوں کا اڈہ اور مرکز سمجھا جانے لگا تھا، ادھر کچھ افتادِ طبع، کچھ خاندانی روایات، کچھ فکر و مطالعہ اور کچھ مولانا مدنی کی ذات سے عقیدت اور ان کے خلوص و ایثار پر کامل اعتماد کی وجہ سے گھر کا بچہ بچہ جمعیت کا حامی تھا، اور اس کو لیگ سے ایک طرح کا بُعد تھا، مولانا تشریف لاتے تو التزاماً و احتراماً وہی نمازوں کے امام اور جمعہ کے خطیب ہوتے، محلہ والے (جن کی اکثریت اس وقت پوری ملت کی طرح اس جذباتی رَو میں بہہ رہی تھی) ان کی امامت پر چیں بجبیں ہوتے، لیکن ہمارے خاندان کے احترام اور بھائی صاحب کے لحاظ سے کوئی بول نہیں سکتا تھا، ہم لوگوں نے صاف کہدیا تھا کہ نماز مولانا ہی پڑھائیں گے، جو نہ پڑھنا چاہے وہ کسی دوسری مسجد میں چلا جائے۔

اس سے زیادہ اشتعال و ابتذال خاکسار تحریک نے پیدا کر دیا تھا، علامہ مشرقی کے پے در پے رسائل "مولوی کا غلط مذہب" ۱-۲-۳ نکل رہے تھے، عوام کی زبانیں (جو ان کی تنظیم، پریڈ اور بیلچہ سے مرعوب تھے، اور مسلمانوں میں فوجی طاقت دیکھنے کے آرزومند تھے) بڑی بے باک ہو گئیں تھیں، اور دیندار، سلیم الطبع اور صاحب علم طبقہ سے تبرّی تبرّا کے حد تک پہونچ گئی تھی، اسی زمانہ میں علامہ مشرقی لکھنؤ آئے گرفتار ہوئے اور معافی مانگ کر یو۔پی سے باہر چلے گئے، اسی زمانہ میں "الفرقان" میں تحریک خاکسار پر میرا تنقیدی مضمون شائع ہوا جس میں میں نے علمی انداز میں اس تحریک کا محاسبہ کیا تھا، اور خوارج اور باطنیوں کی مثال کو سامنے رکھ کر اس سے ان کا موازنہ کیا تھا، اور ثابت کیا تھا کہ محض نظم و اتحاد جوش و خروش، قربانی، ڈسپلن اور نظام، حتیٰ کہ کثرت عبادت بھی (جو خوارج کا طرّۂ امتیاز تھا) حقانیت اور مقبولیت عند اللہ کی ضامن نہیں، اصل چیز صحتِ اعتقاد، مقصد کا

درست ہونا اور اتباع شریعت ہے۔

سیرت سید احمد شہیدؒ کی طباعت اور اس کی مقبولیت

مسلم لیگ کی بعض فکری خامیوں اور حدود سے بڑھی ہوئی جذباتیت اور خاکسار تحریک کے عامیانہ پن اور جارحانہ انداز کے باوجود یہ حقیقت تھی کہ مسلمان اس وقت ایسی دعوت اور لٹریچر کے آرزومند بھی تھے اور ضرورت مند بھی جو ان میں خود شناسی، خود نگری اور بلند نگاہی پیدا کرے، جو ان کو غلامی کے طریق سمجھانے اور ہندوستان میں بے زبان و بے عذر رعیت اور تابع فرمان شہری بننے کے بجائے باوزن و باوقار اور صاحبِ عزت و اعتبار ملت بننے کی دعوت دے اور ان کے قریبی اسلاف کے مجاہدانہ کارناموں کو سامنے لاکر ان میں ایثار و قربانی کی روح پیدا کر دے، بقول اقبالؔ ؎

موت کے آئینہ میں تجھ کو دکھا کر رخِ دوست
زندگی تیرے لئے اور بھی دشوار کرے

دے کے احساسِ زیاں تیرا لہو گرما دے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے

فتنۂ ملت بیضا ہے امامت اس کی
جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے[1]

انھوں نے تحریک قادیانیت کو سامنے رکھ کر یہاں تک کہا تھا ؎

وہ نبوّت ہے مسلماں کے لئے برگِ حشیش
جس نبوّت میں نہیں شوکت و قوت کا پیام

ادھر برادران وطن کے طرز عمل (جس کا تجربہ ان کے ساتھ کام کرنے والوں کو ہوتا رہتا تھا) ان کے احساس برتری بلکہ یکتائی اور کانگریس کی تحریک رابطہ عوام (MASS CONTACT)

---

[1] ضرب کلیم۔

نے مسلمانوں میں ردّ عمل کی ایک طاقتور تحریک اور ملّی وحدت وقوت کا شعور اور ایک نئی بیداری کی لہر (جو زیادہ واضح اور شعوری نہیں تھی) پیدا کر دی تھی، اور ان کو صالح غذا صحیح رہنمائی اور بے اعتدالی سے بچانے کی ضرورت تھی، یہ خالص تقدیری بات تھی کہ ٹھیک اس زمانہ میں میری کتاب "سیرت سید احمد شہید" ۱۹۳۹ء کے آغاز میں مطبع نامی پریس لکھنؤ سے چھوٹے سائز میں ۴۶۴ صفحات میں چھپ کر نکلی[۱]، جس پر مولانا سید سلیمان ندوی کا ولولہ انگیز و فاضلانہ مقدمہ "مسافر اسلام ہندوستان کے غربتکدہ میں" کے عنوان سے تھا جس میں سید صاحب نے دل کھول کر سید شہیدؒ کے کارنامۂ جہاد و اصلاح و تجدید کا تعارف کرایا تھا، اور نوعمر مصنف کی (جس کی یہ پہلی تصنیف تھی) پوری حوصلہ افزائی بلکہ عزت افزائی فرمائی تھی، یہ مقدمہ خود سید صاحب کی ادبی و تاریخی تحریروں میں امتیاز رکھتا ہے، اور اس میں ان کا اندرونی جذبہ اور دلی عقیدت صاف جھلکتی ہے، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور مولانا عبد الماجد دریابادی کے۔۔۔ مختصر آراء اور تاثرات بھی شامل تھے، میں نے کتاب کا یہ پہلا ایڈیشن اپنے شفیق ترین ماموں مولوی حافظ سید عبید اللہ صاحب مرحوم کے نام معنون کیا تھا جن کی ۳۱ مئی ۱۹۳۸ء کو (کتاب کی اشاعت سے چند مہینے پہلے) وفات ہوئی تھی۔

اس وقت مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری مرحوم کی "سوانح احمدی" اور مرزا حیرت کی "حیات طیّبہ" (جو اصلاً مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کی سوانح ہے) کے علاوہ اردو میں کوئی اور کتاب اس موضوع پر دستیاب نہ تھی، اور وہ دونوں قدیم طرز پر تھیں، اچھے اچھے

---

[۱] اس پر طابع و ناشر کی حیثیت سے ہمارے ایک عزیز برادر محترم معین الدھر صاحب ہنسوی کا نام تھا، اور انھیں کے نام آرڈر آتے تھے۔

تعلیم یافتہ اصحاب کے معلومات سید صاحب سے متعلق بہت ناقص اور سطحی تھے، ان کے متعلق عام تصور یہ تھا کہ وہ پچھلی صدی کے ایک صاحب جذب و کرامات شیخ طریقت تھے، جنھوں نے مجاہدین کی ایک جماعت مہیّا کر کے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سلطنت کے خلاف اعلان جہاد کیا اور چند معرکوں کے بعد اپنے مخلص رفیقوں کے ساتھ بالاکوٹ کے میدان میں شہید ہو گئے، اور اس طرح ان کی مجاہدانہ سعی کا خاتمہ ہو گیا، سنجیدہ علمی اور سیاسی حلقوں میں ان کی ذات اور ان کی شخصیت اور کارناموں کا اس سے زیادہ بلند اور واضح تصوّر پایا نہیں جاتا تھا، اور نہ ان کی سیرت و حالات کی تحقیق و جستجو اور تبلیغ و اشاعت کی کوئی سنجیدہ کوشش و تحریک پائی جاتی تھی، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مسلمانانِ ہند کا حافظہ رفتہ رفتہ اس عظیم شخصیت اور اس کے کارناموں کو فراموش کر دے گا۔

یہ کتاب اپنی تمام کوتاہیوں کے ساتھ پہلی کتاب تھی جو عصر حاضر کے مذاق کے مطابق لکھی گئی، اور اس میں سب سے پہلے سید صاحب کی دعوت و تحریک کے وسیع تر اور بلند تر مقاصد کے پیش کرنے کی کوشش کی گئی اور ان کی جماعت اور رفقاء کی ایمانی کیفیات، اخلاقی خصوصیات اور ان کی حیرت انگیز تنظیم و جد و جہد اور قربانیوں کی روداد پیش کی گئی، نیز اس میں پہلی مرتبہ یہ دکھایا گیا کہ سید صاحب کا مقصود محض پنجاب میں مسلمانوں پر ظلم و ستم کا سدِّباب کرنا نہ تھا، بلکہ خلافت اسلامیہ کا احیاء اور حکومت علیٰ منہاج النبوت کا قیام و تاسیس تھا، اور ان کی کوشش کا میدان صرف پنجاب کی سکھ حکومت نہ تھی، بلکہ اصل مقصود وہ ہندوستان تھا، جو اس وقت انگریزوں کے اقتدار و تسلّط میں آگیا تھا، اس کتاب میں انگریزوں کے خلاف سید صاحب کی جماعت کی مجاہدانہ سرگرمیوں اور انگریزوں کے

ظلم وستم اور انبالہ جیل اور انڈمان کے مظلومین کے صبر واستقامت کی داستان بھی سنائی گئی تھی، جو حد درجہ اثر انگیز، ایمان آفریں اور سبق آموز تھی، اور جس کو پڑھ کر سرد سے سرد دل میں حرارتِ ایمانی اور غیرتِ اسلامی کا شعلہ بھڑکے بغیر نہیں رہ سکتا۔

واقعہ یہ ہے کہ موضوع کی عظمت صاحب سیرت کے مقام اور تصنیفی آداب و لوازمات کے لحاظ سے نہ میری عمر (جو اس وقت ۲۴ سال سے زیادہ نہ تھی) اس کے لئے موزوں تھی نہ اتنی قلیل مدت اور محدود ماخذ جو مصنف کے پیش نظر ہے اس کے لئے موزوں و کافی تھے، مگر یہ صاحب سوانح (مجاہد کبیر حضرت سید احمد شہیدؒ) کی مقبولیت عند اللہ تھی، اور وقت کی مناسبت کہ معلوم ہوا کہ کسی نے ملت کے زخم پر مرہم رکھدیا اور اس کے خاموش ساز کو چھیڑ دیا اور ملت کی زبان اس طرح گویا ہوئی ؎

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

کتاب ہاتھوں ہاتھ لی گئی اور عقیدت و قدر کی نگاہ سے پڑھی گئی، مسجدوں مجلسوں میں پڑھ کر سنائی گئی، گمنام و نوعمر مصنف کے پاس گہرے تأثر اور اعتراف و تحسین کے ایسے خطوط آئے جو اس کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھے، بعض ایسے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں جو اسلام کی قوت حیات بخشی اور مسیحائی سے مایوس اور الحاد و کمیونزم کے خیالات کا شکار ہو گئے تھے، دینی رجحان اور ایمانی شعور کے بیدار ہونے کی اطلاع ملی، بعض بعض لوگوں نے اس کو ۸، ۸، ۱۰، ۱۰ مرتبہ پڑھا، یہاں پر صرف دو گرامی مرتبت شخصیتوں کے دو خطوں کے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں، ایک حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کا، دوسرا فاضل جلیل مولانا عبد الباری ندوی کا، کتاب کی اشاعت کے بعد میرے محترم رفیق مولانا

محمد منظور صاحب نعمانی نے حضرت تھانوی کی خدمت میں دو کتابیں ایک اہل تعلق کے ذریعہ ہدیۃً نذر کیں، ایک "سیرت سید احمد شہیدؒ" دوسری مولانا مودودی مرحوم کی کتاب "پردہ" جس کا اس زمانہ میں بڑا چرچا تھا، اور دینی حلقوں میں عام طور پر پسند کی گئی تھی مولانا نے اس کی رسید کے طور پر حسب ذیل الفاظ لکھے:۔

"میرے اصول میں سے یہ بھی ہے کہ اپنے احباب کے عطایا سے قلب پر جو اثر ہوتا ہے اس کا اخفا نہیں کرتا چنانچہ اس ہدیہ سے خصوص سیرت شہید سے قلب پر دو اثر ہوئے، ایک مسرّت کا، دوسرا خجلت کا، وہ خجلت یہ کہ کتاب دیکھ کر اپنی ناکارگی سامنے آجاتی ہے کہ ہم میں نہ ہمت نہ غیرت، بہائم کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں کہ بجز خواب و خور کے کوئی شغل نہیں، لہذا ایسی چیزیں اگر ایسوں کو دی جائیں جو ان سے کام لیں تو ہدیہ ضائع نہ ہو، اب دعاء کی درخواست پر ختم کرتا ہوں اللہ تعالیٰ اپنے بزرگوں کا اتباع نصیب فرمائے۔[1]"

اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ میں جب ۱۹۴۲ء کے موسم گرما میں تھانہ بھون حاضر ہوا (جب کتاب کی طباعت پر تقریباً ڈھائی تین سال گزر چکے تھے) تو میں نے دیکھا کہ مولانا کے ڈکس پر جو کہ سامنے تھا، اور جس پر آئی ہوئی ڈاک اور لکھنے کے کاغذات رکھے ہوئے تھے "سیرت سید احمد شہیدؒ" رکھی ہوئی تھی، چونکہ اس کی جلد پر سونے کی ڈائی تھی، اور نام سونے کی پانی کی وجہ سے چمک رہا تھا، اس لئے دیکھنے میں کوئی اشتباہ نہ تھا۔

مولانا عبد الباری صاحب لکھنؤ سے حیدر آباد جا رہے تھے، میں نے ان کی خدمت

---

[1] یہ مکتوب گرامی ذاتی مرقعہ خطوط میں محفوظ ہے یہ اقتباس "پرانے چراغ" حصہ اول سے ماخوذ ہے مکتوب پر تاریخ درج نہیں ہے۔

میں کتاب پیش کی، ٹرین ہی پر انھوں نے اس کا مطالعہ فرمایا اور حیدر آباد پہونچکر حسب ذیل مکتوب تحریر فرمایا:۔

عثمانیہ کالج ڈاک خانہ لالہ گوڑہ، حیدر آباد دکن
۱۲ مارچ ۱۹۳۹ء

برادرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

سید صاحب کے حالات میں آپ کی کتاب سفر میں ختم کی بلکہ کہنا چاہئے کہ یہ سفر کاملین ایمان کی مجلس وصحبت میں تھا، اسلام و ایمان انھیں بزرگوں کا تھا، باب چہارم[1] پڑھ کر تو یہ سنگ دل بھی اپنی آنکھوں کو خشک نہ رکھ سکا جو ہمیشہ تری کو ترسا کرتی ہیں، واقعی مسلمانوں کے اندر ایمان کو زندہ رکھنے کے لئے ایسے ہی احوال و سوانح کی ضرورت ہے فجزاکم اللہ عن المسلمین میرے تو اس یقین کو بھی آپ کی کتاب نے اور مضبوط کر دیا کہ مسلمانوں کا کام آج کی انجمن بازیوں اور انجمن سازیوں سے ہرگز نہ چلے گا، اس کا کام کسی سرکیف مومن کامل فرد ہی سے چلے گا جس کے گرد خود ہی ہر خدمت و صلاحیت کے مخلصین جمع ہو جائیں گے اور ایمانیوں کی سچی انجمن وہی ہو گی۔"

مولانا سید سلیمان ندوی کی ہمرکابی میں ایک تاریخی سفر

سید صاحبؒ کو اس کتاب کا مطالعہ فرمانے پھر اس پر ذوق و شوق سے مقدمہ لکھنے سے اس کے ناچیز مصنف سے (جس پر محض استاد زادہ اور دار العلوم کے ایک عام مدرس کی

---

[1] باب چہارم کا عنوان ہے "سید صاحب کی شہادت کے بعد آپ کی جماعت کی مذہبی و سیاسی خدمات جماعت کی سیرت آپ کے خلفاء اور مریدین، مسلمانوں کی عظیم الشان تنظیم" ص۳۱۷۔ ص۴۶۴

حیثیت سے شفقت تھی) تعلق بہت بڑھ گیا اس تعلق نے اپنے ظہور و ثبوت کے لئے ایک راستہ پیدا کر لیا (جو ایسے موقعہ پر ہوا کرتا ہے) سید صاحب کو کرنال (مشرقی پنجاب) کے مشہور مدرسہ اسلامیہ کے معاینہ کی دعوت دی گئی تھی، جو چند سال پہلے بڑے عزائم و اعلیٰ مقاصد کے ساتھ تبلیغ اسلام کے لئے قائم کیا گیا تھا، اور اس کے لئے شمشیر جنگ نواب عظمت علی خاں بہادر کرنالی نے ایک جائداد وقف کی تھی، سید صاحب نے مجھے اپنی ہمرکابی اور اس بہانہ سے ازدیاد تعلق و اعتماد و علمی رہنمائی کا شرف بخشا، دیباچہ کے ساتھ اپنے مکتوب میں تحریر فرمایا۔

"مارچ کے شروع میں کرنال کے مدرسہ اسلامیہ کے معاینہ کے لئے جانا ہے آپ بھی چلنے کو تیار رہیئے۔"

اس سفر میں (جس کی مختصر روداد "پرانے چراغ" حصہ اول میں سید صاحب کے تذکرہ میں ضروری حد تک آگئی ہے) کرنال، پانی پت، تھانیسر اور دہلی جانا ہوا اور مجھے بیش قیمت علمی و اخلاقی و ادبی فوائد حاصل ہوئے، بہت سی ممتاز شخصیتوں اور بعض ناموروں (مولانا حالیؔ، مولوی ذکاء اللہ دہلوی) وغیرہ کے اخلاف سے ملنے اور بہت سے بزرگوں کے مزارات پر حاضری اور ان کے حالات سننے کا موقع ملا۔[1]

رسالہ "الندوہ" کا سہ بارہ اجرا

رسالہ "الندوہ" جولائی ۱۹۰۴ئ میں مولانا شبلی اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی ادارت میں ہندوستان کے علمی مطلع پر ایک نئے سیارہ کی حیثیت سے طلوع ہوا تھا،[2] اس وقت

---

[1] ملاحظہ ہو "پرانے چراغ" حصہ اول ص ۲۹۔ ص ۳۳ [2] رسالہ دسمبر ۱۹۱۲ء تک جاری رہ کر بند ہو گیا۔

اچھے اچھے اہل قلم اور اہل علم کے لئے اس میں ان کا مضمون شائع ہوجانا اعزاز کی بات اور ذریعۂ تعارف تھا، مولانا ابوالکلام آزاد ہندوستان کی سیاسی و ادبی افق پر بدر کامل بننے سے پہلے اس کے سب ایڈیٹر کی حیثیت سے اسی نظام شمسی کے "ہلال" تھے جس نے کچھ عرصہ کے بعد عید کے چاند کی طرح سارے ہندوستان کے مسلمانوں کی نگاہوں کو اپنے اوپر مرکوز کرلیا تھا۔

دوبارہ جولائی ۱۹۱۴ء میں پھر یہ رسالہ مولوی اکرام اللہ خاں صاحب ندوی کی ادارت میں نکلا اور دسمبر ۱۹۱۶ء میں بند ہوگیا، سید صاحب کی جب دلچسپی ندوہ سے بڑھنی شروع ہوئی اور انھوں نے اس کے دور اول کی یاد تازہ کرنی چاہی تو ۱۹۴۰ء میں اس کے سہ بارہ اجرا کا قصد فرمایا، قحط الرجال کی بات کہ اس کی ادارت کا قرعۂ فال مرے اور رفیق محترم مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی کے نام نکلا، رسالہ زمانہ کے تغیر اور نوعمر مدیروں کی عدم شہرت و پختگی کی وجہ سے اس معیار اور درجہ کو تو نہ پہونچ سکا جس پر وہ دور اول میں فائز تھا، مگر ملک کا ایک سنجیدہ، باوقار، معلومات افزا اور فکر انگیز علمی و دعوتی رسالہ شمار ہونے لگا، جب مولانا سید سلیمان ندوی، نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا ضیاء الحسن علوی ندوی (ایم۔ اے) وغیرہ کے مضامین شائع ہوئے۔

نومبر ۱۹۴۰ء میں مجھے خیال آیا کہ میں اس میں "مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں" کے عنوان سے ایک سلسلۂ مضامین شائع کروں کچھ عرصہ پہلے مصر کے مشہور رسالہ "الهلال" میں ایک سلسلۂ مضامین "الكتب التي أفادتني" شائع ہوا تھا جس میں مصر کے نامور اہل قلم نے حصہ لیا تھا، جو مستقل اسلوب اور دبستانِ فکر کے بانی تھے، میں نے اپنی معلومات کی حد تک

ہندوستان کی ممتاز و نامور شخصیتوں (قدیم و جدید حلقہ کی) کے نام خطوط لکھے اور ان سے درخواست کی کہ وہ ان کتابوں کا ذکر کریں جن کا ان کی سیرت کی تعمیر اور ان کے فکر و خیال کی تشکیل اور ان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں انقلاب انگیز اور بنیادی حصہ ہے، جوابات ہمت افزا آئے، اور تقریباً ۱۵ نامور اہل قلم و اہل علم نے مضامین لکھ کر بھیجے جن میں نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا سید مناظر احسن گیلانی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا عبدالباری صاحب ندوی، پروفیسر سید نواب علی، مولانا عبیداللہ سندھی (جو اس زمانہ میں ہندوستان تشریف لے آئے تھے) علامہ عبدالعزیز میمنی، مولانا اعزاز علی صاحب، مولانا شاہ حلیم عطا صاحب، مولانا سید طلحہ صاحب، مولانا بدرالدین علوی، مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی، میاں بشیر احمد صاحب مدیر "ہمایوں" اور خواجہ غلام السیدین شامل تھے، افسوس ہے کہ فروری ۱۹۴۲ء میں یہ رسالہ ملک کی ناقدری اور خریداروں کی کمی کی وجہ سے بند کرنا پڑا۔[1]

چند تبدیلیاں اور نئی آمد

۱۳۵۶ھ ۱۹۳۷ء میں مولانا مسعود عالم صاحب ندوی نے دارالعلوم سے ترک تعلق کیا اور اخبار "مدینہ" کی ادارت کے لئے بجنور چلے گئے، ۶-۷ مہینے رہ کر پھر دارالعلوم چلے آئے، لیکن صرف دو مہینے قیام کرنے کے بعد پٹنہ چلے گئے، اور خدابخش خاں مرحوم کی شہرۂ آفاق لائبریری بانکی پور پٹنہ میں مرتّب فہرست (CATALOGUER) کے عہدے پر ان کا

[1] یہ مجموعہ مضامین "مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں" کے نام سے مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب نے مکتبہ دارالعلوم سے ..... میں شائع کر دیا، آخر میں ان کے اصرار سے مجھے بھی ایک مضمون لکھنا پڑا جو کتاب کا اختتام ہے

تقرر ہوا، جس کے لئے وہ ہر طرح سے موزوں تھے، اس طرح میں اپنے ایک رفیق قدیم، معاون و مشیر اور ہمدم و دم ساز کی رفاقت سے محروم ہوگیا، لیکن یہ کمی بہت کچھ مولانا محمد ناظم صاحب ندوی کی آمد سے پوری ہوئی جو جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں استاد ادب عربی کی حیثیت سے (جس کے لئے وہ دارالعلوم ... کی طرف سے بھیجے گئے تھے) کام کرنے کے بعد ۲۹ جنوری ۳۸ء کو اپنے مادر علمی میں آگئے، اور ۱۹۴۸ء تک وہ بحیثیت استاد اعلیٰ ادب عربی اور کچھ عرصہ بحیثیت مہتمم دارالعلوم خدمت انجام دینے کے بعد پاکستان منتقل ہوگئے، جہاں شیخ الجامعہ "بھاولپور" کے معزز عہدہ پر سالہا سال فائز رہے، وہ ادب عربی، نحو و بلاغت اور علوم عربیہ میں پختہ استعداد، عمیق نظر اور وسیع علم رکھتے تھے، اور ہلالی صاحب کے ممتاز ترین شاگردوں میں تھے، میری ان کی تدریسی زندگی، تبلیغی اسفار (جن کا ذکر بعد میں آئیگا) قیام و طعام اور علمی مذاکرہ میں ایسی رفاقت رہی جو کم دوستوں کے ساتھ رہی تھی۔

۳۹ء میں دارالعلوم کے اساتذہ اور شیوخ میں ایک گرانقدر اضافہ ہوا جس سے دارالعلوم کے طلبہ ہی کو نہیں، اساتذہ اور علمی کام کرنے والوں کو بھی بڑی مدد اور رہنمائی حاصل ہوئی، یہ مولانا شاہ حلیم عطا صاحب سلونی کا، بحیثیت استاد حدیث کے تقرر تھا، مجھے طالب علمی کے زمانہ سے اُن سے تعارف کا شرف حاصل تھا کہ وہ ہمارے جوار (سلون ضلع رائے بریلی) کے نامور با وجاہت فاروقی خاندان کے فرد، اور چشتی نظامی سلسلہ کے مشائخ کے خانوادۂ عالی سے تعلق رکھتے تھے، پھر ۳۱ء میں پہلی مرتبہ میں جب سلون مولانا سید طلحہ صاحب اور سید زبیر صاحب کی معیت میں حاضر ہوا تو ان کا وسیع کتب خانہ دیکھا اور ان کے غیر معمولی حافظہ اور وسیع مطالعہ کا اندازہ ہوا، وہ سلف کے حافظہ، ذوق علمی اور شوق مطالعہ کی ایک نشانی تھے، ہندوستان میں امام ابن تیمیہؒ، ابن قیمؒ، ابن رجب،

ابن عبدالہادی اور ابن جوزی کی تصنیفات و تحقیقات پر شاید کسی کی نظر اتنی وسیع اور گہری ہو جیسے ان کی تھی، ان کی کتابوں کے صفحے کے صفحے ان کو یاد تھے، پیرزادوں میں ہونے کے باوجود وہ بہت صحیح الخیال، معتدل مسلک، حدیث و سنت کے مرتبہ شناس، اور ان سے خصوصی شغف رکھتے تھے[1]، مجھے تدریسی خاص طور پر تحقیقی کاموں میں شاہ صاحب سے بڑی مدد اور رہنمائی حاصل ہوئی، بہت سا وقت ضروری مواد کی تلاش میں کتابوں کی ورق گردانی سے بچ جاتا، وہ قدرتی طور پر قدیم خاندانی، وطنی، تعلقات کی بنا پر سب سے زیادہ مجھ پر کرم فرماتے تھے، اور یہی دراصل اُن کے دارالعلوم میں آنے کا محرک ہوا تھا، شاہ صاحب ادب عربی کا بھی صحیح مذاق رکھتے تھے، وہ اچھے ادیبوں ان کے طرز و خصوصیات سے واقف تھے، انھوں نے قدیم طرز پر پڑھا تھا لیکن ان کی نظر جدید چیزوں پر بھی تھی، اور وہ جدید مصنفین کی کمزوریوں سے بھی ناآشنا نہیں تھے، ان کی آمد دارالعلوم میں ایک مبارک اضافہ اور دارالعلوم کی علمی فضا کے لئے نہ صرف مفید بلکہ اس کی وسعت اور تقویت کا باعث تھی۔

اسی زمانہ میں ہمارے قدیم رفیق اور شریک کار مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب ندوی... بھوپال کے ایک وظیفہ پر مزید مطالعہ و تکمیل کے لئے مصر گئے اور جامع ازہر میں کلیۃ أصول الدین قسم الوعظ والارشاد سے تخصص کیا، وہ بھی ۳۹ء میں وہاں سے فارغ ہو کر دارالعلوم آئے، اور بحیثیت نائب مہتمم انھوں نے دارالعلوم میں کام شروع کر دیا، ان کے آنے سے دارالعلوم کے انتظامی کاموں میں مستعدی اور سرگرمی پیدا ہوئی، ہم لوگوں میں ایک

---

[1] شاہ صاحب کے حالات و کمالات کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "پرانے چراغ" حصہ اول مضمون مولانا شاہ حلیم عطا سلونی۔

اچھے رفیق کار اور انتظامی و تنظیمی صلاحیت رکھنے والے با اثر ساتھی کا اضافہ ہوا۔

لیکن ان سب مفید اضافوں کے ساتھ دارالعلوم کو ایک بڑا علمی و دینی خسارہ برداشت کرنا پڑا اُس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۹۴۰ء میں مختلف اسباب کی بنا پر ہمارے شیخ الحدیث و استاد اور مہتمم دارالعلوم مولانا حیدر حسن خاں صاحب کی طبیعت لکھنؤ کے قیام اور دارالعلوم کی ذمہ دارانہ مشغولیت سے اچاٹ ہوگئی، عمر کا بھی تقاضہ تھا کہ اب آزادی سے عزیزوں کے ساتھ اپنے وطن ٹونک میں (جس کی آب و ہوا بھی مولانا کے لئے زیادہ موافق و قوت بخش تھی) مستقل قیام فرمائیں، وہاں مولانا کے قائم کئے ہوئے مدرسہ فرقانیہ کے تقاضے بھی دامن کش تھے، ۳ر ذی الحجہ ۱۳۵۸ھ کو مولانا مستقل طور پر ٹونک تشریف لے گئے اور دارالعلوم ایک بلند مرتبہ محدّث، ایک صاحب روحانیت بزرگ اور ایک جامع اور متبحر عالم کی سرپرستی سے محروم ہوگیا۔[1]

مولانا کے چلے جانے کے بعد صحیحین کا درس مولانا شاہ حلیم عطا صاحب سے متعلق ہوگیا اور وہی ان کے بعد شیخ الحدیث کے مرتبہ پر فائز ہوئے اور مولانا عمران خاں صاحب نے اہتمام کا چارج لیا، ہم دونوں میں اپنے اپنے دائرۂ کار میں پورا تعاون تھا، وہ میرے علمی و تدریسی منصوبوں میں پوری مدد کرتے تھے، اور میں ان کو (بحیثیت مہتمم دارالعلوم) پورا تعاون دیتا تھا، ہمارے اس اشتراک عمل اور باہمی اعتماد و احترام نے دارالعلوم میں اچھی انتظامی و اخلاقی فضا پیدا کر دی، اور کاموں میں زیادہ مستعدی و سرگرمی نظر آنے لگی مولانا نے دارالعلوم کی مالی حالت درست کرنے کے لئے بھی جدّ و جہد کی

---

[1] مولانا کی وفات ۱۵ر جمادی الاول ۱۳۶۱ھ (۳۱ر مئی ۱۹۴۲ء) کو ہوئی مفصل تذکرہ "پرانے چراغ" حصۂ اول مضمون "شیخ الحدیث مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی" میں ملاحظہ ہو۔

اور حسب ضرورت اس کے لئے دورے اور سفر کئے۔

قدیم اساتذہ وشیوخ میں دار العلوم مولانا عبد الودود صاحب کی تدریسی خدمات سے بھی محروم ہوگیا، جو ۲ رنومبر ۳۶ء سے سبکدوش ہوگئے تھے، وہ معقولات کے بڑے کامیاب مدرس تھے، ان کی تقریر بڑی دل نشین ہوتی تھی، ہمارے استاد ومخدوم مولانا شبلی صاحب جیراجپوری تشریف لے گئے، جو استاد الاساتذہ اور دار العلوم کے بڑے محبوب ومحترم استاد واتالیق تھے، ۱۹۴۵ء میں راہی ملک بقا ہوئے، رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔

باب ہفتم

ندوۃ العلماء کی طرف سے ترتیب نصاب کی کوشش کا آغاز اور عربی زبان وادب اور قواعد کی نئی کتابیں

نصاب کی ترتیب جدید کی اہمیت

ندوۃ العلماء کی تحریک مخصوص تعلیمی نقطۂ نظر اور تجربہ اور مطالعہ پر مبنی تھی، وہ دینی نظامِ تعلیم میں زندگی کی نئی روح پھونکنا اور اس کو بدلے ہوئے زمانہ اور بدلے ہوئے حالات کے جائزہ اور فطری تقاضوں سے ہم آہنگ بنانا چاہتی تھی، نیز کتاب سے زیادہ فن سے، وسائل سے زیادہ مقاصد سے، اور متاخرین کے لفظی نزاعات، خیالی موشگافیوں اور شرح و تحشیہ میں اپنی ساری ذہانت صرف کرنے کے بجائے متقدمین کے علم آموز اور ذوق آفریں طرز کو زندہ کرنے کی داعی تھی، اس کے ساتھ عربی زبان کو ایک زندہ اور جیتی جاگتی زبان کی طرح پڑھانے کا انتظام کرنا چاہتی تھی جس کے ذریعہ خود عربوں میں دعوت و تفہیم کا کام کیا جا سکے اور طلباء و فضلائے مدارس میں عربی خطابت و تحریر کا ملکہ پیدا ہو سکے، اسی منصوبہ کو عمل میں لانے اور مدارس کے سامنے اس کا نمونہ پیش کرنے کے لئے اس نے لکھنؤ میں ۱۳۱۲ھ میں اپنا مرکزی "دار العلوم" دار العلوم ندوۃ العلماء" کے نام سے

قائم کیا، اس مقصد کے حصول کے لئے دو چیزوں کی ضرورت تھی۔

۱۔ ایک ایسے نصاب کی تیاری جو ان خصوصیات کا حامل ہو اور وہ ان کتابوں سے مستغنی کر سکے جو اس کے معیار اور مقصد کے مطابق نہیں ہیں، اور اضطراراً ان کو اختیار کیا گیا ہے، ایک ایسے نصاب کو اختیار کرنا جو اس دانش گاہ کے تعلیمی نقطۂ نظر اور مقاصد کے مطابق نہ ہو، اور جو طلباء کے علم و ذوق کو ایک دوسری شاہراہ پر ڈالتا ہو، ایک طرح کا تضاد ہے اور خود ان مقاصد کو ناکام بنانے کی (غیر شعوری و غیر ارادی) کوشش جن کے لئے یہ ادارہ قائم ہوا۔

۲۔ دوسری بنیادی ضرورت اُن اساتذہ کی تیاری اور تربیت ہے، جو اس تحریک اور ادارہ کے تعلیمی نقطۂ نظر اور تخیل سے نہ صرف یہ کہ پورا اتفاق رکھتے ہوں، بلکہ اس کے پرجوش داعی اور اس کا عملی نمونہ ہوں اور جو اپنی علمی اور تدریسی صلاحیت، ہمدردی اور دلسوزی کے ساتھ اس طریقۂ تعلیم کو کامیاب بنانے میں صرف کریں، اور دوسرے نظامہائے تعلیم کے مقابلہ میں اس کا امتیاز ثابت کر سکیں، آغاز کار میں ایسے اساتذہ کا دستیاب ہونا جو اس نظام و نصاب کے ساختہ پرداختہ ہوں (جو ابھی پورے طور پر نافذ نہیں ہو سکا) ممکن نہیں تھا، لیکن ان اساتذہ کی خدمات کا حاصل ہونا بعید از امکان نہیں تھا، جو اس تعلیمی نقطۂ نظر اور اس طرز فکر سے زیادہ سے زیادہ اتفاق رائے رکھتے ہوں اور اس کی افادیت کے قائل ہوں، لیکن اُن کو بڑی باریک بینی کے ساتھ تلاش کرنے اور جانچ پرکھ کر رکھنے کی ضرورت تھی۔

لیکن یہ ایک تلخ تاریخی حقیقت ہے کہ ندوۃ العلماء اپنے ابتدائی دور میں جن ناساز گار و ناہموار حالات سے گزرا جلد ہی اس کی صفوں کے اندر اختلاف رائے رونما ہوا،

اور اس کی طاقت اور وقت کا بڑا حصہ مالی وسائل کی فراہمی، تعمیرات، باہمی اختلافات کو رفع کرنے، ملک میں اس کا تعارف کرانے اور دینی حلقوں میں اپنا اعتماد پیدا کرنے میں صرف ہوا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کو اپنی ضروریات کے مطابق جدید نصاب کی ترتیب (چند کتابوں کو مستثنیٰ کر کے) اور مناسب اساتذہ کی تیاری اور تربیت کا موقع نہیں ملا، اس کے زیر تعلیم نصاب کا بڑا حصہ قدیم درس نظامی ہی سے ماخوذ تھا، اور اساتذہ کی بڑی تعداد بھی قدیم مدارس میں تعلیم پاتے والوں اور تدریسی کام کرنے والوں کی تھی، یہ صورتِ حال اس کے مقاصد کی تکمیل اور بہتر تعلیمی نتائج کے حصول کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ تھی، اور اس طرح وہ ملک اور دنیائے اسلام کے سامنے اپنا صحیح کردار ادا نہیں کرسکا اور کوئی بڑا کارنامہ نہیں پیش کرسکا، اس کے بعض ممتاز ترین فضلاء وہ مستثنیٰ مثالیں ہیں جنھوں نے اپنے ذاتی مطالعہ و محنت اور کسی اہم شخصیت اور اساتذہ کے فیض صحبت سے امتیاز پیدا کیا، اور قدیم نصاب پڑھ کر (جس میں چند جدید کتابیں اور برائے نام عصری مضامین تھے) وسعتِ نظر، علمی رسوخ، اور عربی، اردو کے اعلیٰ ادبی ذوق تحقیق و تنقید اور تصنیف و تالیف کا اعلیٰ نمونہ پیش کرسکے۔

یہ صورتِ حال ندوۃ العلماء کے چھٹے ناظم مولوی حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب ندوی (بی ایس سی، ایم، بی، بی، ایس) کے دورِ نظامت تک قائم رہی، ڈاکٹر صاحب کو ندوہ کی نظامت کی طویل ترین مدت (تیس ۳۰ سال) ملی اور ایک ایسا زمانہ جس میں ناظم ندوۃ العلماء کو ارکانِ انتظامی کا زیادہ سے زیادہ تعاون اور اعتماد حاصل ہوا، اور جو (طلباء کی دو۲ اسٹرائکوں کو مستثنیٰ کر کے) ہر طرح کے ہنگاموں اور صف آرائی سے محفوظ رہا، خاص بات یہ تھی کہ ڈاکٹر صاحب خود قدیم و جدید اور مشرقی اور

مغربی علوم کے جامع تھے، وہ ایک طرف ندوہ کے سند یافتہ تھے تو دوسری طرف دیوبند کے ممتاز فاضل، سائنس کے نمایاں طالب علم اور فاضل جو دو امتیازی تمغوں کا اعزاز حاصل کر چکے تھے، دوسری طرف طبِّ قدیم اور طبِّ جدید کے مستند فاضل اور معالج بھی تھے، اس سب کے ساتھ ان کی سلیم طبیعت، سائنس کی طالب علمی اور حالاتِ زمانہ سے پورے طور پر باخبری اور عصری مطالعہ نے ان میں حقیقت پسندی پیدا کر دی تھی، اور بڑی بات یہ ہے کہ معتمد تعلیم مولانا سید سلیمان ندویؒ کا ان کو پورا تعاون اور اعتماد حاصل تھا، اسی کے ساتھ مولانا مسعود علی صاحب (جو اس وقت دار العلوم کے کاموں سے خاص دلچسپی لینے لگے تھے) نیز معتمدِ مال منشی احتشام علی صاحب جو ندوہ کے قدیم ترین رُکن اور اس کے بانیوں میں تھے، اور نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی جیسے مقتدر ارکان ان کے دل سے قدردان اور ان کے مؤیّد اور حامی تھے، اس لئے یہ زمانہ اور ماحول، نصاب کی اصلاح و ترقی اور اس میں تبدیلی کرنے اور بعض دوسرے تعمیری کاموں کی تکمیل کے لئے ہر طرح سے مناسب اور سازگار تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے سب سے پہلے عربی زبان اور قواعد کی تعلیم میں تبدیلی اور اصلاح کی کوشش شروع کی، یہ بات یک گونہ حیرت کی ہے کہ اگرچہ عربی زبان وادب شروع سے ندوۃ العلماء کا طرّۂ امتیاز رہا ہے، اور خود بانیٔ ندوۃ العلماء مولانا سید محمد علی صاحب مونگیری نے اپنی تحریروں اور خطوط میں اس کی اہمیت پر بڑا زور دیا ہے، اور اس کی تدریس کے لئے بعض عرب ادباء کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش فرمائی[۱]، لیکن

---

[۱] ملاحظہ ہو مولانا سید محمد علیؒ کے خطوط بنام مولانا سید عبد الحی صاحبؒ

اس پورے عرصہ میں عربی زبان کی تعلیم کے لئے فضلائے ندوہ کے قلم سے صرف ایک ہی کتاب "دروس الادب" (۱-۲) (تصنیف مولانا سید سلیمان ندوی) نکلی، جو نہ صرف یہ کہ دارالعلوم کے نصاب میں داخل ہوئی دوسرے مدارس کے حلقہ میں بھی مقبول ہوئی کہ ہندوستان میں وہ اپنے طرز کی پہلی کوشش تھی، لیکن اس کے بعد کی کتابیں جو عربی نثر وادب کے نصاب کی تکمیل کریں اور عربی ادب کے مختلف نمونوں اور اسالیبِ بیان کو پیش کریں اور ان سے تقریری اور تحریری طور پر اظہار خیال کا ملکہ پیدا ہو تیار نہیں ہوسکیں، ایک عرصہ تک "دروس الادب" اور "مقاماتِ حریری" کے درمیان کی (جو اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر ادب کے طلباء کے لئے بہر حال مفید اور ضروری ہے) کڑیاں مفقود تھیں، مجبوراً قدیم نثر کی بعض کتابوں سے مدد لی گئی، عرصہ تک اخوان الصفا (جو اصلاً کوئی ادبی کتاب نہیں ہے) داخل نصاب رہی، کچھ عرصہ تک محمد طلعت حرب کی "تاریخ دول العرب والاسلام" اور "سیرۃ مغلطائی" پڑھائی جاتی رہی، زمخشری کی "اطواق الذہب" بھی زیر درس رہی، نظم میں "دیوان ابوالعتاہیہ" داخل نصاب تھا، اور یہ انتخاب کچھ برا نہ تھا، اس کے بعد نثر میں حریری اور نظم میں حماسہ اور معلّقات کا دور آجاتا تھا۔

عربی زبان وادب کے نصاب کی اصلاح کی ابتدا

بھائی صاحب مرحوم نے سب سے پہلے مصر کی وزارت تعلیم کی تیار کی ہوئی عربی ریڈروں کا سلسلہ داخلِ نصاب کرنا چاہا، اس زمانہ میں نصاب میں کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ تبدیلی بھی مجلس انتظامی کی منظوری کے بغیر نہیں ہوسکتی تھی، بھائی صاحب اور ہمارے استاذ خلیل عرب صاحب اس خیال کے محرک تھے، اور مولانا سید سلیمان ندوی سے امید تھی کہ

وہ اس کی تائید فرمائیں گے، بھائی صاحب اِس کوشش کی دلچسپ کہانی سناتے تھے، فرماتے تھے، اپنے معمول کے مطابق کاکوری کوٹھی[1] میں مجلس انتظامی کا جلسہ تھا، مولانا شروانی (نواب صدریار جنگ) صدارت فرما رہے تھے، معلوم نہیں عرب صاحب بھول گئے یا کوئی ضروری کام پڑ گیا، وہ جلسہ میں نہیں پہونچے، میں نے تجویز پیش کی کہ "القراءۃ الرشیدۃ" کو داخل نصاب کرنا چاہئے، شروانی صاحب نے کہا کہ اس تحریک کی کون تائید کرتا ہے؟ سید صاحب خاموش رہے، منشی احتشام علی صاحب نے فرمایا کہ میں تائید کرتا ہوں، مخالفت میں کوئی ہاتھ نہیں اُٹھا، تجویز منظور ہو گئی، بھائی صاحب کہتے تھے کہ میں نے منشی صاحب سے (جو عربی داں اور عالم نہ تھے) عرض کیا کہ آپ نے اس تجویز کی کیسے تائید کی؟ انھوں نے فرمایا کہ یہ تجویز تمہاری طرف سے آئی تھی، اس لئے میں نے تمہارے اعتماد پر اس کی تائید کی، یہ تفصیل اس لئے سنائی گئی تاکہ اندازہ ہو کہ تبدیلئ نصاب کا مرحلہ کتنا مشکل اور نازک تھا، "القراءۃ الرشیدۃ" کے پورے سلسلہ کے داخل ہونے کے کچھ بعد ہی مصر کے بچوں کے نامور مؤلف کامل کیلانی کا سلسلہ "حکایات الاطفال" داخل ہوا، جو بچوں کی نفسیات اور زبان کی تعلیم کے جدید اصولوں کے مطابق لکھا گیا تھا، آسان اور سلیس زبان، تدریجی ارتقاء، دلچسپ قصے، تصاویر سے مزین لیکن دینی روح اور اخلاقی تعلیمات سے بالکل عاری، پوری کتاب اللہ اور اس کے رسول کے ذکر سے خالی، جانوروں کے قصے اور ان کی تصویروں پر مشتمل، سرورق پر آسانی کے ساتھ کسی عیسائی مصنّف کا نام لکھا جا سکتا تھا، مگر ان سارے عیوب کے ساتھ زبان کی تعلیم میں کامیاب اور بچوں کے لئے دلچسپ اور پسندیدہ۔

---

[1] دولت خانہ منشی احتشام علی صاحب رئیس کاکوری واقع خیالی گنج لکھنؤ۔

"مختارات" کی تالیف

چاہئے تو یہ تھا کہ پہلے "حکایات الاطفال" اور "القرأۃ الرشیدۃ" کا ایسا بدل مہیّا کیا جائے جو زبان کے اصول تعلیم، بچوں کی نفسیات اور جدید تعلیمی تجربوں کی مطابقت اور ان سے پورا فائدہ اٹھانے کے ساتھ اسلام کی اخلاقی تعلیمات و آداب، اس کی پُراثر شخصیتوں کے تعارف، اور اس کے تہذیب و تمدن کی عکّاسی کا جوہر بھی رکھتی ہوں، لیکن واقعات و حوادث ہمیشہ منطق اور ضرورت کے تابع نہیں ہوا کرتے، مجھے سب سے پہلے عربی نثر و ادب کے ایسے مجموعہ کی ترتیب کا خیال پیدا ہوا جو قرنِ اول سے لے کر عصر حاضر تک کے اعلیٰ ادبی نمونوں پر مشتمل ہو، اور جو سجع و قافیہ، تصنّع و تکلّف سے آزاد، دلی جذبات، صحت مند خیالات اور صالح مقاصد کا آئینہ دار ہو، اور جو عربی زبان کو صرف ایک ہی رنگ و آہنگ (جس کا مثالی نمونہ "مقامات حریری" ہے جو ہندوستان کے علمی اور درسی حلقوں میں چھ سو برس[1] سے حکمرانی کرتی رہی ہے، اور عربی تحریر کا واحد نمونہ ہے) پیش نہ کرے، اس بنیادی خیال کی وضاحت کے لئے جو ابتداء میں "مختارات" کی تالیف کا محرّک ہوا اور پھر اس کی بنیاد پر "منثورات"[2] اور بعض دوسری کتابیں لکھی گئیں اور آخر میں ۱۷-۱۹ اپریل ۱۹۸۱ء میں اسی بنیاد و تخیل پر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں "الندوۃ العالمیۃ للأدب الاسلامی" کے نام سے ایک بین الاقوامی سیمنار منعقد ہوا،

[1] ساتویں صدی ہجری اور آٹھویں صدی میں بھی یہ کتاب داخل نصاب تھی، اور محبوب الٰہی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء نے حفظ کی تھی، جس کے کفارہ میں بعد میں انھوں نے قرآن شریف حفظ کیا (سیر الاولیاء) [2] تالیف مولوی محمد رابع ندوی۔

جس میں خاصی تعداد میں عرب ادباء و فضلاء نے اور متعدد اہم اور ممتاز شخصیتوں اور عرب جامعات کے شعبۂ ادب کے سربراہوں نے شرکت کی[1] "مختارات" کے مقدمہ کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس سے اس کام کی اہمیت اور افادیت واضح طور پر سامنے آتی ہے:۔

"کسی بھی ادب کی آزمائش اور ابتلایہ ہے کہ اس پر ایسے لوگ حاوی ہوجائیں جو ادب کو بطور فن اور پیشہ کے اپناتے ہیں، اور اس کو صرف اپنے ساتھ مخصوص و محدود بنا لیتے ہیں، اس کو بنانے سنوارنے اور عبارت آرائی کرنے میں ایک دوسرے سے بازی لے جانا چاہتے ہیں کہ اس طرح کمال و مہارت کا سکّہ جماکر اپنی مقصد برآری کریں، یہ صورتِ حال مسلسل ترقی پذیر رہتی ہے، یہاں تک کہ ادب صرف انہی افراد کی میراث بن کر رہ جاتا ہے، اور ایک ایسا وقت آتا ہے کہ ادب کا تصور ان ہی کی نگارشات قلم تک محدود ہوکر رہ جاتا ہے جو محض صنعت و فن کاری اور تقلیدی ادب کا مجموعہ ہوتا ہے، اس کے اندر زور ہوتا ہے، نہ روح، جدّت و ندرت ہوتی ہے، نہ دل آویزی کا کوئی سامان۔

یہ مصنوعی اور تقلیدی ادب اس فطری، رواں اور سلیس ادب اور اس کی بلیغ تعبیرات پر جن پر انسان جھوم اُٹھے، اور اس کے ذہن و فکر کے اندر وسعت پیدا ہو جو کسی اسلوب کی اندھی تقلید سے روکے، اور انسان کے اندر

---

[1] اس سیمینار کی روداد مولوی محمد رابع حسنی ندوی (صدر شعبۂ عربی) کے قلم سے "دین و ادب" کے نام سے شائع ہوچکی ہے، اس میں خطبۂ صدارت اور اہم مقالات اور مضامین شائع ہوئے ہیں۔

خود اعتمادی پیدا کرے، وہ ادب جس سے اس قوم کا کتب خانہ بھرا پڑا ہے، اس ادب پر یہ تقلیدی اور مصنوعی ادب چھا جاتا ہے، حالانکہ اس رواں اور سلیس ادب میں اس کے سوا اور کوئی عیب یا نقص نہیں کہ وہ ان افراد کے قلم سے نکلا ہے جنھوں نے ادیبوں کی وردی نہیں پہنی اور انھوں نے ادب وانشاء کی دوکان نہیں لگائی، یا اس کو ذریعۂ معاش نہیں بنایا، اور ان کی دلکش ودلنواز ادبی خوش بیانیوں کو کسی ادبی عنوان سے موسوم نہیں کیا گیا اور نہ اس کا ادب کے سیاق میں ذکر کیا گیا ہے، بلکہ اس کی کسی دینی بحث، عالمانہ اور فکر انگیز کتاب اور فلسفیانہ یا معاشرتی موضوع کے سلسلہ میں جلوہ نمائی ہوئی ہے، یہ سب ادبی شہ پارے دینی واخلاقی اور علمی کتابوں کے انبار میں دبے ہوئے ہیں "روایتی ادب" نے خود پسندی کی بنا پر اسے اپنی صف میں جگہ نہیں دی اور مؤرخین ادب نے اپنی فکر ونظر کی کوتاہی کے سبب ادھر توجہ نہیں کی اور نہ اسے وہ مقام دیا جس کے وہ شہ پارے بجا طور پر مستحق تھے۔

یہ فطری دلآویز اور قلب وروح کو تسخیر کر لینے والا ادب عربی کے وسیع کتب خانہ میں وافر مقدار میں پایا جاتا ہے، اور اس کی تاریخ مصنوعی و تقلیدی ادب سے زیادہ قدیم ہے، کیونکہ مکاتیب وخطوط اور قصّہ کہانیوں اور اس طرح کے تقلیدی ادب کے مدوّن ہونے سے پہلے حدیث وسیرت کی کتابوں میں یہ فطری اور سحر انگیز ادب مدوّن ہو چکا تھا، لیکن ادب کے مؤرخین اور تحقیق اور ریسرچ کا کام کرنے والوں نے اپنی ساری توجہ تقلیدی وروایتی ادب پر مرکوز کر دی، وہ اسی زندان کے اسیر اور اسی لکیر کے

فقیر ہے جو استاد اول نے کھینچ دی تھی، بقول اقبال۔ ع

کُند مکتب رہِ طے کردہ را طے

مورخینِ ادب، منتخبات اور درسی کتابوں کے مصنفین (اگر بے ادبی اور بے ذوقی شمار نہ ہو) مکھی پر مکھی مارتے رہے، اور اس ادب پر پردہ پڑا رہا جس سے عربی زبان کی صلاحیت و برتری اور اس کی گہرائی ظاہر ہوتی ہے، اور اہل زبان کا کمالِ فن "ملکہ" اور زبان پر ان کی قدرت کا اندازہ ہوتا ہے، اور درحقیقت وہی ادب کی اولین اور حقیقی تربیت گاہ ہے۔"

مجھے حدیث کے درس کے زمانہ ہی سے اس کا احساس تھا کہ صحاح میں بکثرت ایسی طویل روایات ہیں، جن میں کسی صحابی یا صحابیہ نے آنحضرتؐ کا یا اپنا کوئی واقعہ، سفر کا حال زندگی کا کوئی اہم حادثہ، تفصیل اور بے تکلفی کے ساتھ بیان کیا ہے، اور اس میں روزمرہ زبان کی بے ساختگی اور جذبات واحساسات کی عکاسی اور مصوری اپنے پورے حسن کے ساتھ آگئی ہے، اِس کا نمونہ دیکھنا ہو تو حضرت عائشہؓ کی روایت "حدیث ہجرت" "حدیثِ افک" حضرت حلیمہ سعدیہ کے قصۂ رضاعت، حضرت کعبؓ بن مالک کے واقعۂ ابتلاء اور قصۂ تبوک میں دیکھا جائے کہ عربی زبان اور فصحائے عرب کی قوت بیان اِن روایات میں نقطۂ عروج پر ہے، اور اُن سے بہتر عربی زبان، عربی محاورات و تعبیرات کا نمونہ کتاب اللہ کے بعد عربی زبان و ادب کی پوری تاریخ میں نہیں مل سکتا، اس طرح جہاں کسی قادر الکلام، فصیح اللسان صحابی نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا حلیۂ مبارک، یا اپنے کسی دوسرے جلیل القدر ساتھی کا حلیہ اور اس کے خطّ وخال بیان کئے ہیں۔

جب "الضیاء" جاری ہوا تو اس کے پہلے نمبر کے لئے میں نے جو مضمون لکھا اس کا

عنوان بھی "الادب النبوی" تھا، اور رجب ۱۹۵۷ء میں دمشق کی شہرۂ آفاق اور قدیم ترین علمی اکیڈمی "المجمع العلمی" نے ہندوستان کی طرف سے مجھے اپنا رکن منتخب کیا اور اپنی روایت کے مطابق فرمائش کی کہ میں عربی زبان کے کسی پہلو پر کوئی ایسا مضمون لکھوں جو وہ اپنے رسالہ میں شائع کرے، تو میں نے "عربی زبان کا کتب خانہ ازسرنو کھنگالنے کا محتاج ہے" کے عنوان سے عربی ادب اور اُس کی تاریخ کے دوبارہ جائزہ اور اُن ہیرے جواہرات کو سامنے لانے کی ضرورت پر مضمون لکھا جو خزف ریزوں کے نیچے دبے ہوئے ہیں، اور اور اس کے لئے ادب کے وسیع نقطۂ نظر کے پیدا کرنے کا احساس دلایا، بہرحال یہ میرا پرانا خیال تھا، جس کا میں نے صرف عربی ہی نہیں بلکہ ہر زبان کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے "تاریخ دعوت وعزیمت" کے تیسرے حصہ میں حضرت مخدوم بہاریؒ کے "مکتوبات صدی" کے ادبی پہلو پر گفتگو کرتے ہوئے اس کو ظاہر کیا ہے، اور صدر یار جنگ کے مقدمہ میں بھی اس کو تفصیل سے لکھا ہے۔

میں نے بھائی صاحب کی اجازت سے جمع وانتخاب کا کام شروع کردیا اور ۱۳۵۹ھ ۱۹۴۰ء میں ایک ایسا مجموعہ تیار کرلیا جو دارالعلوم کے درجۂ ششم کے معیار کا تھا، اور جس کے بعد مشکل عبارت سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرنے اور مدارس عربیہ کا ساتھ دینے کے لئے صرف "مقامات حریری" پڑھانے کی ضرورت باقی رہ جاتی تھی[1]، ان طویل روایاتِ حدیث وسیرت کے علاوہ جو حلاوتِ زبان اور سلاستِ بیان کا اعلیٰ نمونہ ہیں کتاب میں

---

[1] افسوس ہے کہ نظم کے حصہ کا مسوّدہ جو منتخب اشعار اور نظم کے نمونوں پر مشتمل تھا جس میں جاہلیت سے لے کر عصر حاضر تک کی شاعری کا نمونہ پیش کیا گیا تھا، ضائع ہوگیا، کیا عجب ہے کہ دارالعلوم کے باذوق اساتذہ میں سے کسی کو اس کمی کو پورا کرنے کی توفیق ملے۔

ان شخصیتوں کو بھی جگہ دی گئی جن کے بارے میں ادبی روایتی حلقوں میں ادب یا انشاء پرداز اور صاحبِ اسلوب ہونے کا شبہ بھی نہیں ہوتا تھا، اور اس کو ان پر ایک تہمت یا خوش عقیدگی کا نتیجہ سمجھا جاتا تھا، مثلاً شیخ محی الدین بن عربی (شیخ اکبر) حضرت حسن بصری، ابن السماک مسعودی، امام غزالیؒ، ابن جوزی، ابن حبّان البستی، حافظ ابن تیمیہ، علامہ ابن قیم، ابن خلدون، شاہ ولی اللہ دہلوی وغیرہ۔

مجموعہ مرتب ہو جانے کے بعد ایک یا دو سال میں درجہ میں لکھواتا رہا، لیکن اس میں بڑا وقت صرف ہوتا تھا، اس لئے اس کی طباعت کی ضرورت محسوس ہوئی، معتمدِ تعلیم مولانا سید سلیمان ندوی صاحب نے اس کی اجازت دی، اُس زمانہ میں عربی ٹائپ ہندوستان میں صرف دو جگہ تھا، دائرۃ المعارف حیدرآباد میں اور مطبعۂ قیمہ بمبئی میں لیکن مصارفِ طباعت بہت زیادہ تھے، بالآخر نظامی پریس لکھنؤ میں اُس کی طباعت کا انتظام کیا گیا، اور اس کے مالک مرزا محمد جواد نے ایسی صنعت سے کتابت کی کہ وہ بادی النظر میں ٹائپ میں چھپی ہوئی معلوم ہوتی تھی، طباعت سے پہلے میں نے مولانا عبدالحفیظ صاحب بلیاوی (مصنف "مصباح اللغات" واستاد ادب دارالعلوم ندوۃ العلماء) سے درخواست کی کہ وہ مشکل الفاظ کا حل اور ضروری حاشیے کتاب پر چڑھا دیں، انھوں نے بڑی خوبی اور محنت و قابلیت سے یہ خدمت انجام دی[1]، رمضان ۱۳۶۱ھ دسمبر ۱۹۴۲ء میں یہ کتاب پہلی مرتبہ زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی کچھ ہی عرصہ کے بعد اس کتاب کو، رفیق محترم مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی کے مشورہ سے میں نے سہولت وصعوبت کے لحاظ سے ..... دو حصوں میں تقسیم کر دیا، ۱۹۵۶ء میں جب میں دمشق یونیورسٹی کی دعوت پر دمشق گیا (جس کا تفصیلی ذکر بعد میں آئیگا)

[1] مولانا نے ۷ا رجمادی الآخرہ ۱۳۹۱ھ (۱۰ راگست ۱۹۷۱ء) کو وفات پائی۔ رحمہ اللہ

تو میں نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھاکر المطبعۃ الجدیدۃ دمشق میں اس کے پہلے حصہ کو خوبصورت ٹائپ میں ندوہ کی طرف سے چھپوالیا، اور اس کا اسٹاک ہندوستان آگیا، ۴-۵ سال کے بعد ۱۹۶۲ء میں اس کے دوسرے حصہ کی دائرۃ المعارف حیدرآباد میں چھپنے کی نوبت آئی ۱۳۸۵ھ ۱۹۶۵ء میں بیروت کے مکتبہ دارالفکر الحدیث لبنان نے اس کو دیدہ زیب طباعت اور اعلیٰ کاغذ پر ایک جز میں چھاپا اور وہ عرب ممالک میں جانے اور توجہ سے پڑھی جانے کے قابل ہوئی، اسی زمانہ میں وہ دمشق یونیورسٹی کے کلیۃ الشریعۃ میں ادب عربی کے نصاب کے طور پر داخل ہوئی، ایک ہندی مصنف کا یہ بڑا اعزاز تھا کہ خالصًا عربی ادب و زبان پر اس کی کوئی کتاب کسی عرب یونیورسٹی کے کورس میں داخل ہو، فالحمد للہ علی ذلک۔

اسی زمانہ میں عربی کے بلند پایہ ادیب اور انشا پرداز (جن کو راقم زورِ انشاء اور قدرتِ تحریر میں مصر کے بہت سے نامور ادیبوں اور اہل قلم پر ترجیح دیتا ہے، جن کی عالم عربی پر دھاک بیٹھی ہوئی ہے) استاذ علی طنطاوی قاضی محکمۃ التمییز دمشق و سابق پروفیسر کلیۃ الآداب بغداد کی نظر اس کتاب پر پڑی، اور انھوں نے اپنے اس مقدمہ میں جو انھوں نے مصنف کی کتاب "المسلمون فی الھند" پر لکھا تھا، حسب ذیل الفاظ میں "مختارات" کے بارے میں اظہارِ خیال کیا:۔

"اگر کسی ادیب کے ذوق کی دلیل اس کا انتخاب ہے تو قارئین کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہم نے کچھ عرصہ ہوا ادبی منتخبات اور نمونوں کے مجموعوں کو جمع کیا تاکہ ان میں سے کسی کو ثانویات شرعیہ کے طلباء کے سامنے رکھیں، ہماری کمیٹی کے ممبران نے (جو سب ادبا میں سے تھے) علیحدہ علیحدہ تلاش و جستجو شروع کی، اور اس موضوع کی کتابوں کا جائزہ لیا، آخر میں ہم سب متفقہ طور پر اس نتیجہ پر پہونچے کہ درسی منتخبات

کے مجموعوں میں سب سے بہتر ابوالحسن علی ندوی کا مرتب کردہ مجموعۂ مختارات ہے'

جو زبان کی اصناف اور ادب کے متنوّع نمونوں کا سب سے جامع مجموعہ ہے"![1]

اس کے بعد انھوں نے قدیم طریقِ انتخاب پر تنقید کی ہے، اور بتایا ہے کہ کس طرح ادب کے مورخ اور کتابوں کے مصنفین ان چند ادیبوں اور انشا پردازوں کے غلام بن کر رہ گئے ہیں، اور ہمارے طلباء اور نوجوانوں کو بھی اسی زنداں میں اسیر کر رکھا ہے، جنھوں نے ادب وانشاء کو حقائقِ زندگی اور وارداتِ قلبی کا ترجمان بنانے کے بجائے نقش آرائی اور گل کاری اور ادبی پینترے بازی اور کرتب دکھانے کا اکھاڑہ یا نمایش گاہ بنا دیا۔

"مختارات" نے جلد مقبولیت حاصل کی لیکن وہ زیادہ تر جدید حلقوں اور یونیورسٹیوں کے شعبہ عربی بی، اے، ایم، اے کے کورس میں داخل ہوئی، شیخ عبید بن محمد عرب (برادر اصغر شیخ خلیل عرب صاحب جو ترتیب نصاب عربی کی اکثر کمیٹیوں کے ممبر تھے، اور جن کو عربی کا صدر جمہوریہ کی طرف سے پہلا ایوارڈ ملا) کی ذاتی کوشش سے وہ علی گڑھ و الہ آباد سے لے کر حیدر آباد و مدراس تک کی یونیورسٹیوں کے کورسوں میں داخل ہو گئی، البتہ اس کو ہمارے قدیم مدارس میں بڑی مشکل سے بار ملا، اور ملا بھی تو جلد اس کو چھٹی دے دی گئی، کہ ان حلقوں کا عمل انظر إلى ما قال ولا تنظر إلى من قال کے بجائے انظر إلى من قال ولا تنظر إلى ما قال پر ہے، البتہ یہ معلوم کر کے بڑی مسرت اور ہمت افزائی ہوئی کہ ہمارے محترم استاد اور ادبِ عربی کے سب سے بڑے معلّم مولانا اعزاز علی صاحب نے اس کو پسند فرمایا، اور اس کے متعلق ایسے بلند الفاظ ارشاد فرمائے، جو اس کے مرتب کی حیثیت سے بلند تھے، یہ بات ان کی بے نفسی اور وسیع القلبی پر دلالت کرتی ہے، کہ خود انھوں نے کچھ عرصہ پہلے "نفحۃ العرب" کے نام سے

---

[1] مقدمہ کتاب المسلمون فی الہند۔

ایک مجموعہ مرتب کیا تھا جس کو "نفحۃ الیمن" کی جگہ پر سارے مدارس میں (خاص طور پر جو دیوبند کے تابع تھے) داخل نصاب کیا گیا، کچھ عرصہ کے بعد سعودی عرب کی وزارت تعلیم کے ایک عہدہ دار کی اس مختارات پر نظر پڑی انھوں نے اس کو کالجوں کے نصاب میں داخل کرنے کی سفارش کی اور بیس ہزار نسخوں کا آرڈر دیا، ۱۳۹۸ھ ۱۹۷۸ء میں "دار الشروق" جدہ نے اس کی طباعت و اشاعت کا انتظام کیا۔

"القرأة الراشدة"

مجھے کئی سال درجہ میں اور درجہ کے باہر مصر کی وزارت تعلیم کی مرتب کردہ ریڈروں کے سلسلہ القرأۃ الرشیدۃ ۱-۲-۳ کے پڑھانے کا اتفاق ہوا، کتاب زبان کی صحت، اصول تعلیم بچوں کی نفسیات و سن و سال اور معلومات عامہ کے لحاظ سے ہر طرح کامیاب ہے، دینی روح اور اخلاقی تعلیمات سے بھی خالی نہیں، لیکن وہ اصلاً مصر کے بچوں (جن میں ایک تعداد عیسائی اور قبطی بچوں کی بھی ہوتی ہے) ترتیب دی گئی ہے، پھر اس پر قدرۃً اور ضرورۃً مقامی اور ملکی چھاپ بھی ہے، بکثرت اسباق قاہرہ کے گرد و نواح کے مقامات، آثار قدیمہ، مصری شخصیتوں سے متعلق ہیں، مثلاً مقامات میں "جزيرة الروضة - الإهرام - القناطر الخيرية حوادين مصر والاسكندرية" مقامی تہواروں اور جشنوں میں سے "عيد وفاء النيل" شخصیتوں میں سے محمد علی پاشا پر مستقل مضمون ہے، سب سے بڑھ کر یہ کہ مصر کا قومی ترانہ بھی موجود ہے جس میں مصر کی عظمت کے گیت گائے گئے ہیں، اور اس کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں، مدارس عربیہ کے مسلمان ہندوستانی بچوں کے لئے اس ترانے کو گانے میں کیا معنویت اور کشش ہوسکتی ہے؟ اسی طرح عيد وفاء النيل جس میں مصر کے عیسائی بڑی دلچسپی لیتے ہیں، ہندوستان

کے حالات سے کیا مطابقت رکھتی ہے۔؟

رفتہ رفتہ یہ خیال دل میں گدگدی لینے لگا کہ کیوں نہ اس کی جگہ لینے کے لئے عربی ریڈروں کا ایک نیا سلسلہ مرتب کیا جائے، بھائی صاحب کی موجودگی، سید صاحب کی شفقت، اور اس وقت کے مہتمم دار العلوم مولانا عمران خاں صاحب کے منصب اہتمام میں ہونے کی وجہ سے اس کا پورا اطمینان تھا کہ اگر یہ سلسلہ مرتب ہو گیا تو اس کے داخل نصاب ہونے میں کوئی دقت نہ ہوگی، چنانچہ بنام خدا کام شروع کر دیا غالباً ۴۴ء کے آس پاس اس کا سلسلہ شروع ہوا اور دو سال کے عرصہ میں اس کے تینوں حصے مرتب ہو گئے، کتاب میں اس کا التزام کیا گیا کہ حتی الامکان کوئی سبق دینی موعظت سے خالی نہ ہو اور آخر میں اس کا کوئی اخلاقی و دینی نتیجہ نکلتا ہو یا کسی دینی تعلیم یا آداب کی طرف رہبری ہوتی ہو، لیکن اس طرح کہ طالب علم کو محسوس نہ ہو کہ کوئی چیز اوپر سے یا باہر سے لائی جا رہی ہے یا اس کو کوئی خارجی انجکشن دیا جا رہا ہے، نمونہ کے طور پر حصۂ دوم میں کسرة من الخبز (روٹی کا ایک ٹکڑا) تاریخ القمیص (کرتے کی کہانی) ماذا تحب ان تکون؟ (تم کیا بننا چاہتے ہو؟) کن أحدَ السبعة (سات میں سے ایک بنو!) ملاحظہ فرمایا جائے، معلومات عامہ میں سے "العین" "الأسد" "الجمل" "القاطرة" "جسم النبات" "الباخرة" وغیرہ کے اسباق، تاریخی واقعات میں سے "الحنین إلی الشہادة" "رسالةٌ إلی رسول اللہ ﷺ" "فی بیت أبی أیوب الانصاریؓ" وغیرہ کے اسباق، شخصیتوں میں سے "الخلیفة عمر بن عبد العزیز" "الامام مالکؒ" "السلطان محمود الکیرانی" "شیرشاہ السُّوری" "السلطان مظفر حلیم" "اورنگ زیب عالمگیر" اور علمائے اسلام میں سے امام غزالیؒ، ابن تیمیہؒ، ملّا نظام الدین فرنگی محلی، اور

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کو دیا گیا، تعلیم گاہوں میں سے جامع ازہر، دارالعلوم دیوبند، مظاہر العلوم اور ندوہ کو دیا گیا ہے، پھر ایک طرف قطب مینار کی زبان سے "المنارۃ تتحدث" کے عنوان سے ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ دلچسپ انداز میں سنائی گئی ہے جس میں ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا نچوڑ اور سیکڑوں صفحات کا خلاصہ آگیا ہے، من النجوم إلی الارض، کے عنوان سے تاریخ اسلام کی وہ جھلکیاں دکھائی گئی ہیں، جو ایک ستارہ کی بلندی سے دیکھنے والے کو نظر آتی ہیں، یہ سلسلہ لکھنؤ میں چھپنے کے بعد پہلے دارالعلوم ندوہ میں پھر ان مدارس میں جنھوں نے اس کا نصاب اختیار کیا ہے، داخل ہو گیا، اور پاکستان میں بھی چھپ کر وہاں کے مدارس میں مقبول ہوا۔

قصص النبیین للاطفال

لیکن مصنّف اپنی جس خدمت اور توفیق الٰہی پر سب سے زیادہ خدا کا شکر ادا کرتا ہے، اور اپنے لئے اُس کو ذریعہ مغفرت اور ذخیرۂ آخرت تصور کرسکتا ہے، وہ "قصص النبیین" کا مقبول سلسلہ ہے، اوپر گذر چکا ہے کہ دارالعلوم میں کامل کیلانی کی کتاب "حکایات للاطفال" کا سلسلہ داخل تھا، اور وہ اس وقت تمام ممالک عربیہ میں حد درجہ مقبول ہو رہا تھا، مجھے اس کے پڑھانے سے بھی واسطہ پڑا، مجھے بھی اس کا خالص سکولر (SECULER) ہونا، جانوروں کے قصوں اور تصاویر کی بھرمار چبھتی تھی، لیکن مخدوم و محترم مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے (جن کی دینی غیرت اور حساسیّت طبقۂ علماء کے لئے باعث غیرت تھی) خاص طور پر اس پر توجہ فرمایا، انھوں نے میرے نام اپنے ایک مکتوب میں جو ۴ جون ۱۹۴۲ء کا لکھا ہوا ہے، اس کتاب پر تبصرہ

کرتے ہوئے لکھا:۔

"حال میں ندوہ کی ایک ابتدائی درسی کتاب محض اتفاق سے نظر پڑ گئی، بڑا ہی دل دکھا، تصویروں کی وہ بھرمار کہ شاید عبارت بھی [illegible] سے لے کر آخر تک جاندار مخلوق کی تصاویر سے رنگین، اللہ ورسول کا شروع سے آخر تک نام نہیں، لغو قصے، قدیم جن وپری کے طرز کے، حیرت ہوگئی، کہ یہ کتاب اور سید صاحب اور ڈاکٹر صاحب کے زمانے میں؟ خط دونوں صاحبوں کو لکھ دیا ہے، "چو کفر از کعبہ برخیزد الخ" مصری کتابیں تعلیمی نقطۂ نظر سے بھی ہرگز ندوی طلباء کے لئے مفید نہیں ہوسکتیں"۔

یہ کام جو غالباً ۴۳-۱۹۴۴ء کے درمیان شروع ہوا اور اس کا سلسلہ سفر وحضر میں ریل پر، کسی سڑک کے کنارے سواری کے انتظار میں، لاہور، سوہاوہ[1]، اور نظام الدین کے قیام میں نقل وحرکت اور انتشار کی حالت میں بھی جاری رہا، خدا کی توفیق سے مکمل ہوا، اس کو شروع کرنے کے بعد ایسا احساس ہوا کہ خدا نے اس کو میرے لئے ایسا آسان کر دیا ہے کہ قلم برداشتہ بلا تکلف اس طرح لکھتا جاتا تھا، جیسے باتیں کر رہا ہوں، اس میں تین باتوں کا التزام کیا گیا۔

۱۔ الفاظ کا ذخیرہ (VOCABULARY) کم سے کم ہو لیکن اعادہ اور تکرار سے اس کو ذہن میں نقش کر دیا جائے۔

---

[1] سوہاوہ ریاست پونچھ (کشمیر) میں بالائے کوہ سادات کی ایک بستی ہے، جہاں عزیز گرامی مولوی سید مظفر شاہ ندوی استاد دارالعلوم کی دعوت پر ۱۹۴۶ء میں جانا ہوا تھا، اور حصہ سوم کا بڑا حصہ وہاں لکھا گیا۔

۲۔ کتاب قرآن کی زبان میں لکھی جائے اور آیاتِ قرآنی جگہ جگہ نگینہ کی طرح جڑدی جائیں۔

۳۔ اسلام کے بنیادی عقائد (توحید، رسالت، معاد) کی تلقین و تعلیم ضمناً ہو جائے۔

۴۔ قصّوں کو پھیلا کر لکھا جائے اور ان میں ایسی رہنمائی کا سامان ہو کہ بچوں کے دلوں میں کفر و شرک کی نفرت، ایمان و توحید کی محبت اور انبیاء علیہم السلام کی عظمت راسخ ہو جائے اور یہ سب غیر شعوری طریقہ پر۔

اس نکتہ پر کہ اس میں بچوں کے عقائد کو درست کرنے اور ان کے ذہن کو بنانے کا سامان ہے، سب سے پہلے مولانا عبدالماجد دریابادی کی نظر گئی، انھوں نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا "اس کتاب کے ذریعہ بچوں کا علم کلام تیار ہو گیا" مولانا مسعود عالم صاحب مرحوم نے اپنے مقدمہ میں لکھا کہ "اس کتاب میں زبان اور دین کو اس طرح ایک دوسرے سے پیوست کر دیا ہے، جیسے گوشت اور ناخن" مولانا عبدالماجد صاحب نے اس کتاب کی ایسی قدر دانی کی کہ ان کا یہ تقاضہ اور اصرار ہوا کہ میں سارے کام چھوڑ کر اس سلسلہ کو مکمل کروں، لیکن کتاب کے تیسرے حصے پر جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مخصوص ہے، یہ سلسلہ رُک گیا، معلوم ہوا کہ مولانا نے اپنی صاحبزادیوں کو باقاعدہ یہ کتاب پڑھائی۔

کتاب کا دوسرا ایڈیشن جب مصر میں چھپا تو میری خواہش ہوئی سید قطب بھی اس پر مقدمہ لکھیں[1]۔.......... انھوں نے مقدمہ لکھا اور اس میں دل کھول کر کتاب کی داد دی انھوں نے یہاں تک لکھا کہ:۔

---

[1] کتاب پر مصنف کے دوست ڈاکٹر شیخ احمد شرباصی کا پہلے سے مقدمہ موجود تھا۔

"میں نے کثرت سے وہ کتابیں پڑھی ہیں، جو بچوں کے لئے لکھی گئی ہیں، اور جن میں انبیاء کرام کے حکایات وقصص بھی شامل ہیں خود ایک سلسلۂ کتب کی ترتیب میں مَیں نے شرکت کی ہے، جو "القصص الدینی للأطفال" کے نام سے مصر میں مرتب ہوا اور جس کے لئے مواد قرآن مجید سے اخذ کیا گیا تھا، لیکن میں تکلف اور خوشامد کے بغیر اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ "قصص النبیین للاطفال" کے مصنف کا کام (جس کا ایک نمونہ حضرت موسیٰ کے قصہ میں نظر آتا ہے) ہمارے وضع کئے ہوئے سلسلہ سے زیادہ کامیاب اور مکمل ہے، اس لئے کہ اس میں ایسی لطیف رہنمائیاں، قصہ کے مقاصد پر روشنی ڈالنے والی تشریحات اور بین السطور میں ایسے اِشارات آگئے ہیں، جو بیش قیمت ایمانی حقائق کی نقاب کشائی کرتے ہیں[1]۔"

یہ کتاب مصر کے بعد بیروت کے مشہور مرکز اشاعت مؤسسۃ الرسالۃ کی طرف سے ہزاروں کی تعداد میں شائع ہوئی، اور سعودی عرب کے بہت سے ابتدائی مدارس کے نصاب درس میں داخل ہوگئی، ہندوستان اور پاکستان کے بہت سے مدارس اور اسکولوں اور کالجوں کے عربی کے نصاب میں بھی داخل ہوگئی، اگر مصنّف کو اپنی کسی کتاب کے داخل نصاب نہ ہونے پر استعجاب اور دوستانہ شکوہ ہوسکتا ہے تو اس کتاب پر کہ وہ زبان آموزی اور دینی تلقین کا بیک وقت کام کرتی ہے، لیکن جماعتی اور مدرسی عصبیت بڑے بڑے حقائق پر پردہ ڈال دیتی ہے، تجربہ سے معلوم ہوا کہ اس بارے میں جدید تعلیمی ادارے اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ زیادہ فراخ دل اور

[1] مقدمہ قصص النبیین جزء ثالث مطبوعہ دار الکتاب العربی مصر ۱۳۷۳ھ۔

وسیع النظر واقع ہوا ہے۔

باوجود مولانا عبدالماجد صاحب جیسے بزرگ کے تقاضے اور کتاب کے قدردانوں کی خواہش وفرمائش کے تقریباً تیس ۳۰ پینتیس ۳۵ سال کی مدت گذر گئی اور تیسرے حصہ کے بعد چوتھے حصہ کے لکھنے اور بقیہ اولوالعزم پیغمبروں کے حالات بالخصوص خاتم النبیین صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ (جس کی عربی میں بچوں کے ذخیرۂ کتب میں سخت کمی محسوس کی جاتی تھی) سعادت حاصل نہیں ہوئی کہ اچانک ۱۳۹۵ھ ۱۹۷۵ء کے رمضان میں اس کا جوش اٹھا اور میں نے ان چند پیغمبروں پر (اللہ کا درود وسلام ہو اُن پر) لکھنا شروع کیا جو حضرت موسیٰ کے بعد مبعوث ہوئے، شروع میں مجھے بچوں کی زبان کی اس سطح پر اترنے میں کسی قدر دشواری محسوس ہوئی جو "قصص النبیین للاطفال" کے لئے اختیار کی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ زبان لکھنا بھول گیا ہوں، مگر تھوڑی کوشش کے بعد قلم میں روانی پیدا ہوگئی، اور چوتھے حصہ کی تالیف کی توفیق ہوگئی جس کو حضرت شعیبؑ سے شروع کرکے حضرت عیسیٰؑ پر مکمل کردیا گیا، اب صرف مسک الختام کی باری تھی، اللہ تعالےٰ نے اس کی بھی توفیق دے دی اور ذی القعدہ ۱۳۹۷ھ اکتوبر ۱۹۷۷ء میں سیرت خاتم النبیین پر اس سلسلہ کا حسن خاتمہ ہوا، اور وہ دونوں حصے بھی مؤسسۃ الرسالۃ (بیروت) میں چھپ کر مقبول عام وخاص ہوئے، اس اجمال کی تفصیل وتوسیع وتکمیل میری کتاب "السیرۃ النبویۃ" سے ہوئی جو حال میں دار الشروق جدہ کی طرف سے چھپ کر سعودی عرب اور بعض دوسرے ممالک کے کلیات اور جامعات کے نصاب میں داخل ہوگئی ہے، اور حال میں اس کا چوتھا ایڈیشن بڑی آب وتاب سے شائع ہوا ہے، دراصل "قصص النبیین" کے سلسلہ کی یہی چھوٹی کتاب اس بڑی کتاب کا محرک اور باعث بنی۔

مضامین قرآن

صفحات بالا سے معلوم ہوچکا ہے کہ میری تدریسی زندگی کا آغاز درس قرآن سے ہوا، ۳۴ء کے بعد سے دارالعلوم کے اہم اسباق قرآن میرے ذمہ ہوئے تھے، اسی دوران میں (غالباً ۴۰-۳۹ء کے درمیان) مجھے احساس ہوا کہ طلباء مطالعۂ قرآن اور اس سے صحیح استفادہ کرنے کے بہت سے مقدّمات اور اصول ومبادی سے ناآشنا ہوتے ہیں، اور اس ناواقفیت کی وجہ سے وہ صحیح طور پر مطالب وتعلیمات قرآنی، قرآن کے پیغام اور اس کی روح اور اس کے اعجاز سے بیگانہ رہتے ہیں یا ان کی واقفیت ابتدائی اور عامیانہ ہوتی ہے اپنے عملی تجربہ اور کئی سال تک درس قرآن کی خدمت انجام دینے کے بعد طبیعت پر اس کا تقاضہ پیدا ہوا کہ میں اوپر کے تفسیری درجوں کے طلباء کے لئے کچھ ایسے مضامین تیار کروں جو تدبّر فی القرآن کے لئے معاون اور اس کی عظمت واعجاز کے سمجھنے میں مددگار ثابت ہوں، چنانچہ ۳۹-۳۸ء میں ایک سلسلۂ مضامین لکھوانا شروع کیا جس کے حسب ذیل عنوانات تھے۔

(۱) قرآن کا تعارف خود قرآن کی زبان سے (۲) قرآن شریف سے استفادہ کے شرائط اور اس کے موانع (۳) اعجاز القرآن (۴) قرآن مجید کا مرکزی مضمون (۵) قرآن مجید کی پیشگوئیاں، خاص طور پر غلبۂ روم کی پیشگوئی (۶) بنیادی عقائد توحید، رسالت، معاد اور ارکان اربعہ پر بھی لکھوانا شروع کیا لیکن وہ نامکمل رہا[۱]۔

طلباء یہ مضامین لکھ لیتے تھے، بعد میں رسالہ الندوہ میں جو ۴۰ء سے جاری

---

[۱] اس کی تکمیل مصنف کی مستقل تصنیف الارکان الاربعۃ سے ہوئی جو بہت بعد میں لکھی گئی۔

ہوگیا تھا، وہ بالاقساط شائع ہوئے اور پسند کئے گئے، عرصہ تک اِن مضامین کو جمع کرنے اور شائع کرنے کی طرف توجہ نہیں ہوئی، ان کا مجموعہ (جس میں بعض غیر مطبوعہ مضامین بھی تھے) گمشدہ سمجھ لیا گیا اچانک ۱۹۸۱ء میں عزیزگرامی مولوی سید محمد طاہر مددگار ناظم ندوۃ العلماء کے یہاں جو دارالعلوم کے طالب علم رہ چکے تھے، اس کا مسودہ مل گیا، میں نے اس پر نظر ثانی کی اور چند اہم مضامین: "قرآن مجید اور قدیم آسمانی صحیفے علم و تاریخ کے میزان میں" "تلاوت و تدبّرِ قرآن کے چند نمونے" "ایک تجربہ ایک مشورہ" کا اضافہ کیا اور اس کو نورِ چشم مولوی سید محمد حمزہ ندوی فرزند خواہرزادۂ عزیز مولوی سید محمد ثانی مرحوم نے مجھ سے لے کر "مطالعۂ قرآن کے اصول و مبادی" کے نام سے مکتبۂ اسلام ۳۷ گوئن روڈ کی طرف سے شائع کردیا، اس کتاب میں دوسرے مضامین کے علاوہ غلبۂ روم کی پیشگوئی اور جن ناقابل قیاس حالات میں اس کا تحقق ہوا کے موضوع پر اتنا مواد جمع کردیا گیا ہے، جو ابھی تک کسی اور کتاب میں نظر سے نہیں گذرا، یہ کتاب قرآن مجید سے اشتغال رکھنے والوں کے لئے چشم کشا اور بصیرت افروز بن گئی ہے اور مدارس عربیہ میں داخل نصاب کرنے کے قابل ہے۔

ترتیب نصاب کی دوسری کوششیں

الحمدللہ کہ نصاب جدید کی ترتیب کا جو سلسلہ بغیر کسی منصوبہ بندی (PLANNING) کے ... انفرادی طور پر شروع کیا گیا تھا وہ کسی نہ کسی شکل میں جاری رہا "مختارات" اور "القراءۃ الراشدۃ" کے درمیان کی کڑی کے طور پر خواہرزادۂ عزیز مولوی سید محمد رابع ندوی (حال صدر شعبۂ عربی دارالعلوم) نے "منثورات" تالیف کی جس میں بہت سے ان قابل انتخاب ادبی نمونوں کو شامل کیا جو "مختارات" کے نمونوں کے مقابلہ میں نسبتاً آسان لیکن طلباء کے سامنے آنے کے

قابل تھے، اُن کے انتخاب میں ان کا صحیح ادبی ذوق اور مطالعہ کارفرما نظر آتا ہے، اور یہ کتاب بھی مدارس میں جگہ پانے کی مستحق ہے، اس کے علاوہ انھوں نے ایک تیسری کتاب "الادب العربی بین عرض ونقد" لکھی جس میں عربی نثر کے منتخب قطعات کو لے کر ان کے محاسن اور خصوصیات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اور طلباء میں ادب سے ذائقہ لینے اور اس کے محل و مقام کے تعین کی صلاحیت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی، دوسری طرف مولوی عبدالماجد صاحب ندوی کے قلم سے "معلم الانشاء" کی ترتیب کا کام شروع ہوا جس کا خلا شدت سے محسوس کیا جارہا تھا، اور مدارس کے نصاب میں کوئی ایسی چیز نہ تھی، جو تحریر و انشاء کی مشق و تمرین کی خدمت انجام دے، انھوں نے بڑی محنت و لیاقت سے اس کے دو حصے مکمل کئے تیسرا حصہ مولوی محمد رابع ندوی کے قلم سے تیار ہوا، یہ کتاب بھی بہت سے مدارس میں داخل نصاب ہے، "تاریخ ادب عربی جس میں استاد احمد حسن الزیات کی کتاب "تاریخ الادب العربی" پڑھائی جارہی ہے، اس کی جگہ نئی کتاب کی ضرورت ہے جس میں نئی تحقیقات اور ادب کے نظریات اور ہندوستانی مسلمانوں کا حصہ اور (CONTRIBUTION) نمایاں کیا جائے، یہ کام عزیز محمد واضح رشید ندوی نے شروع کر دیا ہے، امید ہے کہ اس پر بھی جلد اچھی کتاب تیار ہو جائیگی، اسی طرح تاریخ اسلام کے لئے بھی نئے نصاب کی ضرورت ہے۔

ادھر مولانا محبوب الرحمٰن صاحب ازہری استاد دارالعلوم نے "المحادثۃ العربیۃ" کے نام سے ابتدائی درجہ کے لئے دروس الاشیاء اور روزمرہ کے استعمال والی زبان کے لئے ایک ریڈر تیار کر دی وہ بھی داخل نصاب ہے۔

دوسری طرف زبان کے قواعد صرف و نحو پر میزان و منشعب وغیرہ کی جگہ

لینے کے لئے جدید اصول پر اردو میں تمرین النحو مولوی مصطفےٰ صاحب و مولوی عبدالماجد صاحب کے قلم سے اور تمرین الصرف مولوی معین اللہ صاحب ندوی کے قلم سے اور علم التصریف مولوی سعید الرحمٰن صاحب ندوی کے قلم سے مرتب ہوئی اور داخل نصاب ہوئی۔

جدید نصاب کی ترتیب کے سلسلہ میں ایک ضروری اور مفید کام یہ ہوا کہ عزیزی مولوی محمد رابع ندوی سلمہ نے (غالباً بھائی صاحب کی تحریک سے) "جغرافیہ ممالک اسلامیہ" کے نام سے کتاب تیار کی، حدیث و سیرت ہی نہیں، تاریخ ادب کا طالب علم بھی جب اپنے مضمون کا مطالعہ کرتا تو اس کو محسوس ہوتا تھا کہ وہ ایک سرنگ میں داخل ہو گیا ہے، جس کے آگے پیچھے، دائیں بائیں کچھ نظر نہیں آتا، صدہا مقامات کے نام حدیث و سیرت میں اور اشعار جاہلیت میں ملتے ہیں، جن کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتا، اور اس لاعلمی کی وجہ سے وہ ان بہت سے تاریخی حقائق، سیرت و حدیث کے واقعات کی اہمیت اور ان کا ماحول اور پس منظر سمجھنے سے قاصر رہتا جو ایک باشعور طالب علم کے لئے ضروری ہے، چہ جائیکہ ایک اچھے معلم و استاد کے لئے، یہ کام انھوں نے بڑی محنت و سلیقہ سے انجام دیا، نقشے تیار کئے، حدیث و سیرت کے واقعات کی طرف ضروری اشارہ اور اشعار عرب کا اندراج کیا جو ان مقامات کے متعلق تھے، اس کام کی سب سے زیادہ داد مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی نے دی اور اس کو سراہا افسوس ہے کہ انھیں حجابات کی وجہ سے (جن کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے) مدارس عربیہ نے اس محنت سے پورا فائدہ نہیں اٹھایا۔[1]

---

[1] ۱۹۸۳ء میں یہ کتاب مزید اضافوں کے ساتھ "جزیرۃ العرب" کے نام سے "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام" کی طرف سے شائع ہوئی، اس اڈیشن میں مصنف نے عہد بعثت و نبوت (باقی صفحہ ۲۲۴ پر)

ترتیب نصاب کی یہ داستان ذرا تفصیل و اطناب سے سنائی گئی کہ جہاں تک مصنف کا تعلق ہے ؎

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

مدارس عربیہ کے لئے یوں بھی وہ ایک لمحۂ فکریہ کی حیثیت رکھتی ہے کہ ہمارا قدیم دینی نصاب نمو وارتقا اور تغیر و تبدل کے دور سے (مدارس کے موجودہ درس نظامی کے دور تک) برابر گزرتا رہا ہے، اور اس میں کتابوں میں بھی اور معیار فضیلت میں بھی برابر تغیر ہوتا رہا ہے[1]، اور یہ اس زمانہ میں ہوا جب اس ملک کا دین بھی ایک تھا، آئین بھی، دینی زبان (عربی) دفتری زبان (فارسی) بھی ایک تھی، تہذیب بھی ایک تھی، اور قانون (فقہ حنفی) بھی ایک تھا، اور حکومت بھی (جس کے صرف افراد اور بعض اوقات خاندان جو سب سنی العقیدہ حنفی المذہب مسلمان ہوتے تھے بدلتے تھے) ایک تھی، لیکن جس وقت سے ہندوستان کے زمین و آسمان بدل گئے، حاکمانہ طاقت، تہذیب، زبان، قانون سب تبدیل ہو گئے، اور انقلاب کا دائرہ محیط اور عمیق و وسیع ہو گیا تو یہ نصاب تعلیم ایک جگہ آکر ایسا رکا کہ اس میں ایک کتاب کی تبدیلی بھی بدعت اور سلف کے راستہ سے انحراف کے مرادف قرار پائی، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے اسلاف نے جنھوں نے ہندوستان کی تعلیمی رہنمائی فرمائی اور جو دینی تعلیم کے ذمہ دار تھے، اپنی حقیقت پسندی، زمانہ شناسی

(باقی ص۲۲۳ کا) کے اوزان و پیمانے، سونے چاندی کی بازار کی قیمت، ادب و شاعری، اہم تاریخی مقامات........ کا تعین اور ان کے ضروری نقشے اور بعض دوسرے مفید مواد کا اضافہ کیا ہے۔

[1] تفصیل اور دلائل و واقعات کے لئے ملاحظہ ہو والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب مرحوم کا محققانہ اور مورخانہ رسالہ "ہندوستان کا قدیم نصاب تعلیم"۔

بلکہ ملت اور اس کی ضرورتوں کی صحیح نباضی کا ہر دور میں ایسا ثبوت دیا، جس سے اس زمانہ کے علماء اور ارباب مدارس قاصر رہے، جب اس نصاب کو نمودار تھا، اور ملت کی ضرورتوں اور جدید تقاضوں کا ساتھ دینے کی زیادہ ضرورت تھی اور جب حال یہ تھا کہ؎

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

اب فقہ کی باری تھی، میری پرانی خواہش تھی کہ ان بچوں کے لئے جو کمسنی میں فقہ کی کتابیں پڑھنے پر مجبور ہوتے ہیں، اور جو فارسی و منطق وغیرہ کا قدیم مرحلہ طے کئے بغیر "سن مراہقہ" (قبل بلوغ) میں "نور الایضاح" اور "قدوری" پڑھنے پر مجبور ہوتے ہیں، کوئی کتاب ایسی لکھی جائے جس میں عبارت کی سہولت، پیراگرافوں کی تقسیم، مثالوں اور تشریحی باتوں میں سن و سال کا لحاظ اور مسائل میں صرف عملی اور محتاج الیہ مسائل کا انتخاب ہو،..... اور وہ جو عربی میں پہلی فقہ کی کتاب کے طور پر پڑھائی جاسکے میں نے خود یہ کام شروع کیا تھا لیکن مکمل نہ ہو سکا، الحمد للہ گزشتہ سال عزیز گرامی مولوی شفیق الرحمٰن ندوی نے "الفقہ المیسّر" کے نام سے کتاب تیار کردی جس کو اہل نظر اہل فن نے بھی پسند کیا، اور وہ دارالعلوم میں داخل نصاب ہے، ادھر کئی سال پہلے مولانا محمد اویس صاحب ندوی مرحوم نے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی مشہور کتاب "العقیدۃ الحسنۃ" کو تحشیہ کے ساتھ العقیدۃ السنیۃ" کے نام سے مرتب کیا جس پر راقم نے مفصل مقدمہ لکھا، اس طرح علم کلام کا تعارف اور اہل سنت والجماعت کے عقائد کی تشریح کے لئے ایک اچھی کتاب تیار ہو گئی، اب صرف منطق، فلسفہ، شرح عقائد

اور اصول فقہ پر نئی کتابوں کی ضرورت ہے، اگر یہ کام بھی ہو گیا تو ترتیب نصاب جدید کا کام ایک حد تک مکمل ہو جائیگا، اور دار العلوم ہی نہیں، ہمارا دینی نصاب تعلیم اور اس کے مدارس خود کفیل اور قدیم کتابوں پر تکیہ کرنے سے مستغنی ہو جائیں گے، البتہ صحاح ستہ، ہدایہ اور حماسہ وہ کتابیں ہیں، جن کا کوئی بدل نہیں، اور ان سے استغنائ نہیں ہو سکتا۔

باب ہشتم

مدارس کی چہار دیواری سے وسیع مطالعہ اور فکر و عمل کے میدان میں

ذوق و رجحان کی تبدیلی

ابھی تک میری دنیا دار العلوم کی چہار دیواری تک محدود تھی، شہر لکھنؤ میں (جو عرصۂ دراز سے سیاسی اور قومی تحریکوں کا مرکز چلا آرہا ہے) روز کوئی نہ کوئی جلسہ اور ہنگامہ برپا ہوتا لیکن مجھے اور اکثر اساتذۂ دار العلوم کو اس سے کوئی سروکار نہ ہوتا، اس شہر میں مسلم لیگ کے ہنگامہ خیز اجلاس (جن سے مسلم لیگ کی تحریک کا احیاء ہوا) کانگریس کا سشن مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے جلسے، اور مدح صحابہؓ کی تحریک زوروں پر رہی لیکن صرف مسئلہ فلسطین اور بیت المقدس کو مستثنیٰ کر کے جس کے لئے میں نے دار العلوم کے استاد شیخ محمد العربی کے ساتھ مختصر سا دورہ کیا، اور جلسوں میں اس مسئلہ کی اہمیت پر روشنی ڈالی، میں نے کسی تحریک، جلسہ جلوس، اور احتجاج و مظاہرہ میں حصہ نہیں لیا۔

مدارس عربیہ، بلکہ عام دانش گاہوں کے نقطۂ نظر اور مفاد کے لحاظ سے یہ یکسوئی مناسب اور مفید بھی تھی، کہ اساتذہ اور طلباء کی ساری توجہ اور دلچسپی پڑھنے پڑھانے پر مرکوز رہے، اور اسی وحدت مقصد کی کمی نے آج مدرسوں کو انتشار کا مرکز اور رزم گاہ بنا دیا ہے، امام غزالیؒ کا مقولہ ہے، العلم لا يعطيك بعضه إلّا إذا أعطيته كلّك

فإن أعطيته كُلَّك فانت من أن يعطيك بعضه على خطر (علم اپنا جزوی فیضان بھی تم کو اس وقت تک عطا نہیں کر سکتا جب تک تم اپنی پوری توجہ اور صلاحیتیں اس کو نہ بخش دو، اور اپنا سب کچھ اس کے سپرد کر دینے کے بعد بھی یہ بات مشتبہ ہے کہ وہ تم کو اپنی بخشش و فیضان کا کوئی حصہ دے ہی دے)۔

دار العلوم کی تدریس کے آغاز (۳۴ء سے ۳۹ء تک) میری سب سے بڑی لذت اور دلچسپی طلباء کے پڑھانے، ان میں قرآن مجید اور عربی زبان و ادب کا صحیح ذوق پیدا کرنے میں تھی، ذہین اور ذی استعداد اور سعادت مند طلباء سے ایسا تعلق پیدا ہو جاتا تھا، اور ان کے پڑھنے پڑھانے میں ایسی قلبی مسرّت اور روحانی طاقت محسوس ہوتی تھی کہ بڑی تعطیلات کے آنے پر بجائے خوشی کے رنج اور فکر پیدا ہوتی تھی، اور ان کی جدائی کا صدمہ، اور طویل خلا کا احساس تکلیف دیتا تھا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ آخری دنوں میں یہ بھی محسوس ہونے لگا تھا کہ جس دل سوزی اور جانفشانی کے ساتھ تدریس کی خدمت انجام دی جاتی ہے، طلباء کی علمی، اخلاقی و دینی اصلاح و ترقی کی کوشش کی جاتی ہے، اور جس طرح سبق بالخصوص قرآن مجید کے درس میں بعض اوقات کلیجہ نکال کر رکھ دیا جاتا ہے، جس طرح خدا کی طرف سے اس کام میں مدد ہوتی ہے، اور مضامین کا ورود ہوتا ہے، اس کے بقدر طلباء پر (باستثنائے چند) فائدہ مرتب ہوتا نظر نہیں آتا، بعض مرتبہ خیال ہوتا تھا کہ آج کے درس سے شاید در و دیوار پر بھی نشان بن گئے ہوں، لیکن نوجوان طلباء کے دل و دماغ پر اس کے نقوش مرتسم نظر نہیں آتے تھے۔

اس سے ایک طرف یہ احساس بیدار ہونے لگا کہ خارجی ماحول کا فساد، عام فضا

باب ہشتم

مدارس کی چہار دیواری سے وسیع مطالعہ اور فکر و عمل کے میدان میں

ذوق و رجحان کی تبدیلی

ابھی تک میری دنیا دارالعلوم کی چہار دیواری تک محدود تھی شہر لکھنؤ میں (جو عرصہ دراز سے سیاسی اور قومی تحریکوں کا مرکز چلا آرہا ہے) روز کوئی نہ کوئی جلسہ اور ہنگامہ برپا ہوتا لیکن مجھے اور اکثر اساتذہ دارالعلوم کو اس سے کوئی سروکار نہ ہوتا، اس شہر میں مسلم لیگ کے ہنگامہ خیز اجلاس (جن سے مسلم لیگ کی تحریک کا احیاء ہوا) کانگریس کا سشن مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے جلسے، اور مدح صحابہؓ کی تحریک زوروں پر رہی لیکن صرف مسئلہ فلسطین اور بیت المقدس کو مستثنیٰ کر کے جس کے لئے میں نے دارالعلوم کے استاد شیخ محمد العربی کے ساتھ مختصر سا دورہ کیا، اور جلسوں میں اس مسئلہ کی اہمیت پر روشنی ڈالی، میں نے کسی تحریک، جلسہ جلوس، اور احتجاج و مظاہرہ میں حصہ نہیں لیا۔

مدارس عربیہ، بلکہ عام دانش گاہوں کے نقطۂ نظر اور مفاد کے لحاظ سے یہ یکسوئی مناسب اور مفید بھی تھی، کہ اساتذہ اور طلباء کی ساری توجہ اور دلچسپی پڑھنے پڑھانے پر مرکوز رہے، اور اسی وحدت مقصد کی کمی نے آج مدرسوں کو انتشار کا مرکز اور رزم گاہ بنا دیا ہے، امام غزالیؒ کا مقولہ ہے، العلم لا يعطيك بعضه إلّا إذا أعطيته كلّك

میں پھیلے ہوئے انتشار انگیز و تخریبی اثرات (جو مطالعہ کی کتابوں، لٹریچر اور اخبارات ناولوں اور ترقی پسند لادینی ادب کے ذریعہ آنکھوں اور کانوں کے راستے سے طلباء کے دل و دماغ میں نفوذ کرتے رہتے ہیں) اور جتنی صالح خوراک طلباء کو درجے میں دی جاتی ہے، اس سے کئی گنا ان کے اندر مختلف راستوں سے پہونچ جانے والا زہر ان کوششوں کو بارآور نہیں ہونے دیتا۔

اسی کے ساتھ یہ احساس بھی ابھرنے لگا کہ کسی صالح تحریک و دعوت، اور طلباء کی صحیح خارجی مشغولیت کے بغیر (جو تعلیمی مقاصد اور سن و سال کے ساتھ مطابقت رکھتی ہو) پند و موعظت کا کام، اور تعلیمی و تربیتی کوششیں نقش بر آب ثابت ہوتی ہیں، ان دو احساسات کے علاوہ جو اندرونی عملی تجربوں پر مبنی تھے، ہندوستان کی فضا، سیاسی تحریکوں مسلم لیگ کی زبردست تحریک، خاکسار تحریک کی عسکری تنظیم، اس کے منفی لٹریچر سے (جس میں طبقۂ علماء اور نمائندگان دین پر سخت تنقید تھی) کانگریس کی قومیت متحدہ کے نعرہ، اور رابطۂ عوام کی جدوجہد سے پرشور و متحرک ہو رہی تھی، ہندوستان میں ایک نئے ہمہ گیر انقلاب کے آثار کھلی آنکھوں نظر آنے لگے تھے، جو تہذیب، اخلاقیات، عقائد، مذہبی تصورات واقدار، اور تمدن و معاشرت سب پر اثر انداز ہونے والا تھا، بلکہ ان سب کا ایک نیا سانچہ تیار کرنے والا تھا۔

مطالعہ کی وسعت و تنوع

میرا مطالعہ بھی جو ابھی تک تفسیر و حدیث، اور تاریخ و ادب کے دائرہ میں محدود تھا، ۳۸-۱۹۳۷ء سے یہ مطالعہ اپنے خول سے باہر نکل آیا تھا، ڈاکٹر احمد امین کی کتابوں "فجر الاسلام"

"ضحی الاسلام" (۱-۲-۳) کے سلسلہ، اور بعد میں "ظہر الاسلام" پھر ان کی کتاب "زعماء الاصلاح فی العصر الحدیث" (جو بڑی شگفتہ و سنجیدہ زبان و اسلوب میں لکھی گئی ہے) کے اسلوب اور تحلیل و تجزیہ کی خوبی نے مجھے بہت متاثر کیا، امیر شکیب ارسلان کی "حاضر العالم الاسلامی" کے پُر از معلومات اور اسلامی روح سے معمور حواشی، عبدالرحمٰن الکواکبی کی فکر انگیز کتاب "مؤتمر ام القریٰ" اور "الفتح" کے ولولہ انگیز مضامین نے فکر و نظر میں وسعت پیدا کی، اور ہندوستان سے باہر نکل کر عالم اسلام اور اس کے مسائل اور تحریکات سے دلچسپی لینے کا سامان پیدا کیا، ادھر میں نے ہندوستان کی جنگ آزادی اور سیاسی تحریکات کا، اسی کے ساتھ سیاسیات کے موضوع پر لکھی ہوئی کتابوں کا مطالعہ کرنا شروع کیا، اس سلسلہ میں بعض فکر انگیز و معلومات افزا کتابیں جنھوں نے میری بعد کی تحریروں اور مضامین کے لئے مستحکم بنیادیں اور قیمتی مواد فراہم کیا، نیز مغربی تہذیب اور نظام حیات کے تشکیلی عناصر اور پس منظر کو سمجھنے میں مدد دی، مثلاً ڈریپر کی کتاب CONFLICT BETWEEN RELIGION & SCIENCE کا ترجمہ "معرکۂ مذہب و سائنس" مولانا ظفر علی خاں کے جادو نگار قلم سے، لیکی کی (HISTORY OF EUROPEAN MORALS) کا شستہ و رفتہ ترجمہ مولانا عبدالماجد دریابادی کے قلم سے، گبن (GIBBON) کی شہرۂ آفاق کتاب DECLINE AND FALL OF ROMAN EMPIRE کے بعض حصوں کا براہ راست مطالعہ، ہوفڈنگ کی "تاریخ فلسفۂ جدید" پڑھی، اسی زمانہ میں خالدہ ادیب خانم کی کتاب "ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش" سامنے آئی جس سے اگرچہ پورا اتفاق نہیں، لیکن اس نے موجودہ ترکی کے مزاج اور اس کے نشأ و نما کے سمجھنے میں مدد کی، اور اس سے واقعات کے علمی اور تاریخی تجزیہ کی صلاحیت میں مدد ملی۔

یہ کچھ وسیع اور تفصیلی مطالعہ نہ تھا، جو کسی بڑے علمی و تحقیقی کام کے لئے کافی و وافی ہو، ان میں سے ہر ایک موضوع پر پورا کتب خانہ تیار ہے، اور بہت سے لوگوں نے ان میں سے ہر موضوع پر بہت زیادہ پڑھا ہوگا، لیکن توفیق الٰہی جب یاوری کرتی ہے، تو آدمی تھوڑی معلومات اور محدود مطالعہ سے بہت بڑا کام لے لیتا ہے، اور قدرت الٰہی سے "مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ وَدَمٍ لَبَنًا خَالِصًا سَائِغًا لِلشَّارِبِينَ" کا ظہور ہوتا ہے۔

اسی زمانہ میں نو مسلم فاضل محمد اسد صاحب کی معرکۃ الآراء کتاب (ISLAM AT THE CROSSROADS) تقریباً سبقاً سبقاً پڑھی، اور ان کے پر از اعتماد، اقدامی طرز تحریر، مغربی تہذیب کے پوسٹ مارٹم اور اس کے اور اسلامی تہذیب کے تضاد، پھر سنت کی طاقتور حمایت سے دل و دماغ متاثر ہوئے، اسی زمانہ میں گاندھی جی کی "تلاش حق"، جواہر لال صاحب کی سرگزشت "میری کہانی" مولانا طفیل احمد صاحب کی کتاب "مسلمانوں کا روشن مستقبل" دیکھی، جس سے جزوی طور پر ذہن نے فائدہ اٹھایا، اور معلومات میں اضافہ ہوا۔

اسی زمانہ میں رسالہ "ترجمان القرآن" میں جواب لاہور سے نکلنے لگا تھا، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا مضمون "آنے والا انقلاب" پڑھا، اور ذہن نے اس کا تاثر قبول کیا، اور جن خطرات کی انھوں نے نشان دہی کی تھی، واقعات کے سیاق و سیاق میں ان کا قریبی امکان نظر آیا، اور ان سب چیزوں نے ذہن کی ساکن فضا پر ایک تموّج پیدا کر دیا، اور فطرت کی بعض خوابیدہ صلاحیتوں کے بیدار ہونے میں مدد کی، اس وقت تعلیم یافتہ اور باشعور مسلمانوں میں ایک بڑی تعداد ان مسلمانوں کی تھی جن کی فکر کا اسلامی سانچہ نہ کانگریس کی قومیت متحدہ کی تحریک قبول کر سکتا تھا، نہ مسلم لیگ کے مسلم نیشنلزم کو، مولانا آزاد کے "الہلال" کے ولولہ انگیز مضامین، علامہ اقبال کی حیات بخش شاعری، مولانا محمد علی

وہ تفہیم و تشریح جس پر دین کا سیاسی تصور غالب ہو، اور ملت اسلامیہ کے قرآن کی بنیادی اصطلاحات سے صدیوں تک نابلد رہنے کی حقیقت کا انکشاف (جس کی ترجمان ان کی کتاب "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" ہے) اور ان قدیم اصلاحی و تجدیدی شخصیتوں پر تنقید نہیں آئی تھی، جن کی عقیدت اور ان کے اصلاحی کارناموں کی قدر و عظمت ایک مسلّمہ حقیقت اور مسلمانوں کے ملّی شعور کا ایک جزو بن گئی تھی، نیز بعض معاصر مقتدر علمأ پر جن کے خلوص و قربانی پر مسلمانوں کا اتفاق تھا، طنزیہ تبصرہ سامنے نہیں آیا تھا۔

اسی زمانہ میں میری مولانا سے مراسلت شروع ہوئی، اور خود میرا ایک مضمون "دین و سیاست" مولانا نے "ترجمان القرآن" میں شائع کیا، جس میں دین و سیاست کی تفریق پر تنقید تھی، اور ثابت کیا گیا تھا کہ ممالک اسلامیہ میں بالعموم اور ہندوستان کے تحتی براعظم میں بالخصوص علماء نے مجاہدانہ تحریکوں، استخلاص وطن، اور اجنبی طاقتوں کے مقابلہ کی جدوجہد کی ہمیشہ قیادت کی، اور جدید طبقہ کے مقابلہ میں انھوں نے زیادہ حقیقت پسندی، وقت کے تقاضوں کو سمجھنے اور پورا کرنے کی صلاحیت، اور خطر پسندی اور مہم جوئی کا ثبوت دیا ہے۔

نئی دینی قیادت کی تلاش اور پنجاب اور بلوچستان کا سفر

۱۹۳۹ء میں میری کتاب "سیرت سید احمد شہیدؒ" شائع ہوئی، تو میں نے اس کا ایک نسخہ مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کو ہدیۃً بھیجا، جن سے میرا تعارف اس وقت ہوا تھا، جب وہ حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی کے ادارہ دارالمبلغین میں تدریسی فرائض انجام دیتے تھے، اور ہمارے قدیم دوست حاجی محمد سعید صاحب نصیرآبادی مرحوم

یہ کچھ وسیع اور تفصیلی مطالعہ نہ تھا، جو کسی بڑے علمی و تحقیقی کام کے لئے کافی و وافی ہو، ان میں سے ہر ایک موضوع پر پورا کتب خانہ تیار ہے' اور بہت سے لوگوں نے ان میں سے ہر موضوع پر بہت زیادہ پڑھا ہو گا لیکن توفیق الٰہی جب یاوری کرتی ہے' تو آدمی تھوڑی معلومات اور محدود مطالعہ سے بہت بڑا کام لے لیتا ہے' اور قدرت الٰہی سے " مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ وَدَمٍ لَبَنًا خَالِصًا سَائِغًا لِلشَّارِبِينَ " کا ظہور ہوتا ہے۔

اسی زمانہ میں نو مسلم فاضل محمد اسد صاحب کی معرکۃ الآراء کتاب (ISLAM AT THE CROSSROADS) تقریباً سبقاً سبقاً پڑھی' اور ان کے پر از اعتماد، اقدامی طرز تحریر، مغربی تہذیب کے پوسٹ مارٹم اور اس کے اور اسلامی تہذیب کے تضاد، پھر سنت کی طاقتور حمایت سے دل و دماغ متاثر ہوئے' اسی زمانہ میں گاندھی جی کی "تلاش حق" جواہر لال صاحب کی سرگزشت " میری کہانی " مولانا طفیل احمد صاحب کی کتاب " مسلمانوں کا روشن مستقبل " دیکھی جس سے جزوی طور پر ذہن نے فائدہ اٹھایا، اور معلومات میں اضافہ ہوا۔

اسی زمانہ میں رسالہ " ترجمان القرآن " میں جواب لاہور سے نکلنے لگا تھا، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا مضمون " آنے والا انقلاب " پڑھا، اور ذہن نے اس کا تاثر قبول کیا، اور جن خطرات کی انھوں نے نشان دہی کی تھی، واقعات کے سیاق و سباق میں ان کا قریبی امکان نظر آیا، اور ان سب چیزوں نے ذہن کی ساکن فضا پر ایک تموّج پیدا کر دیا، اور فطرت کی بعض خوابیدہ صلاحیتوں کے بیدار ہونے میں مدد کی' اس وقت تعلیم یافتہ اور باشعور مسلمانوں میں ایک بڑی تعداد ان مسلمانوں کی تھی جن کی فکر کا اسلامی سانچہ نہ کانگریس کی قومیت متحدہ کی تحریک قبول کر سکتا تھا، نہ مسلم لیگ کے مسلم نیشنلزم کو' مولانا آزاد کے " الہلال " کے ولولہ انگیز مضامین، علامہ اقبال کی حیات بخش شاعری، مولانا محمد علی

کی پرجوش تقریروں، تحریک خلافت اور سب سے بڑھ کر مغرب کی اسلام دشمنی اور اسلام کے خلاف مغربی طاقتوں کی صف آرائی نے مسلمانوں میں اپنی ذات و ملت کا شعور پیدا کر دیا تھا، اور اقبالؔ جس کو "خودی" سے تعبیر کرتے ہیں، وہ ملّی اور اجتماعی سطح پر ابھر رہی تھی، اقبالؔ نے خلافت عثمانیہ پر مغرب کی یلغار کے موقعہ پر برسوں پہلے جو کچھ کہا تھا، وہ ایک حقیقت بن کر سامنے آرہا تھا ؎

تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی　　مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے

سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی　　عروقِ مردۂ مسلم میں خون زندگی دوڑا

ہندوستان کے مسلمان اس وقت "دعوت و اقدام" اور "قوت و شوکت" کا پیغام سننے کے لئے بیتاب تھے، ان میں ہر ایسی تقریر و تحریر سے متاثر ہونے کی صلاحیت پیدا ہو گئی تھی جو بلند سطح سے ان کو خطاب کرے، ان کی ملّی خودی کو غذا پہونچائے، مغربی تہذیب اور ہندوستان کی قومیت متحدہ میں تحلیل ہو جانے کی دعوت پر ضرب لگائے، مسلمانوں کو ان کے قائدانہ مقام سے آگاہ کرے، اور ثابت کرے کہ اسلام ہی میں زندگی کے تمام مسائل کا حل، اور انسانیت کے تمام مصائب کا علاج ہے۔

یہی زمانہ تھا جب رسالہ "ترجمان القرآن" کے مضامین، مولانا مودودی کے "رسائل و مسائل" "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" "اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟" "پردہ" اور "سود" جیسے مضامین نے جن میں ملت کے ایک باشعور حصہ کی دل کی ترجمانی اور وقت کی ضرورت کا امتزاج اور سنگم ہو گیا تھا، ایک ایسے طبقہ کے لئے بڑی کشش پیدا کر دی تھی، جو اس طرز فکر اور اسلوب تحریر میں اپنے احساسات اور جذبات کی ترجمانی پاتا تھا، لیکن اس کے پاس وہ طاقتور قلم اور زوردار زبان نہیں تھی، اس وقت تک مولانا کی دین کی

نے جو وہاں اس وقت مقیم تھے، ایک دعوت میں مجھے اور انھیں ملایا تھا، اس زمانہ میں مولانا عبدالشکور صاحب کے صاحبزادہ مولانا عبدالمؤمن صاحب فاروقی نے ہماری ہی گلی (محمد علی لین) کے ایک مکان میں آفتاب پریس کے نام سے مطبع قائم کیا تھا، اور مولانا منظور صاحب طباعت و اشاعت کی بعض ضرورتوں کے سلسلہ میں وہاں آتے جاتے رہتے تھے، اور اکثر ہماری مسجد میں نماز پڑھتے تھے، ابتدائی تعارف و ملاقاتوں کے بعد متعدد مشترک باتوں کی وجہ سے بہت جلد دونوں میں مناسبت اور ربط پیدا ہوگیا، اسی تعارف اور مناسبت کی بناء پر میں نے اپنی یہ نئی کتاب ان کی خدمت میں بھیجی، ان کا خط آیا کہ "یہاں ڈاک آنے کا وقت وہ ہے جب میں کھانے کے بعد سونے کے لئے تیار ہوتا ہوں، تمہاری کتاب کے مطالعہ نے مجھے سونے نہیں دیا، میں پڑھ کر بہت متاثر ہوا، اب تم یہ لکھو کہ تمہاری یہ کتاب تصنیف برائے تصنیف ہے، یا کچھ کرنے کا بھی ارادہ ہے"؟ جہاں تک مجھے یاد آتا ہے، میں نے سَرسَرا حضوری لکھدیا کہ کیوں نہیں، اگر مجھ سے کوئی خدمت بن آئے تو میں تیار ہوں، میرا مزاج فطرتاً و وراثتاً تحریکی نہیں تھا، لیکن بہرحال خاندانی اثرات، اور سید صاحبؒ کی نسبت سے دینی حمیّت و غیرت کا کچھ حصہ ضرور ملا تھا، اور عملی طور پر تو نہیں لیکن نظری طور پر "خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات" پر "وسعتِ افلاک میں تکبیر مسلسل[1]" کی فضیلت و برتری قلب و دماغ کا ایک حصہ بن چکی تھی۔

مولانا کے دل و دماغ پر اس زمانہ میں خاکسار تحریک کی عسکری تنظیم کے متوازی ایک تنظیم

---

[1] اقبال نے کہا ہے ؎

یا وسعتِ افلاک میں تکبیر مسلسل | یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست | یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات

قائم کرنے کا خیال حاوی تھا، ان کے نزدیک اس کے بغیر حوصلہ مند نوجوانوں کو خاکسار تحریک کے مضر اثرات سے بچانے کی کوئی صورت نہیں تھی، ان کے نزدیک محض علمی تردید و استدلال کافی نہیں تھا، ایک عملی اور عسکری تنظیم ضروری تھی، جس میں نوجوانوں کو مشغول کر کے مطمئن کیا جا سکتا تھا، انھوں نے اس مہم کا آغاز کر دیا تھا، لیکن ان کو اس کا بھی احساس تھا کہ وہ اس کی قیادت کے لئے زیادہ موزوں نہیں، اس لئے کہ ان کی شہرت ایک کامیاب دیوبندی مناظر، اور ردّ بریلویت کے مشہور پرجوش مقرر اور عالم کی حیثیت سے ہو چکی تھی، ان کی شخصیت جلد متنازع فیہ بن جائیگی، اس لئے وہ کسی ایسی موزوں شخصیت کی تلاش میں تھے، جس کی کوئی ایسی شہرت نہ ہو، وہ حالات حاضرہ سے باخبر بھی ہو، اور اس مقصد سے کلی اتفاق رکھتا ہو، اپنی محدود و سرسری معلومات کی بناء پر ان کی نظر مجھ پر پڑی، اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میرا ایک پرزور اور مدلل مضمون خاکسار تحریک کی تنقید پر کچھ عرصہ پہلے "الفرقان" میں شائع ہو چکا تھا، مولانا مجھ سے ملنے کے لئے رائے بریلی تشریف لائے، اور مجھے اس ذمہ داری کے قبول کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی، میں اپنی جسمانی کمزوری قائدانہ صلاحیت سے محرومی اور غیر تحریکی مزاج سے الحمد للہ واقف تھا، اور اپنے بارے میں کسی بڑی غلط فہمی میں مبتلا نہیں تھا، میں نے صاف لفظوں میں معذرت کر دی، اور واضح طریقہ پر کہدیا کہ میں اس کے لئے بالکل موزوں نہیں ہوں، مولانا نے پوچھا کہ کیا کوئی اور شخصیت تمہاری نظر میں ہے، جو اس ذمہ داری کو قبول کر سکے، اور اس کا اہل ہو؟ میں نے کہا کہ ہمارے دوستوں میں حاجی عبدالواحد صاحب ایم، اے اس کے لئے موزوں ہیں، وہ صاحب عزیمت شخص ہیں، انگریزی پر انھیں پوری قدرت ہے، اور ایسی تحریک کے قائد کے لئے اس کی ضرورت بھی ہے، ضروری حد تک دین کا علم رکھتے ہیں، صحیح العقیدہ اور

صحیح الفکر شخص ہیں، اپنے بزرگوں سے ان کا تعلق ہے، اور عرصہ سے دین وملت کی خدمت کا جذبہ رکھتے ہیں، لیکن وہ بلوچستان کے محکمۂ تعلیم کی ایک اچھی پوسٹ پر ہیں، اور یہاں سے بہت دور فورٹ سینڈیمن میں ان کا قیام ہے، ان کو اس پر آمادہ کرنا ہوگا، مولانا پر اس تحریک کا اتنا تقاضہ غالب تھا کہ انھوں نے خود بھی وہاں جانے کا عزم کرلیا، اور مجھے بھی رفاقت پر آمادہ کرلیا، اور ہم لوگوں نے اس کا پروگرام بنالیا، ہم لوگ اگست ۳۹ء کی کسی تاریخ کو روانہ ہوئے۔

ہمارے سفر کی پہلی منزل لاہور تھی، وہاں حضرت مولانا احمد علی صاحب کے یہاں قیام رہا، اور وہیں سے مولانا حبیب اللہ صاحب مرحوم فرزند اکبر مولانا احمد علی صاحبؒ کی رہبری میں ہم لوگ مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی سے ملنے ان کی قیام گاہ (غالباً مبارک پارک پونچھ روڈ) گئے اس وقت مولانا "ترجمان القرآن" کی ادارت وتحریر کے علاوہ اعزازی طور پر اسلامیہ کالج لاہور کو کچھ وقت دیتے تھے، اور اسلامیات پر طلباء کو مستفید فرماتے تھے، مولانا نے ملتے ہی فرمایا کہ "آج قران السعدین ہی نہیں قران السعداء ہوگیا" لاہور سے ہم لوگ کوئٹہ کے لئے روانہ ہوئے، اسی درۂ بولان[1] سے گذرنا ہوا جس سے آج سے سوا سو برس پہلے سید صاحبؒ کا سربکف اور کفن بردوش قافلہ ہزار دشواریوں سے گذرا تھا، لیکن اس فرق کے ساتھ کہ وہ گھوڑوں اور اونٹوں کا قافلہ تھا، جس نے دو پہاڑوں کے درمیان کی تنگ گھاٹی جان خطرے میں ڈال کر طے کی تھی، اور ہم تیز رفتار ٹرین پر آرام سے بیٹھے ہوئے اس کو عبور کررہے تھے، ہم کوئٹہ (جس کا پرانا نام شال کوٹ تھا) اس دن پہونچے جس دن جرمنی نے برطانیہ کے خلاف اعلان جنگ کیا، اور ریڈیو نے دوسری جنگ عظیم

[1] درۂ بولان کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "سیرت سید احمد شہیدؒ" جلد اول ص ۴۷۱-۴۷۲

(۳۹-۱۹۴۶ء) کے آغاز کا اعلان کیا۔

کوئٹہ ایک دن ٹھہر کر ہم لوگ فورٹ سینڈمین (FORT SANDEMAN) پہونچے جو ایک فوجی چھاؤنی تھی، اور قندھار کے رُخ پر افغانی سرحد کے قریب واقع تھی، وہاں ایک اسکول میں حاجی عبدالواحد صاحب ہیڈ ماسٹر تھے، ان سے ملاقات اور گفتگو ہوئی اور یہ طے ہوا کہ پہلے دینی مرکزوں کا دورہ کیا جائے، اور جہاں کہیں کوئی اجتماعی اور تنظیمی پیمانہ پر دینی کام ہو رہا ہے، اور اس کو مؤثر تر و مفید تر بنانے کی امید ہو سکتی ہے، اس سے تعاون کیا جائے یا اس کو زمانہ کے جدید تقاضے کے مطابق کام کرنے پر آمادہ کیا جائے، اس کے لئے سہارن پور، دیوبند، تھانہ بھون، رائے پور اور نظام الدین دہلی کے مرکزوں کے دورہ کا پروگرام بنایا گیا، اس سے چند ماہ پیشتر مولانا مودودی کا ایک بڑا طاقتور اور مؤثر مضمون مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی تحریک و دعوت پر ترجمان القرآن (بابت ماہ شعبان ۵۸ھ) میں "ایک اہم دینی تحریک" کے عنوان سے نکل چکا تھا، مولانا خود نظام الدین اور میوات گئے تھے، وہاں سے آکر انھوں نے اپنے چند مشوروں کے ساتھ اس دینی جدوجہد کا تعارف کرایا تھا، اور اس کے بارے میں اپنے گہرے تاثرات کا اظہار کیا تھا، ہم لوگ اس مضمون کو پڑھ کر بہت متاثر ہوئے تھے، میں نے اپنے ایک بزرگ الحاج سید محمد خلیل صاحب نہٹوری سے اور مولانا سید سلیمان ندوی کی معیت میں سفر کرنال اور پانی پت کے موقعہ پر تھانیسر میں وہاں کے ڈپٹی کمشنر حافظ عبدالمجید صاحب آئی، سی، ایس کی دعوت میں ایک شریک مجلس سے مولانا کا نام اور ان کی تبلیغی مساعی کا ذکر سنا تھا، مولانا محمد منظور صاحب کا تعارف اور شناسائی اس سے زیادہ گہری اور پرانی تھی۔

مولانا تو دو۲ ہی تین۳ دن ٹھہر کر اپنی مشغولیتوں کی بناء پر واپس ہو گئے، میرا

قیام ہفتہ عشرہ رہا، واپسی میں منیر احمد صاحب انبیٹھوی کے دولت خانہ پر قیام رہا، جو انگریز چیف کمشنر کوئٹہ کے چیف سکریٹری یا نائب تھے، پھر وہاں سے لاہور ہوتا ہوا لکھنؤ واپس ہوا۔

دینی مرکزوں کا دورہ

۳۹ء کی آخری تاریخیں تھیں کہ ہم تین[۱] دوستوں نے ضلع سہارن پور اور دہلی کے دورہ کا پروگرام بنایا، میں لکھنؤ سے روانہ ہوا، مولانا اور حاجی عبدالواحد صاحب جو اسی غرض سے آئے تھے، راستہ سے کسی اسٹیشن سے ساتھ ہو گئے، ہم پہلے سہارنپور گئے، اس وقت غالباً شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب (جن کی میں نے صرف ایک جھلک ۳۲ء میں دیوبند میں دیکھی تھی) تشریف نہیں رکھتے تھے، مولانا منظور صاحب کا مناظرہ کے رشتہ سے مولانا اسعد اللہ صاحب صدر مدرس مظاہر العلوم سے تعارف تھا، ہم لوگ انھیں کے مہمان ہوئے، کچھ دیر سہارنپور ٹھہر کر شام کو رائے پور کے لئے روانہ ہو گئے، بھاری سامان بہٹ کے رئیس شاہ محمد مسعود صاحب کے یہاں چھوڑ کر ہم تینوں نے رائے پور کا رُخ کیا، پانچ میل کی مسافت پیادہ پا طے کر کے ہم لوگ رائے پور کی خانقاہ اس وقت پہونچے جب حضرت کھانے سے فارغ ہو چکے تھے، اور آرام کے لئے تشریف لے جانے والے تھے، حضرت نے ہم لوگوں کا پرتپاک خیر مقدم فرمایا، اور سابقہ تعارف[۱] کے بغیر

---

[۱] حضرت رائے پوری مولانا محمد منظور صاحب سے "الفرقان" کے ذریعہ واقف تھے، رائے پور کی خانقاہ میں "الفرقان" اور "ترجمان القرآن" اہتمام سے پڑھوا کر سنا جاتا تھا، مولانا منظور صاحب کی خدمتِ سنت اور ردِّ بدعت کی سرگرمیوں سے حضرت کے دل میں ان کی قدر تھی۔

(۱۹۴۶-۳۹ء) کے آغاز کا اعلان کیا۔

کوئٹہ ایک دن ٹھہر کر ہم لوگ فورٹ سینڈیمن (FORT SANDEMAN) پہونچے جو ایک فوجی چھاؤنی تھی، اور قندھار کے رُخ پر افغانی سرحد کے قریب واقع تھی، وہاں ایک اسکول میں حاجی عبدالواحد صاحب ہیڈ ماسٹر تھے، ان سے ملاقات اور گفتگو ہوئی اور یہ طے ہوا کہ پہلے دینی مرکزوں کا دورہ کیا جائے، اور جہاں کہیں کوئی اجتماعی اور تنظیمی پیمانہ پر دینی کام ہو رہا ہے، اور اس کو مؤثر تر و مفید تر بنانے کی امید ہو سکتی ہے، اس سے تعاون کیا جائے یا اس کو زمانہ کے جدید تقاضے کے مطابق کام کرنے پر آمادہ کیا جائے، اس کے لئے سہارن پور، دیوبند، تھانہ بھون، رائے پور اور نظام الدین دہلی کے مرکزوں کے دورہ کا پروگرام بنایا گیا، اس سے چند ماہ پیشتر مولانا مودودی کا ایک بڑا طاقتور اور مؤثر مضمون مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی تحریک و دعوت پر ترجمان القرآن (بابت ماہ شعبان ۱۳۵۸ھ) میں "ایک اہم دینی تحریک" کے عنوان سے نکل چکا تھا، مولانا خود نظام الدین اور میوات گئے تھے، وہاں سے آکر انھوں نے اپنے چند مشوروں کے ساتھ اس دینی جد و جہد کا تعارف کرایا تھا، اور اس کے بارے میں اپنے گہرے تاثرات کا اظہار کیا تھا، ہم لوگ اس مضمون کو پڑھ کر بہت متاثر ہوئے تھے، میں نے اپنے ایک بزرگ الحاج سید محمد خلیل صاحب نہٹوری سے اور مولانا سید سلیمان ندوی کی معیت میں سفر کرنال اور پانی پت کے موقعہ پر تھانیسر میں وہاں کے ڈپٹی کمشنر حافظ عبد المجید صاحب آئی، سی، ایس کی دعوت میں ایک شریک مجلس سے مولانا کا نام اور ان کی تبلیغی مساعی کا ذکر سنا تھا، مولانا محمد منظور صاحب کا تعارف اور شناسائی اس سے زیادہ گہری اور پرانی تھی۔

مولانا تو دو ہی تین دن ٹھہر کر اپنی مشغولیتوں کی بناء پر واپس ہو گئے، میرا

بڑی گرم جوشی اور بزرگانہ شفقت سے ملے، حضرت کے خادم خاص بھائی الطاف کا بیان ہے کہ حضرت نے جب مجھ سے معانقہ کیا تو فرمایا کہ "میں تو آپ کا منتظر ہی تھا" لیکن یہ بات مجھے یاد نہیں، رائے پور میں ایک شب وروز قیام رہا، حضرت نے پوری شفقت اور ذرّہ نوازی فرمائی، جب ہم لوگوں نے اپنے عزائم کا ذکر کیا تو اپنی معذوری اور ضعیف العمری کے باوجود دعا اور ممکن تعاون کا اطمینان دلایا، یہ بھی فرمایا کہ یہ جگہ بھی حاضر ہے، اپنے ایک معتمد خاص مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نومسلم رائے پوری سے بھی ملایا، جو بعض تنظیمی کوششیں کر چکے تھے، لیکن مشورہ دیا کہ پہلے ہم لوگ نظام الدین جاکر حضرت مولانا محمد الیاس صاحب سے ملیں (جن کو حضرت، حضرت دہلوی کے نام سے یاد فرماتے تھے) اور ان کے عظیم الشان تبلیغی کام کو دیکھیں اور اگر شرح صدر ہو تو اس میں شریک ہوں، ہم لوگ رائے پور سے بڑے اچھے تاثرات لے کر دیوبند آئے، یہاں سے تھانہ بھون جانے کا ارادہ تھا لیکن معلوم نہیں کیوں یہ ارادہ ملتوی ہو گیا اور سیدھے دہلی گئے، مولانا منظور صاحب تو اچانک علالت کی ایک اطلاع پر دہلی کے بجائے بریلی واپس گئے، اور میں اور مولوی عبدالواحد صاحب ایم۔ اے نظام الدین اور وہاں سے میوات گئے، مولانا محمد الیاس صاحب اور ان کی دعوت سے تعلق کی تفصیل تو ایک مستقل باب میں آئیگی کہ وہ ایک مستقل دَور کی کہانی، اور تاریخ کا ایک اہم باب ہے، یہاں پر اس سفر کے اجمالی تاثرات کے لئے رائے پور اور نظام الدین سے متعلق اپنے اس مضمون کے دو اقتباسات پیش کرتا ہوں جو سفر سے واپسی پر "مشاہدات و تاثرات" کے عنوان سے لکھا گیا تھا، اور ذی الحجہ ۱۳۵۸ھ کے "الفرقان" اور "الندوہ" میں شائع ہوا تھا:۔

"شہر سہارن پور سے ۲۰-۲۱ میل کے فاصلہ پر کوہ شوالک کے دامن میں رائے پور نامی ایک قصبہ ہے، جو حضرت مولانا شاہ عبدالقادر مدظلہ (خلیفہ حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ) کی اقامت گاہ ہے، ہم نے ایک دن اور دو راتیں بڑے حظّ و کیف کے ساتھ اس گمنام، یا گمنام خانقاہ میں گذاریں، اور ان زندہ خانقاہوں کا نمونہ دیکھا جو اس عہد انقلاب میں بھی مسلمانوں کے لئے مفید، اور بعض دینی اور اصلاحی وجوہ سے ضروری ہیں، مولانا شاہ عبدالقادر صاحب ایک باخبر، روشن ضمیر اور روشن دماغ، جامع عالم اور شیخ طریقت ہیں، اور زمانۂ حاضر کے ان مخصوص بزرگوں اور روحانی پیشواؤں میں سے ہیں، جن کے انفاس و برکات اور رہنمائی کی مسلمانوں کو ضرورت ہے، مولانا کی حالات زمانہ سے مکمل باخبری، سیاسی فہم و فراست، دینی و دنیوی جامعیت اور جذبۂ عمل نے اس خانقاہ میں سنّوسی خانقاہوں کی جھلک پیدا کر دی ہے، اور مولانا کے کریمانہ اخلاق، بزرگانہ شفقت، تواضع اور مسافر نوازی نے مشائخ سلف کے اخلاق کریمانہ کی (جن میں صاحبِ خلق عظیم کا پرتو ہوتا ہے) یاد تازہ کر دی۔[1]

حضرت شاہ صاحب کے ارشادات اور مشاہدات و تجربات ربع صدی کی اسلامی سیاست اور اسلامی تحریکوں اور اداروں پر منصفانہ اور مبصرانہ تبصرہ سے ہم کو گراں قدر علمی فائدہ ہوا، اور بزرگان دیوبند اور حضرت سید احمد شہیدؒ اور آپ کے رفقاء کے وجد انگیز واقعات سے ایمان تازہ اور دل زندہ ہوا۔

---

[1] یہاں خفیف سی لفظی ترمیم ہے۔

اس سفر میں ہم نے جو سب سے حیرت انگیز چیز دیکھی اور جس سے ہم کو لازوال مسرت اور شادمانی حاصل ہوئی، وہ میوات کے علاقہ میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کا تبلیغی کام اور نظام ہے، ہم نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ بیسویں صدی عیسوی کا منظر نہ تھا، بلکہ پہلی صدی ہجری کا نقشہ معلوم ہوتا تھا، عہد بعثت کی اصلاح اور انقلاب حال، اور قرن اول کے نومسلموں کے جوش وجذبہ اور تبلیغ کے ذوق وشوق کے جو قصے ہم نے سیرت اور تاریخ اسلام میں پڑھے تھے، گوڑگانوہ کی جامع مسجد، اور قصبہ نوح اور شاہ پور کی گلیوں میں اس کا ایک نمونہ دیکھا، واقعہ یہ ہے کہ یہ چشتی درویش، اور مجدّدی عالم، قدیم غیاث پور (حال بستی نظام الدین) میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے پہلو میں بیٹھ کر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی اشاعت اسلام اور حضرت مجدد سرہندیؒ، اور حضرت شہیدؒ رائے بریلوی کی حفاظت اسلام کی سنّت زندہ کر رہا ہے۔"

جماعت اسلامی میں شرکت اور علیحدگی

۱۹۴۰ء سے مولانا مودودی سے مراسلت کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا، انھوں نے ۱۳ر اگست ۱۹۴۰ء کو مجھے ایک مفصل خط لکھا جس میں مجھ سے اپنی معرکۃ الآراء کتاب "پردہ" کے عربی ترجمہ کا انتظام کرنے کی خواہش ظاہر کی، اور لکھا کہ "ندوہ کے سوا کسی اور مرکز کی طرف نظر نہیں جاتی، یہ کام اگر ہو سکتا ہے، تو وہیں ہو سکتا ہے، براہ کرم آپ کسی ایسے صاحب کو اس کام پر مامور فرمائیں، جو جیتی جاگتی زبان میں اسے منتقل کر سکے" پھر انھوں نے میرے اس سوال کا جواب دیا جو میں نے مشاہیر اہل علم کی خدمت میں اپنی محسن کتابوں کے

بارے میں کیا تھا۔[1]

مولانا سے میری دوسری ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ اس کمیٹی میں شرکت کے لئے تشریف لائے، جو اسلامی دستور کا خاکہ تیار کرنے کے لئے نواب سر احمد سعید خاں ... آف چھتاری کی دعوت پر ندوۃ العلماء میں منعقد ہو رہی تھی، مولانا نے سب سے پہلے اپنے آنے کی اطلاع دی، اور اپنے قیام کا مجھی کو ذمہ دار بنایا، ۴ یا ۵ جنوری ۱۹۴۱ء کو وہ لکھنؤ تشریف لائے اور ندوہ کے مہمان خانہ میں قیام کیا۔[2] غالباً ۱۹۴۱ء کے شروع میں مولانا منظور صاحب کے توسط سے جو اسی غرض سے لکھنؤ آئے تھے، میں جماعت کا باقاعدہ رکن بن گیا، اور لکھنؤ کی جماعت کا ذمہ دار قرار پایا، وہ جماعت کی خواہش پر دوبارہ لکھنؤ تشریف لائے، انھوں نے میری خواہش پر جمعیۃ الاصلاح دار العلوم ندوۃ العلماء میں اپنا مقالہ "نیا تعلیمی نظام" پڑھا، جو میری فرمائش پر وہ لکھ کر لائے تھے، میری ہی سفارش پر انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی میں "نوع انسانی کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل" کے عنوان سے مقالہ پڑھا، میرا رابطہ مولانا سے اور جماعت سے برابر قائم رہا، میں نے جماعت کے اس جلسۂ عاملہ میں بھی شرکت کی جو فروری ۱۹۴۲ء کو لاہور میں منعقد ہوا تھا، اور جس میں مولانا کی تحریروں اور بعض خیالات سے اختلاف، اور اس مخالفت کی بناء پر جو ہندوستان کے بعض مشاہیر فضلاء اور اہل قلم نے شروع کر رکھی تھی، یہ مسئلہ در پیش تھا، کہ مولانا فی الحال جماعت کی امارت سے سبکدوشی اختیار کر لیں، اور مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کو امیر منتخب کیا جائے، رائے شماری ہوئی تو میرا ووٹ مولانا کے حق میں تھا، اور اس کی بنیاد یہ تھی کہ یہ ایک مصنوعی ردّوبدل

---

[1] اس کا جواب ملاحظہ ہو "پرانے چراغ" حصہ دوم میں ص ۳۰۵-۳۰۶

[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "پرانے چراغ" حصہ دوم ص ۳۰۸-۳۰۹

ہوگا، جس سے کوئی بڑا فائدہ حاصل نہ ہوگا، جماعت کا وجود مولانا کی تحریروں کے اثر سے عمل میں آیا ہے، اور اس کی وابستگی اور انتساب بدستور انھیں کی طرف رہے گا، اس پر فیصلہ ہوا اور جماعت کا نظام وہی رہا، جماعت کی دوسری مجلس انتظامیہ میں میری شرکت اکتوبر ۴۲ء میں دہلی میں ہوئی، اس موقعہ پر میں مولانا کے ساتھ علی گڑھ بھی گیا، اور ایک دو دن اولڈ بوائز لاج میں ہم دونوں کا قیام رہا، میں نے یونیورسٹی کے حلقہ میں مولانا کی مقبولیت کا اندازہ کیا جو اس وقت کے حالات اور مسلمان نوجوانوں کی ذہنی بے چینی اور روحانی پیاس کا عین تقاضا تھا۔

اس زمانہ میں مولانا کو عربی میں ایک ایسے رسالہ کے اجراء کا بڑا تقاضہ تھا، جو دعوت اور جماعت کا ترجمان بن سکے، میں نے اس سلسلہ کے مشکلات کا ذکر کیا، اور اس پر اتفاق ہوا کہ فی الحال عربی میں مضامین کے ترجمہ کا سلسلہ شروع کر دیا جائے، اور ان کو عالم عربی کے مؤقر مجلات و رسائل میں بھیجا جائے، مولانا یہ خدمت میرے سپرد کرنا چاہتے تھے، میں نے اس کے لئے رفیق محترم مولانا مسعود عالم صاحب ندوی کا نام تجویز کیا، مولانا نے اس کو منظور کیا، اور مولانا مسعود عالم صاحب نے اس کی ذمہ داری قبول کر لی، اور بڑی حسن وخوبی کے ساتھ یہ خدمت انجام دی۔[1]

لکھنؤ کی جماعت کی ذمہ داری اور رہنمائی کے دوران (جس کی مدت غالباً تین سال کے قریب رہی ہوگی) میرے اندر تین تاثر و احساسات پیدا ہوئے جنھوں نے مجھے جماعت سے وابستگی اور اس کی افادیت پر از سر نو غور کرنے پر مجبور کیا۔

ایک یہ کہ میں دیکھتا تھا کہ مولانا کی شخصیت کے بارے میں جماعت کے افراد میں

---

[1] ماخوذ از "پرانے چراغ" حصہ دوم ص ۳۰۹-۳۱۱ باختصار۔

بڑا غلو پیدا ہوتا جا رہا ہے، اور وہ ان کے علاوہ کسی اور مفکر، مصنف اور داعی کے متعلق کوئی بلند خیال قائم کرنے، اس پر اعتماد کرنے، اور اس کی تحریروں سے استفادہ کرنے کی صلاحیت سے روز بروز دور ہوتے جا رہے ہیں، ایسا محسوس ہوتا تھا (اور بعض اوقات زبانوں پر بھی یہ بات آجاتی تھی) کہ ان سے بہتر کسی نے اسلام کو سمجھا اور پیش نہیں کیا، اور کُلّی دین کے داعی وہی ہیں، یہ افراد زیادہ تر جدید تعلیم یافتہ اور ملازمین کے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے، ان کا دین کا جو کچھ مطالعہ تھا، وہ مولانا ہی کی تحریروں کے ذریعہ تھا، وہ نہ صرف علمائے سلف بلکہ معاصر علمائے کبار کی دینی خدمتوں، اور دینی تحقیقات سے بھی ناواقف تھے، اور اسلام کی تاریخ اصلاح و تجدید اور اس کے علمبرداروں کے علمی و عملی کارناموں سے بالکل نابلد تھے[1]، اس لئے کسی حد تک معذور بھی تھے۔

دوسرے یہ کہ ان میں تنقید کا عنصر بڑھتا جا رہا ہے، اور علماء اور دینی حلقوں کے بارے میں ان کی زبانیں بے باک ہو رہی ہیں۔

تیسری بات یہ کہ ان میں دین کے ذوق و عمل میں کوئی ترقی، اصلاح نفس کا کوئی نمایاں جذبہ اور تعلق مع اللہ میں ترقی کی کوئی سنجیدہ کوشش نظر نہیں آتی تھی۔

ان وجوہ سے طبیعت کچھ افسردہ رہنے لگی، اور یہ محسوس ہوا کہ کام صرف مولانا کی تحریروں کے پڑھنے، سنانے اور اس کی داد دینے میں منحصر ہو کر رہ گیا ہے، دوسری طرف اپنا خود حال یہ تھا کہ غائبانہ مولانا کی تحریریں پڑھ کر جتنا متاثر ہوتا تھا، اور خیالات میں توارد، اور اس کی وجہ سے انجذاب محسوس ہوتا تھا، ملاقات اور زیادہ دیر ساتھ رہنے میں

---

[1] اسی ناواقفیت کو رفع کرنے کے لئے جو بہت سے خطرات کا موجب تھی، میں نے ۱۹۵۵ء میں سلسلہ "تاریخ دعوت و عزیمت" کی تالیف کا آغاز کیا جس کے اس وقت تک چار حصے شائع ہو چکے ہیں۔

(بغیر کسی محسوس وجہ یا شرعی بنیاد کے) اس انجذاب اور وابستگی میں کمی محسوس ہوتی تھی، شاید یہ خاندانی اثر تھا کہ طبیعت کسی نمایاں باطنی وروحانی کشش کے بغیر کسی شخصیت کی زیادہ گرویدہ نہیں ہوتی۔

میں اگرچہ ان حدود تک کبھی نہیں پہنچ سکا جہاں تک مولانا مودودی کے شدید ناقد پہونچے، جو تکفیر وتفسیق سے کم کے الفاظ پر قانع نہیں، مجھے اب بھی ان کے بہت سے ذہنی کمالات وخیالات کی قدر ہے، اور میں ان کی بہت سی چیزوں کو تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے مفید اور چشم کشا سمجھتا ہوں، اور ان کے مطالعہ کا مشورہ دیتا ہوں لیکن میری مولانا کی دعوت اور جماعت سے وابستگی اور گرویدگی میں فرق آتا رہا، پھر مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی ملاقات، وہاں کی آمد و رفت اور ان کے ان حالات سے جتنا تاثر بڑھتا گیا جو مجھے مزاج نبوت، سیرت طیبہ اور دین کی دعوت کی روح سے قریب تر نظر آئے، میری ذہنی کشمکش بڑھتی گئی، یہاں تک کہ خود میں نے اس کی مولانا کو اطلاع دی، اور مولانا نے مجھے یکسو ہو جانے کا مشورہ دیا، میں نے اپنی علیحدگی کا کوئی اعلان نہیں کیا، اور نہ اس وقت تک جب ۱۹۷۸ء میں میری کتاب "عصر حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح" نکلی کوئی علانیہ تنقید کی، علیحدگی کے بعد بھی میرے تعلقات دو قدیم شریف دوستوں کے سے تعلقات تھے، جن میں بنیادی خیالات کا اختلاف اور طریق کار کا فرق پایا جاتا تھا، میرا جب پاکستان کا سفر ہوتا تو ان سے ملتا، اور ہم میں سے ہر ایک دوسرے سے اکرام واحترام کا معاملہ کرتا، یہاں پر میں "پرانے چراغ" کے مضمون کا وہ حصہ نقل کرتا ہوں جس سے میرے اختلاف کی نوعیت اور اس کے حدود کا پتہ چلتا ہے:-

"میرے مولانا کی تحریروں اور جماعت کے لٹریچر سے تاثر اور وابستگی کی بنیاد

مولانا کے وہ فاضلانہ تنقیدی مضامین تھے، جو انھوں نے مغربی تہذیب اور اس کے فلسفۂ حیات اور موجودہ مادّی نقطۂ نظر کے خلاف لکھے تھے، اور جن کا بڑا حصہ ان کے مجموعۂ مضامین "تنقیحات" میں شامل ہے، یہاں میرے اور مولانا کے خیال میں وہی تفاوت تھا، جو ایک چھوٹے اور بڑے، نومشق و کہنہ مشق مصنفوں کے درمیان ہو سکتا ہے، دین کی اس جدید تفہیم و تشریح سے نہ مجھے کچھ زیادہ دلچسپی تھی نہ ضرورت، جو مولانا کی دوسری کتابوں مثلاً "قرآن مجید کی چار بنیادی اصطلاحیں"، "تفہیمات" اور "رسائل و مسائل" میں پائی جاتی ہے، اس لئے کہ اس بارے میں میرا معاملہ کسی ایسے انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان سے بالکل مختلف تھا، جو دین کا تصور اور اس کا فہم اس کے اصل سرچشموں (کتاب و سنت اور دینی ماحول و تربیت) کے بجائے کُلّیۃً مولانا یا کسی دوسرے مسلمان مفکّر و مصنف کی کتابوں سے حاصل کرتا ہے، میں اپنے براہ راست دینی مطالعہ اور ان متقدمین اور بعض متاخرین کی کتابوں سے استفادہ کرنے کی بنا پر جو کتاب و سنت کا وسیع و عمیق علم رکھتے تھے، اور ان کے یہاں مجتہدانہ فکر و نظر اور نمایاں گہرائی ملتی ہے[1]، مولانا کو ایسا یگانۂ روزگار مفکر اسلام سمجھنے سے قاصر تھا، جس کی نظیر صدیوں میں نہیں ملتی، میں ان کا اصل امتیاز و جوہر ذہانت، ذہن کی صفائی و رسائی، اور نئے انداز میں تحریر و تفہیم کی امتیازی قوت و قدرت سمجھتا تھا، اور اب بھی سمجھتا ہوں۔

---

[1] مثلاً شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ، حضرت مجدد الف ثانیؒ، حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ، حضرت سید احمد شہیدؒ، مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ، جن کی کتابیں اور تحریریں میری نظر سے گزر چکی تھیں۔

لیکن کچھ عرصہ کے بعد مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ جماعت کے اس علمی اور تنقیدی حصہ کو جو مغربی تہذیب اور موجودہ مادّی فلسفوں اور نظامہائے حیات سے متعلق تھا دین کی اس تفہیم و تشریح سے الگ نہیں کیا جا سکتا، جو خود مولانا اور جماعت کے قائدین کی نظر میں بنیاد اور سرچشمہ کی حیثیت رکھتی ہے، میرا شعور جس قدر پختہ اور میرا مطالعہ اور تجربہ جتنا وسیع ہوتا گیا، میری ذہنی کشمکش میں اضافہ ہوتا گیا، اس کا نقطۂ ارتقاء وہ تھا جب میری ہندوستان کی مشہور تبلیغی تحریک کے داعی و بانی مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی خدمت میں آمد و رفت زیادہ ہوئی، میں جب ان کی زندگی، ان کی باطنی کیفیات، اور ان کی ایمان و احتساب کی دعوت سے گہرے طور سے متاثر ہوا تو یہ ذہنی خلیج عمیق اور وسیع ہونے لگی، اور مجھے احساس ہوا کہ دعوت نبوت اور اس کے حامل کا مزاج اور اس کی خصوصیات کیا ہوتی ہیں، اور وہ ایک ایسی تحریک و دعوت سے کتنی مختلف ہوتی ہیں، جس کی بنیاد خالص مطالعہ، ذہانت اور کسی فلسفہ و نظام کے ردّ عمل پر ہوتی ہے...... میں نے ایک بار لکھنؤ سے جب مولانا مودودی کو اپنی اس ذہنی کشمکش کا حال لکھا، اور ان کو مولانا محمد الیاس صاحبؒ سے میرے گہرے تاثر اور تبلیغی کام میں روز افزوں انہماک کا حال بطور خود بھی معلوم ہوا تو انھوں نے مجھے اس بارے میں یکسو ہو جانے کی اجازت بلکہ مشورہ دیا۔[1]

جامعہ ملیہ کی طرف سے دعوت اور مذہب و تمدن پر مقالہ

۱۹۴۱ء کا آخری زمانہ تھا یا ۱۹۴۲ء کا آغاز کہ "جامعہ ملیہ" کی مجلس اسلامیات کی طرف سے

---

[1] "پرانے چراغ" حصہ دوم ص ۳۱۳-۳۱۴

جس کے صدر ہمارے استاد مولانا خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی تھے، مجھے اس مجلس میں ایک مقالہ پڑھنے کی دعوت دی گئی، اس سلسلہ میں خواجہ صاحب نے مجھے خود خط لکھا، اور اس کے قبول کرنے کے لئے اصرار فرمایا، "جامعہ ملیہ" جیسی دانش گاہ کی مؤقر مجلس کے لئے مجھ جیسے کم عمر، گم نام، اور کم سواد آدمی کے لئے کوئی علمی مقالہ تیار کرنا، اور اس کو ملک کے ممتاز دانشوروں، اساتذۂ جامعہ، اور فضلائے شہر کے سامنے پڑھنا ایک جرأت مندانہ اقدام اور بڑی ہمت کی بات تھی، میں نے اپنی اس کمی اور خامی کو (جس سے بحمداللہ ناواقف نہ تھا) پورا کرنے، اور اس کی تلافی کی یہی شکل سمجھی کہ میں کسی اہم و جاذب نظر موضوع کا انتخاب کروں، اور اس پر وسیع سے وسیع تر مطالعہ جو میرے امکان میں ہو کرکے ایسا مضمون تیار کروں جس میں مطالعہ و نظر کی گہرائی اور پختگی ہو، میں نے اپنے لئے "مذہب و تمدن" کا عنوان منتخب کیا، فلسفۂ قدیم و جدید کی تاریخ اور ان کے مختلف مکاتب خیال کے اختلاف پر جو کتابیں میرے دسترس میں تھیں، ان کا مطالعہ کیا، اور اپنے مقالہ میں اس مضمون کو لیا کہ مذہب و تمدن کے کچھ مشترک سوالات ہیں، جن پر پوری زندگی کی اساس ہے، اور جن کے جواب دینے کی ہر ایک نے کوشش کی ہے، اور اس کوشش کے نتیجہ میں ایک معاشرہ اور طرز زندگی وجود میں آیا ہے، اس سلسلہ میں میں نے حواس، عقل، فلسفہ، مذہبی فلسفہ، اور اشراق کی حقیقت، دائرۂ کار، اور ان کے اس سلسلہ میں کامیابی و ناکامیابی، اور افادیت و عدم افادیت کا علمی و تاریخی جائزہ لیا، اور بتایا کہ ان کے نتیجہ میں تین تمدن وجود میں آئے یا آسکتے ہیں، حسّی تمدن، عقلی تمدن، اشراقی تمدن، پھر ان پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ سوالات و جوابات کی دوسری راہ رسالت و نبوت ہے، اور وہی ان بنیادی سوالات کے قطعی جواب مہیّا کرنے اور انسان کی صحیح رہنمائی کی اہل، بلکہ ان کی واحد راہ ہے، پھر انبیائے کرام کی تعلیمات اور ان کے نتائج، اسلامی زندگی کی

خصوصیات کا نقشہ پیش کیا، اس مقالہ میں حواس، عقل، اور فلسفہ پر مغرب کے جدید فلاسفہ کے بعض بڑے قیمتی اقتباسات اور حوالے آگئے ہیں، جن سے ان تینوں کی کمزوری، ماوراء طبیعیات، اور ماوراء عقل امور میں ان کی بے بسی، اور ان کے دائرۂ عمل اور اثر کی محدودیت پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔

یہ مقالہ ۱۹۴۲ء کے کسی مہینہ کی تاریخ میں جامعہ کی ایک منتخب اور مؤقر مجلس میں پڑھا گیا، جس میں شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، ڈاکٹر سید عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب، اساتذہ جامعہ، اور شہر کے متعدد فضلاء موجود تھے، جلسہ کی صدارت مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے کی، ۱۹۴۳ء میں یہ مقالہ مکتبہ جامعہ کی طرف سے شائع ہوا، پھر اس کے کئی ایڈیشن پاکستان، ہندوستان میں نکلے، اس کا عربی ترجمہ مولوی شمس الحق ندوی کے قلم سے "بین الدین والمدنیۃ" کے نام سے بیروت سے اور انگریزی ترجمہ (RELIGION AND CIVILIZATION) کے نام سے سید محی الدین صاحب کے قلم سے لکھنؤ سے شائع ہوا۔

مسلمانوں کی سیاسی بے حمیتی اور عافیت پسندی پر قلق

۱۹۴۲ء میں جب کانگریس نے "QUIT INDIA" ہندوستان چھوڑو" کا رزولیشن پاس کیا، اور اندولن کا آغاز ہوا تو بڑے پیمانہ پر ہندوستان میں ہنگامے شروع ہوئے، جا بجا گولیاں چلیں اور گرفتاری کا سلسلہ شروع ہوا، لیکن اس میں قیادت خالص کانگریس کے ہاتھ میں تھی، اور اکثریت ہی کے لوگ پیش پیش تھے، وہی مصائب کا نشانہ بنتے، اور دار و رسن کا خطرہ مول لیتے تھے، مسلمان عام طور پر خاموش تماشائی بنے ہوئے تھے اور برادرانِ وطن کی

ان قربانیوں پر ہنستے، اور ان کی مصیبتوں سے خوش ہوتے تھے، میں نے لکھنؤ کی ایک مؤقر مجلس میں جس میں بعض مسلمان اہل فکر بھی موجود تھے، ایک مسلمان اعلیٰ سرکاری عہدہ دار کو اس پر طنز واستہزا، اور ان مصائب پر شماتت کا اظہار کرتے ہوئے سنا۔

مسلمانوں کے اس طرز عمل سے میرے حسّاس دل کو چوٹ لگی کہ ہندوستان کی سلطنت انگریزوں نے مسلمانوں ہی سے چھینی تھی، وہی انگریزوں کی آمد سے پہلے اس ملک میں قائدانہ مقام رکھتے تھے، انھیں کو برطانوی اقتدار اور غلبہ سے (جو ایک جاہلی تہذیب، لادینی نظام تعلیم، اور ایسے مادّی فلسفۂ زندگی کا حامل ہے، جس کا اسلام سے پورا تضاد ہے) اس وقت سب سے بڑا خطرہ لاحق ہے، انھیں مغربی طاقتوں نے (جن کا سب سے بڑا نقیب اور نمائندہ برطانیہ ہے) خلافت عثمانیہ کا خاتمہ کیا، اور تمام عرب ومسلم سلطنتوں کو اپنا غلام یا دست نگر بنایا، اس لئے ان کے اصل حریف ورقیب مسلمان تھے، اور انھیں کو اصل میں میدان میں آنا اور قائدانہ کردار ادا کرنا چاہئے تھا کہ قومیں اور ملتیں، دلیری اور جان بازی، قربانی وخطر پسندی، اور قائدانہ کردار ادا کرنے ہی سے عزت وسرفرازی حاصل کرتی ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ ۱۹۳۰ء میں سول نافرمانی، اور نمک کی تحریک کے دنوں میں ایک مرتبہ میں دہلی اور لکھنؤ کے درمیان سفر کر رہا تھا، مجھ سے ایک مارواڑی ہندو نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ میں نے کہا مسلمان! وہ مسلمان کا مطلب نہیں سمجھا، اس نے کہا عباس طیب جی کے مذہب کے ہو؟ وہ عباس طیب جی ہی کو جانتا تھا، جنھوں نے سول نافرمانی اور نمک کی تحریک میں گاندھی جی کی گرفتاری کے بعد کانگریس کے ایک ڈکٹیٹر کی حیثیت سے جیل جانے میں قیادت کی تھی، مجھے اندازہ ہوا کہ قربانی، پامردی، اور اقدام ہی سے افراد اور

جماعتوں کو عزت ملتی ہے، اور اسی سے ان کا دین اور مسلک زندگی احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

علماء کی حقیقت پسندی اور بیدار مغزی

میں کچھ اپنے خاندانی ماحول اور کچھ تاریخی مطالعہ کی بنا پر ان علماء کے طرزِ عمل اور مسلک کو نہ صرف پسند کرتا تھا، بلکہ ضروری سمجھتا تھا، جو جنگ آزادی میں برادران وطن کے نہ صرف دوش بدوش، بلکہ جہاں تک قربانیوں، اور اپنی ملت کے افراد کے غیظ و غضب اور مخالفت و مقاطعہ کا ہدف بننے کا سوال ہے، ان سے آگے تھے، میں نو عمری کے باوجود یہ سمجھتا تھا کہ ہندوستان کو ضرور ایک دن آزاد ہونا ہے، غیر ملکی اقتدار کی یہ صورت حال غیر فطری، غیر انسانی اور زیادہ دنوں تک باقی رہنے والی نہیں، اگر مسلمانوں نے اپنے ملک کی تحریک آزادی میں (اگر قائدانہ نہیں تو دلیرانہ و شریفانہ) حصہ نہیں لیا، تو ملک کے آزاد ہونے کے بعد مسلمان اس کی سرزمین پر سر اٹھا کر چلنے کے قابل نہیں رہیں گے، اور ان کا اپنی ملّی تشخّص کو برقرار رکھنے کا مطالبہ عزت و ہمدردی کی نظر سے نہیں دیکھا جائے گا، "الغنم بالغُرم" (نقصان و تاوان کے بقدر نفع اور بازیافت ہوتی ہے) کا اصول دائمی و فطری ہے، خدا کا شکر ہے کہ یہاں ہندوستان میں (متعدد دوسرے ملکوں کے برخلاف) علماء نے اس تحریک میں نہ صرف حصہ لیا، بلکہ بعض حیثیتوں سے قائدانہ حصہ لیا[1]، اور اس کی وجہ سے آج مسلمان اپنے دینی اداروں کی آزادی، پرسنل لا کے تحفظ، اردو زبان، دینی تعلیم کی بقا و حفاظت کا مطالبہ کر سکتے ہیں، اس بارے میں ہندوستان

---

[1] اس سلسلہ میں علمائے دیوبند و فرنگی محل اور جمیعۃ العلماء اور مجلس احرار کے قائدین کا نام لیا جا سکتا ہے۔

اور الجزائر (ALGERIA) میں بڑی مماثلت ہے کہ دونوں جگہ کے دینی طبقہ اور علمائے دین واساتذۂ مدارس وشیوخ نے جنگ آزادی واستخلاص وطن کی تحریک کی قیادت کی، اور اس کو دینی رنگ دیا۔[1]

میں نے ان واقعات اور مسلمانوں کے طرز عمل سے متاثر ہو کر عربی میں ایک مضمون لکھا جس کا عنوان تھا "دعوتانِ متنافستان" (دو حریف و نبرد آزما دعوتیں) اس میں جاہلیت اور اسلام کے فرق کو واضح کرنے کے بعد ثابت کیا کہ ہمارے اس دور میں یورپ عمومی طور پر اور برطانیہ اس کا قائد اور سب سے بڑی طاقت ہونے کی بناء پر کم سے کم مشرق میں جاہلیت کا علمبردار ہے، اور جاہلیت کی زندگی، اس کی جاذبیت اور اس کا فتنہ اسی کے دم سے قائم ہے، اس کے مقابلہ میں مسلمان اسلام کے حامل و امین، اور داعی و نقیب ہیں، اس لئے چاہئے تو یہ تھا کہ مغربی طاقتوں، اور خاص طور پر برطانیہ کے مقابلہ میں مسلمان ہی میدان میں آئیں کہ مغربی و برطانوی اقتدار سے سب سے زیادہ نقصان انھیں کو پہونچا ہے، اور ایک معین اور مثبت دین رکھنے کی وجہ سے آئندہ بھی انھیں کو سب سے بڑا خطرہ لاحق ہے، لیکن افسوس ہے کہ صورت حال اس کے برعکس ہے، وہ اس جنگ آزادی میں عام طور پر خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں، بلکہ خوش ہیں کہ ان کے برادران وطن، دار و رسن کو دعوت دے رہے ہیں، اور مصائب کا شکار ہو رہے ہیں۔

یہ میرا پہلا عربی مقالہ تھا، جو میں نے ادبی دائرہ سے نکل کر حالاتِ حاضرہ اور مسلمانوں کے تعلق سے لکھا تھا، اور جس میں پہلی مرتبہ دعوتی روح اور اسلامی فکر نمایاں ہوا تھا،

---

[1] الجزائر کی تحریک آزادی وجہاد خالص علماء اور اہل درس کی شروع کی ہوئی تھی، اور ان کی قیادت شیخ عبدالحمید بن بادیس اور شیخ محمد بشیر الابراہیمی نے کی تھی، جس کا اعتراف وہاں کے جدید طبقہ اور اہل حکومت کو بھی ہے۔

بابِ نہم

عربی میں دعوتی لٹریچر کی تیاری کا سلسلہ

عربی مقالات ورسائل لکھنے کا آغاز

"دعوتان متنافستان" مقالہ کے بعد میرے قلم کا رخ عربی میں دعوتی مضامین ورسائل لکھنے اور عربوں کو مخاطب بنانے کی طرف ہو گیا، اس وقت تک میرے سامنے اس طرح کے مضامین کا جس میں دعوت کی طاقت، دینی جذبہ کا اظہار اور زورِ قلم اور زبان کی حلاوت وسلاست بھی ہو، کوئی نمونہ نہ تھا، یا خالص ادبی مضامین تھے، جن کا نمونہ مصطفےٰ لطفی المنفلوطی، مصطفےٰ صادق الرافعی، ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے یہاں دیکھا تھا، یا پھر علمی، تنقیدی اور تحلیلی مضامین، جن کا نمونہ ڈاکٹر احمد امین، عباس محمود العقاد اور علامہ کرد علی کے یہاں نظر آیا تھا، اس وقت تک عالمِ عربی کے افق پر سید قطب، مصطفےٰ السباعی، علی طنطاوی وغیرہ کا سا کوئی تارا نمودار نہیں ہوا تھا، اخوان المسلمین کی تحریک کا لٹریچر بھی ہندوستان نہیں پہونچا تھا، بلکہ میں شاید بانیٔ تحریک شیخ حسن البناء کے نام سے بھی ناواقف تھا، اس لئے حقیقتاً خود ہی تحریر کی ایک روش نکالنی تھی، اور اردو شاعر کے اس دعوی کی تقلید کرنی تھی ؎

نے پیروی قیس نہ فرہاد کریں گے

ہم طرزِ جنوں[1] اور ہی ایجاد کریں گے

---

[1] اس طرزِ جنوں یا طرزِ تحریر کا ارتقاء عربی کے جواں سال وجواں مرگ ہندی مضمون نگار محمد الحسنی مرحوم کے بعد کے مقالات میں دیکھا جا سکتا ہے، جن کی تحریر میں زورِ تحریر وجوشِ بیان سید قطب مرحوم سے کم نہیں۔

عربی میں ایسے دعوتی مضامین ورسائل کی کمی تھی، جس میں خود اعتمادی، جوش دروں اور حرارت ایمانی پائی جاتی ہو، اور اس میں داعی کی بلند سطح سے خطاب کیا گیا ہو، لیکن اس کے ساتھ استدلال کی قوت، قلم کی متانت، اور زبان کی حلاوت بھی ہو، میں نے جب یہ سلسلہ شروع کرنے کا ارادہ کیا تو اس وقت اپنے اس طرز تعلیم، اور عربی زبان و ادب کے اس نصاب اور ماحول کی قدر آئی جو ہندوستان میں ایک نیا تجربہ تھا، اور جس کی بظاہر اس وقت کوئی ضرورت اور معقولیت سمجھ میں نہیں آتی تھی، کہ ایک ایسے دور میں کہ ہندوستان کے نہ عالم عربی سے سیاسی، ثقافتی اور معاشی روابط تھے، نہ آمد و رفت کی سہولتیں تھیں، نہ وفود کے تبادلہ، نہ سفارت خانوں کے قیام، اور ممالک عربیہ کی دانش گاہوں سے ربط و تعلق کا دور شروع ہوا تھا، ایک ایسے خاندان کے (جس میں اعلیٰ انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا رواج تھا) فرد کو عربی زبان و ادب کی اس پیمانہ اور معیار پر تعلیم دی جائے، اور اس کو انشاء و تحریر و گفتگو کی مشق کرائی جائے جس سے مدارس عربیہ بھی ناآشنا تھے، اور دینی و علمی حلقے نہ صرف بیگانہ بلکہ اس کو اضاعتِ وقت کا مرادف سمجھتے ہوں گے، کہ عربی زبان کو صدیوں سے یہاں صرف دینی کتب کے سمجھنے سمجھانے کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا، جب میں نے دعوتی تحریر کا یہ کام شروع کیا، پھر جب تقدیر الٰہی نے ۱۹۵۱ء میں مشرق وسطی کے سفر کا سامان کیا تو اس وقت اپنے مُربّی اور ولیِّ نعمت مولوی حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب کی فراست اور دور بینی، اور دینی بصیرت کی قدر آئی کہ انھوں نے میرے لئے یہ راستہ انتخاب کیا اور مجھے تعلیم و تعلّم کے مروجہ طریقوں سے الگ کر کے عربی زبان و ادب، اور عربی تحریر و انشاء اور خطابت کے ذریعہ عالم عربی کو خطاب کرنے اور ان کو "بضاعتكم ردت إليكم" کہہ کر جھنجھوڑنے اور ان کے جذبات خوابیدہ کو

زوال سے پورے عالم انسانی پر کیا اثر پڑا، ان کے عروج سے انسانیت و تمدن اور اقوام و ملل کو کیا ملا، اور ان کے انحطاط و تنزّل سے انھوں نے کیا کھویا، اس وقت تک مسلمان اہل قلم کے بحث وفکر کا عام موضوع اور مؤرخین و مصنفین کے غور وفکر اور بحث و تحقیق کا میدان یہ تھا کہ دنیا میں پیش آنے والے واقعات عظیم جنگوں سلطنتوں کے سقوط، یورپ کی نشأت ثانیہ صنعتی و سائنسی انقلاب اور مغربی سامراج سے مسلمانوں پر کیا اثر پڑا، اور انھوں نے کیا کھویا اور کیا پایا؟ گویا مسلمان تاریخ کا کوئی "عامل" نہیں بلکہ "معمول" اور اثر انگیز واقعات اور انقلابات زمانہ کا تختۂ مشق ہیں، اردو کے محاورہ کے مطابق "وہ خربوزہ کی طرح ہیں کہ وہ چھری پر گرے یا چھری اس پر گرے نقصان بہر حال خربوزہ کا ہوگا" میرے علم میں ابھی تک کسی نے اس نظریہ کو پلٹ کر اس طرح سوچنے اور لکھنے کی کوئی منظم علمی و تاریخی انداز پر سائنٹفک کوشش نہیں کی تھی کہ مسلمان تاریخ کے ایک ایکٹر (ACTOR) نہیں ایک طاقت ور تاریخی بلکہ تاریخ ساز عامل (FACTOR) کی حیثیت رکھتے ہیں جس سے تقدیر انسانی وابستہ ہے، ان کے عروج و اقتدار سے اور ان کے قائدانہ اور مؤثر رول ادا کرنے کے مقام پر فائز ہونے سے پورے عالم انسانی کا رخ بدل رہا تھا، اور انسانیت سعادت سے ہم کنار ہو رہی تھی، اور ان کے زوال سے (جو خود ان کا لایا ہوا اور پیدا کیا ہوا تھا) انسانیت لاوارث، علم و تہذیب آوارہ، قومیں اور سلطنتیں شتر بے مہار، مساعی بے نتیجہ، علمی و صنعتی ترقیات باعث ہلاکت اور خودکشی کا سامان بن گئیں، اور دنیا اجتماعی اور منظم طریقہ پر ہلاکت و تباہی کے غار کی طرف رواں دواں ہوگئی، اب پھر اگر صحیح منزل کی طرف بازگشت کی کوئی امید اور نجات کا راستہ ہے تو وہ یہی ہے کہ مسلمان پھر منصب قیادت پر فائز ہوں، اور دنیا کی رہنمائی اسلام کے حصہ میں آئے۔

حقیقتاً یہ موضوع میرے سن وسال[1]، میرے علم و مطالعہ اور میرے ذہنی ارتقاء سے جوڑ نہیں کھاتا تھا، اس کے لئے اس سے زیادہ پختہ و بالغ نظر، اس سے زیادہ وسیع و عمیق مطالعہ، اور اس سے زیادہ کہنہ مشق اور تجربہ کار قلم کی ضرورت تھی، میرے جیسے آدمی کے لئے اس موضوع پر لکھنا ایک "جرءت رندانہ" یا "ادائے قلندرانہ" سے کم نہ تھا، لیکن انسانی کوششیں اور کاوشیں (جو توفیق الٰہی سے کبھی کبھی غیر معمولی طریقہ پر کامیاب اور مقبول ہو جاتی ہیں) ہمیشہ منطق و ریاضی کے تابع نہیں ہوتیں، اور اسی میں خیر ہے، ورنہ انسان ایک بے جان مشین بن کر رہ جائے، میں اس خیال سے ایسا سرشار، اور اس کے تقاضہ سے ایسا مغلوب ہوا کہ میں نے نہ صرف اس موضوع پر قلم اٹھانے کی جرءت کی، بلکہ عربی میں لکھنے کا فیصلہ کیا، یہ وہ زمانہ تھا جب دوسری جنگ عظیم کے نتیجہ میں مصر سے نیا لٹریچر آنا بند تھا، اور وہاں کی تازہ مطبوعات، اور مشاہیر ادباء اور مصنفین کی نئی کتابیں نہیں آرہی تھیں، میرے پاس بھی کتابوں کا محدود ذخیرہ تھا، جو زیادہ تر ادب و تاریخ کی کتابوں پر مشتمل تھا، اس وقت تک میں بہت سی نئی علمی اصطلاحات و تعبیرات سے ناآشنا تھا، اور ان کے معلوم کرنے کا میرے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا۔

کتاب میں سب سے پہلے اس کی ضرورت تھی کہ عہد ماقبل اسلام "جاہلیت عالمیہ" (WORLD PAGANISM) کا پورا نقشہ جو اس کے اعتقادی، مذہبی، اخلاقی، اجتماعی اور معاشرتی تمدنی اور سیاسی پہلوؤں پر حاوی ہو پیش کیا جائے، تاکہ معلوم ہو کہ انسانیت عالمگیر پیمانہ پر کس پستی بلکہ خودکشی اور خودسوزی کی منزل پر پہونچ گئی تھی، اور اسلام کا ظہور کن نامساعد حالات اور کس تاریک ماحول میں ہوا، اور اس کو نشأۃ ثانیہ کے لئے، بلکہ بقائے انسانیت

---

[1] میری عمر اس وقت تیس[30] سال سے زائد نہ تھی۔

کے لئے کتنا عظیم اور کتنا دشوار کام کرنا تھا۔

اس سلسلہ میں جب مطالعہ شروع کیا تو اندازہ ہوا کہ جاہلیت عالمی پر کہیں یکجا مواد ان زبانوں میں نہیں ملتا جن سے مجھے کم وبیش واقفیت تھی، یہ مواد علٰحدہ علٰحدہ ملکوں کی تاریخ کی بیسیوں کتابوں، ہزاروں صفحات، اور کئی زبانوں میں منتشر ہے، اور اکثر غیر متعلق اور ضمنی مباحث اور ان موضوعات کے ماتحت ہے جہاں مشکل سے کسی تحقیقی کام کرنے والے کی نظر جاسکتی ہے، مجھے اس سلسلہ میں ایک نئے سفر کا آغاز کرنا پڑا جس کی منزلیں پہلے سے معلوم اور متعین نہیں تھیں، لیکن توفیق الٰہی سے (جس کا اس کتاب کی تالیف کے سلسلہ میں بار بار اور حیرت انگیز تجربہ ہوا[۱]) وہ کڑیاں ملتی چلی گئیں جن کی ضرورت تھی، لیکن یہ کام چیونٹیوں کے منہ سے شکر کے دانے جمع کرنے اور اس کا انبار لگانے کے مرادف تھا، اس سلسلہ میں

---

[۱] جس کی ایک دلچسپ مثال یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء میں میرا مدینہ طیبہ میں قیام تھا، اور میں اس کتاب کی تکمیل وتحسین میں مشغول تھا، مجھے اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ یورپ میں جو اخلاقی مکتب خیال، رواقی، لذتی وغیرہ قائم ہوئے، ان کی تاریخ معلوم ہو اور عربی میں ان کے لئے کیا اصطلاحات وتعبیرات استعمال کی جاتی ہیں، ان کا علم ہو، میرے پاس کوئی ماخذ نہیں تھا، میں ایک دن اپنی قیامگاہ پر آیا تو گھر والوں نے بتایا کہ ایک عرب صاحب آئے تھے، وہ بہت دیر تک تم کو آواز دیتے رہے، جب کوئی جواب نہیں ملا تو دروازہ کی دراز سے یہ کتاب اندر ڈال گئے، میں نے دیکھا تو استاد جاد المولیٰ بک کی کتاب تاریخ وفلسفہ اخلاق پڑی تھی جس میں میری وہ تمام مطلوب معلومات موجود تھیں، بعد میں معلوم ہوا کہ لانے والے میرے ایک ترک نوجوان دوست علی علوی ترکی تھے، میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کو اس کا کیسے خیال پیدا ہوا؟ انھوں نے کہا کہ میری اس کتاب پر نظر پڑی تو میرے دل میں آیا کہ شاید یہ کتاب آپ کی دلچسپی اور کام کی ہوگی، اس لئے میں آپ کے گھر چھوڑ آیا، مصنفین کو جو کبھی نیک مقصد کے لئے قلم اٹھاتے ہیں، ایسے بہت تجربے ہوئے ہوں گے۔

امیر الدولہ لائبریری لکھنؤ کے انگریزی ذخیرہ، مولانا عبد الماجد صاحب دریا بادی کے ذاتی کتب خانہ کی اردو مطبوعات سے (جن میں سے بہت سی "صدق" میں تبصرہ کے لئے آئی تھیں، اور بہت سی انھوں نے انگریزی تفسیر کے سلسلہ میں جمع کی تھیں) اور سب سے بڑھ کر حاجی عبد الوہاب صاحب دہلوی مرحوم (حاجی علی جان والے) کے منتخب کتب خانہ کی جدید ترین عربی مطبوعات سے مدد ملی جس سے استفادہ کا موقعہ مجھے ۱۹۴۷ء میں مکہ معظمہ کے طویل قیام کے دوران ملا، العصر الجاهلی کے تحت میں میرے اندازہ کے مطابق اتنا مواد جمع ہو گیا، جو اس وقت تک کسی کتاب میں یکجا دیکھنے میں نہیں آیا تھا جب میں نے ۱۹۷۷ء میں السیرۃ النبویۃ میں العصر الجاهلی کا باب شروع کیا تو مجھے اس میں بڑا شبہ تھا کہ میں ماذا خسر العالم میں اس باب میں جو کچھ لکھ چکا ہوں، اس میں اب کوئی اضافہ کر سکوں گا لیکن "جوئندہ یابندہ" مجھے اس کے لئے اتنا جدید مواد مل گیا کہ وہ ایک مستقل چیز ہو گئی[1]۔

کتاب کے دوسرے باب میں صحبت نبویؐ کی کیمیا اثری، اور دعوتِ اسلامی کی انقلاب انگیزی کو دکھایا گیا، اور یہ بتایا گیا تھا کہ درس گاہِ نبوت سے جو نسل تعلیم پاکر نکلی اس کی موجودہ زندگی اس کی سابقہ زندگی سے، اور اس کی سیرت و اخلاق ان سب لوگوں سے جنھوں نے اس دعوت کو قبول نہیں کیا تھا، کتنے مختلف تھے، اور یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تبلیغ و دعوت، اور اصلاح و انقلاب کے کام میں کن چیزوں کو اولیت اور مرکزیت عطا کی اور کام کہاں سے شروع کیا اور کہاں ختم کیا؟ اور یہ کہ یہی طریقہ قیامت تک کے لئے کامیابی کا ضامن اور انقلاب حال کا ذریعہ ہے، اس باب کی ترتیب میں مجھے

---

[1] اس سلسلہ میں محب گرامی سید محی الدین صاحب سے قیمتی مدد ملی، جو میری اکثر کتابوں کے انگریزی میں مترجم ہیں، انھوں نے جدید ماخذ سے متعدد نئی معلومات اور تحقیقات جمع کر کے دیں۔

زیادہ دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ اس کا مواد قرآن وحدیث اور سیرت وتاریخ میں موجود تھا، اور وہ عربی ہی میں تھا، کتاب کی طباعت میں جب تاخیر ہوئی تو میں نے اس حصہ کو علیحدہ رسالہ کی شکل دی، اور اس کا نام "من الجاهلية إلى الإسلام" رکھ کر اس کو علیحدہ سے شائع کر دیا۔[۱]

تیسرے باب میں مسلمانوں کے زوال کی المناک داستان سنائی گئی ہے، اور اس کے تدریجی ارتقاء اور حقیقی اسباب پر روشنی ڈالی گئی ہے، پھر ترکوں کے میدان قیادت میں آنے اور عالم اسلامی کا سنبھالا لینے کا ذکر ہے، پھر خود ترکوں میں انحطاط وتنزل شروع ہونے، اس کے اسباب، اور آخر میں اس کے نقطۂ عروج پر پہونچ جانے، اور اس کے عالم اسلامی پر اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے، اس میں ان کتابوں سے مدد لی گئی ہے، جو ترکی کی تاریخ میں اختصاص رکھنے والے مصنفین نے لکھی ہیں۔

اس کے بعد کتاب کا وہ اہم باب شروع ہوتا ہے، جس میں یورپ کے منصب قیادت پر آنے اور دنیا کی زمام کار ہاتھ میں لینے کی تاریخ اور اس کے طبعی اور مادّی اسباب کا ذکر کیا گیا ہے، نیز یہ کہ کس طرح اور کیوں اس نے عیسائیت سے انحراف کیا، اور خالص مادّیت کے راستہ پر پڑ گیا، اس کے تاریخی اسباب ومحرکات کیا تھے؟ اس سلسلہ میں وہ مطالعہ کام آیا،

---

[۱] اس وقت ہندوستان میں عربی ٹائپ اور عربی مطابع اتنے نایاب تھے کہ مجھے اس کے لئے رام پور جانا پڑا، "الحسنات" جس اردو مطبع میں چھپتا تھا، اس کے پاس عربی ٹائپ کا کچھ میٹر تھا، مولوی عبدالحی صاحب مدیر الحسنات کی مدد سے یہ رسالہ اس پریس میں چھپا اور مصر تک پہونچا، بعد میں جنیوا کے اسلامک سینٹر نے جس کے ڈائریکٹر ہمارے عزیز دوست ڈاکٹر سعید رمضان تھے، اس کا انگریزی اور فرنچ میں ترجمہ کرایا، انگریزی میں ONLY A PROPHPET CAN DO IT کے عنوان سے چھپا، حال میں اس کا تامل میں ترجمہ ہوا ہے۔

جو یورپ میں مذہب و سائنس کی آویزش، ریاست و کلیسا کی رقابت، اور یورپ کے اخلاقی زوال اور نئے اخلاقی تصورات و اقدار، قوم و نسل پرستی کے ارتقاء کے سلسلہ میں کیا گیا تھا، پھر بتایا گیا کہ مغرب کی (جس کے ہاتھ میں اس وقت دنیا کی قیادت ہے) اس صورت حال سے دنیا پر کیا اثر پڑ رہا ہے، اور وہ کن خطروں سے دوچار ہے، اسی زمانہ میں "صدق" میں مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے لندن یونیورسٹی کے شعبۂ فلسفہ کے صدر C.M. JOAD کی دو کتابوں (NEW PHILOSOPHY FOR OUR TIME) اور (THE MODREN WICKEDNESS) پر تبصرہ کیا، میں نے یہ کتابیں امیر الدولہ لائبریری سے حاصل کیں، اور ان کو حرفاً حرفاً پڑھا، اور ان سے پورا فائدہ اٹھایا، مجھے اس میں اپنے بعض خیالات کی تائید میں بڑی قیمتی شہادتیں ملیں۔

اس کے بعد یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اب عالم اسلام کس طرح اپنے کھوئے ہوئے مقام کو حاصل کر سکتا ہے، اور دنیا کو اس ورطۂ ضلالت، اور خطرۂ ہلاکت سے نجات دے سکتا ہے، اس سلسلہ میں ایمان و عمل، روح دعوت، اخلاق و روحانیت سے لے کر حربی اور صنعتی تیاریوں، اور عالم اسلام کو خود کفیل بننے کا مشورہ دیا گیا ہے، آخر میں عربوں کو عالم اسلام کی قیادت، اور اس کے منصب امامت سنبھالنے کی پر زور دعوت دی گئی، اور ان کی کمزوریوں کی نشاندہی کی گئی، اور ان کے ازالہ کی تدبیریں بتائی گئیں، اس کتاب کا بڑا طاقتور اور مؤثر حصہ وہ ہے جس کا عنوان ہے "محمد رسول اللہ روح العالم العربی" جس میں بتایا گیا ہے کہ عربوں کو جو کچھ نصیب ہوا وہ سب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قدموں کے صدقہ اور آپ کے طفیل میں ہوا، اگر وہ اس نعمت کی ناشکری کرتے ہیں، اور اس کی قدر و قیمت کا ان کو انکار ہے، اور ان کو اپنی جاہلیت یاد آتی ہے، اور قومیت عربیہ میں اپنی ترقی و سربلندی نظر آتی ہے تو ذرا اس عطیہ کو

واپس کرکے دیکھیں کہ ان کے پاس کیا رہ جاتا ہے؟ یہ گویا علامہ اقبال کے اس بلیغ شعر کی شرح ہے ؂

نہیں وجود حدود و ثغور سے اس کا
محمدؐ عربی سے ہے عالم عربی

اگر کسی بدعت اور فتنہ کا اندیشہ نہ ہوتا تو مصنف وصیت کر جاتا کہ کتاب کے یہ صفحات اس کے کفن میں رکھ دیئے جائیں کہ وہ ان کو اپنے لئے ذریعۂ مغفرت اور وسیلۂ شفاعت سمجھتا ہے۔[1]

کتاب کی تیاری، تکمیل و تذئیل کا سلسلہ ۴۳-۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۷ء تک جاری رہا، جب مصنف کو محسوس ہوا کہ اصل کتاب کی طباعت و اشاعت میں ابھی بہت دیر ہے کہ وہ اس وقت تک ہندوستان سے باہر نہیں گیا تھا، اور مصر کے اشاعتی مرکزوں سے اس کے روابط نہیں تھے، تو اس نے اس وقت تک جہاں تک پہونچی تھی، اس کا ترجمہ اردو میں کر دیا، اور دہلی کے جمال پرنٹنگ پریس سے "مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہونچا"[2] اسی زمانہ میں اس کتاب پر حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ

---

[1] میرے ایک صاحب ذوق اور صاحب ایمان خاندانی بزرگ مولوی حکیم سید حسن مثنیٰ صاحب رضوی ندوی امروہی مرحوم کو کتاب کا یہ حصہ اتنا پسند تھا کہ جب میں پہلی مرتبہ ان سے امروہہ میں ملا تو انھوں نے مجھ سے فرمائش کی کہ اس کو بلند آواز سے اور عربی لہجہ میں پڑھ کر سناؤں، میں نے جب ان کی فرمائش کی تعمیل کی تو ان پر رقت طاری تھی۔

[2] بعد میں پوری کتاب کا ترجمہ عزیزان محمد میاں سلمہٗ اور مولوی عبد اللہ عباس ندوی کے قلم سے "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" کے نام سے شائع ہوا، اور وہی چل رہا ہے۔

اور مولانا سید سلیمان صاحب ندویؒ کی نظر پڑی، مولانا مدنی نے "نقش حیات" میں اس کے حوالہ سے بعض اقتباسات نقل کئے، اس وقت تک مصنف کو خود اس کا اندازہ نہ تھا کہ یہ کتاب وقت کی ایک اہم ضرورت پوری کرتی ہے، اور تعلیم یافتہ مسلمانوں میں ذہنی حرکت پیدا کرسکتی ہے، لیکن اس کا دل گواہی دیتا تھا کہ کتاب کو ضرور منظر عام پر آنا چاہئے۔

اسی عرصہ میں ۱۹۴۷ء میں میرا حجاز کا سفر پیش آیا، وہاں اس وقت حرم مکی کے خطیب وامام ایک مصری عالم شیخ محمد عبدالرزاق حمزہ تھے، وہ وسیع النظر عالم اور متنوع الکمالات شخص تھے، جدید مطبوعات پر ان کی نظر وسیع و عمیق تھی، اور اپنی دینی و خطابتی ذمہ داریوں کے ساتھ وہ علم و مطالعہ کے قافلہ سے بچھڑنے نہیں پائے تھے، میں اکثر ان کے پاس اٹھتا بیٹھتا تھا، میں نے ان کی خدمت میں کتاب کا مسودہ پیش کیا، انھوں نے اس کا مطالعہ کیا، وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے کتاب کے متعلق بلند الفاظ میں اپنا تأثر ظاہر کیا، اور مجھے اس کے طبع کرانے کی تاکید کی بعض اصطلاحات و تعبیرات میں مجھے ان سے مدد بھی ملی، میں نے ایک دن مطبعۃ الکردی میں جاکر جو مکہ معظمہ کا واحد تجارتی مطبع تھا اس کی طباعت کا تخمینہ بھی حاصل کیا، اس زمانہ میں افریقہ کے ایک تاجر آئے ہوئے تھے، جو خود بھی ذی علم و صاحبِ نظر اور اس کے ساتھ مخیر اور فیاض بھی تھے، میں ایک دن ہوٹل لوکانده مصر میں جاکر ان سے ملا، کتاب کا تعارف کرایا اور اس کے چھپنے کی ضرورت ظاہر کی، وہ زمانہ کے جدید تقاضوں اور نئی نسل کے ذہن سے زیادہ واقف نہ تھے، شاید مذہب حنفی کی تائید میں کوئی قدیم یا جدید کتاب ہوتی تو وہ بڑی پیش کش کرتے، انھوں نے ایک رقم (جو شاید دو سو ریال (پانچ سو روپیہ ہندوستانی) سے زیادہ نہ ہوگی، عنایت فرمائی، میں نے قبول تو کرلی مگر بہت دل شکستہ ہوا، جہاں ہم لوگوں کا

قیام تھا، اس کا راستہ حرم شریف سے ہو کر بھی جاتا تھا، میرا وضو تھا، میں سیدھا حرم شریف گیا، اور اسی دل شکستگی کے عالم میں ملتزم پر اس کتاب کی طباعت کے سامان ہونے اور قبولیت کی دعا کی، غالباً اس دعا ہی کا اثر تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی طباعت کا غیب سے بہتر سے بہتر سامان پیدا کیا، اور اس کو وہ مقبولیت عطا کی جو میری کسی تصنیف کو حاصل نہیں ہوئی۔[1]

حجاز سے ہندوستان واپس آیا تو کتاب اپنے تکمیلی مراحل کو پہونچ چکی تھی، اور اشاعت کے لئے بالکل تیار تھی، خدا کی یہ رہنمائی تھی کہ اس کی اشاعت کے لئے میری نظر انتخاب ڈاکٹر احمد امین کے اشاعتی اور تصنیفی مرکز "لجنۃ التالیف والترجمۃ والنشر" قاہرہ پر پڑی، جس کو مصر میں وہ مقام حاصل تھا جو ہمارے تحتی بر اعظم میں دار المصنفین اعظم گڑھ کو ہے، کہ اس سے کسی مصنف کی کتاب کا شائع ہو جانا اس کی وقعت کو بڑھاتا .... اور علمی حلقہ میں اعتماد پیدا کرتا ہے، میں نے ان سے مراسلت شروع کی اور کتاب کے مضامین کی فہرست بھیجی، انھوں نے اپنے ایک خط کے ذریعہ اس کا پتہ چلانا چاہا کہ میں نے اجنبی ماخذ سے کہاں تک استفادہ کیا ہے، اور یہ کتاب صرف مولویانہ اور

---

[1] اس کا ہلکا سا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس وقت تک کتاب کے پندرہ ۱۵ کے قریب صرف قانونی ایڈیشن مصر، بیروت و شام سے نکل چکے ہیں، آخری ایڈیشن ۸۲ء میں ایک لاکھ کی تعداد میں دار القلم کویت نے نکالا، جس کے اسی ۸۰ ہزار نسخے فوراً مملکت سعودیہ کی وزارت تعلیم نے خرید لئے، بارہ ۱۲ ہزار نسخے مکتبۃ الحرم ریاض نے لئے، اور بقیہ بھی اس وقت تک نکل چکے ہوں گے، کتاب کے اردو میں نو ۹ اور انگریزی میں چھ ۶ .... ایڈیشن، ترکی و فارسی میں کم سے کم دو ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

داعیانہ ہے یا مؤرخانہ اور محققانہ؟ میں نے کتاب کے انگریزی مآخذ کی فہرست اور اس کے مسودہ کی ایک نقل بھیج دی، اس پران کا بڑی مسرت اور گرم جوشی کا خط آیا، جس میں انھوں نے لکھا کہ کتاب کیا بلحاظ زبان، کیا بلحاظ مواد ہر طرح سے مکمل ہے، اور ہماری کمیٹی نے اس کی طباعت کا فیصلہ کرلیا ہے، مجھے یاد ہے کہ میری زندگی میں چند دن جو انتہائی مسرت کے گذرے ہیں، ان میں ایک وہ دن بھی تھا، جب عزیزی محمد رابع سلمہ نے مجھے چلتی ہوئی موٹر میں وہ خط دیا[1]، حقیقت میں اس کتاب کی اشاعت نے میرے دعوتی کام میں وہ آسانی، اور مشرق وسطی کے علمی و دینی حلقہ میں میرے تعارف کا وہ کام کیا جو سیرت سید احمد شہیدؒ کی اشاعت نے ہندوستان میں کیا تھا، میں جب ۱۹۵۱ء میں مصر گیا، تو یہ کتاب وہاں کے علمی و دینی حلقوں میں خوب پھیل چکی تھی، اور میرے تعارف کے لئے اتنا کافی سمجھا جاتا تھا کہ یہ "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" کے مصنف ہیں، اس وقت اخوان المسلمین کی تحریک پر پابندی عائد تھی، شیخ حسن البنّاؒ مرحوم کی شہادت ہو چکی تھی، اخوان کے دل مجروح تھے، اس کتاب کو پڑھ کر جس میں ان کو امام شہید کے خیالات و مقاصد کا عکس نظر آتا تھا، اور جو دین کے داعیوں، اور غلبۂ اسلام کی متمنّی طبیعتوں میں خود اعتمادی اور عزم و حوصلہ پیدا کرتی تھی، بڑی تقویت و تسکین حاصل ہوئی، اور انھوں نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا، جیل میں جس میں ہزاروں اخوانی قید تھے، پڑھی گئی، مطالعہ کے

---

[1] افسوس ہے کہ اصل خط میرے پاس سے ضائع ہوگیا، ورنہ وہ ان کے مقدمہ سے زیادہ طاقتور اور مفید تھا، میں اس وقت اپنے مرشد حضرت رائے پوری کے ساتھ تحصیل فتح پور کی طرف جا رہا تھا، میری مسرت اتنی نمایاں تھی کہ حضرت نے مولانا منظور صاحب سے (جو اس سفر میں ساتھ تھے) پوچھا کہ کیا بات ہے؟ میں نے واقعہ عرض کیا۔

حلقوں اور نصاب میں داخل کی گئی، جدید تعلیم یافتہ اور جدید طبقہ میں اس کو ابتداءً اس لئے توجہ کی نظر سے دیکھا گیا کہ وہ "لجنۃ التالیف والترجمۃ والنشر" کی طرف سے ڈاکٹر احمد امین کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔

یہ کتاب ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی لیکن جنوری ۱۹۵۱ء تک مجھے اس کے دیکھنے کی نوبت نہیں آئی، پہلی مرتبہ اس پر نظر پڑنے کا بھی دلچسپ واقعہ ہے، میں نے جنوری ۱۹۵۱ء کی ابتدائی تاریخوں میں جب مکہ معظمہ میں طویل قیام رہ چکا تھا، مصر کے سفر کا عزم کیا، تو شام کو بھی اس پروگرام میں شامل کرنے کا ارادہ ہوا، میں شامی سفارت خانہ جدہ میں شام کا ویزا لینے گیا، عزیزان مولوی معین اللہ صاحب ندوی (حال نائب ناظم ندوۃ العلماء) اور مولوی عبدالرشید ندوی جو سال ڈیڑھ سال سے دعوت وتبلیغ، اور میرے دعوتی رسائل کو اہل علم تک پہونچانے کے لئے مکہ میں مقیم تھے، اس سفر میں میرے ساتھ جانے والے تھے، میرے ساتھ سفارت خانہ گئے، مجھے جب شام کا ویزا مل گیا تو میں نے شامی سفیر سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا، حسن اتفاق سے اس وقت اس عہدہ پر استاذ جواد المرابط متعین تھے، جو خود فاضل وادیب تھے، اور المجمع العلمی العربی دمشق کے رکن، انھوں نے ہم لوگوں کو اوپر بلالیا، ادبائے مصر اور وہاں کے اہل قلم پر بات نکلی تو انھوں نے کہا کہ ہندوستانی علماء ومصنفین کی تحریریں ہم کو جو اثر اور دل آویزی محسوس ہوتی ہے، وہ ان کے یہاں نہیں پائی جاتی، مثلاً میں ابھی مصر گیا تھا، وہاں ایک مکتبہ میں ایک کتاب رکھی ہوئی تھی "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" میں لے آیا، اور پڑھ کر بہت متاثر ہوا، میرے اندر یہ سن کر ایک بجلی سی دوڑ گئی، اور میں نے بڑے اشتیاق واضطراب کے ساتھ پوچھا، کیا یہ کتاب آپ کے پاس ہے؟ اور ہمیں دکھا سکتے ہیں؟ انھوں نے کہا ہاں! اور الماری میں سے نکال کر دی، میں نے چند دن کے لئے اس کو ان سے

مستعار لے لیا، اپنی کتاب پڑھ کر ایک مصنف کو جو خوشی ہونی چاہیئے وہ قدرتاً مجھے ہوئی لیکن ڈاکٹر احمد امین کا مقدمہ پڑھ کر دل بھیکا ہو گیا کہ مقدمہ خود پھیکا اور فرمائشی معلوم ہوتا تھا، مجموعی طور پر کتاب کی انھوں نے تعریف کی تھی اور اس کے مقصد سے اتفاق کیا تھا، مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی لکھا تھا کہ "اگر قارئین کو کتاب میں کہیں غموض نظر آئے تو ان کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ مصنف بہرحال ہندی نژاد شخص ہیں" جن دوستوں نے یہ مقدمہ پڑھا وہ خوش نہیں ہوئے، اور انھوں نے برملا کہا کہ کتاب کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا،[1] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب ڈاکٹر صاحب نے مقدمہ لکھنے کا ارادہ کیا تو یا تو وہ لکھنے کے موڈ میں نہیں تھے، یا ان کو یہ خیال ہوا کہ ایک ایسے گمنام اور نوعمر مصنف کے حق میں ان کو زیادہ تحسین واعجاب کا اظہار نہیں کرنا چاہیئے جس کو انھوں نے ابھی دیکھا بھی نہیں، اور معلوم نہیں وہ اپنے حلقہ میں کس نظر سے دیکھا جاتا ہے، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس کتاب کا ان کے مختصر اور ہلکے مقدمہ کے ساتھ بھی "لجنة التاليف والترجمة والنشر" سے شائع ہو جانا کتاب کے لئے بہت مفید ہوا۔

ڈاکٹر احمد امین کے اس مقدمہ کی کمزوری کی تلافی کا خدا نے ایک غیبی سامان کیا کہ ان کے ایک عزیز شاگرد ڈاکٹر شکری فیصل نے جو ان کی ماتحتی میں ریسرچ کا کام کر رہے تھے، کتاب کے تعارف اور تبصرہ پر ایک طاقتور مضمون خود ڈاکٹر صاحب کے رسالہ "مجلة الثقافة" میں شائع کرایا جس میں انھوں نے کتاب کی زبان واسلوب کی بھی تحسین کی، اور ڈاکٹر صاحب کے اس فقرہ پر استعجاب کا اظہار کیا جو انھوں نے اس کی بعض عبارتوں یا تعبیرات کے غیر واضح ہونے پر لکھا تھا، یہ مضمون ہمارے مکہ معظمہ کے عرب احباب میں بڑے شوق و دلچسپی سے پڑھا گیا،

---

[1] اسی ۱۹۵۱ء میں جب شرق اردن کے والی شاہ عبداللہ (بن شریف حسین) سے ملاقات ہوئی تو میں نے ان کو یہ کتاب پیش کی تو انھوں نے بھی پڑھ کر اسی طرح کے تاثر کا اظہار کیا، اور ڈاکٹر صاحب کے مقدمہ کو پسند نہیں کیا۔

اور اس سے اتفاق کیا گیا، بلکہ ایک دوست استاذ مصطفیٰ العطار نے (جو بعد میں ایک بڑے تعلیمی عہدہ پر فائز ہوئے) کتاب کی حمایت اور تائید میں وہاں کے کسی اخبار یا رسالہ میں مستقل مضمون لکھا۔

مصر ہی کے قیام ۱۹۵۱ء میں جب مجھے معلوم ہوا کہ سید قطب اس کتاب سے متاثر ہیں، اور انھوں نے اس کی بناء پر مجھ سے ملاقات کی خواہش کی، پھر مجھے اپنے یہاں جمعہ کی ایک مجلس میں جس میں اس کتاب پر مقالہ پڑھا جانے والا تھا، اور اس پر بحث بھی ہونے والی تھی، مجھے مدعو کیا، تو مجھے اچانک خیال ہوا کہ میں ان سے اس کتاب پر مستقل مقدمہ لکھنے کی درخواست کروں، انھوں نے بڑی خوشی سے اسے منظور کیا، اور ایسا طاقتور اور مفصل مقدمہ لکھا جس نے خود کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ کیا، انھوں نے صفائی سے اس کا اعتراف کیا کہ انھوں نے اس مقصد پر جو چند بہترین کتابیں پڑھی ہیں، اس میں اس کتاب کو خاص امتیاز حاصل ہے، پھر یہ کہ کتاب بڑی مربوط، مدلل، اور حقیقت پسندانہ علمی اسلوب میں لکھی گئی ہے، اور محض دعاوی اور جذباتیت پر مبنی نہیں ہے، ٹھوس دلائل اور قیمتی مواد رکھتی ہے، سید قطب کے اس مقدمہ سے پہلے ایک مقدمہ ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ (استاذ کلیۃ اصول الدین۔ ازہر) لکھ چکے تھے، جو کتاب کے خاص قدر دانوں میں تھے، انھوں نے کتاب کو ایک ہی نشست میں پڑھ کر سرورق پر لکھا تھا کہ "ہر ایسے شخص کے لئے اس کتاب کا پڑھنا لازمی ہے، جو اسلام اور مسلمانوں کی ترقی کا خواہش مند ہو" ان کے علاوہ ہمارے عزیز دوست شیخ احمد الشرباصی نے (جو بعد میں ڈاکٹر احمد الشرباصی کے نام سے معروف ہوئے) بہانہ بہانہ اور باتوں باتوں میں مجھ سے میری زندگی کے حالات اور اس کے متعلق معلومات حاصل کئے، اور ان کی مدد سے "ابو الحسن علی الندوی، صورۃ وصفیۃ" کے عنوان سے میرا تعارف کرایا۔

اس کتاب میں اپنی ساری تصنیفات کا تعارف کرانا مقصود نہیں، اور نہ یہ کسی مصنف کے لئے مناسب و موزوں ہے، اس کتاب کا قدرے تفصیل کے ساتھ اس لئے ذکر کیا گیا کہ وہ اس کی دعوتی اور علمی زندگی میں بہت اہمیت ہے، اور آئندہ صفحات میں اس کا بار بار حوالہ آنے والا ہے۔

"إلى مُمثّلي البلاد الإسلامية"

اس کتاب کے علاوہ میں اپنے ایک اور دعوتی رسالہ کا ذکر کروں گا، جس سے حجاز میں دعوت کے کام میں بڑی مدد ملی۔

اپریل ۱۹۴۷ء کی تاریخوں میں پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم ہند کی دعوت پر ایشیائی کانفرنس منعقد ہوئی، جو غالباً اپنی نوعیت کی پہلی بین الاقوامی کانفرنس تھی، جو تقسیم سے پہلے منعقد ہو رہی تھی، اس کانفرنس کے لئے مختلف عرب اور اسلامی ممالک کو بھی دعوت دی گئی تھی کہ اپنے ڈیلی گیٹ بھیجیں، میں اس وقت نظام الدین کی تبلیغی دعوت و تحریک سے مربوط تھا (جس کی ابتدا اور ارتقاء کا ذکر مستقل باب میں آنے والا ہے) توقع تھی کہ مصر، شام، عراق، لبنان، ترکی و ایران سے چیدہ عرب نمائندے آئیں گے، اس وقت کے امیر جماعت اور مولانا محمد الیاس صاحب کے لائق فرزند و جانشین مولانا محمد یوسف صاحب نے مجھے دہلی آنے کی دعوت دی، اور یہ کہ میں ان عرب نمائندوں کو خطاب کرنے کے لئے تیار ہو کر آؤں، میں نے چلنے سے پہلے مولانا محمد منظور صاحب کے دفتر "الفرقان" میں جو اس وقت گوئن روڈ پر واقع تھا "إلى مُمثّلي البلاد الاسلامية" کے عنوان سے ایک دو نشستوں میں ایک مقالہ تیار کر لیا، اس کا مرکزی خیال اور بنیادی مضمون میری اس تقریر سے

ماخوذ تھا، جو میں نے ۱۹۴۴ء میں پشاور کی سیرت کانفرنس میں کی تھی، اس کا خلاصہ یہ تھا، کہ امت اسلامیہ کا ظہور اس وقت ہوا جب..... زمین قوموں، ملکوں، تمدنوں، سلطنتوں، اور ماہرین فن سے معمور تھی، اور کسی ایسی نئی قوم اور جماعت کے ظہور کی ضرورت تھی نہ گنجائش جو انھیں ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے دنیا میں آئے، جن کو پورا کرنے کے لئے ہزاروں قومیں اور ملک موجود تھے، اس وقت ایک نئی دعوت، نئے عقیدہ، اور نئے مقاصد کے لئے، اس امت کا ظہور ہوا، بعثت نبوی کے بعد مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ میں کفر و اسلام، اور قریش اور مسلمانوں کے درمیان جو معرکہ پیش آیا، وہ درحقیقت خاص عقیدہ دعوت، مخصوص سیرت و اخلاق اور مسلک زندگی، اور مقاصد زندگی کی بنیاد پر تھا، اور یہ دونوں متحارب گروہ دو متضاد عقیدوں، سیرتوں اور مسلک زندگی کے نمائندہ تھے، قریش مکہ اس لئے مدینہ کے مہاجرین و انصار سے نبرد آزما تھے، کہ وہ ایک خاص عقیدہ کے متبع، ایک خاص دعوت کے حامل، ایک خاص سیرت سے متصف و آراستہ، اور خاص مقاصد زندگی کے داعی اور علمبردار تھے، انھوں نے جب اس دین کے داعی اول (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے دولت کی، سرداری کی، حکومت کی اور عیش و عشرت کی پیش کش کی تو آپ نے اس کو صاف ٹھکرا دیا، اس پر بدر و اُحد، اور حنین و اوطاس کی جنگیں ہوئیں، اور اہل جاہلیت یہی سمجھتے رہے کہ یہ مسلمان مال و منال، عیش و عشرت، اور عزت اقتدار کے بھوکے نہیں، مسئلہ سارا اعتقادی، اصولی، ایمانی اور اخلاقی ہے۔

لیکن اب موجودہ مسلمان ملکوں اور قوموں کی صورت حال مختلف ہے، انھوں نے انہی مقاصد زندگی کو اپنا لیا ہے، اور بہت جگہ وہی سیرت و طرز زندگی اختیار کر لیا ہے، جس کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حقارت کے ساتھ ٹھکرا یا تھا، اور صحابہ کرامؓ نے

اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا، بہت سی مسلمان قوموں اور ملکوں کے نمائندے اگر کسی عالمی اور بین الاقوامی اجتماع میں شریک ہوں تو ان میں وہ مابہ الانبیا زاوصاف اور ایک دوسرے سے جدا کرنے والے خط و خال نظر نہیں آئیں گے، جن سے مسلمان پہچانا جاتا تھا، اب بتایئے کہ اگر قریش کے بدر و اُحد کے مقتولین زندہ ہو جائیں، اور وہ مسلمانوں سے سوال کریں کہ ساری جنگ عقیدہ و سیرت و اخلاق پر لڑی گئی تھی، لیکن تم میں سے بہت سے لوگوں نے وہی راستہ اختیار کر لیا ہے جس پر ہم تمہارے سامنے بڑی سے بڑی پیش کش کر رہے تھے، لیکن تم نے اس کو اس وقت ٹھکرا دیا تھا، اب تم انھیں مقاصد کے پیچھے دوڑ رہے ہو، اور ایک دوسرے سے مسابقت کر رہے ہو، تم نہ اس دعوت کے علمبردار ہو، جو تمہارے نبیؐ لے کر آئے تھے، نہ اس سیرت و طرز زندگی کا نمونہ جس کا تمہارے اسلاف شہدائے بدر و حنین نے نمونہ پیش کیا تھا؟ تو بتایئے کہ ہمارا کیا جواب ہوگا؟ اور ہمارا بڑے سے بڑا وکیل اور نمائندہ ان کو کس طرح مطمئن کر سکے گا؟

میں نے اس مضمون کو دہلی پہونچ کر ہمایوں کے مقبرہ کے پاس لان پر بیٹھ کر صاف کیا، اور سنانے کے لئے تیار کیا، میں ایشیائی کانفرنس میں شریک ہوا، جو مسز سروجنی نائیڈو کے زیر صدارت ہو رہی تھی، جواہر لال صاحب اور جناح صاحب اور سری آئینگر وغیرہ کی انگریزی تقریریں سنیں، عرب ممالک کی طرف سے مصر سے ڈاکٹر عبدالوہاب عزام (علامہ اقبال کے فارسی کلام کے عربی مترجم) اخوان المسلمین کے مشاہد (OBSERVER) بن کر استاد مصطفیٰ مؤمن، لبنان کی طرف سے تقی الدین الصلح (جو بعد میں لبنان کے وزیر اعظم بھی بنے) آئے تھے، افغانستان اور بعض اسلامی ممالک کے نمائندے بھی تھے،

قریشی صاحب[1] نے شام کو چائے کی ایک دعوت کا اہتمام کیا جس میں ایک یا دو عرب نمائندے اور دوسرے ممالک کے معدودے چند لوگ شریک ہوئے، وہاں اس مضمون کے پڑھنے کا کوئی محل سمجھ میں نہ آیا، بعد میں یہ مضمون ایک رسالہ کی شکل میں ڈان (DAWN) اخبار کے پریس میں عربی ٹائپ میں چھپا، اور میرے حجاز کے پہلے سفر ۱۹۴۷ء میں گیا، اور اس نے بڑا کام دیا، جس کا ذکر سفر حج کے سلسلہ میں آئے گا۔

ادارہ تعلیمات اسلام کا قیام، درس قرآن، اور رسالہ "تعمیر"

۱۹۴۳ء میں بعض خاص حالات کی بناء پر رفیق محترم مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی کو دارالعلوم سے علٰحدگی اختیار کرنی پڑی، اس ابتلاء، اور بظاہر ایک علمی خسارہ کے ساتھ ایک اجتماعی اور تربیتی مصلحت بھی مربوط تھی، مولانا اپنے طور پر لکھنؤ کے ایک محلہ میں قرآن مجید کا درس دیا کرتے تھے، جس میں شہر کے چند بااثر حضرات، اور حکومت یو پی کے بعض مسلمان افسران شریک ہوتے تھے، انھوں نے جب دیکھا کہ مولانا کا ضابطہ کا تعلق ندوۃ العلماء سے ختم ہو گیا ہے، اور مولانا فارغ ہو گئے ہیں تو انھوں نے اس سے فائدہ اٹھایا، اور ۱۰ ؍مئی ۱۹۴۳ء کو "ادارہ تعلیمات اسلام" کے نام سے ایک ادارہ کی بنیاد ڈالی، اور اس کے لئے شہر کے مرکزی اور گلزار حصہ امین آباد پارک میں گھنٹہ گھر کے سامنے ایک بالاخانہ کرایہ پر لے لیا، اس تحریک میں پیش پیش ہمارے محترم دوست سید صغیر حسن صاحب اسسٹنٹ سکریٹری حکومت یو پی، شیخ ظہور الحسن صاحب ڈپٹی سکریٹری ریونیو (جو بعد میں اترپردیش کے نامور اور

---

[1] الحاج محمد شفیع قریشی صاحب دہلی کے ایک بڑے ٹھیکیدار اور مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے مخلص خادم تھے، جن کے حصہ میں تبلیغ و دعوت کی خدمت عثمانی آئی۔

کامیاب ریونیو سکریٹری ہوئے) اور ہمارے مخدوم و محترم خان بہادر الحاج سید اصغر حسین صاحب گورنمنٹ ایڈوکیٹ تھے[1] مولانا نے اس ادارہ میں قرآن مجید کے ذریعہ اور کم سے کم قواعد کی مدد سے عربی زبان سکھانے اور قرآن مجید کے فہم و مطالعہ کے لئے تیار کرنے کا بیڑا اٹھایا[2]، اس ادارہ میں جمعہ کے دن بعد مغرب عمومی درس قرآن کا انتظام کیا گیا، اور ہفتہ کے روز حدیث کے درس کا جس کی ذمہ داری میں نے لی، اس درس میں جس میں اپنے استاد اور مربّی روحانی مولانا احمد علی صاحب لاہوری کے درس کے اس اصلاحی و دعوتی طرز کو اختیار کیا گیا تھا، جو وہ تعلیم یافتہ طبقہ کے سامنے دیتے تھے،........ تعلیم یافتہ طبقہ اور اعلیٰ مسلمان عہدیداروں اور دینی ذوق رکھنے والے مسلمانوں کا ایسا رجوع ہوا کہ نیچے کا ہال ناکافی ہونے لگا اور چھت پر اس کا انتظام کیا گیا، اس درس کے وقت اگر لکھنؤ میں کسی دینی ذوق رکھنے والے مسلمان افسر یا اعلیٰ عہدیدار کو تلاش کیا جاتا تو شاید جواب یہی ملتا کہ وہ اس وقت ادارۂ تعلیمات اسلام کے درس قرآن میں ہوں گے، اس درس کا سلسلہ ۴۷ء کے بعد تک جاری رہا، اور اس کی مرجعیت بڑھتی رہی ۱۹۵۱ء میں جب میں مشرق وسطیٰ کے طویل دورہ سے واپس ہوا، اور کچہری روڈ پر تبلیغی مرکز کا قیام عمل میں آیا، مولانا بھی ۱۹۵۱ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں استاد و ناظم دینیات ہو کر چلے گئے، اور ادارہ بھی برائے نام رہ گیا، تو اس درس کا سلسلہ مرکز منتقل ہو گیا، اور حاضری میں مزید ترقی ہوئی، یہاں تک کہ مائک لگانے کا

---

[1] ان حضرات کے علاوہ جو اس کے بانیوں میں تھے، انشاء اللہ خاں صاحب، سراج الدین خاں صاحب، اور محمود خاں صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں، یہ ادارہ کے بڑے معاونین، حاضر باشوں اور حکومت یوپی میں مختلف عہدوں پر فائز تھے۔

[2] اس ادارہ کی کارگذاری و نتائج کے لئے ملاحظہ ہو "پرانے چراغ" حصہ دوم ص ۲۹۱-۲۹۳

انتظام کیا گیا، یہ سلسلہ بھی برسوں چلتا رہا، اور ترقی کرتا رہا، یہاں تک کہ میرے طویل بیرونی سفروں، اور دارالعلوم میں قیام منتقل ہو جانے کے بعد اس کی ذمہ داری رفیق محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کی طرف منتقل ہو گئی، اور الحمدللہ کہ اس کا سلسلہ ابھی تک کسی نہ کسی طرح جاری ہے۔[1]

۴۳ء کے بعد شدت سے اس کی ضرورت محسوس ہونے لگی کہ عام دینی واقفیت اور مسلمانوں کے دینی و سیاسی شعور کی تربیت کے لئے ادارہ کی طرف سے ایک رسالہ جاری کیا جائے، ستمبر ۴۸ء سے "تعمیر" کے نام سے اس دینی رسالہ کا اجراء عمل میں آیا، مولانا عبدالسلام صاحب کا اور راقم السطور کا نام بحیثیت مدیر کے درج ہوتا تھا، اس رسالہ میں بڑے فکر انگیز اور ایمان افروز مضامین شائع ہوئے، اس میں میرا مضمون "دنیا کو ہماری ضرورت ہے" جو بعد میں "روشنی کے مینار" کے عنوان سے شائع ہوا، اور میرے بعض دوسرے مضامین شائع ہوئے، اسی زمانہ میں (دسمبر ۱۹۴۵ء میں) میرے قلم سے "تعمیر" میں ایک سخت ناقدانہ مضمون "ہماری قومی سیرت کے بعض کمزور پہلو" کے عنوان سے شائع ہوا، جس میں میں نے مسلمانوں کی بعض ان عمومی کمزوریوں پر کھلی تنقید کی جو قومی مزاج بن رہی تھیں اور اس کے خطرناک نتائج سے آگاہ کیا، میں نے اس مضمون میں جن کمزوریوں کی نشان دہی کی وہ حسب ذیل تھیں:-

۱۔ اصول و اخلاق پر مصالح و منافع کی ترجیح۔

۲۔ عالمگیر و اصولی حریف (یورپ، اور یورپین تہذیب) کے چیلنج کو قبول کرنے اور اس کے مقابلہ سے غفلت۔

---

[1] اب مولانا اپنی نئی قیام گاہ نظیر آباد میں قریب کی ایک مسجد میں اتوار کے روز صبح یہ درس دیتے ہیں۔

۳۔ بے عملی و بزدلی۔

۴۔ (قومی و لادینی قیادت کی) غیر مشروط اطاعت۔

۵۔ (تقریروں اور مضامین، جذبات کے اظہار اور مخالفت میں) ابتذال و اشتعال۔

بے عملی اور بزدلی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:۔

"مسلمانوں میں اتنی ذہنی پستی پیدا ہو گئی ہے کہ وہ شماتت (دشمن کی مصیبت پر خوشی) پر اتر آتے ہیں، تربّص دوائر (زمانہ کی گردشوں کا انتظار) ان کا شیوہ ہو گیا ہے، اخلاقی طاقت اتنی کمزور ہو گئی ہے کہ دوسروں کی جرءت و جاں بازی اور قربانی کا اعتراف بھی نہیں کر سکتے، مسلمانوں کی اپنے آپ سے مایوسی، اعتماد علی الغیر، اپنی کمزوری کا ضرورت سے زیادہ احساس اور دوسروں کی طاقت کا ضرورت سے زیادہ اندازہ، اور اقلیت و اکثریت کے مسائل سے شب و روز کا یہ انہماک، انگریزی تعلیم و تہذیب اور مغربی سیاست کا نتیجہ ہے، جو مسلمانوں کو ایک جامد قوم دیکھنے کی عادی ہے، اور جو اعداد کے طلسم سے کسی طرح نکل نہیں سکتی"۔

یہ مضمون جلد ایک رسالہ کی شکل میں شائع ہوا، اور حقیقت پسند اسلامی حلقوں میں پسندیدگی، اور مسلمانوں پر ہر قسم کی تنقید کو ناپسند کرنے والے حلقہ میں ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا، "الفرقان" اور بعض دوسرے رسائل و اخبارات میں بھی شائع ہوا۔

رسالہ "تعمیر" سنجیدہ حلقوں میں مقبول سے مقبول تر، اور ادارہ مشہور سے مشہور تر ہو رہا تھا کہ تقسیم ہند کے بعد جو باد خزاں چلی اس نے اس پھلنے پھولنے والے درخت کو بھی خشک کر دیا، ادارہ کی مالی حالت شروع سے غیر مستحکم اور غیر مستقل تھی، اور وہ روز بروز

مالی بحران کا شکار ہوتا جارہا تھا، یہی زمانہ تھا جب مولانا عبدالسلام صاحب کو جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے شعبہ دینیات کی نظامت کی پیش کش ہوئی، انھوں نے وہاں تعلیم بھی پائی تھی، اور وہاں کے ذمہ داروں اور اساتذہ سے ان کے مخلصانہ اور نیازمندانہ تعلقات بھی تھے، وہ دہلی منتقل ہوگئے، اور ادارہ، اور "تعمیر" دونوں کو بند کرنا پڑا، لیکن اس ادارہ کے ذریعہ لکھنؤ کے دینی ذوق رکھنے والے تعلیم یافتہ طبقہ سے ہم لوگوں کا جو رابطہ قائم ہوگیا تھا، وہ قائم رہا، اور بعد کی تبلیغی دعوت، دینی سرگرمیوں اور دعوتی اور اشاعتی کاموں میں اس طبقہ کا تعاون حاصل رہا۔

باب دہم

حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ اور ان کی دینی دعوت سے ربط و تعلق، تبلیغی مشغولیت اور سرگرمی

حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی خدمت میں پہلی حاضری

میری ذہنی پرداخت اسلام کے اولین داعیوں اور مبلّغوں کے واقعات کے سایہ میں ہوئی تھی، اور جیسا کہ میں نے اپنی بڑی عربی کتاب "السیرۃ النبویہ" کے مقدمہ میں لکھا ہے :-

> "پہلا مکتب یا مدرسہ جس میں طالب علم کی حیثیت سے میرا نام لکھا گیا، اور مجھے اس کا فیض پہونچا، وہ سیرت نبویؐ کا مکتب یا مدرسہ تھا جس میں میں اپنے گھر کے ماحول، اور شفیق و حکیم بھائی و مربّی کی بدولت اس عمر میں اس کا طالب علم بنا، جس عمر میں عام طور پر بچے اس سے ناآشنا اور بیگانہ رہتے ہیں"۔

میرا اشارہ اس طرف تھا کہ مجھے سیرت کی کتابیں اس عمر میں پڑھنے کو مل گئیں (زیادہ صحیح ہے کہ دی گئیں) جس عمر میں عام طور پر بچوں کو وہ میسر نہیں آتیں، ان کتابوں میں قاضی محمد سلیمان صاحب منصور پوری کی کتاب "رحمۃ للعالمین" کا بڑا گہرا اثر پڑا، مجھے یاد ہے کہ کنگ جارج میڈیکل کالج لکھنؤ میں جب میں والدہ صاحبہ کی تیمارداری اور

خدمت کے لئے مقیم تھا، اس کا خیال کئے بغیر کہ کالج کے طلبہ، پروفیسر اور مریضوں کے تیماردار کیا رائے قائم کریں گے، اور کس نظر سے دیکھیں گے "رحمۃ للعالمین" کھولے ہوئے سڑک پر ٹہل ٹہل کر وجد و تاثر کی کیفیت میں پڑھتا تھا، خاص طور پر وہ حصہ جس میں حضرت مصعب بن عمیر اور ان کے پاک نہاد رفقاء کے تبلیغی شغف اور دعوتی سرگرمیوں کا تذکرہ ہے، اسی ذوق اور ذہن کا نتیجہ تھا کہ جب "ترجمان القرآن" میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے طاقتور قلم سے میوات کے ایک دورہ سے واپسی پر ان کا مضمون "ایک اہم دینی تحریک" کے عنوان سے نکلا[1] تو میں نے اس کو بار بار پڑھا، یاد آتا ہے کہ دارالعلوم سے جو سڑک یونیورسٹی کی طرف جاتی ہے[2] اس پر پرچہ کھولے ہوئے ایک استغراق کی حالت میں مضمون پڑھ رہا تھا، اور آنے جانے والی سواریوں کا بھی (جو اس وقت نسبتاً کم ہوتی تھیں) ہوش نہیں تھا۔

جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، مولانا کا تذکرہ سب سے پہلے اپنے ایک بزرگ الحاج سید محمد خلیل صاحب نہٹوری سے جو اس زمانہ میں دہلی میں مقیم تھے، سنا تھا، ایک آدھ مجلسوں میں اور ذکر سنا، لیکن ملاقات جنوری ۱۹۴۰ء کی ابتدائی تاریخوں میں مقدر تھی، جب اپنے دو دوستوں مولانا محمد منظور صاحب نعمانی، اور حاجی عبدالواحد صاحب ایم، اے کی معیت میں ہم لوگ دینی مرکزوں، اور دینی جدوجہد کی مختلف کوششوں اور تحریکوں سے ذاتی واقفیت اور مشاہدہ کے لئے نکلے تھے، جنوری ۱۹۴۰ء کی دوسری یا تیسری تاریخ تھی کہ ہم لوگ نظام الدین دہلی بنگلہ والی مسجد میں پہونچے، جہاں مولانا کا قیام تھا، تو معلوم ہوا کہ مولانا سہارن پور کسی تبلیغی جلسہ میں تشریف لے گئے ہیں، اور ایک دو دن بعد تشریف

---

[1] ترجمان القرآن بابت ماہ شعبان ۱۳۵۸ھ (ستمبر ۱۹۳۹ء) [2] اب ٹیگور مارگ کہلاتی ہے۔

لائیں گے، مولانا احتشام الحسن صاحب کاندھلوی نے جو اس وقت مولانا کی تبلیغی دعوت کے ایک طرح کے ناظم تھے، وقت سے فائدہ اٹھانے کے لئے ہم لوگوں کو قصبہ نوح ضلع گوڑگانواں کے ایک تبلیغی اجتماع میں بھیج دیا، اس کے تاثرات اس اقتباس میں گزر چکے ہیں، جو پچھلے صفحات میں اپنے مضمون "ایک ہفتہ دینی مرکزوں میں" سے لے کر پیش کیا گیا ہے، مجھے یاد ہے کہ دہلی واپسی پر دن کے خالی وقت میں حاجی عبدالواحد صاحب اپنے ایک ہندو دوست سے ملنے جنھوں نے بلوچستان میں ان کے ساتھ کام کیا تھا، نئی دہلی گئے، میں ان کے ساتھ تھا، وہ اپنے پرانے دوست کے ساتھ گفتگو میں منہمک تھے، میرے اندر بے چینی کی ایک مبہم لیکن طاقتور کیفیت پیدا ہوئی، اور میں اس سے ایسا مغلوب ہوا کہ قریب تھا کہ دیوانہ وار دروازہ کھول کر کے نظام الدین کی طرف دوڑوں، اسی کے ساتھ دعا وانابت کی بھی ایک ایسی حالت پیدا ہوئی، جو کبھی برسوں میں اور خاص روحانی فضا میں پیدا ہوتی ہے، میں نے اپنے کو بہت سنبھالا کہ کہیں یہ نہ سمجھا جائے کہ مجھ پر کوئی دماغی دورہ پڑا ہے، الحمدللہ کر کے وہ گفتگو اور ملاقات سے فارغ ہوئے اور ہم دونوں نظام الدین پہونچے[1]، ہمارے پہونچنے کے کچھ دیر بعد مولانا تشریف لائے، اور اس شفقت اور گرم جوشی سے ملے، جیسے برسوں کی جان پہچان تھی، یا انتظار ہی میں تھے، خاص طور پر جب ان کو معلوم ہوا کہ میں "سیرت سید احمد شہیدؒ" کا مصنف ہوں، اور میرا صاحب سیرت سے خاندانی تعلق ہے، تو شفقت و محبت اور یگانگت میں اور اضافہ ہوا، سب سے پہلی چیز جس نے ہم لوگوں کو متاثر کیا، اور جس کا کم سے کم مجھے اپنی عمر میں پہلا تجربہ ہوا، وہ مولانا کی شفقت اور

---

[1] مولانا منظور صاحب جو اس سفر میں ساتھ تھے، اور حقیقت میں وہی رہبر تھے اہلیہ کی شدید علالت کا تار پاکر بریلی جا چکے تھے۔

جذب دل کی خاص کیفیت تھی، پہلی ملاقات کے باوجود کہیں سے بھی کوئی اجنبیت، تکلف اور اپنی ذات اور مرتبے کا احساس نظر نہیں آتا تھا، دوسرے دن صبح کی مجلس میں بھی وہی دل نوازی کی شان تھی، جو روبہ ترقی تھی، میری رخصت کے دن جو میں نے دارالعلوم سے لی تھی، ختم ہو رہے تھے، دوسرے یا تیسرے دن مجھے واپس ہونا تھا، مولانا نے روانگی کے وقت ایسی طویل اور اثر میں ڈوبی ہوئی دعا کی جس سے دل و دماغ متاثر ہوئے، اور دوبارہ اور جلد حاضری کا عزم پختہ ہوا، مولانا نے غالباً اسی قیام کے زمانہ میں فرمایا کہ مولانا میں نے آپ کی کتاب (سیرت سید احمد شہیدؒ) پڑھی لیکن اس سے میری معلومات میں کچھ اضافہ نہیں ہوا، میں اپنے خاندان کی بیبیوں اور بزرگوں سے اس سے زیادہ ہی سن چکا ہوں، بات سے بات یاد آتی ہے، ایک مرتبہ میں مسجد کے بالائی حصہ میں ٹھہرا ہوا تھا، جہاں صاحبزادۂ گرامی مولانا محمد یوسف صاحب کا قیام رہتا تھا، مولانا چائے کی ایک پیالی ہاتھ میں لے کر تشریف لائے، میری طرف پیالی بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ "مولانا ابھی تک ہم لوگ حضرت سید صاحبؒ کی تجدید کے سایہ ہی میں ہیں"۔

میں لکھنؤ واپس آگیا لیکن دل کا حال وہ تھا جو شاعر نے بیان کیا ہے۔ ع

دیرینہ سال پیرے بُردش بیک نگاہے

مضافات لکھنؤ میں تبلیغی کام کا آغاز اور مولانا کے گرامی نامے

میں نے لکھنؤ آتے ہی شہر کے قرب وجوار میں اس طرز پر جو نوح اور اس کے نواح میں دیکھ کر آیا تھا، اور مولانا کی باتوں، اور نظام الدین کے ماحول سے سمجھا تھا، کام شروع کر دیا، اس وقت تک شہر سے کوئی ربط نہیں تھا، میری جمع پونجی وہ چند سعادت مند اور

تعلق رکھنے والے طلبہ تھے، جو مجھ سے ذاتی تعلق رکھتے تھے انھیں کو لے کر لکھنؤ کے نواحی محلوں میں جانے لگا، اور غریب محلے والوں اور پسماندہ لوگوں میں دین کی تلقین ایمان کی تجدید اور نماز کی تبلیغ کرنے لگا، میں مولانا کو ان حقیر کوششوں کی روداد بھی لکھتا جو بالکل ابتدائی منزل میں تھیں، مولانا کا پہلا خط جو میرے نام آیا، اس پر مارچ ۱۹۴۰ء کی تاریخ ہے اور موجودہ امیر تبلیغ مولانا انعام الحسن صاحب کاندھلوی کے قلم کا لکھا ہوا ہے[1]، دوسرا مکتوب ۷ راپریل ۱۹۴۰ء کا لکھا ہوا ہے، اور اس میں "عمدۃ الآمال والامانی" کے ساتھ خطاب کیا گیا ہے، جس سے حضرت کی محبت و تعلق اور توقعات کا اظہار ہوتا ہے، مولانا نے اس مکتوب میں بھائی صاحب اور والدہ صاحبہ کی پسندیدگی، اور مسرت و تائید پر اپنی دلی مسرت کا اظہار فرمایا ہے اور لکھا ہے کہ "یہ امر مجھ ناچیز تہی دست کے لئے ایک مبارک دامن تلے آنے کی جھلک دکھلا رہا ہے" جس سے مولانا کی تواضع اور علوئے اخلاق کا اظہار ہوتا ہے، اس کے بعد پے در پے مولانا کے شفقت نامے جلد جلد آنے لگے اور ان میں ایسے خطابات سے نوازا جانے لگا جن کا نقل کرنا بھی دوسروں کے لئے غلط فہمی اور اپنے بارے میں فریب نفس پیدا ہونے کا موجب ہو سکتا ہے، اس لئے جب دسمبر ۱۹۵۲ء میں کتب خانہ انجمن ترقی اردو جامع مسجد دہلی کی طرف سے مکاتیب کا یہ مجموعہ شائع ہوا تو میں نے ان خطابات کو حذف کر دیا کہ "ایاز قدر خود را بشناس"[2] ایک مکتوب پر اپنے نام سے پہلے "از سگ آستان"

---

[1] مولانا محمد الیاس صاحبؒ نے عرصہ سے اپنے قلم سے لکھنا چھوڑ دیا تھا، اور ان کے خطوط حاضر الوقت خدام اور اہل تعلق لکھتے تھے، مکاتیب حضرت مولانا شاہ محمد الیاس صاحبؒ کے مجموعہ کا یہ پہلا خط ہے۔

[2] یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ وقت کے ساتھ اور تعلق کی ازدیاد و ترقی کے مطابق القاب و خطابات میں سادگی اور اختصار پیدا ہوتا گیا، جو حقیقت میں دعوت و تربیت کا تقاضا اور اعتماد و تعلق کی دلیل ہے۔

عزیزی واحمدیؒ تحریر ہے، جس میں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ اور حضرت سید صاحبؒ کی طرف اشارہ ہے، مارچ ۱۹۴۰ء سے لے کر مارچ ۱۹۴۴ء تک جو گرامی نامے اس عاجز کے نام آئے، اور مجموعہ مکاتیب میں شامل ہیں، ان کی تعداد چونتیس ۳۴ ہے۔

یہ خطوط جب ملتے تو میں ان کو اتنی بار پڑھتا کہ اس کا بہت سا حصہ یاد ہو جاتا اور عرصہ تک جیب میں پڑے رہنے اور لوگوں کو سنانے کی وجہ سے مل دَل جاتے، یہ مکاتیب جیسا کہ اس کے مقدمہ میں کہا گیا ہے:۔

"نہ صرف دعوت کے اصول وآداب، اور اس کی روح وضوابط کے لحاظ سے بلکہ اپنے بلند مضامین اور دینی حقائق کے لحاظ سے بھی ایک گراں قدر ذخیرہ ہے، جس سے مولانا کے یقین واعتماد، قوت ایمانی، حمیّت اسلامی دین کی فکرمندی، بے چینی اور بے کلی، تعلق باللہ، دین کے فہم صحیح، مقاصد شریعت، اور روح دین کی معرفت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ان خطوط کا لکھنے والا، اپنے وقت کا عارف ہے، اور وہ دین کی جدوجہد، اور ایک خاص نوع سے دین کے احیاء وتقویت کے لئے اپنے کو مامور اور ذمہ دار سمجھتا ہے[۱]"۔

انجذاب و مناسبت کے خصوصی اسباب

مولانا کی طرف انجذاب اور ان کے مقام سے ہلکی سی شناسائی میں اس کو بڑا دخل تھا، کہ میں ان سے ملنے سے پہلے "مکتوبات امام ربانی" "ازالۃ الخفاء" "صراط مستقیم" اور

---

[۱] "مکاتیب حضرت مولانا شاہ محمد الیاسؒ" ص۵ بترمیم خفیف۔

"منصب امامت" پڑھ چکا تھا، اور (اپنے تاریخی وادبی مطالعہ وذوق کے باوجود) اس کی صلاحیت پیدا ہوگئی تھی کہ میں یہ سمجھ سکوں کہ ان دو دعوتوں اور کوششوں، قیادتوں اور طرزِ فکر و تفہیم میں کیا فرق ہوتا ہے، جن میں سے ایک کا سرچشمہ ذہانت، مطالعہ، وسعت علم، اور کسی خاص فلسفہ اور تحریک یا صورت حال کا ردّ عمل ہوتا ہے، اور دوسرے کا سرچشمہ کثرت عبادت وانابت، ودعا، قرآن مجید میں عمیق تدبّر، سیرتِ نبویؐ کا عاشقانہ مطالعہ اور مخلصانہ تتبّع اور اجتباء اور ہدایت ربانی ہوتی ہے، مولانا محمد الیاس صاحب کو دیکھ کر اور ان کی صحبت میں رہ کر عارف شیرازی کے اس شعر کی تصدیق ہوئی ؎

ایں ہمہ مستی و مدہوشی نہ حدّ بادہ بود[1]
باحریفاں انچہ کرد آں نرگس مستانہ کرد

دوسری طرف مولانا کی مجھ پر جو خصوصی عنایت اور تھوڑے وقت میں جو قرب واختصاص حاصل ہوا، اس کی ایک وجہ تو وہ عجیب وغریب تعلق وعقیدت ہے جو سلسلۂ رشیدی کے تمام مشائخ کو حضرت سید احمد شہیدؒ کے ساتھ رہا ہے، اور جس کا اندازہ کرنا ان لوگوں کے لئے دشوار ہے، جنھوں نے ان حضرات کو قریب سے اور زیادہ نہیں دیکھا،[2]

---

[1] یہاں "حدّ بادہ" کا مفہوم وفور علم یا ذہانت وذکاوت لیا جا سکتا ہے۔

[2] اس کا اندازہ کرنے کے لئے والد ماجد کا روزنامچہ اور سفرنامہ "ارمغان احباب" پڑھا جائے، جو "دہلی اور اس کے اطراف" کے نام سے کتب خانہ انجمن ترقی اردو دہلی سے شائع ہوا ہے، کچھ اندازہ مولانا کی اس تحریر سے ہو سکتا ہے، جو میرے اپنی پھوپھی صاحبہ کے انتقال کی خبر دینے پر تعزیتاً مجھے لکھا تھا، فرماتے ہیں "حضرت پھوپھی صاحبہ رحمۃ اللہ علیہا کے سانحۂ ارتحال کی خبر سے انتہائی (باقی ص۲۸۵ پر)

دوسری وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک فضلاء، واساتذۂ مدارس اور طلبائے علوم دینی اس کام کی طرف متوجہ نہیں ہوئے تھے، بلکہ ان کے اور مولانا کے درمیان (مولانا کی خاص زبان، طرز ادا، اور اس قلبی بے چینی کی وجہ سے جس کا اظہار اولوالعزم پیغمبر حضرت موسیٰ نے "وَيَضِيقُ صَدْرِي وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِي فَأَرْسِلْ إِلَىٰ هَٰرُونَ" کے الفاظ میں کیا تھا) ایک حجاب حائل تھا، اس وقت دارالعلوم ندوۃ العلماء جیسی مشہور درس گاہ کے ایک مدرسؔ اور طلباء کا اس کام کی طرف متوجہ ہونا، عملاً اس کو شروع کر دینا، اور بار بار مولانا کی خدمت میں حاضر ہونا، مولانا کی نظر میں قابل وقعت ٹھہرا اور اس سے ان کی توجہ خاص اس گروہ کی طرف ہوئی، اور اس نے مولانا کی دلی دعائیں لیں، جن سے نہ صرف ان کو فائدہ پہونچا، بلکہ دارالعلوم میں ایک نیا دینی رنگ پیدا ہوا، بلکہ ایک نیا دور شروع ہوا، جس کو ندوۃ العلماء کی تحریک کا کوئی مورخ نظر انداز نہیں کر سکتا۔

جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے، اس کے حسب حال تو حقیقتاً وہ شعر ہے، جو حضرت مولانا فضل رحمان صاحب گنج مرادآبادی بڑے سوز کے ساتھ پڑھا کرتے تھے ؎

بندۂ عیب دار کس نہ خرد　　　با ہزاراں گنہ خرید مرا

(باقی ص۲۸۴ کا) قلق و صدمہ ہوا، حضرت پھوپھی صاحبہ کا سایہ آپ کے سر سے نہیں اٹھا بلکہ تمام ان متوسلین کے سر سے اٹھا ہے، جو حضرت سید صاحبؒ کے دامن سے وابستہ ہیں، اور جن کے قلوب میں حضرت سید صاحبؒ کی عظمت و محبت راسخ ہے، سب شریک غم ہیں، اور سب کو شریک ہونا چاہئے، اگر کسی کو احساس نہ ہو تو یہ اس کی بے حسی ہے، حق تعالیٰ مرحومہ کو اپنے محاسن و مکارم اور ان حقوق کے مطابق جو ہم سب پر واجب ہیں، بلکہ اپنے فضل و کرم کے مناسب ترقی درجات و رضا عطا فرمائیں"۔

(مکاتیب حضرت مولانا شاہ محمد الیاسؒ ص۱۸)

میں نے ایک مرتبہ مولانا سے عرض کیا کہ ہم ندوہ کے منتسبین نے بہت سے حضرات علماء، اور مشائخ کی طرف عقیدت کا ہاتھ بڑھایا، مگران کی طرف سے جواب میں شفقت کا وہ ہاتھ نہیں بڑھا جس کی توقع تھی، آپ نے ہمارے سر پر پہلی مرتبہ شفقت کا ہاتھ رکھا، مولانا یہ سُن کر آب دیدہ ہو گئے، اور فرمایا کہ حضرت آپ یہ کیا فرماتے ہیں، آپ تو ماشاء اللہ اہل دین ہیں، میں تو کہتا ہوں کہ علی گڑھ کے لوگوں کو بھی دور نہیں کرنا چاہئے، نائبین رسول اور داعیان حق کے مزاج و دستور کے مطابق مولانا میں بھی تشکّر اور اعتراف اور شفقت وعنایت کا مادّہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، اسی اقدام کی بناء پر (جو جماعت علماء اور اساتذۂ مدارس میں کسی حد تک سبقت واولیت رکھتا تھا) ایک دن فرمایا کہ مولانا میں آپ کا شکریہ اور تعریف کیا کروں، تعریف محبت کا اوچھاپن ہے، ایک دن فرمایا کہ میں آپ سے کیا کہوں، اچھا دولت قرآن مبارک ہو۔

تبلیغی نقل وحرکت سے طلبہ کی تربیت وربط خاص

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے طلبا اور اساتذہ میں سے رفیق محترم مولانا محمد ناظم صاحب ندوی نے لکھنؤ کے اس تبلیغی کام میں بڑی رفاقت کی، ہم لوگ پنجشنبہ کو نماز عصر کے بعد اپنا راشن اور موسم کے مطابق بستر اٹھا کر پیدل اکبر نگر یا ملہور جاتے، جو لکھنؤ سے ۸ میل پر ہے، وہاں سے جمعہ کے دن جماعتیں تقسیم ہو جاتیں، اور نواحی قصبات اور دیہاتوں میں جاتیں، اس نقل وحرکت سے دینی واصلاحی فوائد نمازوں میں ترقی، ذکر وشب بیداری کی توفیق کے علاوہ طلبہ کو اور بیش قیمت فوائد پہونچے جن میں سادگی اور جفاکشی، ربط وتعارف اساتذہ سے ذاتی تعلق، اپنی کمزوریوں کا علم، عوام کی دینی پسماندگی اور جہالت کا علم،

اور دینی ذمہ داری کا احساس پیدا ہوا، اور اسی نقل وحرکت میں بعض طلباء سے ایسا ربط وتعلق پیدا ہوا، جو بعد میں دینی کاموں اور دارالعلوم کی ترقی میں بے حد ممدّ و معاون ثابت ہوا[1]، مولانا ان طالبان علوم دینی کی دعوت وتبلیغ اور دین سیکھنے کے سلسلہ میں نقل وحرکت، اور دَورو سیر کی اطلاعات سے (جس کا رواج بالکل اٹھ چکا تھا، اور اس کے بجائے سیاسی، اقتصادی، اور ذاتی مقاصد سے سفر کرنے نے لی تھی، اور باہر کے ہنگاموں کا اثر دینی مدارس کے حصار کے اندر بھی پہونچ چکا تھا) بے حد مسرور ہوتے، ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں جس پر ۷ اپریل ۱۹۴۰ء کی تاریخ ہے:۔

"میری امیدوں اور تمناؤں کے ودیعت گاہ محترم سُلالہ خاندان نبوت!
جناب عالی کا مہمانان نبوت[2] کو ساتھ لے کر اس کام کے لئے قدم مبارک کا اٹھانا جس قدر عظیم ہے اس قدر اس کی وقعت اور اس کے بارے میں وارد شدہ آثار واخبار و آیات پر نظر رکھتے ہوئے، اور ان پر یقین کی کوشش کرتے ہوئے ان کے آداب کی رعایت کرنے پر ان کا نتیج ہونا موقوف ہے"۔

چونکہ اس نقل وحرکت کے آداب میں سے ایک ادب اور ضابطہ لایعنی کاموں سے

---

[1] اس کی ایک مثال عزیز گرامی مولوی معین اللہ صاحب ندوی (حال نائب ناظم ندوۃ العلماء) ہیں، جن کا ربط خاص جو مستقل رفاقت و معاونت کا ذریعہ بن گیا، اسی تبلیغی نقل وحرکت اور رفاقت کا ثمرہ ہے، جو علاوہ اور مقاصد کے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے لئے جتنا مبارک ثابت ہوا اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

[2] مولانا مدارس عربیہ کے طلباء کو جو علوم نبویہ کی تحصیل کے لئے ترک وطن کر کے مدارس دینیہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خوان کرم کے مہمان ہوتے ہیں "مہمانان نبوت" کے لقب سے یاد فرمایا کرتے تھے۔

احتراز اور لاطائل گفتگو سے احتیاط بھی ہے، اور نوجوان طلبہ کو جن کو ہفتوں اور مہینوں کے بعد باہر نکلنے اور ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کا موقعہ ملتا تھا، بے تکلفی کی زائد گفتگو سے روکنا مشکل تھا، اس لئے مصلحتاً میں نے طلباء کو اس کا پابند کیا کہ باہر نکلنے کے اس وقفہ اور زمانہ میں وہ صرف عربی میں گفتگو کریں، اس سے دو فائدے حاصل تھے، ایک قلت کلام، اور ایک کتاب وسنت کی زبان (عربی) کی مشق، مولانا کو اس کی اطلاع دی گئی تو اس پر مسرت کا اظہار فرمایا، اپنے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"زبان عربی کے احیائے سنت سے مسرت ہوئی، حق تعالےٰ دیگر اہل مدارس کی توجہ کا ذریعہ بنائیں، آمین[1]"

حضرت کو میرا اور میرے خطوط کا انتظار اور آنے سے جو مسرت ہوتی تھی، اس کا اظہار متعدد خطوط میں ہے، ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"جناب کی تشریف آوری کا مژدہ روئیں روئیں کو تر وتازہ کر رہا ہے، حق تعالےٰ ہمیں آپ کی ذات گرامی سے دارین میں منتفع فرمائیں[2]"

ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں "جناب کا گرامی نامہ کنول قلب کے کھلنے کا سبب ہوا[3]"

میرا بھی یہ حال تھا، کہ ہر مہینہ دوسرے مہینہ حاضری کی کوشش کرتا، ان سفروں کے مصارف میری قلت تنخواہ کی وجہ سے اکثر بھائی صاحب ہی برداشت کرتے، میوات کے اہم دوروں اور جلسوں میں شرکت کی بھی کوشش کرتا، ان سفروں میں اکثر مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب ندوی مہتمم دارالعلوم رفاقت فرماتے جس کی وجہ سے حضرت کو بھی ان سے ربط ہوا، اور ان کو خود حضرت کی زیارت وصحبت اور اس دعوت وعمل سے

---

[1] مجموعہ مکاتیب ص۷۶ [2] ایضاً ص۵۷ [3] ایضاً ص۶۷

بڑا نفع ہوا، جس کا نقطۂ ارتقا یہ تھا کہ وہ بھوپال میں اس دینی جدوجہد کے داعی اول اور وہاں کے اس تبلیغی اجتماع کا سبب بنے جو ہندوستان کا سب سے بڑا تبلیغی اجتماع بن گیا ہے۔

حضرت شیخ الحدیث سے تعارف و نیاز

نظام الدین ہی کے ایک قیام کے زمانہ میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ سے پہلی بار ملاقات اور تعارف ہوا، اتفاق سے ہم لوگ جب سہارن پور حاضر ہوئے تھے، (جس کا ذکر گزشتہ صفحات میں گذرا ہے) تو شیخ اس وقت موجود نہیں تھے، ان کی خدمت میں نیاز اور اس تعلق کی بنیاد پڑنا جو بعد میں بڑا بارآور اور پُرثمر ثابت ہوا نظام الدین ہی میں مقدر تھا، ایک دن بنگلہ والی مسجد میں غلغلہ بلند ہوا کہ شیخ تشریف لا رہے ہیں، سارا مجمع تیزی سے دروازہ اور سڑک کی طرف بڑھا، میں اپنی کچھ کم آمیزی کی وجہ سے، اور کچھ اس خیال سے (جس میں احساس کمتری کو بھی دخل تھا) کہ اتنے بڑے مجمع میں شیخ میری طرف کیا متوجہ ہوں گے؟ اپنی جگہ بیٹھا رہا، لیکن شیخ آئے، اور کسی نے میرا تعارف کرایا، تو ایسی شفقت اور ایسا التفات فرمایا جیسے بہت پہلے سے نیاز حاصل ہو چکا تھا، اور تعلقات تھے، یہ تعلق یوماً فیوماً نہیں، آناً فاناً ترقی پذیر رہا، اور شیخ اتنی جلدی بے تکلف ہو گئے جیسے میں برسوں سے حاضر ہوتا رہا ہوں[1]، پھر سہارنپور کے بار بار سفروں اور قیام نے اس کو اور مستحکم اور مستقل بنا دیا جس کی تفصیل آئندہ صفحات میں آئے گی، مولانا محمد الیاس صاحب کا بھی منشا اور اشارہ تھا کہ (علمی مناسبت کی وجہ سے) میں شیخ سے ربط و مراسلت رکھوں، شیخ بھی اپنے علمی مذاق اور

---

[1] ان تعلقات، خصوصی شفقتوں، اور ملاقاتوں اور مراسلت کی تفصیل کے لئے راقم کی کتاب "سوانح حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ" ملاحظہ ہو جو ان سطور کے لکھنے سے ایک ہی ماہ پیشتر مکتبہ اسلام ۳۷ گوئن روڈ سے شائع ہوئی ہے۔

مختلف مناسبتوں کی وجہ سے توجہ خاص فرمائی۔

شہر لکھنؤ میں تبلیغی کام اور مولانا کی آمد

ایک عرصہ تک اس تحریکِ دعوت کے دارالعلوم کے طلبہ اور اساتذہ میں محدود ہوتے کے بعد اس کا شہر کے دینی ذوق رکھنے والے حلقے اور ان احباب میں تعارف ہوا، جن کو ایسے دینی کاموں سے مناسبت یا ان کی تلاش رہتی تھی، اور لکھنؤ سے بڑی بڑی جماعتیں نظام الدین اور میوات جانے لگیں، اور اس کام میں حصہ لینے والوں کی زندگی میں عظیم تغیر اور کھلی ہوئی دینی ترقی نظر آنے لگی، یہاں تک کہ لکھنؤ کو یہ حق حاصل ہوگیا کہ مولانا اس کو اپنے قدوم سے مشرف فرمائیں۔

رجب ۱۳۶۲ھ (جولائی ۱۹۴۳ء) میں آپ نے لکھنؤ کے سفر کی دعوت قبول فرمائی، ۱۸ر جولائی کو آپ جناب حافظ فخر الدین صاحب، مولانا احتشام الحسن صاحب کاندھلوی، محمد شفیع صاحب قریشی، اور حاجی نسیم صاحب کی معیت میں تشریف لائے، موتی محل کے پل سے پہلے سبزہ پر (اودھ جیم خانہ کے میدان میں) آپ نے نوافل پڑھے، اور دیر تک خشوع و خضوع سے دعا مانگتے رہے، مولانا سید سلیمان صاحب ندوی ایک روز پہلے ہی تشریف لائے تھے، اور مولانا کے ساتھ ہی مقیم تھے، ۸۔۹ دن ان کا شب و روز ساتھ رہا، دوسرے روز حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب، مولانا منظور صاحب نعمانی اور مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کے بعض مدرسین حضرات، اور مولانا عبد الحق صاحب مدنی تشریف لائے، افسوس ہے کہ اس زمانہ میں دارالعلوم کی ۱۹۴۳ء کی ایک اسٹرائک کی وجہ سے جس میں طلبہ کی ایک بڑی تعداد کا اخراج ہوگیا تھا، دارالعلوم میں

طلباء کی تعداد کم اور فضا میں ایک افسردگی سی تھی، لیکن مولانا کی آمد نے اس میں ایک نئی زندگی اور نورانیت پیدا کر دی، مولانا کو بھی دارالعلوم اور اس کے کارکنوں اور ذمہ داروں بالخصوص ناظم ندوۃ العلماء مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب اور مولانا سید سلیمان ندوی صاحب سے گہرا تعلق پیدا ہوا، ایک دن مجھ سے فرمایا کہ مجھے ایسی جگہ لے چلو جہاں سے دارالعلوم کا پورا ماحول نظر آئے، میں مولانا کو دارالعلوم کی چھت پر جہاں سے ایک طرف دریا کا منظر اور دوسری طرف دارالعلوم کی مسجد، شبلی دارالاقامہ، اور دوسری عمارتیں نظر آتی ہیں، لے گیا، اس وقت صرف مولانا اور میں تھا، مولانا نے فرمایا "حضرت میں دارالعلوم کی کچھ خدمت کرنا چاہتا ہوں، بتائیں میں کیا خدمت کر سکتا ہوں" اللہ تعالیٰ نے اس وقت رہنمائی فرمائی، اور میں نے کہا کہ صرف یہ کہ آپ دارالعلوم کو بھی اسی نظر عنایت و اختصاص سے دیکھیں اور سرپرستی فرمائیں، جس سے آپ مدرسہ مظاہر العلوم کو دیکھتے ہیں، مولانا نے دعائیہ الفاظ فرمائے، اور نیچے تشریف لے آئے[1]۔

لکھنؤ کے قیام کے آخری دن رات کی گاڑی سے آپ، حضرت شیخ الحدیث، حافظ فخر الدین صاحب اور بعض دوسرے رفقاء کی معیت میں رائے بریلی تشریف لائے، اور دائرہ شاہ علم اللہؒ میں رات کا بقیہ حصہ اور آدھا دن گذارا، حضرت سید صاحب کی مسجد میں جا کر بہت مسرور ہوئے، اور تلاوت قرآن میں مشغول رہے، حضرت شیخ الحدیث کو مخاطب کر کے اس بستی کے بانی اور اس خاندان کے مورث اعلیٰ حضرت شاہ علم اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق بڑے بلند کلمات فرمائے، اور بڑے تاثرات کا اظہار کیا، دوپہر کی

[1] لکھنؤ کے سفر اور قیام کے مفصل حالات شہر کے اجتماعات، اور علماء و اعیان شہر سے ملاقات کی تفصیل مولانا کی سوانح "حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت" میں ملاحظہ کی جائے ص ۱۲۶-۱۳۰

گاڑی سے لکھنؤ واپسی ہوئی، اور اسٹیشن ہی سے کانپور روانگی ہو گئی، یہاں دو روز قیام فرما کر دہلی تشریف لے آئے۔

ترجمانی کا شرف

اس عرصہ میں مولانا کی ترجمانی کا بار بار شرف حاصل ہوا جن کے بلند مضامین، خاص زبان، نئے نئے مضامین کے تیزی کے ساتھ ورود کا عام لوگوں کا ذہن ساتھ نہیں دے سکتا تھا، اور اچھے اچھے اہل علم بھی بعض اوقات مانوس نہ ہونے کی وجہ سے ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے، اور مولانا کو اس پر بہت جلد اتنا اعتماد و اطمینان ہو گیا کہ بعض اہم موقعوں پر بھی مجھے دعوت پیش کرتے، اور اپنی ترجمانی کا شرف بخشتے، لکھنؤ کے ایک ایسے ہی خصوصی جلسہ میں جس میں مولانا سید سلیمان ندوی، اور شہر کے ممتاز وکلاء اور تعلیم یافتہ حضرات موجود تھے، مولانا نے تقریر فرمائی، اور مجھے اور متعدد حاضرین کو محسوس ہوا کہ معزز حاضرین اس کو پوری طرح اخذ نہیں کر سکے، میں بعض بزرگوں کے اشارے سے یا ضرورت سمجھ کر کھڑا ہوا، اور اہل علم کی مانوس زبان میں مولانا کے مقصد کی وضاحت کی، حاضرین نے اور خود مولانا نے اس پر بڑا اظہار مسرت و اطمینان کیا، بلکہ مولانا نے فرمایا کہ اس کا خلاصہ طبع کرا دیا جائے۔

ایک مرتبہ لکھنؤ سے رات کو نظام الدین پہونچا، صبح مولانا نے مجھی کو نماز پڑھانے کا حکم دیا، سلام پھیرنے کے بعد فرمایا کہ کچھ کہئے، میں نے دیکھا، سامنے پہلی صف میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، قریشی صاحب، ملک دین محمد (دہلی کے ممتاز ترین مسلمان ٹھیکیدار اور تاجر) بیٹھے ہوئے ہیں، میں نے عرض کیا کہ میں بالکل خالی الذہن ہوں فرمایا آپ کہنا تو شروع کیجئے، میں نے کہنا شروع کیا تو اندازہ ہوا کہ مولانا متوجہ ہیں، اور مضامین کا ورود ہو رہا ہے،

اسی اعتماد اور تجربہ کی بنا پر میں نے مولانا کے گرامی ناموں اور ارشادات کو سامنے رکھ کر جو میرے نام آئے تھے، ایک رسالہ " ایک اہم دینی دعوت" کے نام سے مرتب کیا، مولانا نے اس کو من اولہ الی آخرہ لفظاً لفظاً سنا، چند جگہ خفیف سی لفظی ترمیمیں کیں، سننے کے بعد بہت دعائیں دیں۔[1]

اسی مناسبت و اعتماد کی بناء پر حضرت زیادہ سے زیادہ قرب اور مجالس میں میری شرکت پسند فرماتے تھے، ایک مرتبہ شہر کے کسی گشت یا قرب وجوار کے کسی نظام میں ذمہ داروں نے مجھے بھی بھیج دیا، مولانا کو معلوم ہوا تو فرمایا کہ ایک آدمی میری باتیں سمجھنے والا تھا، تم نے اس کو بھی بھیج دیا، اب میں کس سے بات کروں۔؟

تبلیغی اسفار واجتماعات

یوں تو میوات کے اہم جلسوں میں امکانی حد تک پابندی سے شرکت ہوتی، لیکن مولانا کے منشاء اور خواہش پر بعض طویل سفر بھی ہوئے، جن میں پانی پت، کرنال، روہتک، بلبھ گڑھ، مرادآباد وغیرہ کے سفر قابل ذکر ہیں، نوح کے مدرسہ کے جلسوں میں بھی شرکت اہتمام سے ہوتی، ان سفروں میں بالخصوص میوات کے جلسوں میں مولانا کی قوت نسبت اور برکت صحبت کا مشاہدہ برأی العین ہوا، ان اجتماعات میں ایسی کیفیات، سکینت ونورانیت اور انابت الی اللہ کی کیفیت محسوس ہوئی جس سے اولیائے متقدمین کی مجالس کے واقعات کی تصدیق ہوتی، مارچ ۱۹۴۴ء میں بھائی صاحب ڈاکٹر حکیم سید عبدالعلی صاحب بھی نظام الدین حاضر ہوئے، اور مولانا ان کی آمد پر بڑے مسرور ہوئے، جب وہ چلنے لگے

---

[1] یہ مضمون پہلے رسالہ " الفرقان" میں شائع ہوا، پھر اسی نام سے مکتبۂ اسلام لکھنؤ کی طرف سے طبع ہوا۔

تو فرمایا ؎

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

دارالعلوم سے طویل رخصت اور تبلیغی انہماک

میرا تبلیغی دوروں اور سفروں میں انہماک بڑھا تو محسوس ہوا کہ دارالعلوم کے اسباق و تعلیم پر اس کا اثر پڑتا ہے، ادھر مختلف تجربوں اور دعوتی جدوجہد کے اثر سے طبیعت تدریس کے لگے بندھے نظام، اور ضوابط کی جکڑبندی سے بھی عاجز آ گئی تھی، میں نے ستمبر ۱۹۴۲ء میں دارالعلوم سے ضابطہ کا تعلق اور ملازمت کو خیرباد کہنے کا فیصلہ کیا، اور اپنے نزدیک اس کو طے کر لیا، لیکن مولانا سے (جو اس وقت ایک روحانی سرپرست اور امیر کی حیثیت رکھتے تھے) منظوری لینی ضروری تھی، میں نظام الدین گیا، شب میں میں نے مولانا سے اپنے اس طبعی رجحان اور آزادہ کر دین کے کام کرنے کی آمادگی کا ذکر کیا، مولانا نے فرمایا کہ ہمارے بزرگ کسی ذریعہ معاش اور ملازمت کو اس وقت تک ترک کرنے کا مشورہ نہیں دیتے جب تک اس کا نعم البدل مہیا نہ ہو جائے، میں نے دوسری بار پھر عرض کیا، اور مولانا نے اسی طرح کا جواب دیا، غالباً مولانا میری طبیعت اور عزم و فیصلہ کی پختگی کا اندازہ فرما رہے تھے، فجر کی نماز اور تقریر کے بعد مجھ سے خود فرمایا کہ "مولانا آپ کو دارالعلوم سے کیا ملتا ہے؟" میں نے کہا پچاس روپے، یہ سن کر بڑے جوش کے ساتھ فرمایا، اجی حضرت! ایسے ہزاروں پچاس آپ کے غلاموں کے قدموں پر نثار ہوں گے، یہ کہہ کر اجازت دے دی، یہ غالباً ۱۹۴۲ء۔۴۳ء کا زمانہ تھا، میری تھوڑی سی رقم جو سیرت سید احمد شہیدؒ کے

نسخوں کی خریداری میں آئی تھی، ڈاک خانہ میں جمع تھی، پورا سال بڑی فراغت اور عافیت کے ساتھ گذرا، سال کے اختتام پر مہتمم دارالعلوم مولانا عمران خاں صاحب نے سید صاحب کو اس پر آمادہ کر لیا کہ وہ مجھے اصرار کے ساتھ ضابطہ کے تعلق کو قبول کرنے کا حکم دیں گے میرے ایمان کی کمزوری اور کچھ سید صاحب کا لحاظ کہ وہ پس انداز رقم بھی ختم ہو رہی تھی، میں نے یہ سمجھا کہ یہ ایک غیبی انتظام ہے، میں نے یکم دسمبر ۴۳ء سے تنخواہ قبول کرنا اور باقاعدہ پڑھانا شروع کر دیا، خدا کی شان وہ سال عسرت اور تنگی کے ساتھ گذرا، اور اپنی اس کم ہمتی اور خام خیالی پر ایسی ندامت ہوئی کہ ۵ر نومبر ۴۵ء سے میں نے ملازمت کا تعلق ایسا ترک کیا کہ پھر دوبارہ نوبت نہیں آئی، اس عرصہ میں بعض امتحانات بھی پیش آئے، عسرت تنگی کا دور بھی گذرا، قرض کا بھی بار ہو گیا، اور بعد میں ایسی پیشکشیں آئیں، جو میری حیثیت سے بہت بلند تھیں، اور دارالعلوم کی بڑی سے بڑی تنخواہ اور ان کے درمیان کوئی تناسب نہ تھا، توکل و عزیمت تو بڑے درجے کے لوگوں کا کام ہے، مجھے جو چیز ان کے قبول کرنے سے ہمیشہ مانع اور دامن گیر ہوئی وہ یہ تھی کہ اگر دنیا میں کسی نے پوچھا یا آخرت میں سوال ہوا کہ تم نے اپنے گھر اور مدرسہ کی ملازمت اس لئے چھوڑی تھی کہ وہاں تنخواہ قلیل تھی، اور دوسری جگہ کی ملازمت اس لئے قبول کی کہ اس میں اضعافاً مضاعفہ مل رہا تھا؟ تو میں کیا جواب دوں گا، بعض مرتبہ چھوٹی چیزیں بھی بڑے فیصلوں اور اقدامات کا پیش خیمہ اور سبب بن جاتی ہیں۔

مدارس دینیہ سے ربط

اس وقت تک دارالعلوم ندوۃ العلماء کا قدیم اور اہم مرکزی مدارس عربیہ

(جن میں سرفہرست دارالعلوم دیوبند، اور مظاہر العلوم سہارنپور تھے، اور ہیں) ایک برادری میں شامل ہونے کے باوجود ربط و تعلق نہیں رہا تھا، طلباء اور بعض اساتذہ کی اس تبلیغی نقل و حرکت، اور نظام الدین کی بار بار حاضری نے ان دونوں کے درمیان ملانے والی کڑی کا کام کیا، متعدد بار طلبہ کی جماعتیں مولانا کے زمانہ قیام سہارنپور میں، اور بعض اوقات جلسوں کے موقعوں پر سہارنپور گئیں، اور مدرسہ مظاہر العلوم میں ان کا قیام ہوا، یہاں مدرسہ کے ذمہ دار و سربراہ و اساتذہ مولانا حافظ عبد اللطیف صاحب، مولانا عبد الرحمن صاحب کیمل پوری، مولانا اسعد اللہ صاحب وغیرہ نے ایسی شفقت و اکرام کا معاملہ کیا کہ وہ حجاب اور اجنبیت دور ہوگئی جو کم ملنے جلنے، اور ماحول کے تھوڑے سے فرق نے پیدا کردی تھی، ندوہ کے طلبہ کے اس کام سے تعلق نے وہاں کے طلبہ اور اساتذہ کے ذہن میں بھی اس کام کی ضرورت اور افادیت اور اس کی وقعت میں تھوڑا بہت اضافہ کیا کہ ایک ایسے مدرسے کے جس کو ابھی تک عصری (MODERN) سمجھا جاتا تھا، طلباء و اساتذہ اس کام میں عملی حصہ لے رہے ہیں، دو ایک بار دار العلوم ندوۃ العلماء کے طلبہ و اساتذہ دار العلوم دیوبند بھی گئے، اور وہاں بھی دعوت پیش کی، اس سے بھی اس قرب و ارتباط، اور تعارف و اعتماد میں ترقی ہوئی، جس کی ایک ہی مسلک و مقصد کی تعلیم گاہوں، اور دینی مرکزوں میں ضرورت عرصہ سے محسوس ہوتی تھی۔

پشاور کا تاریخی سفر

مارچ ۱۹۴۴ء میں (جب مولانا بستر علالت پر تھے) مجھے مجلس سیرت پشاور کے سکریٹری اے۔ آر ارشد صاحب کا خط ملا کہ اس سال مجلس سیرت پشاور کی کمیٹی نے

فیصلہ کیا ہے کہ آپ کو اس کے سالانہ جلسہ میں جو بڑے اہتمام سے ہوتا ہے مدعو کیا جائے، صوبہ سرحد اور پشاور سے آپ کے خاندانی روابط بھی ہیں، اور وہ حضرت سید صاحب کی تحریک، اور مجاہدانہ سرگرمیوں کی جولان گاہ رہا ہے، اس لئے آپ کو ایک بار یہاں آنا چاہئے، میں مجلس سیرت اور اس کے سکریٹری کے نام سے بھی ناآشنا تھا، اور ہندوستان کے ان نامور مقررین میں بھی میرا شمار نہیں تھا، جن کو دور دراز مقامات سے دعوت دی جاتی ہے، خط میں اس کا بھی تذکرہ تھا کہ عام طور پر اس جلسہ کے لئے مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، اور مولانا قاری محمد طیب صاحب کو دعوت دی جاتی رہی ہے، اس سال کمیٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ دو ندوی فضلاء کو مدعو کیا جائے، ایک آپ دوسرے مولانا قاری شاہ محمد جعفر صاحب پھلواروی ندوی، معلوم نہیں کیا بات تھی کہ اس خط کو پڑھ کر ایک خاص طرح کی مسرت و انشراح محسوس ہوا، اور پشاور کے سفر کا جذبہ پیدا ہو گیا، بھائی صاحب مرحوم نے بھی پشاور کی نسبت اور تعلق سے اس سفر کی منظوری دے دی، اور تائید فرمائی، میں نے سفر کی اطلاع دے دی، ہمارے کرم فرما اور مخلص سید صغیر حسن صاحب نے جب سنا تو اس سفر میں رفاقت اور مدد کے لئے اپنی طرف سے مولوی عبد الغفار صاحب ندوی[1] جونپوری کو اپنی طرف سے ساتھ کر دیا کہ تنہا سفر مناسب نہیں، ہم نے پہلے مولانا محمد الیاس صاحب کی خدمت میں حاضری دی جن کی علالت کا سلسلہ ایک دو مہینے سے جاری تھا، مولانا نے دعاؤں کے ساتھ رخصت فرمایا اور چلتے وقت کہا کہ اپنا کام نہ بھولنا۔

دہلی سے پشاور تک فرنٹیر میل کے سکنڈ کلاس ریزرو میں سفر تھا، راستہ عجیب فرحت و انبساط کے ساتھ گذرا کسی درمیانی اسٹیشن سے شاہ جعفر صاحب بھی ساتھ ہو گئے، لاہور کے

---

[1] حال سکریٹری جماعت اسلامی ہند۔ یوپی

اسٹیشن پر برادر عزیز سید احمد الحسنی موجود تھے، انھوں نے دوپہر کا کھانا پاس کے رسٹورنٹ میں کھلایا، اور رخصت کیا، پشاور پہونچا تو اسٹیشن پر (گاڑی کے کئی گھنٹے لیٹ ہونے اور نصف شب میں پہونچنے کے باوجود) ارشد صاحب اپنے چند احباب کے ساتھ موجود تھے، ہمارا قیام ملک خدا بخش صاحب اسپیکر صوبہ سرحد اسمبلی کی کوٹھی پر ہوا، اگلے دن سیرت کے پہلے اجلاس میں تقریر ہوئی، اتفاق سے ہم دونوں کی تقریر کچھ بنی نہیں، میں نے ایک ایسا موضوع اختیار کیا جو درسی اور علمی حلقے کے لئے تو موزوں تھا، لیکن عوام کے لئے نہیں، وہ ندوی نوجوان جو دارالعلوم میں زیر تعلیم تھے، یا پڑھ کر نکلے تھے، اور جن کو اس پر بڑی مسرت تھی کہ اس مرتبہ پہلی بار دو ندوی فضلاء کو مدعو کیا گیا ہے، کچھ متاثر نظر آئے، انھوں نے ایسے اشارے کئے جن سے اندازہ ہوا کہ ان لوگوں کی خواہش ہے کہ یہ پہلا تجربہ کامیاب ہو، اور اہل شہر اچھا تاثر لیں، مجھے بھی اپنی تقریر کے نہ جمنے کا احساس تھا، قیام گاہ پر آیا تو دعا کی ایک اضطراری کیفیت طاری ہوئی، جو اکثر رنگ لاتی ہے، میں نے خدا کے سامنے اپنے عجز اور نااہلیت کا اقرار کرتے ہوئے مدد کی دعا کی، دوسرے دن کا جلسہ اصل جلسہ تھا، اس دن دفاتر میں تعطیل کر دی گئی تھی، اور ہزاروں کی تعداد میں شہر اور قرب وجوار کے مسلمان جلسہ میں آئے تھے، غالباً سکندر مرزا بھی جو اس وقت کسی بڑے انتظامی عہدہ پر تھے موجود تھے، اور سردار عبدالرب نشتر بھی تشریف رکھتے تھے، میں احتیاطاً لکھنؤ سے سیرت پر ایک مضمون لکھ کر (جو بعد میں "سیرت محمدیؐ کا پیغام، بیسویں صدی کی دنیا کے نام" کے عنوان سے شائع ہوا) لے گیا تھا، میں نے ارشد صاحب سے اس کے پڑھنے کی اجازت چاہی، انھوں نے کہا کہ عام طور پر لکھے ہوئے مضامین عوامی جلسوں میں جمتے نہیں اور لوگ ان کو صبر وسکون کے ساتھ سن نہیں سکتے، ہندوستان کے ایک نامور اہل قلم بھی ایک سال

آئے تھے، اور انھوں نے بھی مضمون پڑھا، لیکن اکھڑا اسا رہا، اور بے دلی سے سنا گیا، میں نے توکلاً علی اللہ تقریر شروع کردی جس کا مرکزی نقطہ بدر کی وہ دعا تھی جس نے میدان جنگ کا نقشہ ہی بدل دیا، اور امت مسلمہ کی بقا اور عروج کا فیصلہ کر دیا، یعنی ارشاد نبویؐ اللھم ان تھلك ھذہ العصابۃ لن تعبد (اے اللہ اگر تو اس مٹھی بھر جماعت کی ہلاکت کا فیصلہ کردے گا تو پھر اس کے بعد تیری واحد ذات کی عبادت نہیں ہو سکے گی) میں نے کہا یہی امت اسلامیہ کی اساس ہے، اور جب یہ دعا قبول اور تمام قیاسات و قرائن کے برخلاف ۳۱۳ کی اقلیت کو ایک ہزار کی مسلم اکثریت پر فتح حاصل ہوئی تو اس کی تصدیق کردی گئی کہ اس امت کا یہی شعار، یہی پیغام، اور اس کی یہی افادیت ہے، اور یہی اس کی زندگی اور کامرانی کی شرط، اور اس امت کا عہد رسالت میں اسی طرح تعارف ہوا تھا، اور اس کی بنیاد پر قریش نے اس کے خلاف علم جنگ بلند کیا تھا، پھر میں نے امت کے ماضی اور حال کا موازنہ کیا، اور کہا کہ آج اگر قریش کے مُردے، اور بدر و احد کے مقتولین زندہ ہو جائیں، اور مسلمانوں سے پوچھیں کہ تمہارا وہ امتیاز اور مقصد زندگی کہاں گیا، جس کو لے کر تم دنیا میں آئے تھے، اور دنیا طلبی، عیش کوشی، دولت پرستی، تن آسانی، بے اصولی اور بے ضمیری میں ہمارے تمہارے درمیان کون سا بڑا فرق ہے؟ تو ہم کیا جواب دیں گے، مجھے معلوم نہیں کہ اس وقت مضامین کا ورود کہاں سے ہو رہا تھا، اور زبان میں طاقت کہاں سے آگئی تھی کہ میں خود بھی اس کے زور میں بہہ رہا تھا، اور مجمع بھی مسرت و سرشار تھا، بعض دیکھنے والوں نے بتایا کہ سردار عبد الرب نشتر چہرہ پر رومال رکھے ہوئے تھے، اور آنکھ سے آنسو جاری تھے، تقریر ختم ہوئی تو بہت سے پٹھان اٹھ کر سامنے آئے اور کہا کہ کیا حکم ہے؟ اسی تقریر کو میں نے پھیلا کر "الی ممثلی البلاد الاسلامیۃ" میں مقالہ کے انداز میں

ادا کیا ہے۔

حاجی ارشد صاحب مرحوم

اس سفر کا سب سے بڑا تحفہ اور کامیابی ارشد صاحب کی یافت اور دریافت تھی، میں اپنی زندگی میں جن چند آدمیوں سے متاثر اور ان کا معتقد ہوا ہوں، اور جن میں میں نے ایسا اخلاص، فہم، دماغی توازن، اور قوت عمل دیکھی ہے، جو ہزاروں بلکہ لاکھوں آدمیوں میں سے کسی ایک میں ہوتی ہے، ان میں ایک ارشد صاحب تھے، ان کو بھی مجھ سے ایسا تعلق و مناسبت پیدا ہو گئی تھی، جو کم دوستوں اور عزیزوں کو ہوتی ہوگی، تقریر نے پشاور میں ایک خاص دینی فضا پیدا کر دی، جگہ جگہ اس کا چرچا تھا، اس لئے مقرر کی بات کا وزن اور وقعت بڑھ گئی، اس فضا سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے تبلیغی طریقہ کی دعوت دی، ایک نئی کالونی میں جہاں ملازمین و عہدے دار رہتے تھے، صوبہ سرحد کا پہلا تبلیغی گشت ہوا، اور اسی وقت سے صوبہ سرحد میں تبلیغی کام کی بنیاد پڑ گئی، اگلے ہی مہینے اپریل ۱۹۴۴ء میں ارشد صاحب مولانا کی خدمت میں نظام الدین حاضر ہوئے، میں نے حضرت کو جو تعارفی عریضہ لکھا اس میں یہ بامعنی فقرہ بھی تھا کہ "ارشد صاحب صوبہ سرحد کے رجل رشید ہی نہیں ارشد ہیں[1]" ارشد صاحب کو بھی مولانا کی ذات اور تبلیغی کام سے ایسا گہرا اور پائیدار تعلق ہوا کہ انھوں نے پہلے پشاور و کلکتہ میں پھر جاپان اور حجاز میں اس کو بڑے سلیقہ سے انجام دیا، جاپان میں تو ان کے ہاتھوں قبول اسلام کا دروازہ کھل گیا، اور حجاز میں اس کام کا وسیع تعارف اور خواص کا رجوع ہوا، وہ اس سلسلہ میں امریکہ بھی گئے،

---

[1] قرآن شریف کی آیت کی طرف اشارہ ہے جس میں ایک نبی کی زبان سے کہا گیا ہے "اَلَیْسَ مِنْکُمْ رَجُلٌ رَّشِیْدٌ"
(سورہ ہود- ۷۸)

حکومت سعودیہ نے آٹومیٹک ٹیلی فون کی اسکیم منظور کی تو اس کے انچارج اور افسر اعلیٰ کی حیثیت سے ان کا انتخاب ہوا، اگر خدا کو منظور ہوتا اور ان کی زندگی وفا کرتی تو اس دعوت کو عظیم نفع پہونچتا، لیکن اللہ کو کچھ اور منظور تھا، ۱۴؍شعبان ۱۳۸۳ھ کو مدینہ طیبہ سے خاص کیفیت کے ساتھ مواجہ شریف سے رخصت ہو کر پندرھویں کا روزہ رکھ کر روانہ ہوئے، جدّہ کے قریب موٹر کا حادثہ پیش آیا، جس میں وہ روزہ اور احرام کی حالت میں جاں بحق ہوئے، حرم شریف میں ایک بڑی جماعت کے ساتھ نماز ہوئی اور جنت المعلیٰ میں شیخ العرب والعجم حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی، اور حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی کے پہلو میں آسودۂ خاک ہوئے[1]۔ ع

یہ نصیب اللہ اکبر! لوٹنے کی جائے ہے!

میرا صوبہ سرحد کا پہلا دورہ

میں نے پشاور کے اس سفر سے اپنے محبوب و محسن موضوع "سیرت سید احمد شہیدؒ" کے سلسلہ میں بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی، ارشد صاحب نے اس میں پورا تعاون کیا، میں پہلے اکوڑہ خٹک گیا، جہاں سید صاحب کی جہاد کی بنیاد پڑی تھی، اور پہلی جنگ کا تجربہ کیا گیا تھا[2]، اکوڑہ خٹک سے شیدو، صوابی تحصیل مانیری اور ضلع مردان کے کئی مقامات پر جانا ہوا، جن کا سید صاحب کی تاریخ و تحریک سے گہرا تعلق تھا، یہاں پر ہنڈ و پنجتار کا خاص طور پر تذکرہ کیا جاتا ہے۔

---

[1] قدرے تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو "سوانح حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ کاندھلوی" حاشیہ ص۲۶۴-۲۶۵۔ نیز کتاب ص۵۴۵-۵۵۶ [2] تفصیل ملاحظہ ہو "سیرت سید احمد شہیدؒ" اکوڑہ خٹک

ایک خطرناک لطیفہ

ضلع مردان میں دریائے اٹک کے کنارہ ایک بڑا قصبہ ہنڈ ہے جس کے متعلق مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کا خیال تھا کہ محمود غزنوی یہیں سے دریائے اٹک پار کرکے ہندوستان میں داخل ہوا، مورخوں نے غلطی سے اس کو بھٹنڈا لکھ دیا ہے، سید صاحب کے زمانہ میں یہاں سردار خادی خاں کی حکومت تھی، اسی مقام پر سید صاحب نے ۱۲ جمادی الآخرہ ۱۲۴۲ھ کو بیعت امامت لی تھی، اور سردار خادی خاں نے دوسرے سرداران علاقہ کے ساتھ بیعت کی تھی، اور شرعی نظام قبول کیا تھا، لیکن بعد میں سردار خادی خاں اس سے پھر گئے، اور مخالفین کے ساتھ سازبازکی، مجاہدین نے حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کی قیادت میں اس پر فوج کشی کی، خادی خاں کو شکست ہوئی، اور قلعہ ہنڈ مجاہدین کے قبضہ میں آیا، اور خادی خاں مقتول ہوا۔[1]

میں ہنڈ کو دیکھنا بھی چاہتا تھا، اور ضروری مقامات کی تصویر اور نقشہ بھی لینا چاہتا تھا، اس کے لئے ارشد صاحب نے ایک نقشہ نویس کو بھی ہمارے ساتھ کر دیا تھا، ہم لوگ سیدھے ہنڈ کی مسجد میں پہونچے، معلوم کیا کہ کوئی صاحب یہاں ایسے ہیں، جن سے کچھ تاریخی معلومات حاصل ہوسکیں؟ لوگ سردار خادی خاں کے خاندان کے ایک معزز فرد کو بلا لائے جو لاہور میں ریلوے میں کسی عہدہ پر تھے، انھوں نے کہا کہ آپ اتنی دور سے یہاں کس کام کے لئے آئے ہیں؟ میں نے کہا کہ مجھے تاریخی ذوق ہے، اور میں یہاں کے حالات

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "سیرت سید احمد شہیدؒ" جلد اول چودھواں باب ص ۱۲۷-۱۳۴

معلوم کرنا چاہتا ہوں، کہنے لگے کہ اتنے کام کے لئے تو کوئی اتنی دور سے نہیں آتا! پھر کہنے لگے کہ لکھنؤ کے ایک صاحب ابوالحسن علی ندوی ہیں انھوں نے ایک کتاب "سیرت سید احمد شہیدؒ" لکھی ہے جس میں ہمارے بزرگوار سردار خادی خاں کے متعلق سخت الفاظ آئے ہیں، جو غلط فہمی پر مبنی ہیں، میں نے ٹالنے کے لئے کہا کہ لوگ کتابیں لکھتے ہی رہتے ہیں! اس وقت نہ انھوں نے میرا نام پوچھا نہ میں نے بتایا، بات آئی گئی ہو گئی، انھوں نے اپنا مہمان بنایا، شام کو انھوں نے کہا کہ چلئے آپ کو دریائے اٹک کی سیر کرائیں، میں اور مولوی عبدالغفار صاحب گئے ایک جگہ مولوی عبدالغفار صاحب تو وضو کے لئے بیٹھ گئے، ہم اور وہ تنہا رہ گئے، انھوں نے کہا کہ آپ کا نام کیا ہے؟ میں نے کہا کہ علی، کہا کہ آپ ہی تو ابوالحسن علی نہیں ہیں، (خیال رہے کہ پٹھان حضرات بندوق ساتھ رکھتے ہیں، اور جگہ بالکل سناٹے کی تھی) میں بڑے مخمصہ میں پھنسا، میں نے کہا کہ لکھنؤ شیعوں کا شہر ہے، وہاں سنّیوں کے نام بھی علی، حسین کثرت سے ہوتے ہیں، اس پر انھوں نے مزید جرح نہیں کی، اور ہم لوگ مغرب کی نماز ادا کر کے قیام گاہ پر آ گئے، رات کو انھوں نے رئیسانہ اور شریفانہ ضیافت کی، اگلے دن جب میں رخصت ہونے لگا، میں نے ان کو دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ کھیتوں پر گئے ہوئے ہیں، میں نے بلوایا، میں نے کہا کہ اب میں یہاں سے جا رہا ہوں اب چھپانا مناسب نہیں سمجھتا، میں ہی "سیرت سید احمد شہیدؒ" کا مصنف ابوالحسن علی ندوی ہوں، وہ بڑے اخلاق سے ملے، اور کہا کہ ابھی تک انجان بن کر آپ ہمارے مہمان رہے، اب تعارف ہوا ہے، اب آپ کچھ وقت یہاں رہئے، تاکہ ہمیں آپ کی میزبانی کا موقعہ ملے، انھوں نے یہ بات خلوص اور شرافت سے کہی تھی، مگر ہمارا پروگرام آگے کا بنا ہوا تھا، میں نے معذرت کی، اور ہانیری کے لئے روانہ ہو گیا۔

پنجتار اور بالاکوٹ میں

مانیری سے میں نے پنجتار کا رخ کیا، جو چار پانچ سال تک سید صاحب اور ان کے عالی مرتبہ رفقاء کا مستقر، اور ان کی دعوتی اور مجاہدانہ سرگرمیوں کا مرکز رہا۔

پنجتار جاکر طبیعت سب سے زیادہ متاثر ہوئی، خاص طور پر جب اس مسجد میں قدم رکھا جہاں حضرت سید صاحب، ان کے رفقائے عالی مقام، اور مجاہدین باصفا نے برسوں نمازیں پڑھیں، اس کی فضا کو اپنی حرارت ایمانی سے گرم، اور اس کی زمین کو اپنے اشکوں سے نم کیا، تو بے اختیار ایسا دل امنڈ آیا، اور طبیعت دعا کی طرف اس طرح متوجہ ہوئی کہ حرمین شریفین اور زندگی کی مخصوص ساعتوں کے علاوہ کبھی اور کہیں اس کا تجربہ نہیں ہوا۔

حسن اتفاق سے پنجتار کے قیام کے بعد میں نے بھائی صاحب کو جو خط لکھا تھا، وہ ذخیرۂ خطوط میں مل گیا، یہاں نقل کیا جاتا ہے:۔

"برادر معظم و محترم متعنا اللہ بطول بقائہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، پرسوں نصف شب میں ہم اپنے پہلے دورہ سے خیر و کامیابی کے ساتھ واپس آئے، اکوڑہ سے ایک کارڈ لکھا تھا جو ملا ہوگا، اکوڑہ کے بعد ہنڈ گئے، خادی خاں مقتول کے ورثہ سے ملاقات ہوئی، اور شب کو انھیں کے مہمان رہے، ایک صاحب جو ان میں سے حالات سے سب سے زیادہ واقف تھے، چھٹی پر آئے ہوئے تھے، انھوں نے خود بھی اپنے بزرگوں کے، اور اپنے قصبہ کے حالات بڑی محنت سے جمع کئے ہیں، اور

ہماری سیرت کے اقتباسات، بلکہ صفحے کے صفحے نقل کئے ہیں، انھوں نے رہنمائی کی، اور تمام آثار دکھائے، ہم نے اپنا تعارف نہیں کرایا تھا، انھوں نے سید صاحب کی بڑی مدح کی، اور ان کی حقّانیت، خدا ترسی اور بے غرضی کی بڑی تعریف کی، طبعی طور پر اپنے جدّ و مورث کی طرف سے معذرت و تاویل کی اور اس افسوسناک اختلاف کو غلط فہمی پر محمول کیا۔

غادی خاں کے پر پوتے نے اپنے جد کا مکان دکھایا، اور واقعات اور ان کے مقامات کی نشان دہی کی۔

ہنڈ سے ہم مانیری آئے، جس کا ذکر سیرت میں بار بار آیا ہے، ایک رات ہم نے وہاں بھی گزاری، دوسرے روز بڑے ذوق و شوق کے ساتھ پنجتار کا رخ کیا، جو سید صاحب اور آپ کے رفقاء کا اصل مستقر تھا، مانیری سے وہ سوات (میاں گل کی ریاست) میں ۸۔۹ میل کے فاصلہ پر پہاڑوں کی بالکل گود میں ہے، دوپہر کو ہم وہاں پہونچ گئے، اور حسن اتفاق کہ فتح خاں مرحوم (سید صاحبؒ کے داعی اور میزبان) کے پر پوتے دوست محمد خاں کے مہمان ہوئے، فتح خاں کے حقیقی پوتے عطا محمد خاں، اور ان کے بھتیجے شاہ پسند خاں اور ان کے دوسرے اعزہ سے ملاقات ہوئی، خان خیل (فتح خاں کی اولاد) کے ۱۰۔۱۵ گھر ہیں، یہ قصبہ ایک بلند ٹیلہ پر پہاڑی چشمہ کے کنارے چاروں طرف سے پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے، نہایت محفوظ اور خوش منظر جگہ ہے، اور اس قابل ہے کہ فوجی مستقر اور نو آبادی بنائی جائے، سید صاحبؒ کے بعد کئی مرتبہ تباہ اور مسمار ہوا، اب قلعہ کی فصیل کے نشانات اور پتھروں کے ڈھیر کے سوا اس کاروان رفتہ کا

وہاں کوئی نشان نہیں، سید صاحب کی فرودگاہ کی جگہ ایک مسطح زمین باقی ہے، سید صاحب کا بنایا ہوا تہہ خانہ بھی ہے۔

لیکن اس ویرانی کے باوجود ان سب مقامات میں سب سے زیادہ اُنس اور کشش وہیں معلوم ہوئی، اور پرانے مناظر کے تصور سے آنکھیں پُر آب ہو گئیں، اور دل بھر آیا، سارا نقشہ یاد آیا کہ تین سو مجاہدین اور ابرار کا یہ مسکن تھا، ہر وقت یہ جگہ ذکر اللہ اور ذکر جہاد فی سبیل اللہ سے معمور رہتی تھی، بہت کوشش کی کہ کوئی تاریخی یادگار یا نشانی مل جائے، ہمارے میزبانوں نے بھی بہت کوشش کی، مگر نہ مل سکی، دو وقت اس خاندان کی دونوں شاخوں کے مہمان رہے، واپسی میں اس قصبہ کے متصل دوسرے قصبہ غُرغشتی میں گئے، وہاں کے سادات جو اپنے کو حسنی بتلاتے ہیں، نہایت محبت اور تکریم سے پیش آئے، اور ٹھہرنے کے لئے اصرار کیا، ان کے پاس پشتو زبان میں ان حالات کی ایک مفصل تاریخ اور روداد ہے، جو کہیں مستعار گئی ہوئی تھی، انھوں نے اس کے بھیجنے کا وعدہ کیا ہے۔

اب صرف بالاکوٹ کی مہم باقی ہے، انشاء اللہ آئندہ سنیچر ۲۶ مارچ تک وہاں کے لئے روانہ ہو جائیں گے، ابھی یہاں بھی سردی ہے، وہاں سے واپس لاہور و دہلی ہوتے ہوئے لکھنؤ پہونچیں گے۔

والسلام مع الاکرام

خاکسار

ابوالحسن علی

ہنڈ غالباً ۱۸ مارچ ۱۹۴۴ء کو جانا ہوا تھا، اگلے ہفتہ غالباً ۲۶، ۲۷ مارچ کو بالاکوٹ روانگی ہوئی، یہ اس کاروان ایمان و عزیمت کی آخری منزل تھی جس کا سفر ہمارے ہی وطن رائے بریلی سے شروع ہوا تھا، یہاں کی زمین کا ہر ذرہ ہم کو عزیز تھا، اور آنے والوں کو حضرت مرزا مظہر جانجاناں کی زبان میں پیام دیتا تھا۔

یہ بلبلوں کا صبا مشہد مقدس ہے

قدم سنبھال کے رکھیو یہ تیرا باغ نہیں

ہم لوگوں کا قیام سرکاری گسٹ ہاؤس میں رہا، جس کے لئے ارشد صاحب نے اجازت نامہ حاصل کر لیا تھا، مہمان قصبہ کے قاضی صاحب کے تھے، یہاں کوئی سفرنامہ یا روزنامچہ لکھنا مقصود نہیں کہ تنہا یہ عنوان ایک کتاب کا طالب ہے، ناظرین "سیرت سید احمد شہیدؒ" کے حصہ دوم طبع سوم کا عنوان "شہدائے بالاکوٹ کا مقام و پیغام" پڑھ لیں[1] اور اس مقصد و پیغام کو بھی تازہ کر لیں جس کے لئے ان عالی ہمت مومنین قانتین، اور مجاہدین صادقین نے اپنے خون سے اس سرزمین کو لالہ زار، اور گنج شہیداں سے گلزار بنایا، اور کم سے کم اس عہد کی انسانیت اور ہندوستان میں اسلام کے باغ کا "عطر مجموعہ" جو صدیوں سے تیار نہیں ہوا تھا، یہاں کی مٹی میں مل گیا، اور مسلمانوں کی نئی تاریخ بنتے بنتے رہ گئی۔

اس سفر میں رفیق قدیم مولوی احسان اللہ صاحب پشاوری ندوی بھی ساتھ تھے، دوسری مرتبہ غالباً اگلے ہی سال میں عزیزی محمد رابع سلمہ، اور حاجی نور الٰہی صاحب پشاوری کی معیت میں دوبارہ حاضر ہوا، اس کے بعد ابھی تک اس سرزمین رنگ و بو میں حاضری کا

---

[1] ص ۴۵۹-۴۶۳

موقعہ نہیں ملا۔

واپسی میں پشاور، لاہور اور دار السلام پٹھان کوٹ ہوتے ہوئے، جہاں مولانا مودودی اور ان کے رفقاء سے ملاقات ہوئی، غالباً ایک شب و روز رہنا ہوا، سہارنپور واپسی ہوئی، میں اس طویل سفر سے بہت تھک گیا تھا، اور ایک دو روز نظام الدین مولانا کی خدمت میں رہ کر (جن کی علالت کا سلسلہ خطرناک حد تک جاری تھا) جلد سے جلد اپنے مستقر پر پہونچنا چاہتا تھا، اس لئے کہ دار العلوم سے ضابطہ کا تعلق دوبارہ قائم ہو چکا تھا، اور مجھے مدرسہ چھوڑے ہوئے تقریباً ایک مہینہ ہو رہا تھا، سہارنپور جب حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اچانک مولانا کا ایک مکتوب مولانا انعام الحسن صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ملا، جس کے سرنامہ پر ضبا اللہ فتقوا وعلی اللہ فتوکلوا لکھا ہوا تھا، اس میں اطلاع دی گئی تھی کہ .... مبلغین کی معتدبہ جماعت جو کراچی گئی ہوئی ہے، اس کا ایک تار آپ کی دعوت کا آیا ہوا ہے، حیدر آباد سندھ میں ایک بڑا جلسہ ہونے والا ہے، جس میں مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب، اور مولانا طیب صاحب وغیرہ شرکت فرمارہے ہیں، اس میں تبلیغی دعوت کو اہمیت کے ساتھ بیان کرنے، اور اس کام پر آمادہ کرنے کے لئے شدید ضرورت ہے۔[1]

میں اس خط کو پڑھ کر سخت کشمکش میں پڑ گیا، سفر کی طوالت، دار العلوم کی حاضری کا تقاضا اور اپنا ضعف دیکھتے ہوئے تو بے اختیار جی چاہتا تھا کہ معذرت کر دوں، لیکن اللہ نے ہمت و توفیق دی اور حضرت شیخ کا بھی ایماء ہوا اور میں اپنے رفیق سفر مولوی عبد الغفار صاحب ندوی کو لکھنؤ روانہ کر کے اگلے ہی دن پنجاب میل سے لاہور روانہ ہو گیا،

---

[1] پورا مکتوب ملاحظہ ہو مجموعہ "مکاتیب حضرت مولانا شاہ محمد الیاس رح" ص ۸۵

لاہور سے مولانا محمد اسماعیل صاحب سنبھلی کا ساتھ ہوگیا، جن کو بھی جمعیت کے اس جلسہ میں شرکت کرنی تھی، جلسہ میں ہمارے استاد الاستاد مولانا عبید اللہ صاحب سندھی بھی تشریف لائے تھے، جو کانگریس کی پہلی وزارت کے زمانہ میں مولانا آزاد کی مساعی سے ہندوستان آچکے تھے، اور چند مہینے پہلے لکھنؤ تشریف لائے تھے، اور ندوہ کے مہمان خانہ میں قیام رہا تھا، سید صاحب کے تعلق و نسبت سے مجھ پر خصوصی شفقت فرماتے تھے، میں نے اس جلسہ میں شرکت بھی کی، اور تقریر بھی، وہاں سے دو دن کے لئے نیو سعید آباد ہوتا ہوا گوٹھ پیر جھنڈا کے مشہور مرکز اور قصبہ میں گیا، جس سے حضرت سید صاحب اور ان کے مجاہدین کا خاص تعلق رہا ہے، اور اس سلسلہ کے بزرگ ہمارے (حضرت مولانا احمد علی صاحب کے واسطہ سے) سلسلۂ قادریہ راشدیہ کے مشائخ میں ہیں، میں نے کتب خانہ بھی دیکھا، اس وقت پیر ضیاء الدین شاہ صاحب بقید حیات اور مسند افروز تھے، انھوں نے بڑی شفقت فرمائی، مولانا عبید اللہ صاحب وہیں مدرسہ کے دار الاقامہ کی بالائی منزل میں مقیم تھے، باوجود ضعف و پیرانہ سالی اور میرے بار بار عرض کرنے کے، روزانہ زینہ اور طویل مسافت طے کر کے میرے پاس تشریف لاتے، اور دیر تک بیٹھتے، ان سے ان کے سفر ہجرت، اور قیام ماسکو کی بعض ایسی باتیں معلوم ہوئیں، جو بڑی تاریخی اہمیت کی حامل ہیں۔

مولانا کی علالت کے آخری دن اور وفات

حیدر آباد اور کراچی سے جہاں پہلی مرتبہ جانا ہوا تھا، اور مختصر قیام رہا، دہلی روانگی ہوئی، مولانا کی علالت تشویش ناک شکل اختیار کر چکی تھی، لیکن مجھے دار العلوم میں حاضری دینی تھی، میں لکھنؤ آگیا، غالباً جون کے مہینہ کی ابتدائی تاریخوں میں میں طویل قیام کی نیت سے

حاضر ہو گیا، اس زمانہ میں مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی کا بھی وہیں قیام تھا، ۲۱؍ جون کو شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب بھی تشریف لے آئے، اسی مہینہ میں نوح کے مدرسہ معین الاسلام کا بھی جلسہ تھا، اس میں میری بھی شرکت ہوئی، خطرہ قریب معلوم ہوتا تھا، مجھ سے کئی مرتبہ فرمایا کہ مجھے اپنے جانبر ہونے کی امید نہیں، اس مرض سے بچتا نظر نہیں آتا، یوں اللہ کی قدرت میں سب کچھ ہے، ایک روز بعض خاص حالات کی بناء پر مجھ پر خیالات و وساوس کا ہجوم تھا، اور طبیعت بہت متاثر تھی، مغرب کی نماز کے سلام پھیرتے ہی طلبی ہوئی، نہایت شفقت سے سر پر ہاتھ رکھا، اور دیر تک بالوں پر ہاتھ پھیرتے رہے، پھر معلوم نہیں کس طرح اس ضعف کی حالت میں (کہ چہرہ کو حرکت دینی بھی مشکل تھی) سر اٹھا کر میری پیشانی کو بوسہ دیا، اور فرمایا کہ تم تھک گئے، تمہارا کوئی معین نہیں، اسی طرح تسلی کے الفاظ فرماتے رہے۔

اسی زمانہ میں حضرت مولانا عبد القادر صاحب رائے پوری بھی تشریف لائے، (جن کے دامن سے وابستہ ہونا بعد میں مقدّر تھا، اور جن کی زیارت کئی بار سہارنپور میں ہو چکی تھی) مولانا کو اپنے تعلق والوں کے ان کی مجلس میں بیٹھنے، ان کی موجودگی سے فائدہ اٹھانے کا بڑا اہتمام تھا، ایک مرتبہ میری تلاش ہوئی، میں مجمع سے گھبرا کر پولیس چوکی سے آگے سڑک پر چلا گیا تھا، آخر میں مولانا انعام الحسن صاحب نے مجھے دریافت کر لیا، اور میں حاضر ہوا، مجھے اشارہ فرمایا کہ کان میرے لبوں کے پاس لاؤ، پھر فرمایا کہ لوگوں کو ذکر کی تاکید، اور مولانا عبد القادر صاحب کی مجلس میں بیٹھنے کی ہدایت کر دو، یہ ۸؍ جولائی ۱۹۴۴ء کا واقعہ ہے، ۱۲، ۱۳؍ جولائی کی درمیانی شب میں وقت موعود آگیا، اور صبح کی اذان سے پہلے جان جان آفریں کے سپرد کی، اور سوانح کے الفاظ میں "عمر بھر کا تھکا ماندہ مسافر کہ شاید کبھی

اطمینان کی نیند سویا ہو، منزل پر پہونچکر میٹھی نیند سویا۔"[1]

میرے اوپر اس حادثہ کا ایسا اثر تھا کہ میں تدفین کے بعد بنگلہ والی مسجد اور سوگوار مجمع میں ٹھہر نہیں سکا، اور اپنے چند ساتھیوں مولوی معین اللہ صاحب وغیرہ کے ساتھ ہمایوں کے مقبرہ چلا گیا، عشا کے قریب جب آیا تو حضرت شیخ کو ایک کوہ تمکنت و وقار پایا جنھوں نے خود مجھے تسلی دی، اب مولانا کے بعد تسکین و تسلی کا ذریعہ ان کی دعوت میں اشتغال اور ان کے جانشینوں بالخصوص صاحبزادۂ گرامی مرتبت مولانا محمد یوسف صاحب اور عزیز و محبوب و محترم بھتیجے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب سے ربط و تعلق تھا، جو الحمد للہ بڑھتا رہا، اور جس کی تفصیل آئندہ صفحات میں آئے گی۔

---

[1] اختصاراً از کتاب "حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت" از راقم سطور۔

بابِ یازدہم

مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی وفات (جولائی ۴۴ء) کے بعد سے جولائی ۴۷ء کے حج تک

مولانا محمد یوسف صاحب کی نیابت وخلافت

مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی علالت کے زمانہ میں ان سب لوگوں کے لئے جن کا کام سے گہرا تعلق تھا، اور جو مولانا کی وہبی کمالات، ان کی قوت نسبت و دعوت سے کچھ بھی آشنا تھے، اور اس دعوت کی وسعت اور روز افزوں ترقی کو دیکھ رہے تھے، یہ مسئلہ پریشان کن بنا ہوا تھا کہ مولانا کی وفات کے بعد (جو کچھ زیادہ دور نہیں معلوم ہوتی تھی) ان کی نیابت کون کرے گا، اور خیر و برکت کا یہ سلسلہ کس طرح جاری رہے گا، جن لوگوں کی مختلف دعوتوں اور رشد و ارشاد کے سلسلوں کی تاریخ پر نظر تھی، اور وہ جانتے تھے کہ اکثر یہ سلسلے اپنی اجتماعیت کے باوجود کسی مخلص فرد اور طاقتور ذات سے وابستہ ہوتے ہیں، ان کو اور زیادہ تشویش تھی، ان لوگوں نے اپنی اس تشویش کا اظہار حضرت شیخ الحدیث سے کیا، شیخ نے سب کے جواب میں کہا کہ اللہ تعالےٰ کا معاملہ اپنے خاص بندوں کے ساتھ جو اس کے لئے مرتے مٹتے ہیں، یہ ہے کہ وہ ان کی چیز کو ضائع نہیں فرماتا، یہ بات ایسی نہیں کہ ہم اور آپ کوئی اس کا انتظام کرلیں، اور وہ ہوجائے، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اچانک اس کے لوگوں میں سے

کسی ایک میں غیر معمولی تبدیلی ہوتی ہے، اور وہ اس کے کام کو سنبھال لیتا ہے (صوفیہ کے یہاں اسی کو انتقال نسبت کہتے ہیں) اس کا انتظار کیجئے اور اللہ سے دعا بھی کیجئے، اگر ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تو میں مشورہ دوں گا کہ چچا جان کی قبر اور ان کے حجرہ کی درودیوار کی وجہ سے یہاں آنے کی کوئی ضرورت نہیں۔[1]

مولاناؒ نے انتقال سے دو دن پہلے مولانا محمد یوسف صاحب کو (چند دوسرے حضرات کے ساتھ) اجازت وخلافت عطا فرمادی تھی، وفات پر انھیں کی جانشینی عمل میں آئی، بہت سے حضرات کو جن کو دستار بندی اور جانشینی کی اس قدیم روایت اور عُرف سے مناسبت نہیں تھی، جو سلسلوں اور خانقاہوں میں پوری پابندی کے ساتھ چلی آرہی ہے، یہ بات کھٹکی، اور انھوں نے اس کو اسی کی تقلید سمجھا، لیکن بہت جلد اندازہ ہوگیا کہ ان کے اندر ایک حیرت انگیز تبدیلی پیدا ہوئی، اور ان میں ان صلاحیتوں اور کمال کا ظہور ہونے لگا، جو اس عظیم اور نازک سلسلہ کو اس کے مزاج اور اس کے داعی اول و بانی کے انداز اور منشاء کے مطابق چلا سکے، خواہ اس میں ان حضرات کے ذہن کی تسکین اور ان کے نزدیک وقت کے تقاضوں اور مقاصد کی تکمیل کا سامان نہ ہو، جو دوسرے ماحول سے تعلق رکھتے تھے، اور فکر و مطالعہ پر ان کی بنیاد تھی، پھر میوات کے اس حلقہ بلکہ پورے معاشرہ کو نہ صرف مطمئن بلکہ متحرک رکھنے کی موجودہ لوگوں میں صرف انھیں میں صلاحیت تھی، جو دعوت کا راس المال، اس کی کامیابی کا نمونہ اور قربانی و ایثار کے لئے سب سے زیادہ تیار تھا، اور جو مختلف اختیاری اور غیر اختیاری اسباب کی بناء پر صرف انھیں کی ذات سے جڑ سکتا تھا۔

---

[1] اختصاراً از "سوانح حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی" تالیف مولوی سید محمد ثانی حسنی ص۲۰۳-۲۰۴

میرا موقف اور طریق فکر

حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ذات سے گہری عقیدت، ان کے فہم دین و اخلاص پر کامل اعتماد، اس کام کی ضرورت اور افادیت پر یقین، اور نہ صرف عملی شرکت، بلکہ ایک داعی اور ترجمان کے فرائض انجام دینے کے ساتھ (جو مولانا کے لئے بھی مسرت اور اطمینان کا موجب تھی) واقعہ یہ ہے کہ میرے ذہن کے سانچہ کی (جو ایک خاص علمی ماحول اور مطالعہ سے تیار ہوا تھا) مکمل شکست و ریخت عمل میں نہیں آئی تھی، اور اس کی جگہ کسی دوسرے ذہنی اور فکری سانچہ نے نہیں لی تھی، یہ صورت حال ان لوگوں کو اکثر پیش آتی ہے، جن کا ذہنی اور فکری سانچہ پہلے سے تیار ہو گیا ہو، اور انھوں نے اپنے ذہن و مطالعہ سے کام لینا نہ چھوڑا ہو، زیادہ صحیح الفاظ میں انھوں نے دماغی سپر اندازی، اور ماضی سے مکمل علیحدگی اختیار نہ کی ہو، اس لئے تحریکوں اور دعوتوں کے لئے وہ لوگ زیادہ مفید اور کارآمد ہوتے ہیں، جن کا سانچہ انھیں تحریکوں اور دعوتوں میں آنے کے بعد بنتا ہے، اور ان کو کوئی فکری ہجرت یا سفر نہیں کرنا پڑتا۔

میرا معاملہ خوش قسمتی یا بد قسمتی سے اس سے مختلف تھا، میرا ایک فکری و علمی پس منظر (BACK GROUND) تھا، اصلاحی اور تجدیدی تحریکوں، اور ان کی مرکزی شخصیتوں کا میں نے نہ صرف مطالعہ کیا تھا، بلکہ ان کے تعارف و تذکرہ نویسی کا شرف بھی حاصل ہوا تھا، میں ہر دور میں منصوصات و غیر منصوصات اور مقاصد و وسائل میں فرق کرتا رہا، اور میرے نزدیک خوب سے خوب تر کی تلاش، اور نافع سے انفع کی جستجو کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا، اسی طرح میرے نزدیک ہر تحریک، ہر دعوت، اور ہر ادارہ میں جو دین کی خدمت اور

اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے قائم ہو، نمو وارتقا، زندگی اور اس کے مسائل سے واقفیت، اور جائز اور ضروری حد تک ان کی تکمیل اور زندگی سے تطبیق کی کوشش ضروری ہے، ورنہ وہ تحریک اور ادارہ نمو اور زندگی کی صلاحیت سے محروم اور جمود کا شکار ہو جائے گا، اور اس کی افادیت محدود سے محدود تر ہو کر رہ جائیگی۔

ان خیالات نے جو میرے خاص ماحول، مطالعہ اور ذہنی ساخت کا نتیجہ تھے، کسی دور میں ساتھ نہیں چھوڑا، اور میں مولانا کی حیات میں بھی کبھی کبھی تنہائی میں اقبال کا یہ شعر پڑھتا تھا ؎

اسی کشمکش میں گزریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی کبھی پیچ و تابِ رازی

لیکن مولانا کی قوتِ نسبت، اور بے پایاں شفقت اور عملی مشغولیت نے ان کی حیات کے پورے عرصہ میں اس فکر کو دبا رکھا تھا، مولانا کی وفات کے بعد وہ نمایاں طریقہ پر ابھرنے لگی، اس نے پہلے یہ شکل اختیار کی کہ کام کو جو اب سارے ہندوستان میں تقریباً پھیل چکا تھا، اور دوسرے ممالک کی طرف بڑھ رہا تھا، کچھ زیادہ منظم، مؤثر اور ذہین و علمی طبقہ کے لئے اطمینان بخش اور پرکشش بنانے کے لئے، اصول دعوت، اور اس کے ان اجزاء ...... کو قائم رکھتے ہوئے (جن کو اس تحریک میں ۶ نمبر کے نام سے یاد کیا جاتا تھا) کم تبدیلیوں اور زیادہ اضافوں کی ضرورت ہے، مختلف مجالس میں مولانا محمد یوسف صاحب اور ان کے اہل شوریٰ سے اس موضوع پر گفتگو ہوئی، مگر اندازہ ہوا کہ ان کا ذہن اس کا ساتھ نہیں دیتا، اور وہ اس کی تائید میں نہیں ہیں، اور شاید مولانا کی وفات کے بعد دعوت کے اس ابتدائی مرحلہ میں اس احتیاط کی کسی قدر ضرورت

بھی تھی، کئی بار متوجہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ جب تک خود اصل داعی کے ذہن میں جو دعوت کا روح رواں ہے، کسی ضرورت کا احساس، اور کسی تبدیلی کا تقاضا پیدا نہ ہو، باہر سے مشورہ دینا خصوصاً ان لوگوں کا جو عمل اور قربانی دینے والوں کے صف اول میں نہیں ہیں، اور جنھوں نے اپنی پوری زندگی وقف نہیں کر دی ہے، مفید اور مؤثر نہیں ہوا کرتا، اور بہت سے داعی اور ذمہ دار اس کو اسی نظر سے دیکھتے ہیں، جیسے کوئی ایسا شخص امام کو لقمہ دے جو نماز میں شریک نہ ہو، اور جس کے قبول کر لینے کو فقہاء مفسد صلوٰۃ سمجھتے ہیں۔

اس احساس اور بار بار کی کوششوں کے غیر مفید ہونے کے تجربہ، نیز جماعت کے اخلاص وللّٰہیت، مولانا محمد یوسف صاحب کی قوت باطنی اور قوتِ دعوت، اور اس میں فنائیت اور استغراق، اور کام کے ہر حال میں نہ صرف مفید بلکہ زندگیوں میں تبدیلی لانے والا عمل دیکھ کر اس سلسلہ کو وہیں روک دینا مناسب سمجھا گیا، البتہ اپنے ذہن کے کام کرتے رہنے کو روکنا قدرت میں نہیں تھا، اس لئے یہ فیصلہ کیا کہ مرکز سے اس تعلق اور دعوت کی مشغولیت کو جاری رکھا جائیگا، البتہ اپنے دائرۂ کار (لکھنؤ اور اس کے اطراف) میں اس کو زیادہ مفید بنانے، اور حالات وماحول کا لحاظ رکھنے، اور دعوت وتفہیم کی اپنی زبان استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ "قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا" ایک دائمی اور عالمگیر حقیقت ہے۔

لکھنؤ کے دینی وعلمی حلقہ میں کام کی مقبولیت اور اہم تبلیغی اجتماعات

۴۴ء سے لے کر تقریباً ۵۲-۵۳ء تک اسی پر عمل رہا، اور اس کا نتیجہ تھا کہ

لکھنؤ کا صاحب علم و فکر طبقہ ممتاز وکلاء، اعلیٰ عہدیدار، علماء اور یونیورسٹیوں سے تعلق رکھنے والے اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کا رجوع اس کام کی طرف بڑھ رہا تھا، اس عرصہ میں لکھنؤ سے بہار کی مشرقی سرحد کٹیہار اور ضلع پورنیہ تک، اور پنجاب و سرحد وکشمیر تک میری اور رفیق محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کی معیت و قیادت میں (جو بہت سے ان احساسات اور طریق فکر میں شریک تھے، جن کا اوپر تذکرہ ہوا) بڑے طویل اور کامیاب دورے ہوئے، ان میں فروری ۱۹۴۵ء کا صوبہ سرحد کا تبلیغی دورہ ۱۹۴۶ء کا تحصیل ہری پور ضلع ہزارہ، تحصیل مری، پھر ریاست پونچھ اور کشمیر کا دورہ اس کے علاوہ مرادآباد کا عظیم جلسۂ تبلیغ جنوری ۱۹۴۵ء میوات کے اہم جلسے بھوپال، لکھنؤ، کانپور، بستی، سیتاپور وغیرہ کے بڑے تبلیغی اجتماعات شامل ہیں، جن میں مجھے بھی تقریر اور دعوت کا فرض انجام دینا پڑا، ۵ رجولائی ۴۵ء سے ۲۵ رجولائی ۴۵ء تک ریاست پونچھ اور کشمیر کا تبلیغی دورہ رہا جس میں عزیز گرامی مولوی سید مظفر حسین شاہ ندوی کی معیت و رفاقت رہی، سری نگر میں میر واعظ مولانا محمد یوسف صاحب کے دولت کدہ پر قیام رہا، رمضان کے دن تھے، اسی سفر میں مولانا آزاد سے نسیم باغ میں جہاں مولانا کا قیام تھا، ملاقات کی، اس سفر میں پامپور اور کوکرناگ وغیرہ بھی جانا ہوا۔

بڑے تبلیغی اجتماعات میں باقی نگر رحیم آباد کا اجتماع خاص طور پر قابل ذکر ہے، جو ۳، ۴، ۵ رجمادی الثانیہ ۱۳۶۵ھ (۶، ۷، ۸ رمئی ۱۹۴۶ء) کو حاجی شیخ فیاض علی صاحب کی دعوت و تحریک پر، اور لکھنؤ کی جماعت و مرکز کی رہنمائی و انتظام میں اور اس کے نقشہ کے مطابق منعقد ہوا، اور جس میں مولانا مدنیؒ کے علاوہ (جو اس زمانہ میں

الہ آباد کے نینی جیل میں اسیر فرنگ تھے) ملک کے ممتاز ترین علماء و مشاہیر شریک ہوئے[۱]۔

فروری ۱۹۴۶ء میں مولانا محمد یوسف صاحبؒ راقم کے وطن دائرۂ شاہ علم اللہؒ رائے بریلی تشریف لائے، ایک بڑا قافلہ مولانا کے ساتھ تھا، ایک روز پہلے حضرت شیخ الحدیثؒ اور حضرت مولانا رائے پوری ایک بڑی جماعت کے ساتھ لکھنؤ پہونچ چکے تھے، ۸ ربیع الثانی کو صبح ایک مستقل بس کے ذریعہ یہ سب حضرات رائے بریلی تشریف لائے، یہ مشائخ، علماء و عمائد کی ایک بڑی جماعت تھی، جن میں حضرت رائے پوری، حضرت شیخ الحدیث اور مولانا محمد یوسف صاحبؒ کے علاوہ پیر ہاشم جان صاحبؒ مجددی (ٹنڈہ سائیں داد سندھ) مولانا احتشام الحسن صاحب کاندھلوی، مولوی ظہیر الحسن صاحب کاندھلوی مرحوم محمد شفیع صاحب قریشی، مولانا عبدالباری صاحبؒ ندوی، اور مولانا محمد منظور صاحبؒ نعمانی بھی تھے حضرت شاہ علم اللہ صاحبؒ کی مسجد کے سامنے دریا کے دوسرے کنارہ یہ مبارک قافلہ اترا، اور کشتی سے دریا عبور کر کے شاہ علم اللہ صاحبؒ کے دائرہ میں داخل ہوا، اور ایک شب و روز قیام کر کے وہاں سے واپسی ہوئی[۲]۔

اس زمانہ میں جمعہ کی شب کے تبلیغی اجتماعات دارالعلوم ندوۃ العلماء کی وسیع مسجد میں ہوتے تھے، اور جماعت کے لوگ اور دینی فضا کے شائقین اور اہل ہمت بڑے ذوق و شوق سے اپنا کھانا اور بستر ساتھ لے کر ندوہ آتے تھے، بعد مغرب دعوتی تقریر ہوتی تھی، جو اکثر میں اور مولانا منظور صاحب کرتے تھے، سیرت کی ایک کتاب کا درس بھی ہوتا تھا، جماعتوں کی تشکیل اور آئندہ کے پروگرام بھی بنتے تھے، آخر شب نوافل و ذکر سے

---

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "سوانح حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ" ص ۱۱۲

[۲] تفصیل "سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری" میں ملاحظہ ہو ص ۱۶۶ سوانح یوسفی ص ۲۷۴-۲۷۵

مسجد میں عجیب نورانی فضا نظر آتی تھی، اکثر اہل ادراک اس میں عجیب سکینت اور نورانیت محسوس کرتے تھے، میں ۱۹۵۱ء میں جب ہندوستان سے مکمل ایک سال باہر رہنے اور مشرق وسطیٰ کا دورہ کرکے آیا، اور حسب معمول یہاں شب گذاری کا موقعہ ملا تو محسوس ہوا کہ ایک چیز یہاں چھوڑ کر گیا تھا، یہیں آکر ملی، اہل جماعت میں ایثار، محبت، تواضع، اور ایک دوسرے کی خدمت کرنے، اور اس کو راحت پہونچانے کا عجیب جذبہ پیدا ہو رہا تھا، شہر کے متعدد اعلیٰ عہدیدار، کامیاب وکلاء، اور بڑے تجار بھی آنے لگے تھے، مدرسہ کے طلبا اور اساتذہ بھی قدرتاً شریک ہوتے تھے، فجر کے بعد بالعموم تربیتی انداز کی تقریر ہوتی تھی، اور عموماً یہ خدمت مجھی کو انجام دینی پڑتی تھی، جو طلبا سالہا سال اس اجتماع میں شریک ہوئے، وہ جب فارغ ہو کر اپنے مقامات اور بیرونی ممالک کے طلبہ جب اپنے وطن پہونچے تو ان میں سے متعدد نے وہاں جا کر تبلیغی کام شروع کیا، اور ندوہ کے اس اجتماع کے بارے میں اس کی افادیت کے سلسلہ میں مؤثر خطوط لکھے، عرصہ کے بعد ۱۹۵۴ء میں یہ اجتماع کچہری روڈ کی تبلیغی مرکز میں منتقل ہو گیا، جس کا سلسلہ بفضلہ تعالیٰ ابھی تک جاری ہے۔

پہلا سفر حج، اور حجاز کا تبلیغی دورہ

مولانا محمد یوسف صاحب کے اسی اعتماد اور محبت، اور مرکز سے میرے اسی تعلق وارتباط کا نتیجہ تھا کہ شعبان ۱۳۶۶ھ (جون ۱۹۴۷ء) میں مولانا محمد یوسف صاحب نے ان خطوط کی بناء پر جو جماعت کے ذمہ داروں کی طرف سے حجاز سے آرہے تھے، اور جن میں میری آمد کی ضرورت کا اظہار کیا گیا تھا، جس سے کہ علمی طبقے میں کام کے تعارف اور قبولیت کی توقع تھی، میرا حجاز جانا طے فرما دیا، اور میں وہاں تقریباً ۲ مہینے قیام کرکے

واپس ہوا[1]، اس سفر کا مستقل تذکرہ ۱۳۶۹ھ؁ ۱۹۵۰ء کے دوسرے سفر حج کے ساتھ (جو حضرت رائے پوریؒ کی معیت میں ہوا) اگلے باب میں آئے گا۔

چند اہم واقعات و اسفار

مرکز نظام الدین سے تعلق اور دعوت و تبلیغ کی مشغولیت کی مناسبت سے مولانا کی وفات جولائی ۴۴ء؁ سے سفر حجاز جولائی ۴۷ء؁ تک کی روئیداد مسلسل لکھی گئی، اور چونکہ ہند و مسلم مخلوط اجتماعات اور ان کی تقریریں اس فکر و مطالعہ کا نتیجہ تھیں، جو خالص مسلمانوں میں دعوتی کام کی مشغولیت کے ساتھ چل رہا تھا، ان کا تذکرہ ۵۴-۵۵ء؁ کے واقعات میں کیا جائے گا... سرگذشت اور ذاتی مشغولیت کے لحاظ سے ان چند واقعات کا اضافہ کیا جاتا ہے، جو اس تین۳ سال کی مدت میں پیش آئے۔

ان اہم واقعات میں ۱۳۶۶ھ؁ ۱۹۴۶ء کے رمضان کا نظام الدین میں حضرت شیخ الحدیثؒ کے ساتھ گذارنا بھی ہے، میں سورت، راندیر، ڈابھیل، بمبئی اور حیدرآباد کے سفر سے واپسی میں ایک ایک دن کے لئے رائے پور، سہارنپور حاضر ہوا، سہارنپور میں معلوم ہوا کہ حضرت شیخ رمضان گذارنے نظام الدین گئے ہوئے ہیں، میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی زندگی میں بھی کبھی رمضان میں نظام الدین حاضر نہیں ہوا تھا، خیال ہوا دو۲ تین دن وہاں ٹھہر کر اور شیخ سے مل کر آجاؤں گا، رخصت کے وقت جب شیخ سے ملنے گیا تو شیخ نے فرمایا کہ مولوی صاحب ہمیں چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو؟ میں نے چند دن اور قیام کا ارادہ کرلیا، وہ ختم ہوئے تو پھر رخصت کے لئے حاضر ہوا، شیخ نے پھر کوئی ایسا فقرہ

---

[1] اس سفر کی تفصیلات اور اس کے فوائد و نتائج کی تفصیل "سوانح یوسفی" میں دیکھی جائے ص ۲۲۶-۱۳۲

فرمادیا کہ جس سے اندازہ ہوا کہ وہ میرا قیام چاہتے ہیں، میں نے پورا رمضان گذارنے کا فیصلہ کرلیا، میری صحت اور حالات کے لحاظ سے یہ بڑا مجاہدہ تھا کہ ان عالی ہمتوں کے ساتھ جو تقریباً ساری رات جاگتے اور مشغول رہتے، مجھ جیسے کم ہمت اور کمزور صحت کے آدمی کا رہنا آسان نہ تھا، خود حضرت شیخ روزانہ پورا قرآن مجید ختم کرتے تھے، اور شب کو ایک منٹ کے لئے نہیں سوتے تھے، مولانا یوسف صاحب کی بھی عبادت اور دعوت کی مشغولیت عام دنوں سے بہت بڑھی ہوئی تھی، اور پوری فضا پر بھی ذوق سایہ فگن تھا، مجھے مسلسل بے خوابی کی شکایت رہنے لگی جس سے حضرت شیخ کو بھی بڑی فکر ہوئی، اور مولانا یوسف صاحب نے بھی اس کو دور کرنے کی بڑی تدبیریں کیں، لیکن مجھے اس قیام سے بڑا فائدہ ہوا، خاص طور پر حضرت شیخ کے قرب اور خصوصی شفقت کی دولت حاصل ہوئی، اور میں نے ان کی قوت نسبت اور برکت صحبت کے وہ واقعات اور اثرات دیکھے جو کتابوں میں پڑھے اور بزرگوں کے حالات میں سنے تھے، عید نظام الدین میں کرکے شیخ اپنے معمول کے مطابق رائے پور تشریف لے گئے، اور مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئے، اور محبت واختصاص کے الفاظ کے ساتھ مجھے حضرت رائے پوری کی خدمت میں پیش کیا، حضرت سے پہلے ہی سے عقیدت ومناسبت تھی، اور ان کی شفقت خصوصی بھی اپنے حال پر پاتا تھا، لیکن اس حاضری کے بعد سے اس تعلق میں استحکام اور استقلال پیدا ہوگیا۔

انھیں قابل ذکر واقعات میں جولائی ۱۹۴۶ء کا حیدرآباد کا سفر ہے، جو مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی کی دعوت وتحریک پر پیش آیا تھا، اور جس کا مقصد والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "نزہۃ الخواطر" کی طباعت کے سلسلہ میں دائرۃ المعارف العثمانیہ (جس نے اس کتاب کی طباعت کا فیصلہ کیا تھا) کے ذمہ داروں کو یاد دہانی اور

تقاضا تھا، اس وقت پروفیسر الیاس برنی صاحب مرحوم دائرہ کے ناظم تھے، یہ میرا حیدرآباد کا پہلا سفر تھا، اور چونکہ تقسیم ہند اور پولیس ایکشن سے پہلے ہوا تھا، اس لئے میں نے اس مسلمان ریاست کی جس نے ایک حد تک مغلیہ سلطنت کی روایات قائم کر رکھی تھیں اور وہ عرصہ تک صاحب صلاحیت مسلمانوں کا ملجا وماویٰ رہ چکی تھی، اور ہندوستان کے بیشتر علمی واسلامی ادارے اس کی فیاضیوں سے بہرہ ور تھے، آخری بہار دیکھی، بہت سے اہل علم، اہل کمال سے ملاقات ہوئی، جن کے نام سنتا تھا، اور جن میں سے بہت سے "سیرت سید احمد شہیدؒ" کے ذریعہ مجھ سے غائبانہ واقف ہو چکے تھے، اس سفر کا سب سے بڑا تحفہ مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی (جن کا میں مہمان تھا) کی علمی مجالس اور پُر لطف معلومات افزا صحبتیں تھیں، افسوس ہے کہ ہمارے محترم مولانا عبد الباری صاحب ندوی سبکدوش اور وظیفہ یاب ہو کر لکھنؤ آچکے تھے، لیکن میں نے وہ مسجد (مسجد اقصیٰ) جس میں دونوں حضرات نماز پڑھتے تھے، اور ان کا مکان دیکھا۔

یہاں پر یہ لطیفہ قابل ذکر ہے کہ میں چونکہ دار العلوم سے اس وقت تنخواہ نہیں لیتا تھا، میرے پاس واجبی کپڑے تھے، اس سفر میں کوئی شیروانی بھی ساتھ نہیں تھی، شیروانی قدیم ریاست حیدرآباد میں شریف انسان کی وردی تھی، جس سے اس کے معیار کا اندازہ ہوتا تھا، بعض پروفیسر صاحبان سے ایک ہی دو بار ملنے سے اندازہ ہو گیا کہ شیروانی نہ ہونے کی وجہ سے وہ صحیح طریقہ پر ملتفت نہیں ہوئے، اس وقت ہمارے دار العلوم کے ایک پشاوری طالب علم مولوی محمد شریف حیدرآباد میں تھے، میں نے اس غرض کے لئے ان کی شیروانی مستعار لی، اس کے بعد میں نے دیکھا کہ نگاہیں بدل گئیں، اور لوگ کسی قدر احترام سے ملنے لگے۔

اس سفر میں برادر محترم نواب سید نجم الحسن خاں (فرزند خورد رضی الدولہ نواب سید نورالحسن خاں خلف الرشید نواب سید صدیق حسن خاں جن سے خاندانی تعلق وروابط کا ذکر اوپر آچکا ہے) سے ملاقات ہوئی، اور انھوں نے اپنی خصوصی محبت اور اخوت سے پرانے زمانہ کی یاد تازہ کردی، اس سفر میں قاری ابراہیم رشید مکی خطیب مکہ مسجد، اور سابق استاذ ندوۃ العلماء اور مولانا فضل اللہ صاحب رحمانی کے ساتھ نشست و برخاست رہی، اس سفر میں مولوی محمد اقبال ہوشیارپوری (جو اب صوفی اقبال کہلاتے ہیں، اور حضرت شیخ الحدیث کے مخصوص مجازین میں ہیں) ہمراہ تھے۔

ایک غلطی اور اس کا خمیازہ

والد صاحب کے انتقال کے بعد سے میں بھائی صاحب کے زیر شفقت اور دامن تلے اسی طرح رہا جیسے اولاد رہتی ہے، رائے بریلی میں تو اپنا گھر ہی تھا، لیکن لکھنؤ میں بھائی صاحب سے علیحدہ رہنے کا کوئی تصور نہ تھا، اسی مکان میں رہائش تھی جس میں والد صاحب نے مطب کیا، تصنیف و تالیف کی، ندوہ کا کام کیا اور وفات پائی، خود والد صاحب ہی کا کمرہ جو سڑک کی جانب تھا، میری رہائش گاہ تھا، پڑھنے لکھنے کے لئے اور خاص طور پر تحریر و تصنیف کے لئے یکسوئی اور تنہائی مطلوب ہوتی تو مسجد چلا جاتا جو مکان سے متصل تھی، فرض نمازوں کے اوقات کے علاوہ وہاں سناٹا رہتا، میرے اس وقت تک کے اہم مضامین و رسائل اسی مسجد میں جانب شمال وغرب کھڑکی کے سامنے بیٹھ کر لکھے گئے۔

۱۹۴۶ء کی ابتداء میں جب میں دارالعلوم سے ملازمت کا تعلق منقطع کرچکا تھا، اور اپنے شوق سے بعض درجوں میں کچھ اسباق پڑھا دیا کرتا تھا، معلوم نہیں کیا خیال پیدا ہوا کہ

دارالعلوم کی مسجد سے متصل جو چھوٹا سا مکان تعمیر ہوا تھا، اس میں میں نے بھائی صاحب سے ضابطہ کی اجازت لے کر رہنا شروع کر دیا، اور والدہ صاحبہ اور گھر والوں کو بھی لے آیا، اس وقت معاش کا کوئی ذریعہ نہ تھا، نہ کتابوں کے معاوضہ اور نفع کا کوئی سلسلہ، یہ سال اقتصادی طور پر سخت پریشانی کا گذرا، مجھے یاد ہے' ایک مرتبہ امین آباد کے چوراہے پر نظیر آباد جانے والی سڑک کے کنارہ کھڑے ہو کر میں نے جیب سے کئی مرتبہ گھڑی نکالی کہ اس کو کسی گھڑی کے دکان پر آدھے پونے دام پر بیچ دوں' اس سے کچھ دن کام چلے' لیکن پھر اس خیال سے ہمت نہیں ہوئی کہ دکان دار کہیں چوری کا نہ سمجھے' زیادہ قرض چڑھ گیا، اور دفتر دارالعلوم نے مطالبہ کیا تو اللہ مغفرت کرے مولوی ظہیر الحسن صاحب رئیس کاندھلہ (شہید ۱۹۴۷ء) کو خط لکھا اور ایک رقم قرض منگوائی، انھوں نے بڑے اہتمام سے اور بڑی عجلت کے ساتھ بھیجی' یہ پورا سال بڑی پریشانی میں گذرا اور سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ بے برکتی کیوں ہے۔؟

ایک روز معلوم ہوا کہ بھائی صاحب میرے اس علیحدہ قیام سے بہت مغموم اور متاثر ہیں' ان کو اس کا بڑا قلق ہے کہ ان کی زندگی میں میں نے لکھنؤ میں رہتے ہوئے علیحدہ قیام کا انتظام کیا، میں نے ان سے رو کر معافی مانگی اور جبکہ تقریباً ایک سال گذر رہا تھا، میں پھر اپنے اسی قدیم مکان میں آگیا، پھر یاد نہیں کبھی ایسی تنگی اور پریشانی پیش آئی ہو۔

مولانا احمد علی صاحبؒ کی خدمت میں حاضری

الحمدللہ کہ تبلیغی و تصنیفی و تدریسی مشغولیت' اور مرکز نظام الدین سے ربط اور حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور بزرگان دیوبند و سہارنپور اور رائے پور سے عقیدت کے باوجود حضرت مولانا احمد علی صاحب سے میرا روحانی ربط اور مراسلت

کا سلسلہ برابر جاری رہا، اور ان کو بھی میرے حال پر وہ شفقت اور نظر عنایت رہی جس کا اندازہ ان کے مکاتیب سے ہوتا ہے، ۱۹۴۶ء میں جب وہ سفر حج سے واپس آئے، تو میں نے تہنیت کا خط لکھا، مولانا نے اس کے جواب میں مجھے لاہور بلایا، میں ہشیار پور، جالندھر ٹھہرتا ہوا لاہور حاضر ہوا، مولانا نے ایک روز تنہائی میں مجھے اپنے سلسلۂ قادریہ میں اجازت مرحمت فرمائی اور اس کے لئے استخارہ اور دعا کا انھوں نے جو غیر معمولی اہتمام مسجد خیف منیٰ میں کیا تھا، اس کا ذکر فرمایا، الحمد للہ علی ذلک، مولاناؒ کی شفقتِ خاص اور اختصاص کا اندازہ، ایک مکتوب گرامی کی اس عبارت سے ہو سکتا ہے جس میں فرماتے ہیں "آپ کی ہر کامیابی سے میرے دل میں جتنا سرور اور فرحت حاصل ہوتی ہے، غالباً دنیا میں اور کوئی نہیں جس کو اس درجہ کی راحت حاصل ہو، میرا دل آپ کی ترقیٔ دارین کے لئے بارگاہ الٰہی میں ملتجی ہے۔"

پنجاب کے ایک عالم مولانا عبد الحنان صاحب (سابق امام اسٹریلیا بلڈنگ مسجد لاہور) کہتے تھے کہ ہم لوگ ملتان جیل میں تھے، مولانا شاہ عطاء اللہ بخاری اور دوسرے حضرات تشریف رکھتے تھے، بلا سابقہ تمہید و تقریب کے مولانا احمد علی صاحب نے ایک مجلس میں فرمایا کہ آپ لوگ مولوی ابوالحسن صاحب کے لئے دعا کیجئے، سب نے ہاتھ اٹھائے اور دعا کی۔

بَابُ دوازدہم

حج کے دو سفر

(۱۳۶۶ھ / ۱۹۴۷ء، ۱۳۶۹ھ / ۱۹۵۰ء)

سفر حجاز اور وہاں کے دعوتی کام کیلئے انتخاب

حجاز میں نظام الدین کی تبلیغی دعوت وطریق کار کا تعارف تو خود مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے سفر حجاز ۱۳۵۶ھ / ۱۹۳۸ء سے ہو گیا تھا، جس کی تفصیل راقم کی کتاب "حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت"[1] میں دیکھی جا سکتی ہے، مولانا کو اس کی بڑی آرزو تھی جو آخر وقت تک قائم رہی کہ "اگر ہندوستان کا کام کچھ جم جائے، تو آپ اپنے چند مخصوص رفقاء کے ساتھ اسلام کے اصل مرکز میں جا کر اس کام کی دعوت دیں، اور وہاں اس کو شروع کریں کہ یہ وہیں کی سوغات ہے، اور وہاں کے رہنے والے اس کے سب سے زیادہ مستحق ہیں، کہ "بضاعتنا ردت الینا" کہہ کر اس کا استقبال کریں، پھر ان کے ذریعہ سے یہ دولت عالم اسلام میں گھر گھر بٹے[2]"۔

مولانا کا یہ جذبہ اور تمنا دوسرے خصائص کی طرح ان کے فرزند و جانشین

---

[1] ملاحظہ ہو ص ۹۰-۹۵

[2] حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت ص ۹۱

مولانا محمد یوسف صاحب کی طرف منتقل ہوا، اور ۱۹۴۵ء ہی سے انھوں نے جماعت کے بعض خواص کو حجاز روانہ کیا، ۱۹۴۶ء میں مولانا عبید اللہ صاحب بلیاوی کو (جو مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے خاص تربیت یافتہ تھے) حجاز کے قیام اور وہاں کے کام پر متعین فرمادیا، انھوں نے وہاں بڑے سلیقہ، صبر و تحمل اور مجاہدہ کے ساتھ کام کیا، لیکن کام شروع ہونے کے ایک سال بعد تک وہ مہاجر اور ہندوستانی حجاج میں محدود رہا۔ مولانا عبید اللہ صاحب نے اپنے اخلاق و تواضع اور اہلِ دین و اہلِ علم کے اکرام، حرم و اہلِ حرم کے شایانِ شان احترام کی بناپر، عرب عوام کو کام سے روشناس اور ایک حد تک مانوس کر دیا تھا۔ لیکن حجاز کے تعلیم یافتہ طبقہ اور علمی حلقوں میں ابھی اس کام کو اس وقعت اور سنجیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا جس کا وہ مستحق تھا، اور اس کی وجہ یہ تھی، کہ ہر طبقہ کی ایک زبان، اس کی ذہنی سطح اور اس کے انس و مناسبت کے اسباب و اسالیب ہوتے ہیں، جن کو بڑے سے بڑے متوکل علی اللہ داعیوں اور مربّیوں نے بھی اپنے اپنے زمانہ میں نظر انداز نہیں کیا، اور سیدنا علی مرتضیٰ جیسے سرگروہ اہلِ ایمان و توکل نے فرمایا "کلّموا الناس علی قدر عقولھم أتریدون ان یکذّب اللہ ورسولہ؟" خود سیدنا عبد القادر جیلانیؒ جیسے عالم ربانی اور مقبول بارگاہ صمدانی نے اپنے خطبات میں وہ طاقتور اور دلوں پر بجلی کا اثر کرنے والی زبان استعمال فرمائی اور اپنے اس ادبی مطالعہ اور مہارت سے فائدہ اٹھایا، جو اس وقت بغداد کے معاشرہ و علمی حلقہ کے لئے ضروری تھی[1]

[1] حضرت شیخ کے اساتذہ میں امام ابوزکریا تبریزی کا نام بھی آتا ہے جو حماسہ کے مشہور شارح اور اپنے عہد کے مسلّم ادیب، لغوی اور نحوی ہیں۔

مولانا عبید اللہ صاحب نے اس حقیقت اور ضرورت کو محسوس کیا اور مولانا محمد یوسف صاحب کی خدمت میں پے درپے خطوط لکھے کہ یہاں ایک ایسی شخصیت کی ضرورت ہے جو اہلِ علم کے حلقہ میں موثر طریقہ سے اس دعوت کا تعارف کرا سکے اور جس کا اثر یہاں کے نوجوانوں اور اہلِ علم اور اہلِ ذوق پر پڑے، اور ان کی توجہ کا سبب بنے، اس کام کے لئے مولانا عبید اللہ صاحب نے بھی شاید میرا نام تجویز کیا کہ وہ میرے ادبی اشتغال کو جانتے تھے اور ۱۹۴۷ء کی ہونے والی ایشیائی کانفرنس میں پیش کئے جانے والے میرے مقالہ "الی ممثلی البلاد الاسلامیۃ" کا بھی ان کو علم تھا، مولانا محمدؒ یوسف صاحب تو اس سے اچھی طرح واقف تھے کہ میں عموماً انہیں کے بالائی کمرے میں قیام کرتا تھا اور ان سے علمی مذاکرہ اور گفتگو رہتی تھی، بلکہ خود مولانا محمدؒ الیاس صاحبؒ اور حضرت شیخ الحدیثؒ بھی میرے اس ذوق سے (جو مرض کی حد تک پہنچا ہوا تھا) واقف تھے، میری کتاب "مختارات" نکل چکی تھی اور مدارس میں بھی پہنچ چکی تھی، اس لئے قرعۂ فال میرے ہی نام پڑا، اور حضرت شیخ الحدیث کے مشورہ سے یہ طے پایا کہ میں حج و تبلیغ و دعوت کی نیّت سے حجاز کے لئے شدّ رحال کروں، میں نے اپنے ساتھ والدہ صاحبہ اور اہلیہ کو بھی لے جانے کا فیصلہ کیا، حضرت شیخ الحدیث نے اپنی خداداد بصیرت اور وسیع تجربہ کی بنا پر فیصلہ کیا کہ میرے ساتھ کوئی ایسا گھر کا فرد اور رفیق سفر ہونا چاہیئے جو مجھے خانگی انتظامات سے فارغ رکھے اور میرا ہاتھ بٹائے تاکہ میں زیادہ سے زیادہ وقت اور توجہ اس مقصد پر صرف کرسکوں، اس کے لئے میرے بڑے بھانجہ مولوی سیّد محمد ثانی حسنی کا انتخاب ہوا جو میرے دینی و علمی کاموں میں دست راست

اور قوّتِ بازو اور عزیز ترین فردِ خاندان ہونے کے علاوہ حضرت شیخ سے بیعت و تلمذ کا شرف رکھتے تھے اور تبلیغی کام سے ان کو نہ صرف مناسبت و واقفیت تھی بلکہ مولانا محمد یوسف صاحب کے خاص دوروں میں ان کی شرکت اور ان کا قرب حاصل رہتا تھا، اس مختصر قافلہ میں ایک اور عزیز ہستی کا اضافہ ہوا وہ میری ہمشیرہ سیدہ امۃ اللہ (عرف عائشہ بی) مصنفہ "زادِ سفر"[1] کی ذات تھی۔

یوں تو ہر مسلمان کو حج کی تمنّا اور شوق ہوتا ہے، لیکن سیرت کے مطالعہ اور شغف، حدیث کے درس اور عربی زبان کے ناتے مجھے خصوصی تمنّا اور آرزو تھی، یاد ہے کہ اکثر امین آباد سے تیزی کے ساتھ اسٹیشن کی طرف جاتے ہوئے تانگوں کو دیکھ کر کبھی کبھی دل میں ارمان اُٹھتا تھا کہ کیا کوئی ایسا دن بھی آئے گا جب ہم بھی حج کے لئے اسٹیشن جارہے ہوں گے، آخر وقت آگیا ع

دن گنے جاتے تھے جس دن کے لئے

اس وقت غالباً دوسری جنگِ عظیم کے بعد حج کا راستہ کھلے ایک ہی سال ہوا تھا، اس لئے پرمٹ حاصل کرنا پڑتا تھا جو مل گیا تھا، بندرگاہ کے انتخاب کی آزادی تھی، خواہ بمبئی سے جایا جائے، خواہ کراچی سے۔ کہ ابھی تقسیم نہیں ہوئی تھی اور فاصلہ کے علاوہ دونوں شہر سیاسی و انتظامی حیثیت سے ایک ہی تھے اتفاق کہ بمبئی میں کسی سے ایسی شناسائی اور تعلقات نہیں تھے جو اس کے انتخاب کے محرک ہوں، کچھ ہی دن پہلے نظام الدّین میں حاجی عبد الجبّار صاحب دہلوی سے

[1] یہ امام نووی کی مشہور و مقبول کتاب "ریاض الصّالحین" کا مقبول ترجمہ ہے جس کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں اور جدّہ ریڈیو اسٹیشن سے کئی بار نشر ہوا ہے۔

تعارف ہوا تھا جو کراچی کے بڑے تجّار میں سے تھے، ان کی وجہ سے کراچی کا انتخاب کیا گیا، ۲۶ر جون ۱۹۴۷ء کو لکھنؤ سے روانگی ہوئی، لاہور کے اسٹیشن پر کئی گھنٹے ٹھہر کر کراچی کے لئے گاڑی بدلی، فرقہ وارانہ فسادات اس وقت شباب پر تھے (کہ تقسیمِ ملک میں مشکل سے ایک ہی مہینہ باقی تھا) اس لئے لاہور میں ہوتے ہوئے بھی حضرت مولانا احمد علی صاحب کی خدمت میں حاضر نہ ہوسکے، کراچی گیارہ دن قیام رہا، اور حاجی عبد الجبّار صاحب اور ان کے برادر محترم حاجی عبد الستّار صاحب اور ان کے صاحبزادوں اور ان کے گھر والوں نے میزبانی اور مہمان نوازی میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔

حجاز کا سفر اور حرمین شریفین کا قیام

غالباً ۱۹ر شعبان ۱۳۶۶ھ (۹ر جولائی ۱۹۴۷ء) کو کراچی سے مغل لائن کے اسلامی جہاز سے جدّہ روانگی ہوئی، محترمی محمّد شفیع صاحب قریشی کی تاکید و اصرار سے (جو قریبی زمانہ میں حج کو گئے تھے) دو ٹکٹ فرسٹ کلاس کے خرید لئے جس کی وجہ سے ایک پورے کیبن کی سہولتیں ہم کو حاصل ہوگئیں، ہمارے کیبن سے متصل ہی برطانوی قنصل جنرل متعیّن جدّہ، شاہجہاں امیر کبیر (برادر بزرگ مسٹر ہمایوں کبیر سابق وزیر تعلیم ہند) کا کیبن تھا، ان سے تعارف میر غلام علی تالپور وزیر سندھ کی ایک دعوت میں ہوگیا تھا، اس سفر میں میں نے اپنی ضعیف والدہ اور ان کے ہمراہیوں اور خدّام کے لئے راحت و آرام کے غیبی انتظامات اور تیسیر و تسہیل کے ایسے واقعات دیکھے جو اللہ تعالیٰ کے لطفِ خاص کا نتیجہ معلوم ہوتے تھے، فرسٹ کلاس کے کیبنوں کے قریب لائبریری ہال میں خواتین کا

اجتماع ہونے لگا اس میں ایک مرتبہ ہمشیرہ صاحبہ نے جن کے قلم سے "ریاض الصالحین"
کا ترجمہ "زادِ سفر" کے نام سے نکل چکا تھا کوئی مضمون پڑھ کر سنایا اس سے حج کو
جانے والی خواتین و مستورات کے حلقہ میں ان کو عقیدت و احترام کی نظر سے
دیکھا جانے لگا، ہمارے کیبن سے ملے ہوئے کیبن میں بمبئی کے ایک بڑے میمن
تاجر (جو کھلونوں کی تجارت کے بادشاہ سمجھے جاتے تھے) حاجی احمد صاحب
اپنے خاندان کے ساتھ سفر کر رہے تھے، ان کے پورے گھر کو بالخصوص ان کی
اہلیہ اور والدہ صاحبہ کو ہمشیرہ سے ایسا ربط و تعلق پیدا ہو گیا، کہ وہ ہر وقت ان کی
خدمت اور دل بستگی کی فکر میں رہتی تھیں، اس خاندان کے کراچی منتقل ہو جانے
کے بعد تک سالہا سال یہ رابطہ باقی رہا۔

ہم لوگ ۲۹ رشعبان ۱۳۶۶ھ (۱۹ر جولائی ۱۹۴۷ء) کو جدّہ پہنچے، اس وقت
جدہ کی بندرگاہ پر قدم رکھتے ہی وہ سرور و کیف حاصل ہوا، جو بہت سے خوش نصیبوں
کو حرمین شریفین میں حاصل ہوتا ہے، والدہ صاحبہ کی تو قلبی کیفیت و مسرّت کا
عجیب حال تھا، ابھی چونکہ حج کے ایّام بہت دور تھے، اور پورے تین مہینے باقی
تھے، اس لئے ہم نے یہ درمیانی مدّت مدینہ طیّبہ میں گزارنے کا فیصلہ کر لیا تھا،
اس میں حضرت شیخ الحدیث کے ایما، و ذوق کو بھی دخل تھا، ہم نے رمضان المبارک کا
چاند جدّہ ہی میں دیکھا، اور دو روزے بھی وہاں رکھے، یاد آتا ہے کہ میں اور عزیزی محمد ثانی چاند
رات کو سحری کا سامان لینے بازار کی طرف گئے، ایک خوانچہ والا ایک خاص لہجہ میں آواز دے رہا
تھا "تمر تمر یا صائم، تمر تمر یا صائم" اس وقت اندازہ ہوا کہ بعض اہلِ دل پر شوق انگیز اشعار سننے
پر کیسے وجد و حال کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی دوسرا روزہ تھا کہ عین تراویح کے درمیان (جو میں ہی ایک

کھلے میدان میں پڑھا رہا تھا) مدینہ لے جانے والی بس آ گئی، ہم لوگ اپنے ہمراہیوں (مراد آباد و میوات کے تبلیغی حجّاج) کے ہمراہ روانہ ہو گئے، ایک روز اور دو راتوں کے اس سفر اور راستہ کے ذوق و شوق اور کیف و مسرّت کو الفاظ میں نہیں ادا کیا جا سکتا، کچھ اندازہ راقم کے مضمون "اپنے گھر سے بیت اللہ تک"[1] اور مضمون "حضور و سرور"[2] سے ہو سکتا ہے، یا ان خطوط سے جو حضرت شیخ کو لکھے گئے اور جن کے سننے سے حضرت شیخ کی رمضان المبارک میں وہ کیفیت ہوئی کہ جسم ایک ایک بالشت اچھلتا اور رقّت و جوش روئیں روئیں سے ابلتا تھا، گرمی کا رمضان تھا لُو زوروں پر چل رہی تھی، منھ میں روزہ، دل میں جوش، آنکھوں میں آنسو، زبان پر درود و شوقیہ و نعتیہ اشعار، بقول اقبال ؎

چہ خوش صحرا کہ در وے کاروانہا — درودے خواند و محمل براند
بہ ریگِ گرم او آور سجودے — جبیں را سوز تا داغے بماند

امیرِ کارواں آں اعجمی کیست — سرود او بآہنگِ عرب نیست
زند آں نغمہ کز سیرابئ او — خنک دل در بیابانے تواں زیست

یہاں پر اردو کے صرف دو شعر لکھے جاتے ہیں، جو بے اختیار زبان پر جاری ہو گئے تھے ؎

بادِ نسیم آج بہت مشکبار ہے — شاید ہوا کے رُخ پہ کھلی زلفِ یار ہے

---

[1] یہ مضمون مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کی مشہور و مقبول کتاب "آپ حج کیسے کریں؟" میں شامل ہے

[2] مضمون شاملِ کتاب "کاروانِ مدینہ" صفحہ ۱۳۷

وہ ایک بار ادھر سے گئے مگر اب تک   ہوائے رحمتِ پروردگار آتی ہے

مدینہ طیبہ کے قیام کے دنوں کا کیا ذکر کیا جائے کہ ع

ہر روز روزِ عید ہے، ہر شب شبِ برات

جگہ بھی بالکل مسجد نبویؐ کے زیر سایہ ملی، اور ع گدا بسایۂ دیوارِ شہ خفت است، کا خیالی مضمون حقیقت بن گیا۔

مولانا مدنیؒ نے اپنے بھتیجے مولانا سیّد حبیب صاحب کے نام ایک تعارفی خط لکھدیا تھا، جس کے حوالہ کرنے کی نوبت نہیں آئی، مولانا کے برادر خورد (اور بذاتِ خود بزرگ) مولانا سیّد محمود احمد صاحب نے بڑی خصوصیت برتی اور مدرسہ شرعیہ کا ایک پورا مکان ہم لوگوں کے حوالے کر دیا جو مسجد سے چند قدم پر تھا حرمین شریفین میں دونوں جگہ، اور حجاز کے اس طویل قیام میں حضرت شیخ کی اصابت رائے اور دور اندیشی کا تجربہ ہوا، کہ عزیزی محمد ثانی حسنی کی رفاقت نے مجھے بالکل فارغ البال کر دیا، وہ پانچوں وقت مستورات کو مسجد لے جاتے، جہاں وہ مستورات کے حصّہ میں نماز ادا کرتیں، اور مواجہ شریف پر صلوٰۃ وسلام پڑھواتے باب جبریل سے چند قدم پر قبلہ کی دیوار کے بالکل زیر سایہ شیخ الاسلام عارف حکمت بے کا مشہور کتب خانہ ہے مخطوطات و نوادر کا بہت بڑا مخزن سمجھا جاتا ہے، اس کے مہتمم ایک ترکی النسل فاضل شیخ ابراہیم خربتلی تھے، جو کچھ عرصہ پہلے ہندوستان آئے تھے اور ندوہ اور دار المصنّفین میں چند دن قیام کیا تھا، بھائی صاحب، سیّد صاحب اور مولانا مسعود علی صاحب سے اچھے مراسم ہو گئے تھے، انھوں نے ایک دن ہمارے پورے قافلہ کی دعوت کی، فرمایا کہ یہ کتب خانہ جس مکان میں ہے، یہ مکان آپ کے

جدِّ امجد سید حسن مثنیٰ ابن سبط اکبر سیدنا حسن ابن علی کا مکان ہے اور یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے، آپ ایک رات یہاں رہیئے، ہم لوگوں نے یہ کریمانہ پیش کش قبول کی، والدہ صاحبہ اور ان کے ہمراہی زنان خانہ میں رہے، مجھے اور محمّد ثانی کو چھت پر جگہ ملی، اس کے اور گنبدِ خضرا کے درمیان چند گز کا فاصلہ تھا، ہم گنہگاروں اور دُور افتادوں کے لئے اتنا قرب بھی غنیمت نہیں بلکہ نعمت تھا۔ ع

چہ مبارک سحرے بود چہ فرخندہ شبے

ایک رات مولانا سیّد محمود صاحب کے اس مکان میں گزری جو اُحد کی شہادت گاہ سے متّصل تھا، وہاں سیدنا حمزہؓ کے مرقد مبارک کے قریب ترکوں کی بنائی ہوئی جو مسجد[1] تھی، وہاں میں نے "زادالمعاد" کے اس حصّہ کی تلخیص کی جو واقعہ اُحد سے متعلق تھا، میں بولتا تھا اور محمّد ثانی لکھتے تھے۔

۲۰ ذی قعدہ کو یہ قافلہ حج قران کا احرام باندھ کر مکہ معظمہ روانہ ہوا، پہلی مرتبہ بیت اللہ شریف پر نظر پڑنے اور بابُ السّلام سے حرم میں قدم رکھنے کی جو کیفیت ہوئی (بالخصوص ہمشیرہ مرحومہ کی) اس کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جس کو وہاں کی حاضری نصیب ہوئی ہو، ایّام حج تک قیام محلہ شامیہ رباط ٹونک میں رہا، جس کا حرم شریف سے خاصا فاصلہ ہے، اور اونچا زینہ طے کر کے وہاں آنا جانا پڑتا تھا، والدہ صاحبہ ضعیف تھیں لیکن قوّتِ ایمانی اور ذوق و شوق پیری میں جوانی کی طاقت پیدا کر دیتے ہیں، عزیزی محمّد ثانی ان سب کو پانچوں وقت حرم شریف لے جاتے، طواف کراتے، میں دعوتی کاموں کی مصروفیت و ملاقاتوں میں رہتا۔ ۱۴ ذی الحجہ کو منیٰ سے واپسی پر بس والے نے مکّہ معظّمہ کے حدود شروع ہوتے ہی اس قافلہ کو اُتار دیا، معلوم نہیں کس طرح والدہ صاحبہ وہاں سے

[1] اب وہ مسجد وہاں سے ختم کر دی گئی ہے

پیدل رباط ٹونک تک گئیں، زینہ طے کیا، اتر کر حرم شریف گئیں

اللہ تعالیٰ نے یہ مشکل اس طرح آسان کی کہ ایک حیدر آبادی دوست مولوی قربان محی الدین جو ۱۳۴۹ھ (۱۹۳۰ء) میں پریشان حال ہو کر لکھنؤ پہنچے تھے، اور بھائی صاحب نے ان کو گھر ٹھہرا لیا تھا، اور ان کی مدد کے خیال سے ان کو نقل و کتابت کا کچھ کام سپرد کر دیا تھا، رباط آئے اور اصرار کر کے ہم لوگوں کو مدرسہ فخریہ عثمانیہ کی پرانی عمارت میں جو عین باب ابراہیم پر تھی اور جس کے وہ مہتمم یا نائب مہتمم تھے، لے آئے اور کتب خانہ جس حال میں تھا وہ ہمارے سپرد کر دیا، اس سے متصل ایک کمرہ تھا جو باورچی خانہ بن گیا، اب بالکل گویا ہم حرم شریف ہی میں تھے حرم کی صفیں (حجاج کی کثرت کی وجہ سے) اس کی دیوار سے آکر اس طرح مل جاتی تھیں کہ اوپر متصلاً جماعت کے ساتھ نماز پڑھی جا سکتی تھی، غرض حج کے بعد قیام کی طویل مدت جو تین مہینے سے کم نہیں تھی، گویا حرم میں گذری، اور وہیں سے جنوری ۱۹۴۸ء میں ہندوستان کے لئے روانگی ہوئی، بجائے کراچی کے بھائی صاحب کی ہدایت پر بمبئی اترنا پڑا، کہ کراچی سے ٹرین سے ہندوستان کا سفر ممکن نہ تھا، بمبئی سے بھی مسلح پولیس کی رفاقت میں سفر طے ہوا، جو اس زمانہ میں ریل پر چلا کرتی تھی۔

رسالہ "إلى ممثلي البلاد الإسلامية"

کسی داعی کے لئے جو کسی نئے ملک اور ماحول میں دعوت کا کام شروع کرے دو چیزوں میں سے ایک چیز کی سخت ضرورت ہے:

۱۔ خاندانی تعارف، اس کے ماضی، تاریخ اور اسلاف سے وہاں کے لوگوں کی واقفیت، اور اعتبار و احترام، بعض اہل نظر کے نزدیک اسی وجہ سے انبیاء اپنی قوم اور ملک کے معروف و محترم

خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

۲۔ شخصی وجاہت اور اثر جس کی بنا پر اس کی بات توجہ سے سنی جائے اور دل ودماغ اس کا اثر قبول کریں، اس کے عام اسباب ہیں جسمانی وجاہت، خطابت وزورِ بیان، وفورِ علم ہیں۔

جہاں تک پہلی چیز کا تعلق ہے وہ الحمد للہ ہندوستان میں تو حاصل تھی لیکن حجاز مقدّس میں، میں نو وارد اور اجنبی اور خاندان غیر معروف تھا (اس وقت تک والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات بالخصوص "نزہتہ الخواطر" طبع نہیں ہوئی تھی) دوسری چیز میں بھی میں کم مایہ اور قلیل البضاعۃ تھا، اس لئے بڑی شدت سے اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ میری کوئی عربی تصنیف یا رسالہ اس سفر میں ساتھ ہوتا جو تعارف کا کام دیتا، اور توجہ سے بات سننے اور مخاطبین کے دل میں وقعت واعتبار پیدا کرنے کے لئے راہ ہموار کرتا، میں نے پوری کوشش کی کہ میرا مقالہ "الی ممثلی البلاد الاسلامیہ" جو ایشیائی کانفرنس دہلی کے عرب مندوبین کے لئے تیار کیا گیا تھا اور جس میں طاقتور ادبی اسلوب میں داعی کے بلند مقام سے خطاب کیا گیا تھا (میرا اندازہ تھا کہ وہ ضرور مؤثر ہوگا) میری روانگی سے پہلے چھپ جائے اس کو لے کر جاؤں، وہ لطیفی پریس دہلی میں چھپنے کے لئے دیا گیا تھا، لیکن دوڑ دھوپ کے باوجود روانگی تک نہیں مل سکا تھا، خدا کا شکر ہے کہ عین روانگی سے ایک دن پہلے اس کا ایک پیکٹ ڈاک سے کراچی پہنچا اور اس کو ساتھ لے جانے کا موقع مل گیا۔ اس رسالہ نے الحمد للہ راستہ ہی سے اپنا کام کرنا شروع کر دیا، جہاز تھوڑی دیر کے لئے خلاف معمول کامران ٹھہرا، اور عرب پولیس اور مقامی عہدیدار جہاز پر آئے، ان کے ذریعہ سے وہ مقالہ شہر کے قاضی صاحب

اور بعض ممتاز علماء کو بھیجا گیا۔

حجاز میں اس وقت تک دعوتی لٹریچر بہت کم پہنچا تھا، جس میں دل کے ساز چھیڑنے اور دماغ کو متاثر کرنے کی یکساں صلاحیت ہو، یا تو خالص کلامی (مسئلۂ صفات وغیرہ) اور فقہی مباحث پر قدیم علمی زبان میں مضامین، کتابچے اور بحثیں ملتی تھیں، جن سے وہاں کے نوجوان، اہل فکر اور اہلِ ذوق اکتا چکے تھے، یا ادبائے مصر کے خالص ادبی، تنقیدی اور تجدّد و مغربیت کی دعوت دینے والے یا دل کو بہلانے والے مضامین اور کتابیں اور مجلّات و رسائل تھے "الیٰ ممثّلی البلاد الإسلامیۃ" نے جو ایک مقالہ یا ایک رسالہ ہی تھا، ایک نمونہ پیش کیا جس میں داعی کے بلند مقام سے خطاب کیا گیا تھا، اس میں قلب کی حرارت بھی تھی، روح کا کرب بھی، انقلاب کی دعوت بھی، درخشاں مستقبل کی پیشین گوئی بھی اور جو احساسِ کمتری، مایوسی، مغرب کے اقتدار اور حکمراں تہذیب کی مرعوبیت کے ہر شائبہ سے پاک تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس حلقہ نے جو پہلے دونوں طرزِ فکر اور طرزِ نگارش سے اُکتا چکا تھا، اور عالمِ عربی کی بالخصوص اور عالمِ اسلامی کی بالعموم موجودہ صورتِ حال سے غیر مطمئن تھا، اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا، اپنے حلقۂ احباب اور مجلسوں میں سنایا اور اپنے تعلّق والوں کو اس کے پڑھنے کا مشورہ دیا۔ مجھے یاد ہے کہ مسجد نبویؐ کے ایک ممتاز استاذ حدیث اور نجدی عالم شیخ محمد علی الحرکان نے جو ابو داؤد یا مسلم شریف کا درس دیتے تھے، ایک دن درس روک کر اپنے حلقۂ درس میں اس رسالہ کو خود پڑھ کر سنایا، بعد میں وہ جدّہ کے قاضی، پھر وزیر العدل (وزیر قانون و انصاف) اور اب رابطۂ عالم اسلامی کے سکریٹری جنرل ہیں[1]، اسی طرح ایک ترک عالم شیخ عثمان ساعاتی نے جو ذریعۂ معاش

[1] افسوس ہے کہ ۷ رمضان المبارک ۱۴۰۳ھ کو ان کا انتقال ہو گیا، غفر اللہ لہٗ

کے طور پر گھڑیوں کا کام کرتے تھے، اور مدینہ منوّرہ میں قرآن مجید کا درس دیتے تھے اور ترکوں میں بڑے مقبول و محترم تھے، اس کی بڑی پذیرائی کی اور بڑے تاثّر کا اظہار کیا۔

قیامِ حجاز کی مختصر رُوداد

حجاز کے بابرکت قیام، جس کی مدّت چھ مہینے کی قریب تھی اور وہاں کے مبارک شغل، دعوتی کام کی مفصّل روداد نہ یہاں لکھنی مقصود ہے، نہ اس کی گنجائش ہے اس کی کسی قدر تفصیل عزیزی مولوی محمد ثانی مرحوم کی کتاب "سوانح حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ" میں دیکھی جاسکتی ہے[1]۔ خلاصہ یہ ہے کہ تقریباً ۳؍رمضان سے ۲۰؍ذی قعدہ تک مدینہ طیّبہ میں قیام رہا، مدینہ طیّبہ میں تراویح کے بعد علماء کے حلقوں میں اور جمعہ کے بعد مدرسہ شرعیہ کے ایک ہال میں، اور شہر کے مضافات و عیون میں اجتماعات، تقریریں اور تبلیغی کام ہوتا، آخر ذی القعدہ میں مکّہ معظّمہ حاضری ہوئی، یہاں کے کبار علماء سے بڑا ربط پیدا ہوا، جن میں علامہ سید علوی مالکی، شیخ امین کتبی، شیخ حسن مشّاط، شیخ ابن عربی، شیخ محمود شوبل اور شیخ عبدالرّزاق حمزہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، اس وقت حجاز کے نوجوان، ادیب، اہل قلم اور صحافی علماء کے حلقہ سے دور اور خالص دینی تحریک و دعوت سے جتنے متوحّش تھے، اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ میں نے ایک مرتبہ وہاں کے ایک بڑے ادیب اور ایک ادبی مجلّہ کے مدیر سے جو ایک دینی مدرسہ کے فارغ بھی تھے، ہندوستان کے دعوتی کام کا تعارف

---

[1] از ص ۴۲۶ تا ص ۴۳۲

اور اس کے اثرات کا ذکر چھیڑا تو انھوں نے برجستہ کہا کہ "یا شیخ خلّ الـدّین للحرم" مولوی صاحب دین کی باتیں تو حرم شریف کے لئے چھوڑ دیئے، یہ بتائیے کہ تقسیم ملک میں مسلمانوں نے کیا دھوکا کھایا اور ان کی موجودہ صورتِ حال کے کیا اسباب ہیں ۔؟

مکہ معظمہ کے طویل قیام کا ایک بڑا ثمرہ شیخ عمر بن الحسن آل الشیخ سے تعارف اور ان کے انس و اعتماد کا حصول ہے جو دعوت و جماعت کے حق میں بہت مفید ثابت ہوا، وہ شیخ محمد بن عبدالوہاب کی اولاد میں تھے، قاضی القضاۃ اور شیخ الاسلام مملکت سعودیہ شیخ عبداللہ بن الحسن (جو مملکت کی سب سے بڑی دینی شخصیت تھے) کے وہ حقیقی بھائی اور ریاض کی ہیئت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے رئیس تھے، وہ ولی عہد مملکت امیر سعود کے بڑے معتمد اور مشیر تھے، اور ان کو من جانب اللہ مجھ سے ایک خاص تعلق پیدا ہوگیا، میرے رسائل پڑھتے اور پڑھوا کر سنتے، ان کے اس تعلّق اور اعتماد نے، ان لوگوں کی باتوں کو بے اثر بنا دیا (جو مختلف اسباب کی بنا پر) جماعت کے بارے میں بدگمانی اور شکوک پیدا کرتے تھے اور مختلف افواہیں اڑاتے تھے، شیخ عمر کو اس بارے میں اتنا اطمینان پیدا ہوگیا، کہ انھوں نے کھُل کر جماعت کی حمایت اور بارہا اس کی طرف سے مدافعت کی، ظاہری اسباب کے لحاظ سے اگر شیخ عُمر کا یہ طرزِ عمل نہ ہوتا تو شاید جماعت کے لئے آزادی سے وہاں کام کرنے کا اس وقت موقعہ جاتا رہتا۔ ان کا یہ تعلق ان کے آخر عمر تک قائم رہا اور وہ ایک عزیزانہ اور بزرگانہ تعلق میں تبدیل ہوگیا، جس کا اندازہ ان پُرمحبت خطوط سے ہوسکتا ہے جو مرقّع خطوط میں محفوظ ہیں، وللہ جنود السّمٰوات والارض ط

"رسالہ بین الجبایۃ والھدایۃ"

- قیام حجاز کی طویل مدّت میں اندازہ ہوگیا کہ ملک اور یہاں کا معاشرہ

کس طرف جارہا ہے، کس طرح ایک ایسے ترقی پذیر، مرفہ الحال تیزی سے بدلنے والے مُلک اور مصر و شام و عراق جیسے آزادی پسند اور مغربی ممالک کے پیچھے چلنے والے ممالک کے نقشِ قدم پر چل رہا ہے، جس کے لئے کوئی دینی و اخلاقی "وازع" (بریک لگانے والی طاقت) نہیں، اور یہ سب اس کا نتیجہ ہے کہ مملکت نے اس تحریک و دعوت کو فراموش کرنا شروع کردیا ہے جس کے نام اور جس کے فیض سے اس کا وجود عمل میں آیا اور ایک ناممکن بات ممکن ہوگئی، اب اس نے طریق ہدایت کے بجائے طریقۂ جبایت (تحصیل وصول اور مالیات) پر چلنا شروع کردیا ہے اور اس راہ کے اختیار کرنے کے تمام فطری و منطقی نتائج، دولت ستانی استحصال، غیر ہمدردانہ اور غیر ذمہ دارانہ روش اور ایمان داری کی کمی کے آثار شروع ہوگئے ہیں۔

میرے قیام کے آخری دن تھے بلکہ شاید آخری دن تھا کہ طبیعت میں اس کا شدید تقاضا پیدا ہوا کہ میں ان حقائق کو ایک خط کی شکل میں ظاہر کروں اور شیخ عمر بن الحسن سے درخواست کروں کہ وہ ولی عہد مملکت امیر سعود کو پڑھ کر سنا دیں، جو مملکت کے سربراہ اور مستقبل کے قائد بننے والے ہیں، میں نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے اس تاریخی اور بلیغ و حکیم جملہ کو جو انھوں نے اپنے ایک گورنر کو لکھا تھا، جس نے یہ شکایت کی تھی کہ نئے مفتوح ممالک میں لوگوں کے کثرت سے اسلام قبول کرنے کی وجہ سے مملکت کے خزانہ و مالیہ پر اثر پڑ رہا ہے، کیونکہ شرعاً و قانوناً ان سے جزیہ نہیں لیا جاسکتا، جو حکومت کی آمدنی و مالیہ کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، سیّدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس کو لکھا "ویحك ان محمداً صلّی اللہ علیہ وسلّم بعث هادیا ولم یبعث جابیا" اللہ کے بندے! محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم "ہادی" بنا کر

مبعوث کئے گئے "تحصیلدار" بناکر (تحصیل وصول ٹیکسوں اور آمدنی بڑھانے کے لئے) مبعوث نہیں ہوئے تھے، میں اس پر راضی ہوں کہ سب لوگ مسلمان ہو جائیں اور خزانہ خالی ہو جائے اور لوگوں کو معیشت کے دوسرے اسباب اختیار کرنے پڑیں، پھر میں نے دونوں طرزِ حکومت کے مزاج، طریقِ فکر، طرزِ عمل اقدار و معیار کا فرق بتایا اور دونوں کے نتائج دکھائے اور مناسب طریقہ پر اشارہ کیا کہ اب حکومت "طریقۂ جبایت" پر گامزن ہو گئی ہے اور یہ ایک بڑے خطرہ کی نشانی ہے، پھر مسلمانوں کو اس مملکت سے جو توقعات ہیں ان کا ذکر کیا۔ اور حکومت ہدایت کے برکات اور اس کے ساتھ اللہ کی نصرت اور مسلمانوں کی محبت و مقبولیت کا ذکر کیا، یہ خط میں نے کچھ قیام گاہ پر، کچھ مکہ معظمہ و جدّہ کے درمیان بس پر اور کچھ بندرگاہ پر جہاز کے انتظار میں جو وقت ملا اس میں لکھا اور وہیں مولانا عبید اللہ صاحب کے حوالے کیا، انھوں نے شیخ عمر بن الحسن تک پہنچا دیا، بعد میں ان کے ایک گرامی نامہ سے معلوم ہوا کہ انھوں نے امیر سعود کو پڑھ کر سنایا، کاش! کہ اس خط کا کوئی عملی نتیجہ نکلتا، اور اسی وقت سے راستہ کی تبدیلی کی کوشش کی جاتی تو آج نہ صرف مملکت سعودیہ بلکہ عالم عربی اور عالم اسلامی کی صورت حال بہت مختلف ہوتی۔[1]

تقسیم ملک اور اس کے اثرات

ہم لوگ حجاز ہی میں تھے اور مدینہ طیبہ میں رمضان اپنی پوری برکتوں اور مدنی خصوصیات کے ساتھ گزر رہا تھا، کہ رمضان ہی میں (۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو) ہندوستان کی تقسیم اور ہندوستان

[1] یہ خط تھوڑی لفظی ترمیم کے ساتھ "بین الجبایۃ والھدایۃ" کے عنوان سے الگ رسالہ کی شکل میں شائع ہوا، پھر راقم کے مجموعۂ مضامین "إلی الإسلام من جدید" کا جزء بنا دیا گیا۔

و پاکستان دو جمہوریتوں کے قیام کا اعلان ہوا، اور یہاں وہ قیامتِ صغریٰ قائم ہوئی جس کی خبریں اخبارات و خطوط کے ذریعہ (قدرے تاخیر اور قدرتاً اختصار کے ساتھ) ہم لوگوں تک پہنچتی رہیں، جیساکہ اوپر کے صفحات سے معلوم ہوا ہوگا، عملی سیاست سے کنارہ کش ہونے کے باوجود میرا اور پورے گھرانہ بلکہ پوری جماعت کا رجحان جمعیۃ العلماء اور مجلس احرار کی طرف تھا اور ہم تقسیم کو ملک کے لئے مضر سمجھتے تھے، تقسیم سے پہلے اس مسلک کے علماء اور قائدین، بالخصوص مولانا مدنیؒ کے ساتھ تحریکِ پاکستان کے پُرجوش حامیوں نے جو غیر شریفانہ اور غیر انسانی برتاؤ کیا تھا اس سے ہم لوگوں کے دل مجروح تھے اور اس کو مسلمانوں کے لئے ہم شگون نیک نہیں سمجھتے تھے، لیکن اس کے ساتھ اکثریت کی تنگ نظری تنگ دلی اور ان مسلمانوں کے ساتھ جو ان کے ساتھ زندگی کے مختلف میدانوں میں کام کرتے تھے متعصبانہ اور تنگ دلانہ برتاؤ بھی ہم کو معلوم تھا، اس لئے ہم بھی اس گروہ کی نفسیات، طریقِ فکر اور طرزِ عمل کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے تھے جو اس سے بیزار اور مایوس ہوکر اور ایک نفسیاتی ردِّ عمل کے طور پر، ایک آزاد مسلمان ملک اور آزاد حکومت کا خواہش مند تھا اور اس کی ضرورت سمجھتا تھا جہاں وہ اپنی صلاحیتوں اور محنتوں کے مطابق عزّت و اعتبار کی زندگی گزار سکے اور اس چھوٹے سے گروہ کے ساتھ بھی انصاف کرتے تھے، جو ایک ایسے خطۂ زمین کے آرزومند تھے اور اس کی ضرورت کے قائل تھے، جہاں وہ آزاد اور باافتدار اسلامی زندگی کا تجربہ کرسکیں اور اسلامی نظام اور شریعت کے احکام کی افادیت اور برتری ثابت کرسکیں[۱]۔ یہ اتفاق کی بات تھی کہ ہم لوگ جس دن لکھنؤ پہنچے اسی دن (۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء) گاندھی جی کے قتل کا واقعہ پیش آیا جس سے دفعتاً (خواہ وقتی طور پر) پورے ملک کی

---

[۱] افسوس ہے کہ پاکستان کے قیام کی طویل تر مدت میں اس کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی اور اس وعدہ اور شرط کو پورا نہیں کیا گیا جو ان سب قربانیوں اور خساروں کا جواز تھا جو ہندوستان کی ملتِ اسلامیہ نے برداشت کئے تھے۔ "وَلَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ أَمْرًا"

فضا بدل گئی اور مسلمانوں کے لئے دلوں میں ایک نرم گوشہ پیدا ہو گیا، کم سے کم وہ جوش واشتعال ختم ہو گیا جس نے غور و فکر کی صلاحیت اور انسانیت و ہموطنی کے احترام کو بالکل دبا رکھا تھا ـــــــ وَلِلّٰہِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰاتِ وَالْاَرْضِ۔

مسلمانوں کے احساس کمتری و مایوسی کا مقابلہ اور نئے حالات میں کام کرنے کے لئے "نشانِ راہ"

جنوری ۱۹۴۸ء کی آخری تاریخوں میں ہندوستان واپس ہوا تو یہاں کی دنیا ہی بدلی ہوئی تھی، جو مسلمان ہندوستان میں باقی رہ گئے تھے (اور ان کی بڑی تعداد تھی) وہ (اِلَّا ماشاء اللہ) احساس کہتری اور مایوسی کا شکار تھے، ان کے قومی قائد، ان کو بے یار و مددگار چھوڑ کر چلے گئے تھے، اپنے پیغام و دعوت اور اپنی ضرورت و افادیت کی انقلاب انگیز اور ناممکن کو ممکن بنا دینے والی اس طاقت سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے جو ان میں بحیثیت صاحبِ دعوت و صاحبِ کردار ملت کے ودیعت تھی، ان کو ہندوستان میں کوئی روشنی نظر نہیں آتی تھی اور وہ ایک تحیّر کے عالم میں تھے۔

دوسری طرف غیر مسلم اکثریت کے دانشور اور زیادہ تر وہ لوگ جو حکومت کے اونچے عہدوں اور وزارتوں پر سرفراز تھے، ان کو ایسے مشفقانہ اور دانشورانہ طریقہ پر مشورہ دیتے تھے جیسے اس ملک کے سارے مسلمان طفلِ مکتب ہیں، کبھی ان کے ملی تشخصات اور جداگانہ تہذیب کا مذاق اڑاتے تھے، کبھی باہر کی طرف دیکھنے پر (جس میں ان کا دینی مرکز اور ان کی ہدایت و انسانیت کا سرچشمہ مکہ و مدینہ بھی ہے) چیں بہ جبیں ہوتے، کبھی اردو کے لئے ہندی رسم الخط اختیار کرنے کا مشورہ دیتے، کبھی اس بات پر اظہار تعجب کرتے کہ ہندوستان کے مسلمان، قدیم ہندوستان کی قابل فخر نامور شخصیتوں (پوروج) پر

فخر اور ان سے اپنا انتساب نہیں کرتے، اور ان کے نام پر اپنے بچوں کے اس طرح نام نہیں رکھتے، جیسے ہندوستان اور ایران کے مسلمان قدیم ایران و عرب کی تاریخی شخصیتوں کے نام (رستم و سہراب و حاتم طائی) پر بلا تکلف اپنے بچوں کے نام رکھتے ہیں، کبھی زمزم کے متبرک پانی اور کھجور سے (جو عرب کا میوہ ہے) روزہ افطار کرنے کو مسنون و افضل سمجھنے پر طنز کرتے اور کہتے کہ مسلمانوں کا یہ معاملہ یہاں کے مقدس دریاؤں کے پانی اور یہاں کی زمین میں پیدا ہونے والے لذیذ پھلوں کے ساتھ کیوں نہیں ہے؟

معتدل اور پُر سکون حالات میں تو اس طرح کے مشورے اور اعتراضات کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتے اور علمی و فکری طور پر ان کا ٹھنڈا جواب دیا جا سکتا تھا، لیکن جس ذہنی و نفسیاتی کیفیت سے اس وقت کے مسلمان دوچار تھے اس میں یہ اعتراضات و طنزیات زخم پر نمک چھڑکنے کے مرادف تھے اس "کارِ خیر" میں ہمارے صوبہ اترپردیش کے دو ذمہ دار بزرگ بابو پرشوتم داس ٹنڈن (صدر مجلس قانون ساز اترپردیش) اور سمپورنانند جی (اس وقت کے وزیر تعلیم اور بعد کے وزیر اعلیٰ) پیش پیش تھے[1] میں نے ان دونوں کے جواب میں صاف اور دوٹوک انداز میں مضامین لکھے جو ہفت روزہ "تعمیر" اور ماہنامہ "الفرقان" میں اسی زمانہ میں شائع ہوئے، ایک ایسی فضا میں کہ کسی ملت پر معنوی و ذہنی محاذ سے حملے ہو رہے ہوں اور اس میں جواب دینے کی بھی پوری جرأت نہ ہو، اس طرح کے مضامین و خطابات افادیت و تاثیر سے خالی نہیں، ایک تاریخی حقیقت کے طور پر اس کا بھی اظہار و اعتراف ضروری ہے کہ اس زمانہ میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سہاروی مرحوم (ناظم عمومی جمعیۃ علمائے ہند) کی تقریروں، جرأت مندانہ موقف اور اکثریت کے لیڈروں اور وزیروں سے آنکھوں سے آنکھیں ملا کر بات کرنا بھی بڑا مفید ثابت ہوا، اس لئے کہ انھوں نے اور ان کے رفقاء اور بزرگوں نے کانگریس کا ساتھ دے کر اپنے فرقہ کی جو ناراضگی مول لی تھی اور اس کی جو قیمت ادا کی تھی اس سے کانگریس کے بڑے

---

[1] ۱۹۶۱ء میں وہ قومی یک جہتی کمیٹی کے چیئرمین بھی رہے۔

بڑے لیڈروں کا جیب و دامن خالی تھا۔

ہندوستان واپس آنے کے بعد رمضان ۱۳۶۷ھ (جولائی، اگست ۱۹۴۸ء) میں طبیعت پر سخت تقاضا غالب آیا کہ عید کے بعد ہی مختلف مکاتب خیال کے دردمندوں کا ایک اجتماع بلایا جائے اور اس کے سامنے ملک اور مسلمانوں کے موجودہ حالات میں اپنے خیالات اور تجاویز کو رکھا جائے، یہ تقاضا ایسا غالب آیا کہ اس کو ٹالنا مشکل ہو گیا اور عید کے چاند کی طرح اس دن کا انتظار ہونے لگا، جب دل کا یہ درد' درد آشنا کے سامنے رکھا جا سکے گا' عید ہوتے ہی ایسے مسلمان دانش وروں' مختلف اداروں اور مکاتب خیال کے ذمہ داروں کے نام دعوت نامے بھیجے کہ ۲۰ر شوّال ۱۳۶۷ھ (۲۶ر اگست ۱۹۴۸ء) کو لکھنؤ آنے کی زحمت گوارا فرمائیں اور دار العلوم ندوۃ العلماء میں منعقد ہونے والے ایک ملّی مشاورتی اجتماع میں شرکت کریں، الحمدللہ خاصی تعداد میں مدعو حضرات تشریف لائے' اور میں نے تمہیدی طور پر ان کے سامنے اپنا وہ مضمون پڑھا جو میں نے عید کے بعد ہی اس اجتماع کے لئے درد و تاثر کی ایک خاص حالت میں لکھا تھا جو بعد میں "نشانِ راہ" کے عنوان سے کئی جگہ سے شائع ہوا[1]

اس مضمون میں پہلے ماضی کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے، اور ان تحریکوں کا مختصر تعارف کرایا گیا جو مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ کے لئے ماضی قریب میں پیدا ہوئیں ساتھ ہی مسلمانوں کی اس قوّتِ مدافعت اور ملّی غیرت پر بھی روشنی ڈالی گئی جس نے

---

[1] یہ رسالہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ سے منگوایا جا سکتا ہے۔

انگریزوں کے دور کے اثرات کا مقابلہ کیا، ساتھ ہی ساتھ آزادیٔ ہند اور اس سے پہلے کے دور کے بنیادی فرق کو بھی نمایاں کیا گیا، پھر نئے دور کے خطرناک پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا، اور ان نزاکتوں اور پیچیدگیوں کی نشان دہی کی گئی (جن کو قومی حکومت کا یہ دور اپنے جلو میں لئے ہوئے تھا) اسی کے ساتھ حالات کے روشن پہلوؤں کو بھی نمایاں کیا گیا' اور امّت کی داعیانہ و قائدانہ حیثیت سے پردہ اٹھایا گیا اور بتایا گیا کہ یہ طاقت آج بھی معجزے دکھا سکتی ہے، آخر میں طریقِ کار بتایا گیا، اس سلسلہ میں مخلوط مجمعوں میں حکیمانہ طرز پر خطاب' ہندی اور انگریزی میں دعوتی و تعارفی لٹریچر کی تیاری، ساتھ ہی ساتھ عمومی دعوت و تبلیغ (جس میں عرصہ سے عملی شرکت تھی) کی ضرورت و افادیت بتائی گئی اور ساتھ ہی ساتھ آزاد اسلامی درس گاہوں کی ضرورت کی طرف بھی توجّہ دلائی گئی۔ آخر میں حرفِ آخر کے طور پر مضمون کو اس پیغام پر ختم کیا گیا:

"حضرات! ان غیبی امدادوں اور قدرتی انتظامات کے ساتھ جو اسلام کی دعوت کے لئے راستہ صاف کر رہے ہیں' اور ایک صاحبِ دعوت اور صاحبِ عزم و ایمان جماعت کے مستقبل کو درخشاں سے درخشاں تر بنا رہے ہیں، مستقبل سے ہراس، یا اللہ کی رحمت سے یاس کی کوئی گنجائش نہیں معلوم ہوتی، پھر جو مجمع اس وقت سامنے ہے اس کو دیکھ کر یہ باور نہیں آتا کہ جس ملک میں اتنے صاحبِ فہم و فراست اور صاحبِ حمیّت مسلمان بھی ہوں' اس سے اسلام مٹ سکتا ہے جب کبھی ایک مردِ خدا نے مومن کے یقین کے ساتھ کہہ دیا کہ:

"أينقص الدين و انا حي" کیا میری زندگی میں، دین میں قطع و برید ہو سکتی ہے"؟) تو فوراً زمانہ کے تیور بدل گئے'' اور ارتداد کی طرف بڑھتا ہوا دھارا فتح روم و شام اور عالمگیر اشاعتِ اسلام کی طرف پلٹ پڑا ہے، اگر مخلصین کی ایک جماعت اب بھی صدّیقیت کے ادنیٰ پرتو کے ساتھ کہہ اُٹھے کہ کیا ہمارے جیتے جی ہندوستان سے دین مٹ سکتا ہے؟ تو یقین مانئے کہ ہرگز نہیں مٹ سکتا، بلکہ اس کی کامیابی، استحکام و اشاعت کے لئے وہ نئی نئی راہیں کھلیں گی جو کسی کے وہم و گمان میں نہیں:

فَلَا تَهِنُوا وَتَدْعُوٓا	سو تم بودے نہ ہوئے جاؤ
إِلَى السَّلْمِ ۖ وَأَنْتُمُ	اور پکارنے لگو صلح، اور تم ہی
الْأَعْلَوْنَ ۖ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ	رہو گے اُوپر، اور اللہ تمہارے
وَلَنْ يَّتِرَكُمْ أَعْمَالَكُمْ ۝	ساتھ ہے اور ہرگز نقصان نہ دے گا
(سورۂ محمدؐ- ۳۵)	تم کو، تمہارے کاموں میں۔

اس اجتماع کی ایک نشست صبح ہوئی جس میں حضرت جگر مرادآبادی بھی تشریف رکھتے تھے، سہ پہر کو جب اس کی دوسری نشست ندوۃ العلماء کی مسجد میں ہوئی تو جگر صاحب نے فرمائش کی کہ صبح کا مقالہ دوبارہ پڑھا جائے، میں نے ان کی فرمائش کی تعمیل کی، ہندی و انگریزی لٹریچر تیار کرنے کے لئے سرمایہ کا سوال تھا، جگر صاحب نے سبقت کی اور ایک ہزار روپیہ کی رقم اپنی طرف سے پیش کی، تھوڑا بہت سرمایہ اور جمع ہوا اور ایک

مجلس اشاعت قائم ہوئی اور میرے مضامین کا ہندی اور انگریزی میں ترجمہ ہوا، ہندی ترجمہ کا کچھ کام مولوی عابد علی صاحب بلہوری نے کیا اور انگریزی ترجمہ کا کچھ کام جناب مظہر الدّین صاحب صدّیقی نے انجام دیا، جو ہمارے قریبی ضلع بارہ بنکی کے مردم خیز قصبہ فتحپور کے رہنے والے اور حیدرآباد میں امورِ خارجہ کے شعبہ میں انڈر سکریٹری کے عہدہ پر فائز تھے اور پولیس ایکشن کے بعد اپنے وطن آگئے تھے[۱] ہندی رسائل کی طبع کے بعد بڑا مسئلہ ان کی اشاعت کا تھا۔ برادرانِ وطن (خاص طور پر اس زمانہ میں) مسلمانوں کے کسی ادارہ کی طرف سے شائع کی ہوئی کتابوں کو بہت کم ہاتھ لگاتے تھے، مسلمانوں میں نہ ان کا مارکیٹ تھا اور نہ ضرورت کا احساس، نتیجہ یہ ہوا کہ مطبوعہ رسائل کا ایک بڑا ذخیرہ کچہری روڈ کے تبلیغی مرکز میں جہاں میرا قیام تھا، جمع ہو گیا۔

خیال آیا کہ مسلمانوں کو اس کی طرف توجّہ دلائی جائے کہ وہ خرید کر اپنی طرف سے اپنے ہندو دوستوں کو اور دفاتر و تعلیم گاہوں میں ساتھ کام کرنے والوں کو تحفہ کے طور پر پیش کریں تو اس سے محنت کی قیمت وصول ہو جائے گی، میں نے اردو کے متعدّد اخبارات و رسائل میں اس کا اعلان کیا اور اس کی طرف توجہ دلائی، حیرت کی بات ہے کہ اس کی طلبی کے لئے صرف ایک خط آیا جس میں یہ کام کرنے کی ہامی بھری گئی تھی، اس خط پر لکھنے والے کا نام ڈاکٹر محمد عبد الجلیل فریدی تھا، جن سے ابھی تک کوئی خاص تعلق پیدا نہیں ہوا تھا، میں ان کو صرف اس حیثیت سے جانتا تھا کہ وہ شہر کے ایک کامیاب مسلمان ڈاکٹر ہیں، بعد میں خیال آیا کہ اس کا ایک مستقل شعبہ قائم کیا جائے، اس کے لئے اچھے ذی علم اور مقصد سے اتفاق رکھنے والے رفیق اور ذمّہ دار کی ضرورت تھی، اس موقعہ پر مولانا اسحٰق صاحب ندوی سندیلوی نے جو ۱۹۴۳ء سے دار العلوم ندوۃ العلماء میں تدریسی فرائض انجام دے رہے تھے

---

[۱] موصوف پاکستان میں بقیدِ حیات ہیں اور انگریزی کے اچھّے لکھنے والے ہیں۔

آمادگی ظاہر کی۔ ۱۶ جون ۱۹۴۹ء سے انھوں نے دارالعلوم سے استعفا دیکر اس کام کی ذمہ داری قبول کر لی اس زمانہ میں جے پور میں کانگریس کا سیشن ہوا، مولانا دعوتی رسائل کو وہاں بھی لے گئے، ۳۰ مئی ۱۹۵۰ء تقریباً پورے سال ان کا اس کام سے تعلق رہا لیکن مجلس کو نہ تو کوئی موزوں جگہ شہر میں مل سکی جہاں کوئی دارالمطالعہ کھولا جا سکے، نہ تعلیم یافتہ مسلمانوں نے اس کام کی شایان شان ہمت افزائی کی، نتیجہ یہ ہوا کہ اس اقدام کے خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہوئے، لیکن اس کی اہمیت وافادیت اور شدید ضرورت کے بارے میں نہ اس وقت تردد تھا اور نہ اب کوئی شک وشبہ ہے۔

حجاز سے آنے کے بعد میں نے وہاں کے علماء اور ان احباب اور بزرگوں سے جن سے تعلقات پیدا ہو گئے تھے، مراسلت کا سلسلہ جاری رکھا، یہ ان عرب حضرات علماء اور ادیبوں اور اہل قلم کی نسلی خصوصیت اور طبعی شرافت تھی (جس کا مجھے بار بار تجربہ ہوا) کہ انھوں نے اس تعلق کو جس کی مدت قلیل تھی برابر قائم رکھا اور خط لکھتے رہے[1]۔ حجاز کی پاک سرزمین میں دعوت وفکر کے جو نئے بیج ڈالے گئے تھے ان کو باقی رکھنے اور ان کی آبیاری کے لئے ۱۹۴۹ء میں بھائی صاحب کی تجویز اور ان کی دلچسپی اور تعاون سے دو نوجوان ندوی فاضلوں کا حجاز کے طویل قیام کرنے کے لئے انتخاب ہوا، جو ان اشخاص اور اداروں سے رابطہ قائم رکھیں، جن سے ۱۹۴۷ء میں تعارف ہوا تھا اور ہمارے دعوتی رسائل اہل علم اور اہل فکر تک پہنچاتے رہیں، جو حجاز سے واپسی پر تیار کئے تھے۔ یہ دو نوجوان مولوی محمد معین اللہ ندوی[2] اور مولوی عبدالرشید ندوی تھے، انھوں نے خوش اسلوبی اور سرگرمی کے ساتھ یہ کام انجام دیا اور اس دھاگہ کو ٹوٹنے نہیں دیا جو دعوتی اور فکری ہم آہنگی کے رشتہ سے ایک کم حیثیت اور گمنام داعی اور حجاز ونجد کی باوقار شخصیتوں کے درمیان قائم ہو گیا تھا۔

---

[1] یہ خطوط جو علم وادب کا بھی اچھا سرمایہ ہے، ذاتی مرقع خطوط کی زینت ہیں۔
[2] حال نائب ناظم ندوۃ العلماء ہیں۔

لکھنؤ کی بعض اہم تقریریں اور ان کے عربی تراجم

اس عرصہ میں لکھنؤ میں متعدد اہم اور وسیع تبلیغی اجتماعات ہوئے جن میں قدرتاً میں نے خطاب کیا، ان اجتماعات میں بعض اہم تقریریں ہوئیں، ان میں سب سے اہم تقریر وہ تھی جو میں نے ۱۱ دسمبر ۴۹ء کے جلسہ میں "صورت و حقیقت" کے عنوان سے کی جس میں مثالوں کی مدد اور روزمرہ کے تجربوں کی روشنی میں بتایا گیا کہ صورت اور حقیقت میں بڑا فرق ہے. چھوٹی سی چھوٹی حقیقت نے بڑی سے بڑی صورت پر فتح پائی ہے، اور صدر اول کی تاریخ سے حقیقت اسلام کی فتح و تسخیر کے محیّر العقول واقعات پیش کئے گئے، بتایا گیا کہ صورت اسلام مسلمانوں کی حفاظت کے لئے کافی نہیں، رحمت و نصرت اور تائید الٰہی کے وعدے اور لوگوں کا احترام، خوف و لحاظ حقیقت سے متعلق ہے، نہ کہ صورت، دعوے اور تاریخ سے، واقعہ یہ ہے کہ حقیقت اسلام مدّت سے میدان میں آئی ہی نہیں، اس وقت امت کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ مسلمانوں کو حقیقتِ اسلام سے متّصف اور آراستہ کیا جائے اس میں آج بھی طاقت ہے اور آج بھی اس سے معجزات و خوارق کا ظہور ہو سکتا ہے ؎

آج بھی ہو جو براہیمؑ کا ایماں پیدا آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا

اس تقریر کا ترجمہ برادر زادہ عزیز محمد الحسنی نے کیا جن کی عمر اس وقت تیرہ ۱۳ سال سے زائد نہ تھی، ترجمہ میں تقریر کی طلاقت و طاقت پورے طور پر موجود ہے اور اس سے ہونہار بچّہ کی فطری صلاحیت اور وہبی تحریری طاقت کی پیشین گوئی کی جا سکتی تھی اور اندازہ ہو سکتا تھا کہ وہ مستقبل قریب میں عربی کا ایک طاقتور مضمون نگار اور داعی ہوگا، ان کی کوئی باضابطہ تعلیم نہیں ہوئی تھی اور ایک دن بھی انھوں نے درجہ کا طالب علم بن کر کسی مدرسہ میں نہیں پڑھا تھا، بھائی صاحب نے ان کو صرف و نحو کی کسی کتاب کے بغیر براہ راست قرآن مجید اور عربی زبان کی تعلیم دی تھی، البتّہ انھوں نے بڑے شغف اور عقیدت کے ساتھ میرے مضامین اور عربی کتابوں کا مطالعہ کیا تھا اور ان کے اسلوب کو

جذب کرلیا تھا یہ ترجمہ "بین الصّورۃ والحقیقۃ" کے نام سے مطبع قیمہ (بمبئی) سے شائع ہوا اور میں جب ۱۹۵۰ء میں حجاز گیا (جس کا تذکرہ آگے آئے گا) تو یہ رسالہ سب سے زیادہ ذوق شوق سے پڑھا گیا، مجلسوں میں سنایا گیا، بعض عرب فضلا نے اس کو اتنے بار پڑھا کہ تقریباً ان کو حفظ ہو گیا[۱]

اس رسالہ کے علاوہ عربی کے دو رسالے "بین الانسانیۃ وأصد قائھا" ("آنکھوں کی سوئیاں") "الی شاطی النجاۃ" (ترجمہ "خطرناک تکبر") جو علی الترتیب عزیزان محمد رابع ندوی و مولوی عبداللہ عباس ندوی کے قلم سے نکلے، عربی ٹائپ میں شائع ہوئے، اس طرح میرا عربی کے ذریعہ عالم عربی سے دعوتی ربط قائم ہوا۔

عربوں میں دعوت کا جذبہ

حجاز سے ۱۹۴۸ء میں واپس ہوا تو عربوں کو ان کی زبان میں اسلام کی طرف بازگشت کی دعوت اور عالم اسلام ہی میں نہیں انسانی دنیا میں داعیانہ و قائدانہ کردار ادا کرنے اور اپنا قدیم منصب سنبھالنے کی دعوت دل و دماغ پر چھا گئی اور اعصاب پر اس طرح مستولی اور حاوی ہو گئی کہ اسی کو اپنی زندگی کا مقصد و موضوع بنا لینے کا خیال آنے لگا، میرے اس جوش و جذبہ کا کچھ اندازہ اس خط سے ہو سکتا ہے جو میں نے اپنے عزیز و محترم دوست مولانا مسعود عالم صاحب ندوی کو ۶ر شوال ۱۳۶۸ھ (۲ر اگست ۱۹۴۹ء) کو اس وقت لکھا جب وہ عراق میں تھے اس کا ایک اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے:

"دین کی تخم ریزی کے لئے اس کشت ویراں میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھئے، حجت تمام کر دیجئے دن رات ایک کر دیجئے، دل کو جلائیے اور بدن کو گھلائیے، خون دیدہ اور خون جگر بہائیے اور اس طرح بہائیے کہ دجلہ و فرات اپنی تنگ ظرفی اور کم مایگی پر ماتم کریں، ایک ایک کا گریباں تھام کر کہئے کہ اے صحرائے عرب کے بھٹکے ہوئے آہو! اے عالم کی آبرو! اے ابراھیمؑ و

---

[۱] مضمون شیخ اسماعیل سعد بن العتیق رسالہ "الدعوۃ" ریاض ماہ ربیع الثانی ۱۴۰۳ھ

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آرزو تو کہاں گم ہے؟ کیا سیدنا عمرؓ کی دعائے نیم شبی اور آہ سحر گاہی مثنیٰ بن حارثہؓ کے خون شہادت، ابو عبید الثقفیؓ کی پامالی اور استخوان شکنی، سعد بن ابی وقاصؓ کی علم برداری، علی بن ابی طالبؓ کی جگر سوزی، اشک ریزی اور خطابت و تاثیر کی طوفان خیزی آبروئے شہیداں، جگر گوشۂ رسولؐ کی تشنگی اور خاندانِ رسالت کے خون کی ارزانی، ابو حنیفہؒ کی دماغ سوزی، احمد بن حنبلؒ کی تعزیر جرم عشق، ابن جوزیؒ کی حمایت سنت، عبد القادر جیلانیؒ کی درد مندی کا حاصل صرف یہ ہے کہ تو ائمۂ ضلالت کا ادنیٰ غاشیہ بردار اور اس کی راہ کا غبار ہے، عراق کے اس مقبرہ میں صور پھونک دیجئے، اور شورِ قیامت برپا کیجئے کہ

گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا۔"

ندوۃ العلماء کی رکنیت اور معتمدی

۱۹۴۸ء کے وسط میں میرا بحیثیت رکن مجلس انتظامی اور مجلس دار العلوم انتخاب ہوا، جنوری ۱۹۴۹ء میں مولانا سید سلیمان ندویؒ (معتمد دار العلوم) کی تحریک پر مجھے نائب معتمد بنایا گیا، ۱۹۵۴ء میں جلسۂ انتظامیہ نے (مولانا سید سلیمان ندویؒ کی وفات کے بعد) معتمد کی حیثیت سے انتخاب کیا۔

حضرت رائے پوریؒ سے ربط و تعلق اور آمد و رفت

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کے درجے اللہ تعالیٰ بلند فرمائے کہ وہ مجھے برابر حضرت مولانا عبد القادر صاحب رائے پوریؒ سے ربط بڑھانے اور استفادہ کرنے کی تاکید فرماتے رہے[1] اور لکھتے رہے کہ "اب یہی ایک دکان رہ گئی ہے جس سے اخلاص، تعلق باللہ اور تربیتِ نفس کا سودا ملتا ہے اور وہاں اس کے سوا کسی اور چیز کا ذکر فکر نہیں"، تقسیم کے بعد سے پاکستان جانے اور اپنے قدیم مرکز روحانی سے تعلق پیدا کرنے کی راہ میں جو دشواریاں پیدا ہو گئی تھیں، انھوں نے اور بھی اس کی

[1] شیخ الحدیث کی سوانح، مصنفہ راقم، ص ۲۱۵ - ۲۱۶

ضرورت پیدا کردی کہ دل کی انگیٹھی کو گرم رکھنے، نفس و اخلاق کی کمزوریوں پر مطلع ہونے اور جس سفر کا میں مسافر[1] تھا اس کے لئے زادِ سفر لیتے رہنے کے لئے ایک ایسی ہی جگہ اور ایسی ہی شخصیت کی ضرورت تھی جہاں یہ جنس ملتی ہو، رائے پور جا کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ مادّیت و عقلیت کے بحرِ ظلمات میں جو چاروں طرف پھیلا ہوا ہے، یہی ایک جزیرہ ہے جہاں ذکر و فکر کے علاوہ کوئی موضوعِ گفتگو اور مشغلۂ زندگی نہیں، اور جہاں پتہ پتہ سے اللہ اللہ کی آواز آتی ہے، باطنی کمالات کا ادراک نہ اس وقت تھا نہ اس وقت، لیکن حضرت کی تین خصوصیتوں نے خاص طور پر متاثر کیا، ایک فنائیت و بے نفسی جس کی نظیر کم سے کم میں نے نہیں دیکھی "وفوق کل ذی علم علیم" دوسرے ذہن کی وسعت اور حقیقت پسندی جو بڑے بڑے میدانی کام کرنے والے اور زمانہ کے سرد و گرم چشیدہ علماء اور سیاسی قائدین میں بھی (اس درجہ کی) نہ دیکھی، خاص طبعی ساخت، اور اس وسیع و متنوع مطالعہ اور ماحول نے جس میں اپنا ذہنی نشو و نما اور پرداخت ہوئی تھی، اس تعلق اور رابطہ میں اور مدد کی، جو روز بروز بڑھتا گیا، کہ اس وسیع النظری، وسیع القلبی کے بغیر ہم جیسے آدمیوں کا گزارہ نہیں ہو سکتا۔

تیسری خصوصیت حضرت کی بے پایاں شفقت تھی، جس کے لئے شفقتِ مادری سے بڑھ کر کوئی تشبیہ نہیں ہو سکتی، اس کی بعض مثالیں آئندہ صفحات میں آئیں گی[2]، حضرت کے ایک سفر لکھنؤ، رائے بریلی (۱۹۴۶ء) کا ذکر اوپر آچکا ہے، اس آمد کے علاوہ حضرت کے لکھنؤ کے چھ سفر اور ہوئے[3]۔ حضرت نے اپنے سفر لکھنؤ کے موقع پر جو اپریل ۱۹۴۸ء میں ہوا تھا، ۲۶ اپریل ۱۹۴۸ء کو ہمارے وطن دائرہ شاہ علم اللہؒ رائے بریلی کو دوبارہ شرف بخشا، وہیں ایک روز بے سان گمان حضرت شاہ علم اللہؒ اور سید صاحبؒ کی مسجد سے باہر نکلتے ہوئے مجھ سے فرمایا۔ "میں آپ کو چار دن

---

[1] دعوت و تصنیف
[2] اس اجمال کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "سوانح مولانا عبدالقادر رائے پوری" خاص طور پر اس کا باب "باطنی کیفیات و نمایاں خصوصیات"
[3] تفصیل ملاحظہ ہو، سوانح ص ۱۶۲ - ۱۷۰،

سلسلوں بالخصوص حضرت سیّد صاحبؒ کے سلسلہ میں اجازت دیتا ہوں"۔ حضرت کا پہلے دو سفروں میں قیام دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مہمان خانہ میں اور بعد کے تین سفروں میں شہر کے تبلیغی مرکز واقع کچہری روڈ میں رہا (جہاں میرا اور مولانا محمد منظور صاحب کا قیام تھا) حضرت حقیقتاً ہماری ہی دعوت پر لکھنؤ کرم فرماتے رہے، پھر مختصر مختصر وقفوں کے بعد میں بھی رائے پور حاضر ہوتا رہتا تھا، اس نے اس روحانی ارتباط کو اور قوی و مستحکم بنا دیا اور حضرت کی شفقت و عنایت میں برابر اضافہ ہوتا رہا،

حج کا دوسرا سفر ۱۳۶۹ھ ۱۹۵۰ء

۱۳۶۸ھ (۱۹۴۹ء) کا واقعہ ہے کہ حضرت رائے پوریؒ دہلی کے محلہ قصاب پورہ مدرسہ سبحانیہ میں مقیم تھے میں بھی حاضر خدمت تھا، اسی زمانہ میں ایک قابل احترام شخصیت کی طرف سے مجھے حج کے موقعہ پر دوبارہ حجاز جانے کی پیش کش کی گئی اور اس کی تیاری کرنے کے لئے کہا گیا، میں صبح کی ہوا خوری میں حضرت کے ساتھ تھا، میں نے حضرت سے اس کا ذکر کیا اور حضرت کا ایماء معلوم کرنا چاہا، حضرت نے فرمایا کہ اگر میں روک دوں تو طبیعت پر کوئی اثر تو نہیں پڑے گا؟ میں نے کہا نہیں! حضرت نے میرے چہرہ کی طرف دیکھا، الحمد للہ اس پر کوئی اثر نہ تھا، بات آئی گئی ہو گئی۔

۱۰ شوال ۱۳۶۹ھ (۲۷ جولائی ۱۹۵۰ء) کو میں رائے پور کے ارادہ سے لکھنؤ سے سہارنپور گیا، وہاں رائے پور جانے والی بس پر سوار ہو گیا، راستہ میں رائے پور سے آنے والی موٹر کار سے کراس ہوا، دیکھا تو حضرت تشریف رکھتے ہیں، حضرت نے مجھے اپنے ساتھ بٹھا لیا، فرمایا کہ ہم حج کو جا رہے ہیں میں نے تم کو خط لکھوایا تھا کہ تم بھی ساتھ کے لئے تیار ہو جاؤ۔ سہارنپور پہنچ کر قانونی مراحل، ٹیکہ، انجکشن کی جیسے اپنے لئے تکمیل فرمائی، ویسے میرے لئے بھی، میرے لئے اس سفر کے مصارف کا انتظام دشوار تھا، اس مشکل کو حضرت شیخ الحدیث نے اس طرح حل کیا کہ اپنی مرحومہ صاحبزادی (اہلیہ مولوی احمد حسن کاندھلوی) کا حج بدل کے لئے میرا انتخاب فرمایا، جن کا قریب ہی زمانہ میں انتقال

ہوا تھا، اور مصارف سفر کا انتظام کر دیا، سفر کے دوران غالباً جہاز پر یا حجاز میں کسی موقعہ پر فرمایا کہ یہ سفر میں نے تمہارے لئے کیا ہے، حضرت کے کہنے پر سفر کے التواء اور طبیعت میں ناگواری نہ پیدا ہونے کا یہ انعام تھا، شیوخ کاملین کی طرف سے اس طرح کے امتحان لئے جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہوا کہ ایسے موقعہ پر طبیعت میں اطاعت و انقیاد اور اپنی خواہش و رجحان پر شیخ کی خواہش اور رجحان کو ترجیح دینے کی توفیق و ہمت ہوئی۔

اس مبارک سفر کی تفصیلات حضرت کی سوانح میں آچکی ہیں[1] یہاں مختصراً چند ضروری باتیں لکھی جاتی ہیں:

۲۰؍ ذی قعدہ ۱۳۶۹ھ (۴؍ ستمبر ۱۹۵۰ء) کو حضرت کی ہمرکابی میں بمبئی سے اسلامی جہاز سے روانگی ہوئی، اس سفر میں چار عزیز اس نیت سے ساتھ تھے کہ حج کے بعد حجاز میں عربوں میں دعوتی کام کے لئے ٹھہر جائیں گے اور دونوں سابق ندوی فضلاء (مولوی محمد معین اللہ صاحب اور مولوی عبدالرشید صاحب) کے ساتھ خواص کے طبقہ اور تعلیم یافتہ حضرات میں ہندوستان کے تبلیغی کام کے تعارف اور ہمارے دعوتی عربی رسائل کی اشاعت کا فرض انجام دیں گے یہ مولوی عبداللہ صاحب ندوی[2]، مولوی سید رضوان علی ندوی[3]، مولوی سید محمد طاہر مظاہری منصورپوری[4] خواہرزادۂ عزیز مولوی محمد رابع ندوی[5] تھے، جہاز خلاف معمول مکلا حجاج کو لینے کے لئے کچھ دیر ٹھہرا شہر سے جو افسران جہاز پر آئے، میں نے ان کو اپنے عربی رسائل، وہاں کے قاضی صاحب اور ممتاز شخصیتوں کے لئے دیئے، ابھی جہاز روانہ نہیں ہوا تھا کہ کچھ سپاہی وہاں سے ایک خط، جس پر

---

[1] ملاحظہ ہو ص ۱۷۶ تا ص ۱۸۲

[2] ڈاکٹر عبداللہ عبّاس ندوی، حال استاذ جامعہ ام القریٰ مکہ مکرّمہ

[3] ڈاکٹر سید رضوان علی حال استاذ جامعۃ الامام محمد بن سعود ریاض

[4] حال مددگار ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

[5] حال استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ و وکیل کلیۃ اللغۃ العربیۃ دارالعلوم

ان حضرات کی مہریں بھی تھیں لے کر آئے، جن میں تاثر و تشکر کا اظہار تھا۔

حج سے فراغت کے بعد جس کی تفصیل سوانح میں آچکی ہے، ایک واقعہ خصوصیت سے قابل ذکر ہے کہ کلید بردار خانہ کعبہ عالی مرتبت ـــــ شیبی صاحب نے از خود مجھے بیت اللہ شریف کے داخلہ کی دعوت دی اور اس کی اجازت دی کہ میں جن لوگوں اور ہمراہیوں کو ساتھ لانا چاہوں ان کو بھی اجازت ہے، میں اس کو حضرت ہی کی ایک کرامت سمجھتا ہوں کہ نہ اس سے پہلے اس کا موقعہ آیا تھا اور نہ اس کے بعد بار بار حاضری کے باوجود یہ شرف حاصل ہوا۔

اس موقعہ پر نہ صرف حضرت اور ان کے قافلہ کے ہمراہیوں نے یہ سعادت حاصل کی، بلکہ بہت سے دوسرے احباب اور دوسرے ساتھیوں نے بھی (جن کی طرف میں اشارہ کرتا تھا) داخلہ کا شرف حاصل کیا، اور اطمینان سے جوف کعبہ میں نوافل پڑھیں، بعض شناساؤں نے جن کو اس کی اطلاع ہوئی شکایت کی کہ ہم رہ گئے، میں نے محترم شیبی صاحب سے عرض کیا، انھوں نے دوبارہ حرم کی پولیس کے ذریعہ اس کا انتظام کیا اور خود بھی تشریف لائے، اس طرح پھر حضرت کی معیت میں دوبارہ داخلی ہوئی، میری زندگی میں یہ عزّ و شرف کا سب سے مبارک دن تھا جو نہ اس سے پہلے پیش آیا نہ اس کے بعد۔

اس واقعہ کی اہمیت و نُدرت، یہ معلوم کرکے اور بڑھ جاتی ہے کہ اس کے بعد دو مرتبہ سرکاری طور پر اس کا انتظام کیا گیا کہ رابطہ کے ارکان (جن میں یہ ناچیز بھی تھا) بیت اللہ شریف کے اندر جائیں، لیکن حکومت کے پورے انتظام کے باوجود یہ شرف حاصل نہ ہوسکا، ایک مرتبہ ۱۹۶۴ء میں باقاعدہ رابطہ کے ارکان کو دعوت دی گئی اور ان کو بیت اللہ کے دروازے کے سامنے بٹھایا گیا اور زینہ لگایا گیا، اور پولیس حفاظت و انتظام کے لئے متعین کی گئی لیکن زینہ لگاتے ہی ان لوگوں کا جو اس وقت مطاف یا حرم میں موجود تھے (یاد رہے کہ حج کا زمانہ قریب تھا)

ایسا ہجوم ہوا کہ ایک یا دو حضرات کے علاوہ جو زینہ کے قریب تھے اور بہت چست و مستعد، ہم میں سے کوئی زینہ کے قریب بھی نہ پہنچ سکا اور یہ خیال ترک کرنا پڑا، دوسری مرتبہ خانہ کعبہ کے غسل کے موقع پر (جس کو شاہ فیصل مرحوم کو ارکان حکومت اور معززین کے ساتھ انجام دینا تھا) ہم لوگوں کو جو قریب ہی کے ہوٹل فندق شبرا میں مقیم تھے، دعوت نامہ پہنچا کہ آپ غسل کعبہ میں شریک ہو سکتے ہیں، دو رویہ فوج اور پولیس کا پہرہ تھا (اور ان کو معلوم تھا کہ ارکان رابطہ مدعو ہیں) میں اور رفیق محترم مولانا محمد منظور صاحب، اپنے چند رفقاء کے ساتھ بڑی خوشی اور فخر محسوس کرتے ہوئے حرم شریف میں داخل ہوئے معلوم ہوا کہ بیت اللہ شریف کا دروازہ بند ہو گیا ہے، اب جانے کا موقعہ نہیں۔

ان دونوں واقعات کو سامنے رکھتے ہوئے اگر یہ نتیجہ نکالا جائے کہ ہم لوگوں کو حضرت کے طفیل ہی میں یہ شرف حاصل ہوا تو بیجا نہ ہوگا۔ شاعر نے صحیح کہا ہے ؎

مور مسکین ہوسے داشت کہ در کعبہ رسد
دست بر پائے کبوتر زد و ناگاہ رسید

اس سفر میں میرا قیام بالکل حضرت کے ساتھ ہی تھا، اس قیام میں حضرت کی اس شفقت کے جن کو گزشتہ صفحات میں شفقت مادری سے تعبیر کیا گیا ہے نمونے دیکھے:

نماز کے اوقات میں حضرت کا قیام حرم شریف کے ایک **خلوہ** میں رہتا تھا، دوپہر کا کھانا بھی وہیں تناول فرماتے تھے، میں تبلیغی اجتماعات اور علماء و خواص کی ملاقاتوں میں ایسا منہمک رہتا کہ اکثر کھانے کے وقت دیر سے حاضری ہوتی، خیمہ میں قدم رکھتا تو دیکھتا کہ حضرت بیٹھے ہوئے ہیں، سامنے رومال میں روٹیاں لپٹی ہوئی رکھی ہیں، مجھ کو دیکھ کر فرماتے، علی میاں! تم کو کھانے کا بھی ہوش نہیں، یہ دیکھو میں تمہارے لئے چپاتیاں لئے بیٹھا ہوں، کہ خمیری روٹی تم کو نقصان کرتی ہے، مدینہ طیبہ حاضری کا موقعہ آیا تو مجھ سے فرمایا کہ ــــــــ بس اب حضرت شیخ کی ضیافت اور انتظام

ختم ہوا[1] اب تم ہمارے ساتھ رہو گے ـــ حضرت نے ہوائی جہاز سے سفر کا فیصلہ اور میرا ٹکٹ بھی لیا، مدینہ طیبہ میں بھی قیام حضرت کے ساتھ مدرسہ علوم شرعیہ میں رہا۔

۲۰محرم ۱۳۷۰ھ (۲ نومبر ۱۹۵۰ء) کو حضرت کی مع اپنے رائے پوری رفقاء و خدام محمدی جہاز سے روانگی ہوئی، مجھے حجاز میں مزید قیام کرنا تھا اور کچھ مصر کے سفر کی بھی نیت تھی، اس لئے واپسی کے سفر میں ہمرکابی نہیں رہی، ہم لوگوں نے جدّہ کی بندرگاہ پر حضرت کو رخصت کیا، قدیم دستور کے مطابق حضرت ایک موٹر لانچ میں بیٹھ کر جہاز کے لئے روانہ ہوئے جو فاصلہ پر ٹھہرتا تھا، حضرت کے ایک خاص خادم راؤ حاجی فضل الرحمٰن خاں رائے پوری بیان کرتے ہیں کہ جب تک تمہاری صورت اوجھل نہیں ہوئی، حضرت موٹر لانچ پر سے برابر تم کو دیکھتے رہے۔

حجاز میں مغربی تہذیب و تعلیم کا اثر

حجاز کے قیام کے دوران اس کا بہ شدّت احساس ہوا کہ مغربی تہذیب عرب ممالک کو پورے طور پر متاثر بلکہ مفلوج کر چکی ہے اور جزیرۃ العرب اور حجاز مقدس کے (جس سے دنیا کو ایمان و اسلام کی روشنی ملی اور ایک ایسی امّت کا ظہور ہوا جو زمانہ کی امامت کے لئے پیدا کی گئی تھی) تعلیم یافتہ نوجوان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، اقبال نے گویا ان ممالک کو دیکھ کر کہا تھا ؏

فرنگی شیشہ گر کے فن سے پتھر ہوگئے پانی

میں نے ستمبر ۱۹۵۰ء کی کسی تاریخ کو بھائی صاحب کو حجاز سے ایک خط لکھا تھا جس میں اس انقلاب حال اور اپنے رنج و تاثر کا اظہار کیا تھا، اس خط کو آج بھی پڑھ کر تعجب ہوتا ہے کہ حقیقت حال کی ایسی سچی تصویر اس وقت موئے قلم سے کیسے کھنچ سکا، جبکہ وہاں بار بار حاضر ہونے اور طویل قیام کی ابھی نوبت نہیں آئی تھی، اس کا ایک متعلق اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے:

---

[1] اوپر گذر چکا ہے کہ راقم کا یہ سفر حضرت شیخ الحدیث کی صاحبزادی مرحومہ کے حج بدل میں تھا

"۱۹۴۷ء میں ہم پہلی بار یہاں آئے تھے، اب ۱۹۵۰ء میں آئے ہیں، تین برسوں میں کھلا ہوا تغیر محسوس ہوتا ہے، بازار سے لے کر لوگوں کے دماغوں تک مغربی تمدن، تجارت، معاشیات اور افکار و خیالات کے پنجے اور زیادہ گڑ چکے ہیں، جدہ اترتے ہی اس کا احساس ہوتا ہے اور جس قدر حالات سے واقفیت ہوتی ہے اتنا ہی اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کوئی نہیں جانتا، خوب صورت عربی لباس میں کتنے دل و دماغ خالص مغربی بن چکے ہیں اور قرآنی زبان کتنے مغربی خیالات اور خالص مادی تخیلات کا ذریعۂ اظہار بنتی ہے، معاش کا انہماک، دولت آفرینی کی عادت بحرانی حد تک پہنچ چکی ہے، زندگی کا تصور اس کے بغیر ان کے نزدیک ممکن نہیں کہ اس کے سایہ میں پناہ لی جائے اور ترقی کی جائے عالم اسلام کا قبلہ مکہ معظمہ اور بیت اللہ ہے اور مرکز اسلام کا قبلہ سر دست امریکہ ہے، وبائے عام کی طرح اس کا اثر فضا اور ہوا میں ہے، اس کے مقابلہ میں، ہماری حقیر کوشش چند کتابیں، چند ملاقاتیں، جماعتوں کے گشت اور نقل و حرکت بالکل وہ حیثیت رکھتی ہے جو کسی سمندر میں ٹھیکریاں پھینکنے سے ہلکے تموج کی حیثیت ہوتی ہے۔ ادھر ملاقاتوں، اجتماعات اور چند شخصیتوں کے اتفاق و استحسان سے غلط فہمی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے، حقیقت میں ان کی حیثیت تلاش و جستجو سے زیادہ نہیں[1]"

حجازی ادبا اور اہلِ قلم کی ایک نشست

حجاز میں خواص کے طبقہ ادباء و اہلِ قلم اور اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کے حلقہ سے ابھی تک رابطہ نہیں پیدا ہوا تھا، ایک ایسے آدمی کی تلاش تھی جو اس حلقہ سے تعارف کرائے اور اس کے ذریعہ سے اس حلقہ سے روابط پیدا ہوں اور وہ ہم پر دلیسیوں کے بارے میں کوئی سنجیدہ اور وقیع تصور

[1] "تعمیر" یکم نومبر ۱۹۵۰ء

قائم کرے کہ ہندوستانی و پاکستانی اہل علم اور دعوت کے کام کرنے والوں کو یہ حضرات کچھ اہمیت نہیں دیتے تھے، زبان اور جدید اسالیب بیان سے ناواقفیت ہمیشہ سے ایک حجاب رہی ہے اور اس زمانہ میں جب زبان و ادب اور زیادہ اہمیت اختیار کر گئے ہیں، یہ حجاب اور بھی بڑھ گیا ہے۔

اس غرض کے لئے ایک دن میں اور مفتی زین العابدین صاحب جو پاکستان کی تبلیغی جماعت کے اہم رکن تھے، حافظ سید محمود صاحب نائب مدیر مطبعۃ الحکومۃ کے پاس گئے، ان کا صوبہ سرحد سے کچھ نسلی تعلق رہ چکا ہے اور وہ اس رشتہ، نیز اپنے دینی رجحان کی بنا پر ہم لوگوں سے بہت مانوس اور قریب تھے، ہم نے اپنی اس ضرورت کا اظہار ان سے کیا، انھوں نے کہا کہ میں آپ لوگوں کو ایک ایسے شخص سے ملا دیتا ہوں جو اس حلقہ کی کنجی ہے، انھوں نے ہمارا تعارف شیخ احمد عبدالغفور عطار سے کرایا، جو حجاز کے ایک معروف اہلِ قلم اور علمی و تحقیقی ذوق رکھنے والے فاضل تھے، انھوں نے اس ذمہ داری کو قبول کیا، اور ایک قریبی تاریخ میں بستان بخاری میں جو مکہ میں بڑی تفریحات اور اجتماعات کی جگہ تھی، اپنے ادیب و اہلِ قلم دوستوں اور ریڈیو اور صحافت سے تعلق رکھنے والے عرب فضلاء کو دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا، اور ہم لوگوں کو دعوت دی، ہم وہاں پہنچے تو عرب فضلاء اور نوجوان ادیبوں اور صحافیوں کا ایک مجمع دیکھا، عطار صاحب نے ہمارا تعارف کرایا اور کھانے کے بعد ایک مجلس شروع ہوئی، ان عرب ادیبوں میں جن کے نام اس وقت یاد ہیں، شیخ سعید العامودی مدیر رسالہ "الحج" و رکن شوریٰ مملکت سعودیہ، شیخ عبدالقدوس انصاری مدیر رسالہ "المنہل"، سید علی حسن فدعق (ایک ادیب اور وزارت مالیہ کے ایک عہدیدار) سید محسن احمد باروم (وزارت تعلیم اور ریڈیو کے ایک عہدیدار) شیخ حسین عرب (جو بعد میں وزیر حج و اوقاف بھی ہوئے) موجود تھے مجلس اس طرح شروع ہوئی جیسے کسی طالب علم کا VIVA VOCE ہوتا ہے، پہلے تو انھوں نے

اس کا اندازہ کرنا چاہا کہ آج کا مہمان (یہ حقیر) عربی زبان سے واقفیت اور عام مطالعہ و معلومات کے لحاظ سے کتنے پانی میں ہے، کبھی ڈاکٹر طٰہٰ حسین اور عباس محمود العقاد اور مصر کے نامور ادیبوں کے متعلق سوال ہوتا، اور اندازہ کیا جاتا کہ میں نے ان کی کوئی کتاب پڑھی یا نہیں؟ کبھی اشتراکیت کے متعلق میری رائے پوچھی جاتی، کبھی مغربی تہذیب کے بارے میں سوال کیا جاتا، کبھی اس کا اندازہ کیا جاتا کہ میں انگریزی سے کچھ واقف ہوں یا نہیں؟ اس وقت اس طرزِ تعلیم اور مطالعہ کی قدر آئی، جس کا اللہ تعالیٰ نے ہندوستان میں سامان کیا تھا، اور اس وقت اس کی افادیت کا اندازہ نہیں تھا۔

سعودی ریڈیو پر تقریریں

اس زبانی امتحان کے متعلق یہ تو اندازہ نہیں ہوا کہ انھوں نے کتنے نمبر دیئے لیکن جب وہ اس سے فارغ ہوئے تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ کیا آپ ہمارے ساتھ تفریح میں چل سکتے ہیں، میں نے ہامی بھری، اور ان کے ساتھ موٹر پر سوار ہوگیا، وہ مجھے لے کر اچانک ایک اسپتال میں داخل ہوئے، وہاں شیخ محمد سرور الصبّان (نائب وزیر مالیہ، اور نگراں سعودی ریڈیو) کے پاس لے گئے جو بغرض علاج و آرام اس وقت اسپتال میں تھے انھوں نے میرا تعارف کرایا اور ان سے خواہش کی، کہ مجھے ریڈیو کی کچھ تقریریں دی جائیں، شیخ محمد سرور سے مولانا محمد سلیم صاحب ناظم مدرسہ صولتیہ نے اس سے پہلے میرا تعارف کرادیا تھا اور ان سے میری ملاقات ہو چکی تھی، انھوں نے بخوشی اس کو منظور کیا، اور ریڈیو کی طرف سے مجھ سے باقاعدہ تقریروں کے ایک سلسلہ کی فرمائش کی گئی، میں نے سوچ سمجھ کر "بین العالم وجزيرة العرب" کا عنوان منتخب کیا۔ جس میں مجھے امید تھی کہ اپنے خیالات و تاثرات کا موزوں طریقہ پر اظہار کرسکوں گا، اور اپنے دل کی بات دنیا کی زبان سے اور پھر اس کا جواب جزیرۃ العرب کی زبان سے کہلواؤں گا، پہلی تقریر کا عنوان تھا "من العالم إلى جزيرة العرب" جس میں عالم انسانی جزیرۃ العرب کے ان احسانات کا شکریہ ادا کرنے کے بعد جو نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اس پر ہوئے، اور اس کو

ایک نئی زندگی ملی، شکایت کا ایک دفتر کھولتا ہے، اور اپنے زخمی دل کو نکال کر سامنے رکھ دیتا ہے کہ پھر اس کی ہدایت وقیادت سے جزیرۃ العرب نے (جس کے افق سے اسلام کا آفتاب طلوع ہوا تھا) کیوں دست کشی اختیار کر لی ؟ اس نے صفائی سے کہا کہ ہمیں تمہارے تیل کی ضرورت نہیں؟ جس سے ہماری مشینیں چلتی ہیں، ایمان کی اس روشنی اور حرارت کی ضرورت ہے جو تنہا تمہارے پاس ہے اور جس سے دل ودماغ روشنی اور زندگی پاتے ہیں، پھر جزیرۃ العرب کی طرف سے اس کا جواب دیا گیا، جس میں کچھ اپنی کوتاہی کا اعتراف تھا، کچھ معذرت اور وعدہ، ان دونوں تقریروں سے پہلے شیخ احمد عبد الغفور عطار کی تعارفی وتمہیدی تقریر تھی، الحمدللہ کہ یہ تقریریں دلچسپی اور شوق کے ساتھ سنی گئیں اور نوجوان اور اہلِ ذوق میں ان کا چرچہ رہا[1]

اس کامیاب مجلس اور ریڈیو کی تقریروں کے بعد میرا حجاز کے ادبی حلقوں میں اچھا تعارف ہو گیا، ان نوجوان ادیبوں اور اہل قلم سے روابط پیدا ہوئے، کبھی ہم لوگ ان کو اپنی قیام گاہ پر بلاتے، کبھی وہ ہم کو مدعو کرتے۔

---

[1] یہ دونوں تقریریں میرے قیام مصر کے دوران ۱۹۵۱ء میں "بین العالم وجزیرۃ العرب" کے نام سے ایک رسالہ میں شائع ہوگئیں

بابُ سیزدہم

سفرِ مصر اور مشرقِ وسطیٰ کا دورہ (۱۹۵۱ء)

مصر عالمِ عربی کا علمی وفکری مرکز

حجاز کے تعلیم یافتہ نوجوانوں، ادیبوں اور اہلِ قلم سے ملنے جلنے کے بعد اندازہ ہوا کہ یہ سب مصری ادیبوں اور وہاں کے اہلِ علم اور مصنفین کے خوشہ چیں اور زلّہ ربا ہیں، اور ان کو ادب وفکر یہاں تک کہ اسلام کے فہم میں بھی استاد و امام مانتے ہیں، ان میں سے کچھ لوگوں میں اسلامیت و خود اعتمادی کی جھلک پائی، تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ اخوان کی تحریک کا نتیجہ ہے ان میں سے بعض دوستوں نے اس کا اعتراف کیا کہ اگر امام حسن البنّا کی شخصیت اور ان کی دعوت سے ان کو متعارف ہونے کا موقعہ نہ ملتا تو وہ الحاد کا شکار ہو چکے تھے اور دین کے مستقبل اور مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ سے وہ یکسر مایوس ہو جاتے۔

حجاز کے اس دوبارہ قیام سے جس کی مدّت چار مہینے کے قریب تھی اور جس میں تعلیم یافتہ نوجوانوں اور اہلِ قلم و اہلِ فکر سے ملنے کا زیادہ موقعہ ملا تھا، عالمِ عربی میں مصر کی علمی و ادبی مرکزیت وقیادت کا اندازہ ہوا اور معلوم ہوا کہ مریض و سقیم فکر و ادب، انتشار انگیز لٹریچر اور اس کے مقابلہ میں صحت مند خیالات، صالح علمی و فکری قیادت دونوں کا مرکز اور سرچشمہ

(عالمِ عربی کی حد تک مصر ہی ہے) اگر عالمِ عربی میں کسی چیز کو پھیلانا اور روتیج بنانا ہو اور اس میں کوئی تغیّر و انقلاب لانا ہو تو وہ مصر ہی کے راستہ سے ممکن ہے، اس وقت مصر کے سفر کی اہمیت و افادیت پورے طور پر واضح ہوگئی اور اس کا ارادہ کرلیا گیا۔

لیکن اس کا ہم بے نواؤں کے پاس کوئی ساز و سامان نہ تھا، میرے ان خطوط میں، جو ہندوستان اپنے دوستوں اور بزرگوں کی خدمت میں بھیجتا رہا تھا، اس خواہش کی جھلک نمایاں ہوئی۔ اس کو پڑھ کر محترم بھائی صاحب حضرت شیخ الحدیث اور بعض کرم فرما دوستوں کے دل میں اس کا جذبہ پیدا ہوا کہ وہ اس ارادہ کی تکمیل کا سامان کریں، چنانچہ انھوں نے اپنے عنایت ناموں سے اس خیال کی پوری ہمت افزائی کی اور اتنی رقم کا بندوبست کر دیا کہ جس میں اپنے دو رفیقوں کے ساتھ پانی کے جہاز سے مصر جا سکوں اور وہاں کچھ عرصہ قیام کر سکوں۔

سرزمینِ مصر پر

۱۲ ربیع الثانی ۱۳۷۰ھ (۲۰ جنوری ۱۹۵۱ء) کو دو عزیز رفیقوں مولوی معین اللہ ندوی اور مولوی عبدالرشید ندوی کی معیت میں اطالوی جہاز (ONDA) سے جدہ سے سوئس کو روانگی ہوئی، میں نے اس سفر میں روزنامچہ لکھنے کا التزام کیا، اس روزنامچہ کے پہلے صفحہ پر سفر کا آغاز کرتے ہوئے یہ اندراج ملتا ہے جس سے سفر کے مقصد اور محرکات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے،

"جزیرۃ العرب! ہم تجھ سے جدا ہو رہے ہیں مگر کنارکش نہیں، اور نہ ہمیشہ کے لئے، ہمارا یہ سفر بھی دراصل تیرے ہی رشتہ سے، اور تیرے اس عزیز خاندان کے افراد کی ملاقات کی غرض سے ہے، جو بحر احمر اور بحر روم کے ساحل پر پھیلا ہوا ہے، میں ان کو تیرا سلام پہنچاؤں گا اور اس بات کا جائزہ لوں گا کہ تجھ سے جدا ہونے کے بعد زمانہ کے دست بُرد نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا اور اس دعوت و پیغام کی مقدس امانت کے ساتھ انھوں نے

کیا برتاؤ کیا۔"

قاہرہ میں ہمارا قیام چھ مہینے سے کچھ دن کم رہا، اس سفر کا پورا روزنامچہ، ملاقاتوں کی کیفیت، تقریروں کے خلاصے، مختلف حلقوں سے تعلق وارتباط، دینی دعوت اور ہندوستان کے تعارف کی پوری کہانی راقم کی کتاب "مذکرات سائح فی الشرق العربی[1]" میں آگئی ہے جس کا اردو ترجمہ مولوی شمس الحق ندوی کے قلم سے "شرق اوسط کی ڈائری" کے نام سے شائع ہو چکا ہے[2]۔

دورِ ناصری سے پہلے کا مصر

مصر کا یہ قیام دعوتی، علمی، ادبی ہر حیثیت سے بہت مفید رہا، یہ وہ زمانہ تھا جب مصر اپنی اس اصلی صورت پر تھا جو مدتِ دراز سے چلی آرہی تھی، اظہار خیال اور تقریر وصحافت کی پوری آزادی تھی، علم و ادب اور صحافت اپنے پورے عروج پر تھی، سیاسی پارٹیاں بھی آزاد تھیں، پچھلی نسل کے بہترین دماغ اور قدیم وجدید تعلیم کے بہترین ساختہ پرداختہ موجود تھے، ایسے متعدد اہلِ فکر، اہلِ قلم اور ادیب زندہ اور سرگرم عمل تھے جو مخصوص اسلوب کے مالک اور پورے پورے مدرسہ ادبی کے بانی اور رہنما تھے، اور جن کی تقلید کو شام، عراق، حجاز، نجد اور مغرب اقصیٰ کے نوجوان ادیب سرمایۂ فخر ومباہات سمجھتے تھے، جن میں ڈاکٹر احمد امین بک، ڈاکٹر طٰہٰ حسین پاشا، عباس محمود العقاد ڈاکٹر محمد حسین ہیکل، توفیق الحکیم، احمد حسن الزیات، منصور فہمی پاشا، فکری اباظہ باشا کا نام لیا جاسکتا ہے، کبار علماء میں شیخ الازہر شیخ عبدالمجید سلیم، شیخ محمود شلتوت، شیخ احمد محمد شاکر شیخ حسنین محمد مخلوف، احمد بن عبدالرحمن بنا ساعاتی (والد امام حسن البنا شہید) شیخ حامد الفقی

---

[1] اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن، بیروت سے حال میں ان اضافوں کے ساتھ شائع ہوا ہے جو مصر کے سنسر نے سنہ ۱۹۵۲ء کے ایڈیشن میں حذف کر دیئے تھے۔

[2] شائع کردہ مکتبہ فردوس، مکارم نگر، لکھنؤ

شیخ عبد الوہاب بک خلّاف، شیخ زاہد الکوثری، شیخ محمد الخضر حسین، شیخ محمد عبد اللطیف دراز ڈاکٹر عبد اللہ دراز، محمد فواد عبد الباقی، شیخ مصطفیٰ صبری آفندی، (سابق شیخ الاسلام سلطنت عثمانیہ) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

زعماء اور اسلامی قائدین میں سے (جن میں سے بعض اپنے وطن و دیار کو چھوڑ کر مصر میں پناہ گزین تھے) مفتی سید امین الحسینی، مشہور مجاہد امیر عبد الکریم ریفی، سید مبشر الطرازی (ترکستانی) عبد الرحمٰن عزام پاشا (سکریٹری جنرل عرب لیگ)، جنرل صالح حرب پاشا (رئیس عام جمعیات الشبان المسلمین) امین محمود خطّاب (رئیس الجمعیۃ الشرعیۃ) حسین یوسف (قائد شباب سیدنا محمد) محمد علی علوبہ پاشا سابق وزیر اوقاف و صدر حزب الاحرار الدستوریین، ناقابلِ فراموش ہیں۔

اسلامی الفکر ادیبوں اور داعیوں میں استاذ محب الدین الخطیب (صاحب الفتح) سید قطب محمد احمد بک الغمراوی، محمود محمد شاکر، احمد الشرباصی، محمد الغزالی، فرید وجدی، سعید رمضان صالح العشماوی (مدیر الدعوۃ) سرفہرست ہیں، مصر کی جدید نسل کے مربیوں اور جدید تعلیم اور تجدّد کے داعیوں میں، احمد لطفی السّید باشا صدر مجمع فواد الاوّل (مجمع اللغۃ العربیۃ) کا نام تنہا کافی ہے جو اس وقت تک بقید حیات تھے۔

جماعتوں اور تنظیمات میں الاخوان المسلمون، شباب سیدنا محمد، جمعیۃ الشبان المسلمین، مصر الفتاۃ، جمعیۃ انصار السنۃ المحمدیۃ، الجمعیۃ الشرعیۃ، جمعیۃ العشیرۃ المحمدیۃ، جمعیۃ مکارم الأخلاق موجود و سرگرم عمل تھیں، نوجوانوں اور اہلِ علم میں مقبول رسائل میں ڈاکٹر احمد امین کا الثقافۃ اور استاذ احمد حسن الزیّات کا الرّسالۃ مستقل ادبی دبستان کی حیثیت رکھتے تھے اور ان کا طوطی بولتا تھا، یہ شاہ فاروق کی حکومت کا زمانہ تھا۔ ان ساری اخلاقی، معاشرتی اور شخصی کمزوریوں کے ساتھ جو خاندانی حکمرانوں اور دولت مند و آزاد فرماں رواؤں کا خاصہ ہیں، اس عہد کے

مصر میں بہت کچھ اظہارِ خیال کی آزادی، دین اور علماء کا احترام، ازہر کا اثر، عوام میں سادگی اسلامی جوش اور اخوت اسلامی کی جھلک نظر آتی تھی اور ملک میں اسلامی وعربی اخلاق کریم النفسی، محبت وگرم جوشی پائی جاتی تھی جو عرصہ سے مصری قوم کا خاصّہ اور امتیاز رہا ہے۔

اس وقت تک دورِ ناصری کی وہ بادِ خزاں نہیں چلی تھی[۱] جس سے علم وادب، فکر اسلامی آزاد سیاست اور اخلاقی جرأت وتنقید کے سرسبز وشاداب درخت برگ وبار سے محروم ہوگئے اور پورے ملک پر انقلاب کی ایسی جھاڑو پھری کہ گرد وغبار کے سوا کہیں زندگی اور زندہ دلی کے آثار نظر نہیں آتے تھے، حکمتِ الٰہی کی یہ کارفرمائی تھی کہ اس نے قومیت عربیہ اور اشتراکیت علمیہ کے طوفان سے (جو ۱۹۵۲ء میں مصر کے افق سے نمودار ہوا، پھر سارے عالمِ عربی کو اس نے اپنی لپیٹ میں لے لیا) کئی سال پہلے مجھے مصر وسوڈان اور شام کی سیاحت اور قیام کا موقعہ دیا

علمی وادبی حلقوں میں تعارف وتبادلۂ خیال

قاہرہ پہنچ کر مولانا عبید اللہ صاحب بلیاوی جو ایک دعوتی دورہ پر سوڈان گئے ہوئے تھے، ہم لوگوں کے ساتھ شامل ہوگئے، چند دن ہمارا قیام العتبۃ الخضراء کے ہوٹل فندق البرلمان میں رہا، اس کے بعد ہم لوگ ایک انجمن کے دفتر میں جو السکۃ الجدیدۃ (سوق الصیارفۃ) کی ایک بالائی منزل پر تھا قیام پذیر ہوگئے۔

قاہرہ کے اس ہنگامہ خیز اور پُرشور شہر میں ہم نوعمر اور گمنام اجنبیوں کے پاس کوئی ایسی چیز نہ تھی جو وہاں کے علمی وادبی ودعوتی حلقہ کو ہماری طرف متوجہ کرتی، میں جو اس جماعت کا ترجمان ونمائندہ تھا، نحیف الجثہ ۳۶-۳۷ سال کی عمر کا جوان، لباس ہندوستانی، نہ علمائے ازہر کا سا عالمانہ لباس، نہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ اور مرفہ الحال "آفندیوں" کا سوٹ بوٹ اور ترکی ٹوپی، وہ لباس، جو

[۱] مصر میں ۱۹۵۲ء میں فوجی انقلاب ہوا اور محمد نجیب برسرِ حکومت رہے۔ ۱۹۵۴ء میں جمال عبد الناصر برسرِ اقتدار ہوئے۔

مشرق وسطی کے لباس شب خوابی (SLEEPING DRESS) سے ذرا غنیمت ہے، جہاں تک قیام کا تعلق تھا وہ کسی بڑے ہوٹل کے بجائے (جو یورپ اور مشرق وسطی میں مہمان کی حیثیت عرفی کو متعین کرتا اور اس کی عظمت و اہمیت کا پیمانہ ہے) ایک اسلامی انجمن کے معمولی سے دفتر میں تھا جس میں نہ آنے والوں کے استقبال کے لئے کوئی کمرہ تھا نہ سونے اور کھانے کے لئے الگ الگ کمرے اور ضروری فرنیچر تھا، ایسی حالت میں اس کے پورے قرائن موجود تھے، کہ ہم چند مہینے قاہرہ میں قیام کرتے اور خود وہاں کی علمی ادبی فضلاء سے فائدہ اٹھا کر چلے آتے اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی کہ نقار خانہ میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے اس قیام سے فائدہ اٹھانے کے پہلے سے انتظامات فرما رکھے تھے، پہلی بات یہ کہ ہمارے پہنچنے سے پہلے ہماری کتاب "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" اہل علم و فکر اور دعوت اسلامی کے حلقہ میں پہنچ چکی تھی اور اس نے اپنی جگہ پیدا کر لی تھی، وہ میرے لئے ایک بطاقۃ الزیارۃ VISITING CARD اور ایک تعارف نامہ کی حیثیت رکھتی تھی، اور اکثر جگہ یہ کہنا کافی ہوتا تھا "مؤلف "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" دوسری طرف بعض موقر مجالس و جمعیات میں تقریروں کا ایسا سلسلہ شروع ہوا، جس سے مصر کے نوجوانوں اور قدیم و جدید حلقہ میں نہ صرف تعارف ہوا بلکہ ان کی توجہ منعطف ہوئی اور ہماری بات میں وزن پیدا ہوا

چند اہم تقریریں اور مقالات

اس سلسلہ میں دار الشبان المسلمین کے (جو مصر کا سب سے بڑا اسلامی بجنید جامع اور مؤقر اسٹیج تھا) عبد الحمید سعید ہال میں میری تقریر "العالم علی مفترق الطرق" (دنیا دوراہے پر) کے عنوان سے ہوئی، جس میں بعض ممتاز علمائے ازہر اور مصر کے متعدد اہلِ فکر و اہلِ قلم موجود تھے، یہ تقریر مصر کے عام دستور کے مطابق پہلے سے لکھی ہوئی اور تیار کی ہوئی نہیں تھی، برجستہ اور فی البدیہہ تھی، جو اہل مصر کے لئے

ایک عجمی کے بارے میں پہلا تجربہ تھا، تقریر میرے اپنے احساس و وجدان کے مطابق (جیسا کہ میں نے "مذکرات" میں ذکر کیا ہے) بہت کامیاب اور معیاری نہیں تھی، لیکن مصر کے فضلاء اور نوجوانوں کو متوجہ کرنے کے لئے کافی تھی، اس کا عام طور پر چرچا ہوا، تقریر کے بعد ازہر کے ایک استاد شیخ احمد الشرباصی ایک مصنف و ادیب عبدالمتعال الصعیدی، اور اخوان کے مصنف اور ترجمان شیخ محمد الغزالی، اور ایک صاحب قلم استاد عبدالمنعم خلاف نے اپنی تقریروں میں بڑے اچھے تبصرے کئے۔

دوسرا انتظام یہ ہوا کہ جمعیات الشبان المسلمین کے رئیس عام اللواء صالح حرب پاشا نے میرے لئے ایک استقبالیہ اور جلسۂ تعارف (حفلۃ التکریم) کا انتظام کیا، جس میں بعض اہم شخصیتوں امیر عبدالکریم خطابی، شیخ حسنین محمد مخلوف سابق مفتی الدیار المصریۃ، شیخ محمد عبداللطیف دراز (ازہر کے معہد دینی کے مدیر) شیخ محمد الشربینی (رئیس جمعیۃ علماء الازہر) وغیرہ نے شرکت کی میں نے وہاں ہندوستان کی اصلاحی، تجدیدی شخصیتوں اور دعوتی کام اور اس کے مختلف مراحل و اسالیب کا تعارف کرایا اور اس کو اپنے وطن کی سوغات کی طرح یہ کہہ کر علمائے مصر کے سامنے پیش کیا کہ اگر میں عالم عربی ہی کی کوئی چیز پیش کروں تو "بضاعتنا ردت الینا" کے مصداق ہوگی، اس لئے میں تاریخ اسلام، خدمت دین اور خدمت اسلام کا وہ باب آپ کے سامنے کھولتا ہوں، جس پر ابھی تک آپ کی نظر نہیں پڑی ہوگی، یہ مقالہ میرے زمانہ قیام قاہرہ ہی میں "الدعوۃ الاسلامیۃ وتطورہا فی الہند"[1] کے نام سے شائع ہوگیا، اور دلچسپی اور اہتمام سے پڑھا گیا۔

ان دو موقعوں کے علاوہ دو اہم تقریریں، ایک "اقبال کی شاعری اور پیغام" کے تعارف میں، مصر کی مؤقر اور تاریخی دانش گاہ دار العلوم[2] میں، دوسری

---

[1] بعد میں یہ رسالہ ہندوستان میں "الدعوۃ الاسلامیۃ فی الہند وتطوراتہا" کے نام سے شائع ہوا، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام" لکھنؤ سے مل سکتا ہے

[2] دار العلوم مصر کا وہ ممتاز تعلیمی مرکز ہے جو قدیم و جدید کا جامع ہے اور جس میں عربی زبان و ادب کی تعلیم کا معیار سب سے بلند رہا ہے۔ اس کی ترقی و شہرت میں مفتی شیخ محمد عبدہٗ نے خاص حصہ لیا امام حسن البناء شہید اور بہت سے اہل فکر و علم نے وہیں تعلیم پائی۔

"اقبال کا انسان کامل" کے عنوان سے جامعۃ فواد الاوّل (قاہرہ یونیورسٹی) میں ہوئی۔ ان دو اہم تقریروں کے علاوہ وہاں کی تقریباً تمام جمعیتوں اور دعوتی مراکز، شباب سیدنا محمد، جمعیۃ انصار السنۃ المحمدیہ، الجمعیۃ الشرعیۃ، جمعیۃ العشیرۃ المحمدیۃ، جمعیۃ مکارم الاخلاق، الرابطۃ الاسلامیۃ میں تقریریں ہوئیں، جن سے ان تنظیموں کے متعلق افراد اور حلقوں میں تعارف ہوا اور تعلقات کی راہ ہموار ہوئی۔

طلباء سے ربط و ملاقات اور علاقائی دورے

جمعیتوں کے علاوہ ہم لوگوں نے طلبائے ازہر کے، جو دنیا کے گوشہ گوشہ اور خاص طور پر افریقی ممالک سے ہزاروں کی تعداد میں آئے ہوئے ازہر کے رواقوں (ہوسٹلوں) اور ہوٹلوں میں مقیم تھے، آنا جانا اور مختلف ممالک کے طلباء سے خطابات کا سلسلہ شروع کیا۔

یہ ایک بڑا انسانی ذخیرہ تھا جو ازہر کے نام پر اور اس کی دینی و علمی بین الاقوامی شہرت کی بنا پر قاہرہ میں جمع ہو گیا تھا اس سے نہ صرف برّ اعظم افریقہ میں (جہاں کے طلباء کی سب سے بڑی تعداد تھی) بلکہ پورے ممالک عربیہ اور عالم اسلام کے بھی ایک بڑے حصّہ میں مسلمانوں کی اصلاح اور دینی تعلیم و تربیت اور صحیح اسلامی قیادت کا کام لیا جاسکتا تھا، لیکن افسوس ہے کہ ان کی ذہنی تربیت اور مطالعہ اور ملک میں رہنمائی کا کوئی انتظام نہیں تھا، ان کے رواقوں اور ہوٹلوں میں جہاں وہ مقیم تھے اور خود ازہر میں کوئی یہ بتانے والا نہیں تھا کہ تم اپنے کو کس طرح زیادہ سے زیادہ مفید اور موثر بنا سکتے ہو، تمہیں اپنے ملکوں میں واپس جا کر کیا کام کرنا ہے، وہاں کے مسائل اور حالات کیا ہیں، تمہیں ان مسائل اور سوالات کا سامنا کرنے کے لئے یہاں رہ کر کیا تیاری کرنی چاہیئے؛ وہ آزاد تھے جن معاہد اور کلیات میں وہ تعلیم پاتے تھے، ان کے اسباق میں شریک ہو کر (اور اگر چاہیں تو ان سے بھی غیر حاضر رہ سکتے تھے) وہ شہر کی جن تفریحات، مشاغل اور مفید و مضر مجالس میں

حصّہ لینا چاہیں اور وہاں کے حالات و خیالات سے متاثر ہوں، اس کی بالکل چھوٹ تھی میں نے اس وقت کے شیخ الازہر شیخ عبدالمجید سلیم جو بلند علمی و دینی مقام رکھتے تھے اور عرصہ کے بعد ازہر کو ایک ایسا شیخ ملا تھا جس کی علمی و دینی حیثیت مسلّم تھی، اس سلسلہ کے اپنے بعض تاثرات اور مشورے پیش کئے، انھوں نے مجھ سے خواہش کی کہ میں اس کو ایک یادداشت کے طور پر قلمبند کر کے دوں۔ رئیس البعثات شیخ محمود شلتوت کو ضروری ہدایت کی کہ وہ مجھ سے یہ تحریر لے لیں اور اس پر غور کیا جائے، میں نے یہ یادداشت تیار کر کے شیخ شلتوت کے حوالے کر دی، پھر معلوم نہیں اس پر کیا عمل ہوا؟

طلبائے ازہر میں خاص طور پر تُرک طلباء سے جو اتاترک کے بعد پہلی مرتبہ علوم دینیہ حاصل کرنے کے لئے ملک سے باہر بھیجے گئے تھے اور زیادہ تر ہوٹل بغداد میں مقیم تھے، ربط رہا، ان میں متعدّد تقریریں ہوئیں، ان میں متعدّد نوجوان بڑے صاحب صلاحیت اور ہونہار نظر آتے تھے، ان میں سے بعض سے یہاں سے جانے کے بعد بھی ربط رہا۔ اور وہ ترکی کے بعض اہم دینی عہدوں و مناصب پر فائز ہوئے، ہندوستان اور ترکی کے قریبی رشتہ کی وجہ سے جس کو خلافت تحریک نے ایک دینی اور جذباتی رنگ میں منتقل کر دیا تھا۔ ان نوجوانوں سے خاص مناسبت معلوم ہوئی اور ان کو بھی بہت جلد اُنس و تعلق پیدا ہو گیا۔ ان کے علاوہ شامی، انڈونیشی، اریٹریائی طلباء سے بھی خطاب کرنے کا موقعہ ملا، ازہر کے کلیۃ الشریعۃ و کلیۃ الدین کے طلباء زیادہ قریب اور مانوس رہے۔ ان کی قیام گاہوں پر بار بار جانا ہوا اور وہ بھی ہماری خاکسارانہ قیام گاہ پر بے تکلّف آتے جاتے تھے[1]

---

[1] انھیں میں ایک طالب علم یوسف القرضاوی تھے، جو اب العلامۃ الدکتور یوسف القرضاوی کے نام سے مشہور ہیں۔ قطر یونیورسٹی کے کلیۃ الشریعۃ کے پرنسپل اور فقہ الزکوٰۃ کے نامور مصنف ہیں، دوسرے عبداللہ العقیل تھے، جو اب کویت میں مستشار وزارۃ الاوقاف ہیں۔

ان جمعیتوں اور جماعتوں کے علاوہ اخوان نے (جن کا مستقل ذکر آگے آئے گا) میرے دوروں کا پروگرام بنایا، جن میں التزاماً ان کے ترجمانِ خاص اور داعی شیخ محمد الغزالی ساتھ ہوتے تھے۔ اس سلسلہ میں القناطر الخیریۃ، طنطا، بنہا، حامول، حلوان، سنتریس، المحلۃ الکبریٰ نکلہ، عزیزیہ، قولیسنا، نبروہ کے دعوتی و تبلیغی دورے رہے، المحلۃ الکبریٰ میں جو مصر کا سب سے بڑا صنعتی مرکز اور وہاں کا لنکا شایر ہے، ہم نے نبروہ کے لئے ایک جماعت بھی نکالی۔

بھائی صاحب مرحوم کی عالمِ اسلام پر وسیع اور گہری نظر تھی، ان کا مطالعہ وسیع اور جامع، ان کا دل اسلام کی دعوت و عروج کے جذبہ سے معمور تھا، زمانۂ طالب علمی میں چونکہ انٹرمیڈیٹ تک ان کا مضمون جغرافیہ رہ چکا تھا، اور اپنے ذاتی مطالعہ اور شوق سے جزیرۃ العرب اور ممالک اسلامیہ کے جغرافیائی، سیاسی، اقتصادی حالات اور ان میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے مشکلات و امکانات سے وہ واقف تھے، وہ لکھنؤ میں بیٹھ کر مجھے ایسے خطوط لکھتے رہے، جن سے مجھے مصر کی داعیانہ اور قائدانہ اہمیت اور افریقہ میں دعوت کے وسیع میدان ہونے کا احساس پیدا ہو، اور میں اس کی کوشش کروں کہ مصر کا دینی طبقہ افریقہ میں دعوت و اشاعت اسلام کی ذمہ داری قبول کرے، ان کے خط کا ایک اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے:

"اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہتا ہوں کہ افریقہ کو اللہ تعالیٰ نور اسلام سے منور فرما دے اور تمہیں اس کا ذریعہ بنا کر اپنے شان و کرم کے مطابق اجر عطا فرمائے، بہت سے ملک ایسے ہیں جہاں قدیم زمانہ سے تمدن رہا ہے، مثلاً ہند، ایسے ملکوں کے غیر مسلموں میں استکبار قبولِ حق سے بڑا مانع ہے، افریقہ میں مصر کے علاوہ تمام ملک تمدن سے خالی رہا ہے اور اب تک بڑا حصہ بالکل ابتدائی جاہلانہ بت پرستی کے سوا تمدن مذہب سے ناآشنا ہے، گویا تقریباً پورا برِّ اعظم سادہ تختی ہے، قرین عقل یہ ہے کہ حق کے قبول کرنے کی ان میں ایسی صلاحیت ہو

جیسی عرب جاہلت اور بربر اور ترکوں میں تھی اور تمہاری کوششوں کو اللہ عزّ وجل قبول فرمالیں اور اہل افریقہ کے قلوب کو قبولِ حق کے لئے کھول دیں۔ مصر، افریقہ کا دروازہ ہے۔ اگر اہل مصر کو اس کی ذمّہ داری کا احساس ہو جائے اور اپنے ملک میں بیٹھے ہوئے بھی ہر موقعہ سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں۔ اور مغرب صحرائے اعظم اور صحرا کے جنوب کے اور مغرب کے علاقوں سے جو حجاج جن میں اکثر پیادہ ہوتے ہیں مصر ہو کر گزریں تو ان کو دینی جد وجہد میں مشغول ہونے پر آمادہ کریں اور اپنے اپنے ملکوں میں اور قریب کی غیر مسلم آبادی میں تبلیغ کے لئے نکلنے پر تیار کریں، تو انشاء اللہ ایک دن پورا افریقہ نور اسلام سے منور ہو سکتا ہے[1]۔"

"اسمعی یامصر!" (مصر کے نام)

قاہرہ پہنچنے کے کچھ ہی دن بعد مجھے اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ میں مصر کو اس طرح خطاب کروں کہ اس کو اپنا انعام وپیغام یاد آجائے اور یہ محسوس ہو کہ وہ عالمِ عربی میں بلکہ عالم اسلامی میں قائدانہ کردار ادا کر سکتا ہے، مغرب سے اس کو کیا لینا چاہیئے اور لے کر چھان پھٹک کر عالمِ عرب کو دینا چاہیئے؟ اور اس کے مقابلہ میں مغرب کو کیا دینا چاہیئے جس سے اس کو زندگی کا نیا راستہ ملے اور وہ اس دلدل سے نکلے جس میں دھنستا چلا جاتا ہے، مصر کو اس کا فیصلہ کرنا چاہیئے! یہ کام تنہا مصر ہی انجام دے سکتا ہے جو مشرق اور مغرب کے نقطۂ اتصال پر واقع ہے اور جہاں دو تہذیبیں آکر ایک دوسرے سے بغل گیر ہوتی ہیں، نیز یہ کہ اس وقت معنوی اور فکری نہر سوئز کی ضرورت ہے جو مشرق اور مغرب میں خود دارانہ اور مساویانہ تبادلہ کا ذریعہ بنے، مشرق کی بہترین چیزیں (جن میں سب سے قیمتی اسلام کا پیغام ہے)

[1] حیات عبدالحیؒ ص ۳۹۶-۳۹۷

مغرب کو دے، اور مغرب سے ان چیزوں کو لے جن میں اس کو سبقت اور فوقیت حاصل ہے، یعنی ٹکنالوجی اور جدید علوم وصنائع۔

میں نے اس مقصد کے لئے ایک مقالہ لکھنا شروع کیا جس میں مضامین کی ایسی آمد محسوس ہوئی جو کمتر محسوس ہوئی ہے، اس میں میں نے سب سے پہلے پوری فراخ دلی اور فیاضی کے ساتھ مصر کی علمی ودینی خدمات، نشر واشاعت کے وسیع وعظیم کام، علمی وادبی فتوحات اور ازھر کی شاندار تاریخ اور اشاعتِ علم ودین کے کارناموں کا اعتراف کیا پھر بتایا کہ مصر! تیرے دو ہاتھ ہیں، ایک ہاتھ سے مفید چیزوں کو لے اور دوسرے سے حیات بخش، وروح پرور تحائف سے مغرب کا دامن بھر دے، لیکن اس حکمتِ نبوی کو ہمیشہ یاد رکھ کہ "الید العلیا خیر من الید السفلیٰ" (اونچا ہاتھ نیچے ہاتھ سے بہتر ہوتا ہے۔) پھر ان کمزوریوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو پچھلے دورِ حکومت ومعاشرہ کے نتائج، اور بے لگام وانتشار انگیز صحافت کا نتیجہ ہیں، مصر کو مردانگی کے اوصاف، اسلامی اخلاق اختیار اور ان چیزوں سے اپنی حفاظت کرنے کی دعوت دی، جو گزشتہ قوموں کے زوال اور صفحۂ ہستی سے مٹ جانے کا سبب بنے، پھر بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے دنیا کے ایک وسیع ترین برّاعظم (افریقہ) کا انتخاب کیا ہے اس کو اس میں داعی اور قائد کا کردار ادا کرنا چاہیئے، جہاں ابھی بہت سے حصّوں میں بت پرستی اور جاہلی عقائد اور زندگی موجود ہے لیکن ابھی تک بہت سی قوموں کے دل سادہ تختی کی طرح ہیں، جن پر بغیر کسی مشقت کے نئے نقوش ثبت کئے جاسکتے ہیں ؎

وہی اپنی فطرت پہ طبع بشر ہے   خدا کی زمیں بن جُتی سربسر ہے

یہ مقالہ جو تقریباً ایک رات کے بڑے حصہ اور صبح کے کچھ وقت میں تیار ہو گیا، مصر کے

مقبول ترین رسالہ "الرسالۃ" میں شائع ہوا، کچھ عرصہ بعد میں نے اس کو ایک الگ رسالہ کی شکل میں مصر ہی میں "اسمعی یا مصر!" کے عنوان سے شائع کروایا اور وہ ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور بڑے شوق اور دلچسپی سے پڑھا گیا، قریبی زمانہ میں سید قطب مرحوم سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے کہا کہ میں نے آپ کا رسالہ "اسمعی یا مصر!" پڑھا، یا لیت مصر قد سمعت (خدا کرے مصر نے سن لیا ہو[1])

بعض دوسرے رسائل

اس مضمون کے علاوہ میرے تین اور رسالے اس زمانۂ قیام میں شائع ہوئے، ایک المد والجزر فی تاریخ الاسلام" دوسرے "شاعر الاسلام الدکتور محمد اقبال"، تیسرے سعودی ریڈیو پر کی ہوئی دونوں تقریروں کا مجموعہ "بین العالم وجزیرۃ العرب" کے نام سے، ان رسائل کے ذریعہ جو بڑے اہتمام سے اہلِ علم اور اہلِ فکر کو پیش کئے گئے، میرے خیالات وافکار کی اشاعت ہوئی اور علمی وادبی حلقے میں تعارف ہوا۔

خصوصی روابط

مصر کے نامور ادباء میں سوائے ڈاکٹر طٰہٰ حسین پاشا کے جو اس وقت وزیر تعلیم ہو گئے تھے اور اکثر بیرونِ ملک کے دوروں پر رہتے تھے اور ڈاکٹر محمد حسین ہیکل کے (جن سے نہ ملنے کی کوئی وجہ اس وقت یاد نہیں) تقریباً ان تمام ادباء سے ملاقاتیں ہوئیں، اور بعض کی مجلسوں میں شرکت کا اتفاق ہوا، جن کا ذکر اوپر آچکا ہے ان میں سب سے زیادہ ربط قدرتاً ڈاکٹر احمد امین بک سے رہا جنھوں نے ہماری کتاب "ماذا خسر العالم" شائع کی تھی، علماء میں سے شیخ حسنین محمد مخلوف، اور شیخ احمد محمد شاکر سے

---

[1] یہ رسالہ اب مصنف کے مجموعہ مضامین "العرب والاسلام" میں شامل ہے اور علاحدہ بھی ملتا ہے۔

زعماء اور قائدین میں سے اللواء صالح حرب پاشا اور مفتی امین الحسینی سے، اساتذہ میں سے ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ (استاذ کلیۃ اصول الدین) اور ڈاکٹر احمد الشرباصی سے، جماعتوں میں سے الاخوان المسلمین اور اس کے نوجوان قائدین اور داعیوں سے۔

مصر کے اخوان المسلمین اور ان سے ربط وتعلّق

جب مصر کا سفر پیش آیا، تو مجھے اس کی شدید خواہش تھی کہ اخوان کی تحریک کا مطالعہ کروں اور اس کے متعلق براہِ راست معلومات حاصل کروں، شیخ کے پرانے رفیقوں، ان کے معتمدین اور ان کے تربیت یافتہ نوجوانوں سے ملاقات کروں اور اس عظیم الشان دعوت کے اصول ومبادی، اور اس کی کامیابی کے اسباب معلوم کروں، ۱۹۴۹ء میں شیخ کی شہادت کا واقعہ پیش آچکا تھا، لیکن میری خوش قسمتی سے اس وقت شیخ کے تمام پرانے رفقاء وشرکاء کار اور ان کے تلامذہ وحلقۂ احباب کے خواص موجود تھے، میری عربی تصنیف "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" جو میرے سفر مصر سے چند ہی مہینے قبل شائع ہوئی تھی اخوان کے حلقہ میں کثرت سے پڑھی گئی تھی، اور اخوان نے اپنی روایتی فراخدلی اور بے تعصبی سے اس کو اپنے مخصوص تبلیغی لٹریچر میں جگہ دی تھی، یہ کتاب میرا ذریعۂ تعارف تھی، پھر ہندی مسلمان ہونا اور ایک معروف ادارہ سے تعلق رکھنا اخوان کے لئے (جو عالم اسلام کی وحدت اور تعارف وتعاون کے سب سے بڑے داعی ہیں) کافی وجہ کشش تھی، جہاں تک شیخ کے متعلق تاریخی وشخصی معلومات کا تعلق تھا اس کے لئے سب سے مستند اور قابلِ اعتماد ذریعہ ان کے والد محترم شیخ احمد عبدالرحمٰن البنّاء کی ذات تھی، جنھوں نے ازراہِ شفقت بزرگانہ اپنے قابلِ فخر وذریعہ نجات فرزند کے متعلق تمام ضروری وجزوی معلومات فراہم کیں[1]۔ ان کے علاوہ شیخ کے

[1] ملاحظہ ہو راقم سطور کا عربی روزنامچہ "مذکرات سائح فی الشرق العربی" الطبعۃ الثالثۃ ص ۶۰-۶۲

رفیقِ درس و شریکِ کار اور اخوان کے مربّی استاذ بہی الخولی (صاحب "تذکرۃ الدعاۃ") اس عاجز کے مخصوص دوستوں اور کرم فرماؤں میں تھے، انھوں نے بحیثیت ایک دوست، رفیق، مشاہد و معاصر کے اپنے مشاہدات، معلومات اور تاثرات سنائے، ان دونوں بزرگوں کے علاوہ، ان چند نوجوانوں سے بھی ملاقات ہوئی جو شیخ کے معتمد خاص، سکریٹری اور دست راست رہ چکے تھے، مثلاً استاذ صالح عشماوی مدیر الدعوۃ، استاذ منیر دلہ جج ہائی کورٹ، استاذ عبدالحکیم عابدین، استاذ سعید رمضان، استاذ فرید عبدالخالق، ان اصحاب سے شیخ کی زندگی اور ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کے متعلق مستند معلومات حاصل ہوئیں اور ایسا محسوس ہوا کہ ان حضرات سے ملنے کے بعد شیخ کی زیارت سے کُلّی طور پر محرومی نہیں رہی۔

ان اصحاب سے جو کچھ سنا اور خود شیخ کے جو اثرات دیکھے، اس سے اس بات کا یقین پیدا ہوا کہ ان کی شخصیت تاریخ کی ان غیر معمولی شخصیتوں میں سے تھی، جن کو اللہ تعالیٰ کسی تحریک و دعوت کو چلانے اور کسی عہد میں اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے پیدا فرماتا ہے اور اس کو قیادت کی وسیع اور متنوّع صلاحیتیں عطا فرماتا ہے، وسیع و روشن دماغ، گرم و پر محبت و درد مند دل، فصیح و بلیغ زبان، تسخیر کر لینے والے اخلاق، دل آویز شخصیت یہ ان کے عناصر ترکیبی تھے میں جب اقبالؔ کا یہ شعر پڑھتا ہوں تو بے ساختہ شیخ حسن البنّا کی شخصیت، آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبالؔ نے انہیں کو دیکھ کر کہا ہے ؎

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پرسوز

یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

بدقسمتی سے جس زمانہ میں میرا قیام مصر میں تھا، اخوان کی تحریک خلافِ قانون تھی اور ان کے اجتماعات نہیں ہو سکتے تھے، لیکن اس اعتماد کی بنا پر جو ان کے ذمہ داروں کو میری

حقیر ذات پر پیدا ہو گیا تھا مجھے ان کی مخصوص مجلسوں میں شرکت کی عزت حاصل ہوئی، مجھے ان کے حالات و خیالات سننے اور اپنے ناچیز خیالات پیش کرنے کا موقع ملا، ایک مخصوص مجلس میں جس میں اخوان کی مجلس انتظامی (مکتب الارشاد) کے ارکان اور دل و دماغ شریک تھے، مجھے منضبط طور پر اپنے خیالات اور تجربات پیش کرنے کا موقعہ ملا، اخوان نے ان کی جس درجہ پذیرائی کی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اس کو علٰحدہ رسالہ کی شکل میں شائع کیا، اور جب تک اخوان کی تحریک دوبارہ خلاف قانون قرار نہیں دی گئی، اس کے تین ایڈیشن شائع ہوئے[1]۔ اس رسالہ کا نام ہے "أرید أن أتحدّث إلی الإخوان" (اخوان سے دو دو باتیں) مجھے کسی دینی و سیاسی جماعت کے متعلق اتنی فراخدلی اور عالی ظرفی کا تجربہ نہیں ہو سکا۔

اسی زمانۂ قیام میں مجھے شیخ محمد الغزالی کی معیت میں (جو اخوانی لٹریچر کے سب سے بڑے مصنف ہیں) مصر کے قصبات اور دیہاتوں میں بارہا جانے کا اتفاق ہوا، ہر جگہ اخوان کے دینی جوش و خروش، مہمان نوازی اور اسلام دوستی، محبّت و اخلاص اور بے تعصّبی و وسیع النظری کے ایسے مناظر دیکھے جو ساری عمر یاد رہیں گے اور جن سے شیخ حسن البنّا کی تربیت و تاثیر اور ان کی مردم گری اور سیرت سازی کا اندازہ ہوا، اور معلوم ہوا کہ اس شعلۂ جوّالہ نے کتنی ایمانی حرارت پیدا کر دی ہے، اس تحریک کے مطالعہ اور جو لوگ اس سے متعلق تھے، ان کو قریب سے دیکھنے کے بعد، میں خاص طور پر جن پہلوؤں سے متاثر ہوا وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ اس تحریک نے ایک ایسی قوم اور سوسائٹی میں جو مغربی تہذیب اور تمدّن جدید کی خرابیوں سے پورے طور پر متاثر ہو چکی تھی اور اس سے پہلے ترکی سلطنت اور شخصی حکومت

---

[1] اس کے پہلے ایڈیشن پر شیخ محمد الغزالی نے، اور دوسرے ایڈیشن کے لئے شیخ حسن البنّا کے پہلے جانشین استاذ حسن الہضیبی مرشد عام نے مقدمہ لکھا، یہ بات بھی جماعتوں کی تاریخ میں خاص ندرت اور اہمیت رکھتی ہے کہ ایک ایسی کتاب پر جو تنقید و مشورہ سے خالی نہیں، جماعت کا سب سے بڑا ذمہ دار مقدمہ لکھے۔

کے اثرات سے متاثر رہ کر "طبقہ مترفین" میں شامل ہو چکی تھی، ایسی قوتِ عمل، جذبۂ سرفروشی سادگی و جفاکشی پیدا کردی جس کی نظیر اس زمانہ میں ملنی مشکل ہے اور خود اس کے ایک رہنما اور قائد (شیخ بہی الخولی) کے الفاظ میں ایک نرم و نازک قوم "الشعب الرخو الرّقیق" میں اس نے ایک نئی زندگی پیدا کردی، اور گویا اقبالؔ کے اس تخیّل اور تمنا کو پورا کیا۔ ع

کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

ان کی اس قوتِ عمل، جذبۂ سرفروشی اور عقابی شان دیکھنے کے لئے استاذ کامل الشریف کی کتاب "الاخوان المسلمون فی حرب فلسطین" کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

۲۔ دوسری چیز جس نے مجھے متاثر کیا وہ اخوان کی محبّت و گرم جوشی اور ان کے آپس کے تعلّقات ہیں، اتنا مستحکم رشتۂ اخلاق و مودّت اور احساس اخوّت و رفاقت میں نے کم دعوتوں اور جماعتوں میں دیکھا ہے، اخوان کی تحریک نے ایک ایسی عالمگیر برادری پیدا کردی، جس کا ہر فرد دوسرے فرد کو اپنا حقیقی بھائی سمجھتا ہے اور بغیر کسی جماعتی عصبیت و حمیت جاہلیہ کے اس کی مدد اور حمایت کے لئے تیار رہتا ہے، کسی مصری اخبار نے ایک مرتبہ طنز کے طور پر لکھا تھا (اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ انتہائی اعتراف ہے) کہ اگر شیخ حسن البنّا کو اسکندریہ میں چھینک آجائے تو اسوان (مصر کی جنوبی سرحد) میں "یرحمك الله" کی صدائیں بلند ہوں، نہ صرف اپنے "مرشد عام[1]" بلکہ ہر رفیق جماعت کے لئے ان کا یہی جذبہ اور طرزِ عمل ہے، وہ عام طور پر ایک دوسرے سے تعارف انہیں الفاظ میں کراتے ہیں "اخوك فی الله فلان" ان کے طرزِ عمل اور سلوک سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس اخوۃ فی اللہ پر عقیدہ رکھتے ہیں اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں

---

[1] اخوان کی اصطلاح امیر جماعت کے لئے

۳۔ تیسرا پہلو جس نے مجھے بہت متاثر کیا یہ ہے کہ اس تحریک کا زندگی سے قریبی تعلّق ہے، وہ زندگی سے بچ کر نہیں نکلتی، بلکہ اس پر اثر انداز ہوتی ہے اس کے مسائل اور مشکلات کو حل کرنے کی کوشش کرتی ہے، عوام سے اور عملی زندگی سے اس کا تعلق ہے، اس نے عوام کی زندگی میں دخل دیا ہے، اس کی خرابیوں کی اصلاح کی ہے اور قدم قدم پر ان کی مدد کی کوشش کی ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کی کامیابی اور مقبولیت اور تاثیر میں اس کو بڑا دخل ہے۔

۴۔ اس کا چوتھا روشن پہلو یہ ہے کہ اس نے دینی و علمی اختلافات سے بچ کر اپنا کام کیا یہ چیز اس کے کمزور پہلوؤں میں بھی شمار کی جاسکتی ہے مگر عالم اسلام کے موجودہ دینی و اخلاقی زوال، الحاد و زندقہ کے حملہ اور مسلمانوں کے ذہنی انتشار کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ ایک اسلامی دعوت کے لئے خوش قسمتی سمجھی جائے گی کہ وہ اپنا وقت اور قوت خالص اصلاحی و تعمیری کام اور اساسی دعوت کے فروغ میں لگائے۔

۵۔ اخوان کی تحریک کا سب سے کامیاب اور روشن پہلو یہ ہے کہ اس نے مصر (اور اس کی پیروی میں ممالک عربیہ) کے بڑھتے ہوئے الحاد و لادینیت کے دھارے کو روکا اور دین کے استخفاف و بے وقعتی اور ذہنی ارتداد و بغاوت کا جو رجحان روز افزوں تھا اس پر اثر انداز ہوئی، جو لوگ مصر کی صحافت و ادب سے واقف ہیں، وہ خوب جانتے ہیں کہ اس ملک میں دین کے خلاف ایک منظم سازش اور کوشش تھی، مصر کے ادیبوں اور صحافیوں، مصنفین و باحثین سب نے دین کے خلاف ایک محاذ بنا رکھا تھا اور انقلاب فرانس کے علمبرداروں کی طرح وہ پوری مصری اسلامی سوسائٹی کو اپنے "ترقی پسند" ادب، اپنے "شک آفریں خیالات و تحقیقات" اپنے طنز و تمسخر سے

ڈائنامیٹ کر رہے تھے اور" یوحی بعضھم إلی بعض زخرف القول غرورا" کا مصداق تھے اس متحدہ محاذ کے خلاف کسی دینی جماعت، حتّٰی کہ ازہر تک میں آواز بلند کرنے اور اس کا مقابلہ کرنے کی جرأت نہ تھی، اخوان کے مخالفین کو بھی اعتراف ہے کہ اخوان کی تحریک نے اس مورچہ کو کمزور وخوف زدہ کر دیا، الحاد کی علانیہ دعوت دینے اور دین کے استخفاف کی جرأت بڑے بڑے زعمائے ادب کو نہ رہی، اخوان نے غیور نوجوانوں اور صاحب حمیت مسلمانوں کا ایک ایسا لشکر پیدا کر دیا کہ ملحدین کو اپنے ملحدانہ خیالات وتصنیفات کی اشاعت، اور اخبارات ورسائل کو دین واسلامی تہذیب کے ساتھ تمسخر واستہزاء کی جسارت باقی نہ رہی، پھر اس کے ساتھ اس نے اسلام پسند ادیبوں، ناقدین واہلِ قلم اور ماہرین فن کی ایسی جماعت پیدا کی جو علمی وفنی طور پر، ان ملاحدہ کا مقابلہ کر سکیں اور اسلامی ادب کو پیش کریں، اخوان کا یہ کارنامہ اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ کوئی شخص جس کے دل میں نورِ ایمان ہے اس کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا راقم سطور کے سامنے چونکہ ان ممالک کی سابقہ زندگی، اور موجودہ دینی وفکری انقلاب ہے اور اس کو اپنے طویل قیام کی بنا پر اس کا مشاہدہ وتجربہ ہو چکا ہے کہ اخوان نے جدید نسل کے دل ودماغ کو کس طرح متاثر کیا ہے اور دین وشعائرِ دین کے اظہار و اعلان کی کیسی جرأت پیدا کر دی ہے اور جو لوگ دینی مظاہر وشعائر اور دینی عقائد و حقائق کے اظہار میں شرمندگی اور حقارت محسوس کرتے تھے اب کس طرح علانیہ منظر عام پر دینی فرائض وشعار کو ادا کرتے ہیں اور احساس کہتری کے بجائے برتری کا احساس رکھتے ہیں، ان ذاتی مشاہدات وتجربات کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان میں میری زبان سے ایک تقریر میں اخوان کے متعلق بے ساختہ یہ لفظ نکل گئے کہ:

"لا یحبّهم إلّا مومن ولا یبغضهم إلّا منافق" (اخوان سے اسی کو محبت ہوگی جس کے دل میں ایمان ہے، اور اسی کو نفرت ہوگی جس کے دل میں نفاق ہے۔)

تاریخ اسلام میں جن جرائم اور سفاکیوں نے ملّتِ اسلامیہ کو عظیم ترین نقصان پہنچایا، اور تاریخ کا دھارا بدل دیا، ان میں ایک شیخ حسن البنّا کا مجرمانہ قتل ہے جس نے کم سے کم مشرق وسطیٰ کو ایک مفید ترین شخصیت سے محروم اور صالح دینی انقلاب سے عرصہ تک کے لئے بہت دور کر دیا۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر اخوان کچھ عرصہ اور عملی سیاست میں حصہ نہ لیتے (یا اس عملی سیاست میں الجھانہ لئے جاتے) اور اپنا اصلاحی و دعوتی کام پوری قوت سے جاری رکھتے تو ممالک عربیہ میں ایک اسلامی انقلاب برپا ہو جاتا، اور ایک نئی زندگی پیدا ہو جاتی، مجھے مستند اور باوثوق و متعدد ذرائع سے معلوم ہوا کہ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں شیخ حسن البنّا کو خود اس کا شدید صدمہ اور قلق تھا کہ ان کو قبل از وقت سیاسی میدان میں اترنا پڑا، اور ان کا دامن ان کانٹوں سے الجھ گیا، ان کو اس کی بڑی تمنا تھی کہ ان کو پھر خالص دعوتی و تربیتی کام کا موقعہ ملے اور وہ جماعت اور جمہور مسلمین میں وہ استعداد پیدا کر لیں، جس کے بعد وہ ہر طرح کی ذمّہ داری کو پورا کر سکیں اور ہر امتحان و آزمائش سے گزر سکیں۔

سوڈان

۲۸ر شعبان ۱۳۷۰ھ (۳ر جون ۱۹۵۱ء) کو ہم قاہرہ سے شلّال کے لئے روانہ ہوئے، فراعنہ کے پایۂ تخت مصر کے بالائی علاقہ صعید میں اقصر سے گزرتے ہوئے شلّال پہنچے، جہاں ٹرین کا سفر ختم ہوا، اور ہم وادی حلفا کیلئے جہاز میں سوار ہوئے، یکم رمضان ۱۳۷۰ھ (۶ر جون ۱۹۵۱ء) کو ٹرین پر سوار ہو کر ۲ر رمضان ۱۳۷۰ھ (۷ر جون ۱۹۵۱ء) کو الخرطوم البحری پہنچے، سوڈان کے مشہور دینی و روحانی قائد سید میرغنی پاشا کا مہمان بن کر ہم نے ان کے ایک معتمد خاص شیخ طیب عبد المقصود کے یہاں قیام کیا، اس سفر میں مولانا عبید اللہ صاحب میرے

ساتھ تھے، الخرطوم البحری میں دس روز قیام کیا، رمضان کا زمانہ تھا اور سوڈان میں سخت گرمی کے ایام، پھر بھی ہم نے مختصر قیام سے پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی، سوڈان کے اعیان اور معززین میں سے سیّد علی میرغنی پاشا، استاد اسمٰعیل بک ازہری (جو بعد میں سوڈان کے وزیر اعظم ہوئے) شیخ شوقی اسد (سکریٹری جمعیۃ التبشیر الإسلامی) جامع مسجد کے امام شیخ محمد عوض، مزدوروں کے لیڈر اور سوڈان کی جمعیۃ الشبان المسلمین کے صدر الحاج محمد موسیٰ سلیمان سے طویل اور مفصّل ملاقاتیں ہوئیں، ہندوستان کے دعوتی کام کا تعارف ہوا، اس تازہ دم عرب مسلم قوم کی (جو ابھی تک بہت سے اسلامی، عربی اخلاق کی حامل ہے، لیکن مصر کے علمی اور سیاسی اثر میں ہے) کی ذمّہ داریاں، افریقہ میں دعوت اسلامی کے وسیع امکانات اور روشن مستقبل کی طرف اشارہ کیا گیا اور بتایا گیا کہ سوڈان اور افریقہ دنیا کی تاریخ میں ایک اہم رول ادا کر سکتے ہیں، تقریباً ہر برِاعظم اپنا کردار ادا کر چکا، اور اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کا اظہار کر چکا ہے، صرف افریقہ باقی ہے جس کو (اگر وہ داعی قوم کے صحیح اوصاف سے متصف ہو جائے) اللہ تعالیٰ قیادت کا مقام اور دعوت کا کام سپرد فرما سکتا ہے لیکن یہ اس وقت ممکن ہے جب کہ سوڈانی بھائی اپنی قدر و قیمت کو پہچانیں اور اس کو اچھی طرح استعمال کریں۔

دمشق میں

۱۲ رمضان ۱۳۷۰ھ (۱۷ جون ۱۹۵۱ء) کو ہم سوڈان کے سفر سے فارغ ہو کر قاہرہ کیلئے روانہ ہوئے اور ۱۷ رمضان ۱۳۷۰ھ (۲۲ جون ۱۹۵۱ء) کو قاہرہ پہنچ گئے، جہاں دو روز ٹھہر کر ۱۹ رمضان (۲۴ جون) کو طیارہ سے ہم دمشق کیلئے روانہ ہوئے اور دو گھنٹے میں ہم براعظم افریقہ سے براعظم ایشیا پہنچ گئے اور دمشق کی اس تاریخی محبوب سرزمین پر قدم رکھا جو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا مدفن اور کبار اولیاء و علماء کا مولد و مسکن رہا ہے[1]

[1] مورخین کا خیال ہے کہ حرمین شریفین کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اتنی بڑی تعداد کہیں آرام فرما نہیں، جتنی (باقی اگلے صفحہ پر)

شام کے علماء و ادباء سے تعارف اور دینی و علمی مرکزوں کی زیارت

دمشق پہنچ کر ہوٹل قصر الاندلس میں قیام کیا (جو دمشق کے مرکزی و پُرفضا مقام مرجہ میں واقع ہے) چند دن کے بعد اپنے محترم دوست سید محمود الحافظ کے اصرار سے ہم لوگ ان کے خسر شیخ عبدالوہاب الصلاحی جو قصر جمہوری کے امام تھے، اور شہر کے صلحاء و معززین میں ان کا شمار تھا، کے دولت خانہ منتقل ہو گئے، جہاں گھر کی سب سہولتیں حاصل تھیں۔ شام کی کُل مدّت قیام ۴۸ دن اور دمشق کی مدّتِ قیام ۲۴ دن تھی —— یہ مدّتِ قیام کمیّت کے اعتبار سے کچھ طویل نہ تھی، لیکن کیفیت، مصروفیت اور فوائد کے لحاظ سے عریض تھی، ہم نے تقریباً اس ڈیڑھ مہینے کی مدّت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کی، ملک کے مختلف علمی، دینی، ادبی حلقوں کے ممتاز لوگوں سے تعارف اور تبادلۂ خیال کی کوشش کی، سیاسی و حکومتی حلقہ مصر میں بھی ہمارے دائرہ کار سے باہر تھا، یہاں بھی باہر رہا، علماء میں سے شیخ مکی الکتّانی، شیخ احمد الدقر، علامہ شیخ محمد بہجۃ البیطار، شیخ ابوالخیر میدانی، ڈاکٹر مصطفیٰ السّباعی، استاذ محمد المبارک، استاذ مصطفیٰ احمد الزرقا، شیخ محمد احمد دہمان (صدر الدراسات الإسلامیۃ) ڈاکٹر ابوالیسر عابدین (علامہ شامی کے پوتے اور مفتی جمہوریہ) اور شیخ احمد کفتارو[1]، شیخ محمد سعید برہانی، ادباء میں مشہور شاعر محمد علی الحومانی، استاذ تیسیر ظبیان، محمد کمال خطیب، مصنفین اور محققین

(مسلسل) .... شام میں بالعموم اور دمشق میں بالخصوص ہے۔ سرزمینِ شام میں آرام فرمانے والے صحابہ میں حضرت بلال حبشیؓ مؤذن رسولؐ اللہ، امین الامّت حضرت ابوعبیدہؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت ابوالدرداؓ، حضرت سعد بن عبادہؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت دحیہ کلبیؓ کا نام تاریخ میں ملتا ہے، علماء و محدثین میں سے ابن الصلاح ذہبی، مزّی، مورخین میں سے ابن خلکان، ابن عساکر، ابن کثیر، ائمہ اسلام میں سے نووی ابن تیمیہ، ابن قیّم، صوفیائے کبار میں سے ابراہیم ابن ادہم، بایزید بسطامی، شیخ اکبر محی الدین ابن عربی مجاہدین میں سے نورالدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی اسی خاک دمشق میں آسودۂ خاک ہیں۔ رحمہم اللہ جمیعاً

[1] موجودہ مفتی جمہوریہ شام

میں علامہ محمد کرد علی، استاذ محمد عزۃ دروزہ، استاذ خلیل مردم بک، علامہ شیخ عبدالقادر مغربی سے روابط قائم ہوئے۔ نوجوان اور صحیح الفکر اساتذہ میں سید عبدالرحمٰن الباانی سے خاص ربط رہا، وہ ہمارے پورے قیام دمشق میں ایک رضاکار سکریٹری کی حیثیت سے ہماری رہبری، رفاقت اور مدد کرتے رہے وہ کلیۃ المعلمین (TRAINING COLLEGE) کے ایک ممتاز استاذ بڑے باخبر باسلیقہ اور صاحب فکر نوجوان تھے۔

دمشق و شام کے اداروں اور علمی ادبی مرکزوں میں ہم نے دمشق میں اخوان المسلمین کا مرکز جامع الدقاق، شام کی شہرۂ آفاق اور قدیم ترین اکیڈمی المجمع العلمی، مشہور کتب خانہ اور نادر ذخیرۂ کتب کتب خانہ ظاہریہ، قدیم اور تاریخی مدرسہ دار الحدیث جس میں امام نوویؒ درس دیتے تھے، مشہور اور تاریخی سیرگاہ غوطہ دمشق کی سیر کی، شامی پارلیمنٹ کے ایک ہنگامہ خیز اجلاس میں بھی شرکت کی۔

بیت المقدس و الخلیل

بیت المقدس جاکر مسجد اقصیٰ کی زیارت کا شرف بھی حاصل کیا، رمضان کے آخری دن گزار کر وہیں عید کی نماز پڑھی وہیں اپنے ملک کے محبوب مسلمان رہنما مولانا محمد علی جوہر کی قبر کی زیارت کی، متبرک شہر الخلیل میں بھی دو دن گزارے، بیت اللحم کے پاس سے بھی گزرے الھیئۃ العلمیۃ الإسلامیۃ کے اجتماع میں شرکت کی، الکلیۃ العلمیۃ الإسلامیہ کا بھی معائنہ کیا، دمشق کی الجمعیۃ الغراء اور النادی العربی اور جمعیۃ التمدن الإسلامی کے جلسوں میں بھی شرکت کی۔

دوسرے تاریخی شہر اور مقامات

شہروں اور مقامات میں حمص، حماۃ معرۃ النعمان اور حلب کی سیر کی اور ترکی کے حدود حارم تک گئے۔

شاہ عبداللہ والئ اردن وقدس

بیت المقدس کی زیارت کے سلسلہ میں جو سفر کیا گیا اس میں واپسی پر ہماری ملاقات شرق اردن کے حکمراں شاہ عبداللہ سے بھی ہوئی، ان کو ہماری آمد کا علم سفیر افغانستان شیخ محمد صادق مجدّدی کے ذریعہ ہوا، جو مصر سے ہم سے واقف تھے اور جن کی ضیافت کریمانہ اور میزبانی میں ہم نے مسجد اقصیٰ میں رمضان کے آخری دن گزارے تھے، ہم عمّان میں اپنے میزبان کے گھر پر تھے، اور دسترخوان پر بیٹھ چکے تھے کہ بادشاہ کی طرف سے بلاوا آیا، ہم وہاں گئے ان کے ساتھ کھانا کھایا۔ اور ان سے دعوتی انداز میں ان کے خاندان، ان کی سابق تاریخ اور بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ کی تولیت کی نازک ذمّہ داری، اور اس کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر بے تکلّف گفتگو کی[1]۔ شاہ سے تین دن کے بعد دوبارہ ملاقات ہوئی، ہم دونوں نے شہر کی جامع مسجد میں نماز پڑھی تھی، ان کی نظر مجھ پر پڑ گئی، انھوں نے دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا، اس عرصہ میں وہ "ماذا خسر العالم" پڑھ چکے تھے، جو میں نے ان کو پچھلی ملاقات میں پیش کی تھی، انھوں نے اس پر تبصرہ کیا، میں نے ان کو مسجد اقصیٰ کی دیکھ بھال اور پناہ گزینوں کی طرف توجہ کرنے کی دعوت دی۔ اور اپنے دو رسالے "بین العالم وجزیرۃ العرب" اور "شاعر الإسلام الدکتور محمد اقبال" پیش کئے، تقدیری بات ہے کہ اگلے جمعہ کو وہ مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھنے کے لئے گئے اور وہیں شہید کر دیئے گئے، جس کی اطلاع مجھے جمعہ ہی کے دن دمشق کی جامع محیّ الدین ابن عربی میں شیخ احمد کفتارو کے درس میں ہوئی۔ "وکان امر اللہ قدرا مقدورا"

---

[1] تفصیل ملاحظہ ہو "شرق اوسط کی ڈائری" ص ۳۳۱-۳۳۴

المیۂ فلسطین کے بارے میں معتبر معلومات اور عینی شہادتیں

عمّان و بیت المقدس کے سفر میں فلسطین کے بارے میں معتبر و ذمّہ دار اشخاص کے ذریعہ وہ افسوسناک حقائق معلوم ہوئے جن کا علم کسی کتاب کے مطالعہ سے نہیں ہو سکتا تھا، اس کا لُبّ لباب یہ ہے کہ مسئلہ فلسطین ایک ڈرامہ تھا جس کو انگریزوں اور ان کے پٹھوؤں نے پہلے سے تیار کر رکھا تھا، اس کے کردار عرب، عرب بادشاہ اور حکومتیں تھیں، یہ ڈرامہ فلسطین کے اسٹیج پر کھیلا گیا اور عالم عرب اور عالمِ اسلام کی آنکھوں میں دھول ڈال کر برطانیہ اور صیہونی یہودیوں کے منصوبے کو پورا کیا گیا، یہ ایک سوچی سمجھی شاطرانہ اسکیم تھی، مسلمانوں کی اس ذلّت و رسوائی کے معاملہ میں آزاد فلسطینی قوم سب سے زیادہ بے قصور ہے، اصلاً فلسطین کا خون عرب حکومتوں اور ان کے قائدین اور عرب لیگ کی گردن پر ہے، بعض لوگوں نے رو رو کر یہ داستانِ رُسوائی سنائی، ان میں مسجدِ اقصیٰ کے امام اور وہاں کے مقیم، معمّر شیوخ اور اہلِ حمیت عرب تھے، میں نے خود بھی مسجدِ اقصیٰ کے چند روزہ قیام میں فلسطینیوں کو پردیسیوں، یتیموں کے حال میں دیکھا، ان کے دل ٹوٹے ہوئے اور سر جھکے ہوئے تھے، میں نے ان کو شکستہ خاطر اور زخم خوردہ پایا، وہ ایسے واقعات بیان کرتے جو آنکھوں کو اشکبار اور دل کو غمزدہ بنا دیتے عرب زعماء اور ملک کے قائدین پر سے ان کا بھروسہ اُٹھ چکا تھا۔

مسئلہ فلسطین پر تقریر

شام کے قیام میں جن خطابات اور تقریروں کی توفیق ہوئی، ان میں سب سے اہم وہ مقالہ تھا، جو ۲۳ جولائی ۱۹۵۱ء کو میں نے دمشق یونی ورسٹی کے ہال میں ایک ممتاز اور صاحبِ فکر مجمع کے سامنے پڑھا، میں نے اس مقالہ کی عمّان اور بیت المقدّس کے سفر کے درمیان تیاری کی تھی، اس کا عنوان تھا،

"شهادة العلم والتاريخ فی قضية فلسطين"[1] (مسئلہ فلسطین کے بارے میں علم و تاریخ کی شہادتیں) جلسہ کی صدارت یونی ورسٹی کے عیسائی وائس چانسلر استاذ قسطنطین زُرَیق نے کی جن کا رسالہ اس المیہ سے متعلق "معنی النکبۃ" کے نام سے شائع ہو چکا تھا، جلسہ میں سامعین کی بڑی تعداد موجود تھی اور ہال اپنی وسعت کے باوجود بھرا ہوا تھا۔ حاضرین میں پارلیمنٹ کے اسپیکر ڈاکٹر معروف الدوالیبی، شامی سفیر متعین پاکستان عمر بہاء الامیری، اور متعدد ممبرانِ پارلیمنٹ، یونیورسٹی کے پروفیسر، اور ماہرینِ تعلیم موجود تھے، دمشق کے علمائے کبار میں سے علامہ بہجۃ البیطار، استاذ سعید الافغانی، استاذ نمر المصری، استاد امین المصری، شیخ احمد کفتارو شیخ مکی کتانی، اور شیخ احمد الدقر تشریف رکھتے تھے، علامہ محمد بہجۃ البیطار نے مقرر کا سامعین سے تعارف کرایا، مقالہ کے بعد ڈاکٹر مصطفٰی السباعی[2] نے اپنے مخصوص انداز میں اس پر تبصرہ کیا، اور مقالہ کے بنیادی خیالات ونظریات کی تائید کی، مقالہ میں ان اہم اسباب سے بحث کی گئی، جو المیۂ فلسطین کے ذمہ دار ہیں، ان میں پہلا سبب اپنے اصول وعقیدہ پر مرمٹنے اور جان کی بازی لگا دینے والے جذبہ کا فُقدان تھا، دوسرے اس ذہنی ونفسیاتی کیفیت کا فقدان جس کو اقبالؔ نے اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

تیسرا سبب یہ ہے کہ عرب حکومتوں اور قوموں میں کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا جس کے دل ودماغ پر فلسطین کا مسئلہ چھا جائے اور اس کی صلاح الدین ایوّبی کی طرح وہ کیفیت ہو جائے

---

[1] یہ مقالہ بعد میں "العوامل الاساسية فی كارثة فلسطين" کے نام سے شائع ہوا۔

[2] مشہور عرب فاضل، اسلامی قائد ومصنّف اور شام کی جماعت اخوان کے مرشد عام (امیر) دمشق یونیورسٹی میں قانون اسلامی کے نامور پروفیسر

جس کو ان کے سکریٹری ابن شدّاد نے اس طرح بیان کیا ہے "معلوم ہوتا تھا کہ ماں کی گود میں اس کے اکلوتہ بچّہ کو کسی نے حلال کرکے ڈال دیا ہے" فلسطین کا مسئلہ جب کبھی حل ہوگا، اسی طرح حل ہوگا، کانفرنسوں، ریزولیشنوں اور خوشامدوں سے حل نہیں ہوگا۔[1]

شام کی دوسری تقریریں

اس تقریر کے علاوہ جس کا دمشق کے دینی علمی حلقہ میں اچھا اثر محسوس ہوا "الهيئة العلمية الاسلامية" (قدس) "جمعية التمدّن الإسلامي" میں اور "الجمعية الغراء" میں مجھے خطاب اور اپنے خیالات و تجربات پیش کرنے کا موقعہ ملا۔ علماء کے سامنے میں نے براہِ راست رابطہ پیدا کرنے، عمومی دعوت اور مدارس میں اس کام کی ضرورت پر زور دیا، اور ان خطرات کی نشان دہی کی، جو عوام سے الگ تھلگ رہنے، ان سے ربط نہ قائم کرنے، ان کے دینی و شہری شعور کو بیدار نہ کرنے کی صورت میں پیش آسکتے ہیں۔

دمشق کی ایک تقریر میں، میں نے کہا کہ جس طبقہ کے ہاتھ میں ملکوں کی زمام کار ہے اسلام پورے طور سے ان کے حلق سے نہیں اترا، ان کا اسلام پر ایک دین اور ضابطہ حیات کی حیثیت سے ایسا ایمان نہیں ہے جیسا مغربی تہذیب کے اصولوں اور اس کی افادیت پر ہے، اسی کے ساتھ اکثر عرب ممالک کی مسلم آبادی، سیاسی شعور اور بیداری میں ابھی نابالغی کے مرحلہ میں ہے، ان کو دوست دشمن کے فرق کی تمیز نہیں، قوم کا اجتماعی ضمیر بیدار نہیں ہے اور جب تک وہ بیدار نہ ہو کسی خیر کی امید نہیں، ان تقریروں کے علاوہ میں نے ایک روز (۲۳ شوال، ۲ر جولائی) دمشق یونی ورسٹی کی جامع مسجد میں جمعہ کا خطبہ بھی دیا، جس میں نوجوان طلبا کی عمر، ذہن، تعلیم کا لحاظ کرتے ہوئے خطاب کیا گیا تھا۔

---

[1] یہ مقالہ بیروت کے ایک ممتاز فاضل اور دردمند مسلمان ڈاکٹر خالدی نے علاحدہ سے شائع کیا، اب وہ مصنف کے مجموعہ مضامین "المسلمون وقضية فلسطين" میں شامل ہے

حضرت خالد سیف اللہ کے شہر حمص میں تقریر

حمص میں (جو اسلامی فتوحات کی ایک بڑی کڑی اور سیف اللہ خالد بن ولید کی آرام گاہ ہے) کے مرکز اخوان المسلمین میں (۲۹ر جولائی ۱۹۵۱ء کو) میری ایک ولولہ انگیز تقریر ہوئی، جس میں میں نے سرزمین شام، خاص طور پر حمص کے تاریخی شہر سے اپنی واقفیت و عقیدت کی تاریخ بیان کی اور بتایا کہ کس طرح ہمارے بچپن میں ہمارے خاندان میں واقدی کی کتاب "فتوح الشام" کے منظوم ترجمہ "صمصام الاسلام" کے پڑھنے کا رواج تھا، اور اس نے ہمارے ایمان کی بالیدگی و ترقی اور ذہنی تربیت میں کیا حصّہ لیا، میں نے کہا کہ شام و حمص کے رہنے والو! یہ تاریخ تمہارے ملک میں تیار ہوئی، اس نے ہندوستانی مسلمانوں کو وہاں کی اکثریت کی قومیت و سیرت اور فلسفہ میں تحلیل ہونے سے روکا، آج بھی وہ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ایمان کی بالیدگی، روح کی تازگی اور قلب کی حرارت کا سرچشمہ ہے، عالم اسلام کو اب پھر ایک سیف اللہ کی ضرورت ہے کیا آپ عالم اسلام کی اس کی کھوئی ہوئی تلوار مستعار دے سکتے ہیں، عالم اسلام کی سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ حقیقت کے بجائے صورت نے اس کی جگہ لے لی ہے۔ اس کی حیات نو اور قوت کا ایک ہی راستہ ہے کہ وہ صورت کے بجائے حقیقت بن جائے۔ چونکہ یہ تقریر اہل حمص کے حسب حال تھی، اس لئے لوگ اس سے بڑے متاثر ہوئے۔

حماۃ کے ایک جلسہ میں بھی اخوان کے مرکز میں اس سے ملتی جلتی ایک تقریر ہوئی حلب کے بھی ایک بھرے ہوئے جلسہ میں میری ایک پُرجوش تقریر ہوئی جس میں عہد ماضی میں دنیا میں عربوں کے غلبہ کا راز بیان کیا اور قرن اول کے ان داعیان اسلام اور فاتحین کا امتیاز بتایا، جو جزیرۃ العرب سے اسلام کی اشاعت اور دنیا کو انسانوں کی غلامی، مذاہب کے

ظلم وجور اور مادّی زندگی کے کال کوٹھری سے دینِ صحیح، توحید خالص اور روح وقلب کے وسیع آفاق کی طرف منتقل کرنے کے لئے نکلے تھے، پھر بتایا کہ عرب اپنے عالمی مرکز کی طرف کیوں کر لوٹ سکتے ہیں، عرب نعرۂ قومیت کے ساتھ روحانی قیادت اور عالمی مرکزیت کی توقع نہیں کر سکتے، اگر وہ ایسا کریں گے تو ان قوموں کو بھی اپنی پرانی قومیتیں یاد آئیں گی، جن کو ترک کر کے وہ وحدتِ اسلامی اور اخوتِ انسانی کے دائرہ میں داخل ہوئے۔

زیارتِ قبور

حمص میں صحابہ میں سے حضرت خالد بن ولیدؓ، خلفاء میں سے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ، دمشق میں مشائخ واولیاء میں سے شیخ محی الدین ابن عربیؒ، مشاہیر علماء میں سے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور علامہ ابن قیمؒ، مجاہدین میں سے سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کی قبر کی زیارت کی، اور فاتحہ پڑھا۔ حماۃ میں مشہور مؤرخ ابوالفداء حموی معرّۃ النعمان میں مشہور شاعر ابوالعلاء معرّی کی قبر پر بھی گیا۔ جس کا دیوان میں نے طالب علمی میں بڑی محنت سے پڑھا تھا، اور اس کا بہت سا کلام مجھے زبانی یاد تھا۔

حجاز کو واپسی اور مشغولیتیں

۱۲/ اگست ۱۹۵۱ء کو دمشق سے بذریعہ ہوائی جہاز مدینہ کی طرف پرواز کی، اس پورے سفر میں مولانا عبیداللہ صاحب بلیاوی ہمارے ساتھ رہے، مدینہ طیبہ میں ہم کو اپنے عزیز رفیق محمد رابع ندوی سلمہ ومولوی سیّد محمد طاہر مل گئے، چند دن مدینہ طیبّہ میں قیام کر کے ہم لوگ مکہ مکرمہ آئے جو اس پورے سفر کا نھایۃ المطاف تھا، مکہ معظمہ میں پانچ مہینے مزید قیام رہا۔ جس کے دوران ہم تیسرے حج سے بھی مشرّف ہوئے، اس حج میں رفیق محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی بھی شریک تھے اور وہ سخت گرمی میں پڑا تھا۔

حج کے بعد پھر مکہ معظمہ میں طویل قیام رہا، اس اثناء میں ان دوستوں سے ان روابط و

تعلقات کی تجدید ہوئی، جو مکہ معظمہ کے قیام میں خاص طور پر بستان بخاری کے اجتماع کے بعد پیدا ہو گئے تھے، میری سعودی ریڈیو پر دو مزید تقریریں ہوئیں، ایک تقریر "من غار حراء" کے عنوان سے ہوئی، جس میں، میں نے اس پر روشنی ڈالی کہ اسلام کی صبح صادق کے طلوع سے دنیا میں کیا روشنی پھیلی، انسانیت کے الجھے ہوئے مسائل کا کیا حل عمل میں آیا اور اس کے مختلف النوع اور کثیر التعداد فتنوں کی کون سی کلید مہیا ہوئی، جو آج بھی حیاتِ انسانی کی شاہ کلید (MASTER KEY) ہے۔ درس گاہ نبوت نے مختلف ضرورتوں کے لئے کیسے انسانی ماڈل تیار کر کے اور ان کو زندگی کے ہر ہر محاذ پر کس طرح متعین و مامور کیا؟ اور انھوں نے دنیا میں کیا انقلاب برپا کر دیا؟ یہ دراصل ریڈیو کے ڈائریکٹر شیخ محمد شطا کا دیا ہوا موضوع "القضايا الانسانية وحلولها الإسلامية" تھا جس کو بدل کر میں نے "من غار حراء" کر دیا، کہ غار حرا ہی انسانیت کی صبح سعادت کا مطلع اور نئی انسانی تاریخ کا آغاز تھا۔

ایک دوسری تقریر "اقبال ان کی زندگی، ان کا پیغام" تھا جس کا مقصد عرب نوجوانوں کو اسلام کے مطالعہ کی طرف متوجہ کرنا تھا، ان تقریروں کے علاوہ میرا ایک اہم مضمون، وہاں کے واحد عربی اخبار "البلاد السعودية" میں "کیف توجه المعارف" (تعلیم کی پالیسی اور طریق کار) کے عنوان پر شائع ہوا، بعض اہل علم، اہل قلم نے بھی اس عنوان پر خامہ فرسائی کی، جن میں شیخ محمد علی الحرکان (حال سکریٹری جنرل رابطہ عالم اسلامی) خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اداروں میں سے المعهد السعودی اور تحضیر البعثات اور طائف کے كلية الشريعة میں تقریریں ہوئیں۔

طائف کا سفر بھی ایک یادگار سفر تھا، جو شیخ محمد سرور الصبّان کی دعوت و

ضیافت میں ہوا، اس سفر میں عزیزان محمد رابع ندوی، مولوی معین اللہ صاحب ندوی ہمراہ تھے اور شیخ احمد عبد الغفور عطار رہبر و معرّف، طائف کے مشہور فندق التیسیر میں قیام رہا، اور امیر طائف کی ایک خصوصی دعوت میں شرکت کا اتفاق بھی ہوا۔

مکہ معظمہ میں وادی فاطمہ کا ایک تبلیغی سفر بھی ہوا، جس میں حجاز کے متعدد مشہور ادیب صحافی اور تعلیم یافتہ نوجوان شریک تھے، حجاز کے اس طویل قیام کے بعد اکتوبر ۱۹۵۱ء کو ہندوستان رضوانی جہاز سے واپسی ہوئی۔ واپسی میں مولانا محمد میاں فاروقی الہ آبادی کا ساتھ رہا، عزیز محمد رابع ہمراہ تھے، سمندر پرسکون تھا اور موسم پُر لطف، اس طرح تقریباً ۱۳-۱۴ مہینے کے بعد حجاز و مشرق کے سفر سے واپسی ہوئی۔

لکھنؤ کے اسٹیشن پر تبلیغی احباب اور لکھنؤ کے دوستوں کی ایک بڑی تعداد استقبال کے لئے موجود تھی، انھوں نے فرمائش کی کہ میں اسٹیشن سے قریبی مسجد میں سفر کا ماحصل سناؤں میں نے مختصر تقریر کی اور اقبال کے دو شعر پڑھے۔

سنی نہ مصر و فلسطیں میں وہ اذاں میں نے دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشۂ سیماب
وہ سجدہ روحِ زمیں جس سے کانپ جاتی تھی اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

مولانا مدنیؒ کا ایک مکتوب

یہاں پر حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا ایک مکتوب درج کیا جاتا ہے، جو بھائی صاحب کے نام لکھا گیا تھا، بھائی صاحب نے ازراہِ شفقت مصر میں میری حقیر دعوتی کوششوں کی اطلاع اپنے ایک خط میں مولانا کو دی تھی، تاکہ وہ خوش ہوں اور میرے حق میں دعا فرمائیں ۱۵ ربیع الاوّل ۱۳۷۰ھ کا لکھا ہوا مکتوب گرامی یہاں درج کیا جاتا ہے کہ اس کو اپنے حق میں ایک بشارت اور تبرک سمجھتا ہوں۔

محترم المقام زید مجدکم،   السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

مزاج مبارک۔ والانامہ باعث سرفرازی ہوا۔

مولوی علی میاں صاحب کی خبریں روساءِ تبلیغ مولانا محمد یوسف صاحب اور دیگر حضرات سے معلوم ہوتی رہتی تھیں، مگر آپ کی تحریر سے تفصیلات معلوم ہوئیں اور مزید اطمینان ہوا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ، وہ کریم کارساز موصوف کو مفتاحِ خیر اور مغلاقِ شر بنائے اور حضرت سید صاحب شہید قدس اللہ سرہ العزیز کی تجدید ملت اسلامیہ کی خدمت علیّہ کا علمبردار بنا کر نعمائے لدنیہ سے مالامال کرے، آمین۔

والسّلام

ننگِ اسلاف حسین احمد غفرلہ،

۵ اربیع الاول ۱۳۷۰ھ

باب چہاردہم

مخلوط اجتماعات، چند سفر، کچھ نئی تصنیفات

(اکتوبر ۱۹۵۱ء — اپریل ۱۹۵۶ء)

مخلوط اجتماعات اور انسانیت و اخلاق پر تقریریں

اس طرزِ فکر کے نتیجے نے جس نے اپنا کام کرنا چھوڑا نہیں تھا اور جس نے گرد و پیش کے حالات و واقعات سے آنکھیں نہیں بند کی تھیں اور جس کے سامنے ماضی کے تجربات حال کے حقائق اور مستقبل کے خطرات بھی تھے، تبلیغی سفروں اور ان اجتماعات میں جن کی قیادت و امارت اس زمانہ میں میرے اور مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کے ہاتھ میں تھی، ایک نئے رُخ اور شعبہ کا اضافہ کیا، یہ وہ مخلوط اجتماعات تھے جن میں غیر مسلموں بالخصوص تعلیم یافتہ حضرات کو اہتمام سے دعوت دی جاتی، اور ان کو اور ان کے ذہن کو سامنے رکھتے ہوئے اس زبان میں تقریر کی جاتی جو ان کے لئے زیادہ سے زیادہ قابلِ فہم اور پرکشش ہو، اس لئے اس میں انگریزی کے مقابل الفاظ اور ہندی کے آسان و مروّجہ الفاظ استعمال کئے جاتے۔

یہ اقدام اس خیال پر مبنی تھا کہ ہندوستان میں رہ کر ہندوستان کی (غیر مسلم) اکثریت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو بہرحال اس ملک پر حاوی اور اثر انداز ہے اور رہے گی

اور جو نہ صرف اسلام کے عقائد و حقائق و دعوت سے ناآشنا، مسلمانوں کے معتقدات، ان کی زندگی کی بنیادوں اور ان کی (وسیع معنی میں) تہذیب اور ملّی شخصیت سے ناواقف بلکہ متوحّش ہے، مزید برآں سیاسی صف آرائی، پاکستان کے قیام اور کوتاہ اندیش مقررین کی اشتعال انگیزی نے اس کو مسلمانوں سے متنفّر اور بدگمان بنا دیا ہے، اس اکثریت کو نظر انداز کرنا، اور اس کو کچھ سننے اور جاننے کا موقعہ نہ دینا، اپنی ملت کے حق میں بھی خطرناک ہے اور ملک کے حق میں بھی مضر ہے، یہ غلطی بہت قدیم زمانہ سے چلی آرہی ہے، اور اس کا نتیجہ ہے کہ جب مسلمانوں کی سلطنت و اقتدار گیا، تو سب کچھ گیا اور ایسا معلوم ہوا کہ مسلمان اس ملک میں خلا میں ہیں، یا الگ تھلگ جزیرہ میں بستے ہیں۔

لیکن غیر مسلم اکثریت کے ان افراد کو متوجہ کرنے اور ان کے ذہن و ضمیر تک پہنچنے کا کوئی راستہ اس وقت زندگی کے مشترک مسائل، انسانیت اور اخلاق، اور ملک کے مفاد کے تذکرہ اور تمام مسائل و مصائب کے حل کی نشان دہی کے سوا نہیں اور یہی طریقہ ان کو اسلام کے مطالعہ اور مسلمانوں کے سمجھنے اور ان کو ان کا صحیح مقام دینے پر اور اس خداداد دولت (مسلمانوں کی موجودگی) سے فائدہ اٹھانے پر جو اس ملک کی تاریخ نہیں بلکہ تقدیر بن گئی ہے، آمادہ کرسکتا ہے۔

لیکن یہ کام بہت نازک تھا اس کے لئے بڑے سلیقہ، احتیاط، اظہارِ خیال پر قدرت اور مخاطبین کی نفسیات سمجھنے کی ضرورت تھی، ذرا سی بے احتیاطی سے یہ دعوت "وحدت ادیان" کے لئے راستہ ہموار کرسکتی ہے۔ دوسری طرف مخاطبین کے اس شوق کو ختم کرسکتی ہے جو ایک مرتبہ جلسہ میں آچکے ہیں، اس لئے یہ نازک کام زیادہ تر میں اور کم تر مولانا منظور صاحب نعمانی انجام دیتے تھے اور الحمد للہ یہ تجربہ بہت کامیاب ہوا۔

مصر اور شام سے واپسی پر لکھنؤ کی تبلیغی جماعت کے زیر اہتمام امین الدولہ پارک میں جس کو جھنڈے والا پارک بھی کہتے ہیں، اور جہاں تحریکِ خلافت کے وقت سے لے کر اس وقت تک اہم سیاسی جلسے ہوتے رہے اور گاندھی جی اور موتی لال نہرو سے لے کر مولانا محمد علی اور جواہر لال نہرو نے ہمیشہ تقریریں کی ہیں۔ ایک عمومی اور مخلوط جلسہ ہوا جس میں مسلم اور غیر مسلم سبھی شریک تھے، میں نے وہاں خدا پرستی اور نفس پرستی کے عنوان سے ان دو متوازی فلسفۂ حیات اور عالمگیر مذہبوں پر تقریر کی، جنھوں نے دنیا کو منقسم کر رکھا ہے اور دونوں کے نتائج اور زندگی پر اثرات کی وضاحت کی۔ بعض لوگوں کا اندازہ ہے کہ اس جلسہ میں حاضرین کی اتنی تعداد تھی جو بڑے سے بڑے سیاسی رہنما حتیٰ کہ جواہر لال صاحب کے خطاب میں بھی دیکھنے میں نہیں آئی، من جانب اللہ بات تھی کہ مضامین کی ایسی آمد اور تقریر میں ایسی روانی اور جوش تھا کہ سامعین ایک سکتہ کے عالم میں تھے اور ایسی خاموشی تھی جس کو (PIN DROP SILENCE) سے تعبیر کیا جاتا ہے بہت سے رکشے والوں نے جن کا اڈہ قریب تھا، سواری لینے سے انکار کر دیا اور کھڑے سنتے رہے، اس جلسہ کی ایک خصوصیت یہ تھی جو میرے لئے بڑی اہمیت رکھتی ہے، کہ بھائی صاحب مرحوم بھی پاس کی ایک عمارت میں بیٹھے ہوئے تقریر سن رہے تھے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اپنی محنت اور تربیتِ ذہنی پر مسرور و مطمئن ہوئے ہوں گے۔

اس کے بعد باقاعدہ یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک تقریر ۹ جنوری ۱۹۵۴ء کو گنگا پرشاد میموریل ہال لکھنؤ میں کی گئی جس میں شہر کے سربرآوردہ حضرات اور غیر مسلم تعلیم یافتہ افراد کی خاص تعداد شریک تھی، اس سلسلہ کی دوسری چار تقریریں تبلیغی دورے میں جو یو۔ پی کے مشرقی اضلاع میں ہو رہا تھا، جون پور، غازی پور، مئو (اعظم گڑھ) اور گورکھپور میں کی گئیں، ان تقریروں کے

عنوانات سے (جن سے زیادہ تفصیل اس باب میں پیش نہیں کی جا سکتی) ان تقریروں کے مزاج، مقصد اور کچھ مشتملات کا اندازہ ہو سکتا ہے، یہ عنوانات بہ ترتیب لکھے جاتے ہیں:

۱۔ خرابی کی جڑ یہ ہے کہ برائی اور پاپ کی خواہش پیدا ہو گئی ہے۔

۲۔ آج دنیا پر خود غرضی اور بداخلاقی کا مانسون چھایا ہوا ہے، اسے چادروں سے روکا نہیں جا سکتا۔

۳ انسان خود پرست بھی ہے اور خود فراموش بھی۔

۴۔ دنیا کی موجودہ کشمکش یہ نہیں ہے کہ برائی دور ہو بلکہ یہ کہ برائی ہماری نگرانی اور انتظام میں ہو۔

۵۔ اعلیٰ اخلاقی قدریں دل کے اندر کھوئی ہیں، ان کی تلاش باہر ہے۔

ہر تقریر کا اختتام ایسے مضمون پر ہوتا تھا جس سے آسمانی ہدایت کی ضرورت نبوّت کی قدر و منزلت اور اس کی آخری شکل اسلام کی جستجو اور تلاش پیدا ہو۔[1]

اگلے سال ۱۹۵۵ء میں پھر دوسرے تبلیغی دورہ میں مخلوط اجتماعات کا اہتمام کیا گیا، ان میں جو مختلف مقامات پر تقریریں کی گئیں، ان کے عنوانات اور مقامات لکھے جاتے ہیں:

۱۔ زندگی میں فرد کی اہمیت، ہمارے اصلاحی کاموں کا ایک بڑا خلا (ٹاؤن ہال جونپور)

۲۔ ایک مقدّس وقف اور اس کا متولّی (بلند شہر اروڈ)

---

[1] ان تقریروں کا مجموعہ "پیامِ انسانیت" کے نام سے "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام" پوسٹ بکس ۱۱۹ لکھنؤ سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ موجودہ تہذیب کی ناکامی، ذرائع و مقاصد کا عدم توازن (وکٹوریہ پارک بنارس)

۴۔ ملک کی حقیقی آزادی (امین الدّولہ پارک لکھنؤ)[1]

ان تقریروں کے دوران اثر پذیری کے بعض عجیب واقعات پیش آئے جن کا ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا اور جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر یہ سلسلہ ان ضروری احتیاطوں کے ساتھ جاری رہتا، جن کا ذکر اُوپر آیا ہے اور تائیدِ الٰہی شاملِ حال ہوتی تو نہ صرف اسلام اور مسلمانوں کی ایک بڑی خدمت انجام پاتی بلکہ اس ملک کے بھی سب سے پیچیدہ مسئلہ کے حل ہونے کے امکانات پیدا ہو جاتے، لیکن جیسا کہ آئندہ صفحات سے معلوم ہوگا بعض اندیشوں اور زیادہ تر اس موضوع پر محتاط و مؤثر تقریر کرنے والوں کی کمیابی یا نایابی نے اور واقعہ یہ ہے کہ میرے بیرونی سفروں اور علمی مشاغل نے اس سلسلہ کو جاری نہیں رہنے دیا اور بقول شاعر ؎

زمانہ بڑے شوق سے سُن رہا تھا
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

ایک مرتبہ تو یہ پیش آیا کہ سیوان میں شب کے مخلوط اجتماع میں میں حسبِ معمول تقریر کر کے بیٹھنا چاہتا تھا کہ جلسہ سے آوازیں آئیں کہ ابھی اور فرمائیے ہم ابھی سننا چاہتے ہیں، ہم نے کہا کہ ہم لوگوں کا یہ معمول نہیں کہ جب بات پوری ہو جائے، تو بلا ضرورت تقریر جاری رکھیں، میں یہ کہہ کر بیٹھ ہی رہا تھا کہ ایک سن رسیدہ ہندو اسٹیج پر (WONDERFUL WONDERFUL) کے الفاظ کہتے ہوئے آگے بڑھے

---

[1] ان تقریروں کا مجموعہ "مقام انسانیت" کے نام سے "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام" پوسٹ بکس ۱۱۹ لکھنؤ سے مل سکتا ہے۔

اور کہا کہ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں، ہم لوگوں نے اس اندیشہ کے پیش نظر کہ کہیں اس جلسہ میں کوئی انتشار یا خیالات کا تضاد سامنے نہ آئے' ان کو مہذّب طریقہ پر بٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ اسٹیج تک پہنچ گئے، معززین شہر نے بتایا کہ یہ یہاں کے بہت کامیاب وکیل اور یہاں کی پرجا سوشلسٹ پارٹی کے سکریٹری یا صدر ہیں۔ انھوں نے مائک پر کہا کہ میں نے اپنی زندگی میں دو تقریریں سنی ہیں جن سے سب سے زیادہ متاثر ہوا ہوں۔ ایک مسٹر C.R.DASS کی تقریر' اور ایک آج مولانا صاحب کی' اور میں صاف کہتا ہوں کہ محمدؐ صاحب (انھوں نے صلّی اللہ علیہ وسلّم کا جملہ ادا کرنے کی کوشش کی تھی جو انھوں نے بار بار سنا تھا، لیکن وہ ادا نہ کرسکے) خدا کے سچّے پیغمبر ہیں۔ مولانا صاحب آپ صرف مسلمانوں ہی کے نہیں ہیں' ہم بھی آپ پر اپنا حق سمجھتے ہیں' ہم آپ کو آئندہ بھی یہاں آنے کی زحمت دیں گے۔

اسی تجربہ اور اقدام نے ۱۹۷۴ء میں "پیامِ انسانیت" کی تحریک کی شکل اختیار کرلی جس کا تجربہ پچھلے تجربوں کی طرح کامیاب رہا، اور اس نے اکثریت کے طبقہ' انصاف پسند غیر مسلموں اور دانشوروں میں اسلام اور سیرت کے مطالعہ کا کسی درجہ میں شوق اور جذبہ بھی پیدا کیا، ہندوستان انسانی بحران' اخلاقی انتشار' انسانی جان و مال کے عدم احترام و تحفظ، خودغرضی اور دولت پرستی کے جنون کی وجہ سے جس خطرہ سے دوچار ہے اس کا مہیب نقشہ پیش کرنے اور ملک کو بچانے کی جدوجہد کی دعوت دینے پر بعض ممتاز ہندؤں نے یہاں تک کہا کہ آج معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو اس ملک کے بچانے کی فکر ہم سے زیادہ ہے۔[1]

---

[1] پیامِ انسانیت کی تحریک کے اسباب و محرکات' اس کی ضرورت اور اس کے فوائد (باقی صفحہ پر)

دار العلوم دیو بند کی ایک تقریر

باوجود قدیم وقوی مسلکی دینی وعلمی رشتوں اور متعدد مابہ الاشتراک حقیقتوں کے ایّامِ طالب علمی کے ان چار مہینوں کے بعد سے جو دیوبند میں مولانا مدنیؒ کے درسِ حدیث میں شرکت میں گزرے، دار العلوم دیو بند سوائے ایک دو بار کے سفروں کے (جو دار العلوم ندوہ کے طلبا و رفقاء کے ساتھ دعوت وتبلیغ کے سلسلہ میں کئے گئے) کوئی رابطہ نہیں رہا، اس سے زیادہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ربط رہا جہاں بار بار طلباء کی یونین میں تقریر کرنے کا اتفاق ہوا، شعبۂ اسلامیات اور شعبۂ فلسفہ کی طرف سے بھی خطبات کا انتظام کیا گیا، جن میں یونی ورسٹی کی ممتاز شخصیتیں اور ذمہ دار بھی شریک ہوئے۔ لیکن اتفاقاً دیوبند کے اہتمام یا طلباء کی طرف سے کوئی ایسی تحریک وتقریب نہیں پیدا ہوئی کہ وہاں اپنے خیالات کے اظہار اور اساتذہ وطلباء سے خطاب کرنے کا موقع ملے، اس لحاظ سے حضرت شیفتہ کا یہ شعر کچھ بے موقع نہیں ہے ؎

جو راز مے کدہ میں ہے اک اک زبان پر
افسوس مدرسہ میں ہے بالکل نہاں ہنوز

دفعتہً اس کا ایک موقعہ غیبی طور پر پیش آگیا، وہ اس طرح کہ دار العلوم میں سجّاد لائبریری کے نام سے طلباء کی ایک انجمن تھی جس میں زیادہ تر بہاری طلباء دلچسپی لیتے تھے، ان میں سے بعض خاص طور پر مجھ سے واقف و مانوس[1] تھے، انھوں نے ۱۹۵۴ء

(مسلسل) .... سمجھنے کے لئے ملاحظہ ہو، مصنف کا پیام انسانیت کے سلسلہ میں مفصل انٹرویو جو "ایک اہم انٹرویو" کے عنوان سے ایک رسالہ کی شکل میں شائع ہوا ہے۔

[1] ان میں خاص طور پر مولوی فضل الرحمٰن سیوانی اور مولوی مجاہد الاسلام صاحب (قاضی امارت شرعیہ بہار واڑیسہ) کے نام یاد ہیں۔

کے آغاز میں مجھے دیوبند آنے اور سجّاد لائبریری کے زیر اہتمام ایک جلسہ میں خطاب کرنے یا مضمون پڑھنے کی دعوت دی، اس خیال سے کہ میں انکار یا کم فرصتی کا عذر نہ کردوں، انھوں نے مولانا مدنی اور مولانا اعزاز علی صاحب سے (جن کا میں خاص طور پر ادب کرتا تھا) سفارشی خط لکھوایا، یہ خط مرقع میں محفوظ ہے اور بجنسہ درج کیا جاتا ہے:

"جناب مولانا ابوالحسن علی میاں صاحب زید مجدہٗ۔ بعد از سلام مسنون

عرض آنکہ طلبائے دارالعلوم سجاد لائبریری کی پُر زور خواہش ہے

کہ وہ آپ کی گراں قدر نصائح اور ہدایات سے مستفید ہوں، امیدوار ہوں

کہ ان کی تمنّاؤں کو قبولیت سے نواز دیں۔

والسّلام

ننگِ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ

۲۰ جمادی الاوّل ۷۳ھ (۱۴ جنوری ۱۹۵۴ء)

انچہ استاذ ازل (مولانا مدنی عمت فیوضہم) گفت

هماں می گویم

محمّد اعزاز علی امروہی

۲۰ جمادی الاوّل ۷۳ھ"

یہ دعوت جس زمانہ میں ملی اس زمانہ میں میں شدید اختلاج قلب میں مبتلا تھا بیٹھ کر کوئی کام کرنا میرے لئے مشکل تھا، میں نے طلباء کی یہ دعوت قبول کر لی، جلسہ مارچ میں تھا، میں نے ایک مقالہ "طالبانِ علوم نبوّت کا مقام اور ان کی ذمہ داریاں" کے عنوان سے تیّار کرنا شروع کیا، اختلاجی کیفیت کی وجہ سے اس کا بڑا حصہ ٹہل ٹہل کر لکھوایا گیا، اس مضمون میں دینی مدرسے کا حقیقی منصب و مقام اور اس کے طلباء

وفضلاء کے فرائض وذمہ داریاں بتلانے، اور ان کو آگاہ کرنے کی کوشش کی گئی، کہ عصرِ جدید ان سے کس قسم کی توقعات رکھتا ہے اور اس دورِ انقلاب میں ان کو دین کی دعوت اور اس کی تفہیم وتلقین کے لئے کس قسم کی ذہنی، فکری، علمی اور اخلاقی وروحانی تیاریوں کی ضرورت ہے، اس مقالہ کی روح اور مرکزی خیال کا اندازہ کرسکنے کے لئے اس کے دو اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں مدرسہ[1] کی ذمہ داری وگراں باری کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا:

"دنیا میں ہر ادارہ، ہر مرکز، ہر فرد کو راحت وفراغت کا حق ہے، اس کو اپنے کام سے چھٹی مل سکتی ہے، مگر مدرسہ کو چھٹی نہیں، دنیا میں ہر مسافر کے لئے آرام ہے لیکن اس مسافر کے لئے راحت حرام ہے، اگر زندگی میں ٹھہراؤ ہو، سکون اور وقوف ہو تو حرج نہیں کہ مدرسہ بھی چلتے چلتے دم لے لے لیکن جب زندگی رواں اور دواں ہے تو مدرسہ میں جمود وتعطل کی گنجائش کہاں، اس کو قدم قدم پر زندگی کا جائزہ لینا ہے، بدلتے ہوئے حالات میں احکام دینے ہیں، نئے نئے فتنوں کا مقابلہ کرنا ہے، بھٹکے ہوئے قدموں کو راستے پر لگانا ہے، ڈگمگاتے ہوئے پیروں کو جمانا ہے، وہ زندگی سے پیچھے رہ جائے یا تھک کر بیٹھ جائے، یا کسی منزل پر قیام کرے یا اس کو کوئی مقام خوش آجائے تو زندگی کی رفاقت اور قیادت کون کرے ___؟ سرود ازلی اور پیغامِ محمدی اسے کون سنائے؟ مدرسہ کا تعطل اور قیادت

[1] مدرسہ کا لفظ یہاں پر اپنے وسیع اور عمیق معنی میں استعمال کیا گیا ہے یعنی دینی تعلیم اور مسلمانوں کی دینی و فکری قیادت کا مرکز، جس کی بنیاد کتاب وسنت اور تعلیماتِ نبوت پر ہے۔

سے کنارہ کشی، کسی منزل پر قیام خودکشی کا مرادف ہے اور انسانیت کے ساتھ بے وفائی کے ہم معنی ہے، اور کوئی خود شناس اور فرض آشنا مدرسہ اس کا تصور نہیں کرسکتا،،

علوم اسلامیہ کا زندگی سے ربط و تعلّق اور اس کے لئے ہمارے اسلاف نے جو کوششیں فرمائیں، ان کا بیان کرتے ہوئے عرض کیا گیا:

" عزیزو اور دوستو! نبوت نے ہم کو جو علوم و حقائق اور جو اصول و ضوابط عطا کئے ہیں، ان میں ایک شوشہ اور ایک نقطہ کی ترمیم ممکن نہیں، آپ کے اسلاف کا یہ تجدیدی کارنامہ ہے کہ انھوں نے ان میں کوئی تحریف اور کوئی تبدیلی نہیں ہونے دی اور اس ذخیرہ کو ہمارے ہاتھوں تک بے کم و کاست پہنچا دیا۔

لیکن اسی کے ساتھ اس حقیقت کو یاد رکھئے کہ ہمارے انہیں اسلاف نے ہر دور اور ہر عصر میں اس ذخیرہ کو زندگی میں منتقل کرنے کی کوشش بھی جاری رکھی، انھوں نے اپنی ذہانت اور محنت سے اس ذخیرہ کو ایک زندہ قابلِ عمل اور نمو پذیر ذخیرہ ثابت کیا، انھوں نے اس کی ایسی ترجمانی اور تشریح کی کہ ان کی معاصر نسلوں کے دماغوں نے اس کو بآسانی قبول اور ہضم کرلیا اور ان کو اپنے زمانہ، اپنی عقلی سطح اور اس ذخیرہ کے درمیان کوئی تفاوت اور فاصلہ محسوس نہیں ہوا، ان میں اصل شریعت، مقاصد دین اور منصوصات کے بارے میں پہاڑوں کی سی استقامت اور فولاد کی سی صلابت تھی لیکن اس کی تعبیر و تشریح میں، اس کی توضیح و تفہیم میں شاخ گل کی سی لچک اور ریشم کی سی نرمی

تھی، ان کا عمل دراصل سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کرّم اللہ وجہہٗ کی اس حکیمانہ ہدایت پر تھا

کہ "کلموا الناس علیٰ قدر عقولهم أتريدون أن يكذب الله ورسوله"

اس لئے انھوں نے ہر زمانہ کی عقلی سطح کے مطابق دین کی تشریح و ترجمانی کا فرض

انجام دیا، اور اس زمانہ کی نفسیات و ضروریات کا لحاظ کیا۔"

یہ جلسہ مارچ ۱۹۵۴ء میں ہوا، جس میں طلبائے دارالعلوم کی ایک بڑی تعداد شریک ہوئی اور انھوں نے ذوق و شوق سے سنا۔[1] اس مقالہ میں نئی تحریکوں سے گہری اور ناقدانہ واقفیت کی ضرورت، نئے مطالعہ کی مشکلات و ذمہ داریوں پر بھی روشنی ڈالی گئی، نیز ملکی زبان و ادب سے ربط و تعلق اور عربی زبان پر قدرت کی اہمیت پر بھی زور دیا گیا، آخر میں عقائد صحیحہ کی حفاظت اور نئے دور کے نئے فتنوں کے لئے سدِّ سکندری بن جانے کی دعوت پر اس کو ختم کیا گیا، اس مقالہ میں ایسی بنیادی اور ضروری باتیں آگئی ہیں کہ اگر میرا بس چلے تو مدارس عربیہ کے طلبا (بالخصوص دارالعلوم دیوبند اور اس کے مسلک کے مدارس کے طلبا) کے لئے فارغ ہونے سے پہلے اس کا ایک بار مطالعہ ضروری قرار دے دوں لیکن بقول سوداؔ ؎

دل درد سے خالی ہو مرا کس طرح سوداؔ

وہ ناشنوا حرف، میں گفتار فراموش

اس جلسہ اور مقالہ کے ذریعہ دارالعلوم کے طلبائے سے ربط و تعلق کی تجدید ہوئی اس کے کچھ عرصہ بعد مجھے وہاں کی اصلاح نصاب کی کمیٹی کا ایک رکن بنایا گیا جس کی جگہ

---

[1] یہ مقالہ پہلے ایک رسالہ کی شکل میں شائع ہوا، پھر مدارس عربیہ کی تقریروں کے مجموعے "پاجا سراغ زندگی" میں شامل کیا گیا، جسے "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام" لکھنؤ نے شائع کیا۔

مولانا سید سلیمان ندوی کی وفات سے خالی ہوگئی تھی، بھائی صاحب مرحوم کی وفات کے بعد (جو دار العلوم دیوبند کے ایک ممتاز فاضل بھی تھے اور مجلس شوریٰ کے رکن بھی) ان کی جگہ پر رکنیت کے لئے میرا انتخاب کیا گیا جس کا سلسلہ تادم تحریر جاری ہے۔

عرصہ کے بعد مجھے دوبارہ (۱۲ / اگست ۱۹۷۲ء کو) طلبائے دار العلوم سے خطاب کرنے کا موقعہ ملا اور میں نے "عصرِ جدید کا چیلنج اور اس کا جواب" کے عنوان سے ایک طویل تقریر کی، یہ تقریر بھی الگ رسالہ کی شکل میں شائع ہوئی اور بعد میں "پاجا سراغ زندگی" کے مجموعہ میں شامل کردی گئی۔

قیام پاکستان کے بعد کا پہلا سفر

پاکستان کے قیام کے بعد سالہا سال پاکستان جانے کی نوبت نہ آئی ۱۹۵۳ء میں پاکستان کے ارادہ سے دہلی تک گیا، لیکن وہاں ختم نبوت کی تحریک کے سلسلہ میں لاہور وغیرہ میں مارشل لا نافذ تھا۔ اس لئے دہلی سے واپس آگیا ۱۳۷۳ھ (۱۹۵۴ء) میں حضرت رائے پوری پاکستان گئے ہوئے تھے اور اس سال رمضان گھوڑا گلی (کوہ مری) میں کرنا طے ہوا تھا، دل میں پاکستان کا سفر اور حضرت کی معیت وصحبت میں رمضان گزارنے کا تقاضا اور عزم قوی پیدا ہوا۔ میں شعبان ۱۳۷۳ھ (مئی ۱۹۵۴ء) کی کسی تاریخ کو تنہا لکھنؤ سے لاہور کے لئے روانہ ہوا۔

لاہور میں دو تین دن اپنے مخلص ومحبوب دوست حاجی ارشد صاحب کے پاس قیام کرکے جس کے دوران حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری کی کئی بار زیارت کا شرف اور ان کی سرپرستانہ اور بزرگانہ شفقت کا حظ وکیف حاصل ہوا۔ راولپنڈی کے راستہ کوہ مری کے لئے روانہ ہوگیا۔ حضرت محمد شفیع قریشی صاحب اور ملک محمد دین صاحب

کی ضیافت و انتظام میں گھوڑا گلی میں مقیم تھے، سو سے اوپر مہمان تھے، پہاڑ کی چوٹی پر ایک معمور و عظیم خانقاہ کا منظر تھا، جس نے غیاث پور کی چشتی اور مکان شریف (ضلع گورداس پور) اور چینلی قبر دہلی کی نقش بندی خانقاہوں کی یاد تازہ کر دی تھی، مولانا سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کے صاحبزادے مولوی سیّد عطاء المنعم قرآن شریف سناتے تھے علماء و صلحاء کی ایک بڑی تعداد مقیم تھی اور شب و روز کی عبادات، نوافل اور تلاوت میں منہمک، میرا قیام عم محترم الحاج سیّد محمد خلیل صاحب نہٹوری اور ان کے فرزند جلیل سید محمد جمیل صاحب اکاؤنٹنٹ جنرل پاکستان کے ساتھ ایک ہی کمرہ میں تھا، افطار اور طعام اور تراویح کی نماز بالکل حضرت کے ساتھ ہوتی تھی اور حضرت کی خصوصی شفقت سے بہرہ ور تھا، عید کے بعد راولپنڈی میں دو چار دن قیام کر کے میں لاہور آگیا، جہاں ارشد صاحب کے پاس انارکلی میں ٹیلی گراف آفس کے کوارٹرز میں قیام کیا، اس کا افسوس اور حسرت رہی کہ اپنے محبّ و محبوب دوست مولانا مسعود عالم صاحب ندوی میرے اس سفر پاکستان سے دو مہینے پہلے ۱۶ر مارچ ۱۹۵۴ء کو راہیٔ ملکِ بقا ہو چکے تھے، وہ زندہ ہوتے تو ہم دونوں دوستوں کو ایک دوسرے سے مل کر کتنی خوشی ہوتی اور کیسی پُر لطف اور پُر مسرّت صحبتیں رہتیں، مولانا مسعود عالم صاحب تو سفر آخرت اختیار کر چکے تھے لیکن ایک دوسرے عزیز دوست اور سالہا سال کے رفیق مولانا محمد ناظم صاحب ندوی بحمد اللہ موجود تھے وہ میری پاکستان کی ہر آمد کے موقعہ پر بہاولپور سے لاہور سفر کر کے آتے اور کئی کئی روز قیام کر کے بیتے ہوئے دنوں کی یاد تازہ کرتے۔

لاہور میرے لئے لکھنؤ، رائے بریلی کے بعد سب سے زیادہ مانوس شہر تھا، میں نے وہاں اپنی طالب علمی کی بھی ایک خوشگوار مدّت گزاری اور مختلف موقعوں پر کئی کئی مہینے

کا طویل قیام بھی کیا، اس سے میرے بچپن، نوجوانی استفادۂ علمی واستفاضۂ روحانی کی بہت سی عزیز یادگاریں وابستہ تھیں، شادؔ عظیم آبادی کا یہ شعر میرے حسبِ حال تھا ؂

ہوں اس کوچہ کے ہر ذرّہ سے آگاہ
ادھر سے مدّتوں آیا گیا ہوں

پاکستان کے نظریہ سے اگرچہ اس وقت اصولاً اختلاف تھا، اور میں مسلمانوں کی پوری قوت کا ہندوستان میں رہ کر تبلیغ دین اور ایک بلند تر اخلاقی، روحانی، انسانی اور اسلامی زندگی کا نمونہ قائم کر کے وہاں کی اکثریت کو دینِ فطرت سے مشرف کرنے کے کام کو زیادہ ضروری اور مفید سمجھتا تھا اور میرے نزدیک اس کے روشن امکانات تھے، لیکن پاکستان بن جانے کے بعد اب اس کی مخالفت و بدخواہی کے بجائے اس کے لئے نیک تمنائیں اور پھلنے پھولنے اور ترقی کرنے کی دعائیں تھیں[1]، میں نے پاکستان کی حاضری کے ایک موقعہ پر کہا تھا کہ "سلطنت عثمانیہ کے بعد عالمِ اسلام کا کوئی ملک اور ملّتِ اسلامیہ کا کوئی کنبہ اور کوئی خاندان اس پوزیشن میں نہیں ہے، کہ عالمِ اسلام کے کسی مسئلہ میں اپنا سیاسی وزن ڈال سکے، یہ خدمت پاکستان (اگر وہ ان شرائط کو پورا کرے جو ایک صحیح اسلامی مملکت کے لئے ضروری ہیں) انجام دے سکتا ہے"۔

میں لاہور میں، اس شوق میں گھومتا پھرتا تھا کہ اپنی ابتدائی عمر کے ان مقامات کو دیکھوں، جہاں سے بے شمار مرتبہ گزرنا ہوا، لیکن مجھے شہر بہت بدلا ہوا نظر آیا، میں دوستوں سے کہتا تھا کہ لاہور کی وہ پہلی سی رونق اور بھیڑ بھاڑ نہیں ہے وہ کہتے تھے

---

[1] مولانا آزادؔ جیسے متحدہ اور غیر منقسم ہندوستان کے حامی اور محبِ وطن قائد نے جو آخر وقت تک پاکستان کے نظریہ کے مخالف رہے، پاکستان بن جانے کے بعد کئی بار فرمایا کہ اب جب پاکستان بن گیا ہے تو اس کو پھلنا پھولنا اور ترقی کرنا چاہیئے

کہ نہیں، ان سب چیزوں میں اب اضافہ ہی ہے۔

لاہور کا دوسرا سفر

اگلے سال ۱۹۵۵ء کی گرمیوں میں پھر لاہور جانا ہوا، خواہر زادۂ عزیز مولوی سید محمد ثانی مرحوم ساتھ تھے، اس سفر میں لاہور میں دریائے راوی کا وہ تاریخی سیلاب آیا جس نے ہمارے یہاں کے ۱۹۱۵ء کے طوفانِ نوح کی یاد تازہ کر دی، لاہور شہر کی بہت سی سڑکوں پر پانی آ گیا تھا، میں پشاور، کوہاٹ کے سفر پر تھا، "سیرت سید احمد شہیدؒ" کا مسوّدہ سلطان فاؤنڈری، واقع بادامی باغ کی ایک الماری میں چھوڑ کر گیا تھا، جو نشیبی علاقہ میں تھا، سیلاب کی خبریں ریڈیو سے نشر ہو رہی تھیں، طبیعت پر اچانک واپسی کا تقاضا ہوا، دوستوں کے اصرار کے باوجود کہ دس گیارہ سال کے بعد آنا ہوا ہے، دس دن تو ٹھہرنا چاہیئے، لاہور کے لئے روانہ ہو گیا، جب ٹرین لاہور کے اسٹیشن پر پہنچی تو خطرہ کے سائرن بج رہے تھے، یہ آخری ٹرین تھی جس کو گزرنے کی اجازت دی گئی، اس کے بعد رسل و رسائل منقطع ہو گئے، سلطان فاؤنڈری کے سامنے والی سڑک پر سیلاب کا پانی آ گیا تھا، اس پریشانی میں تالہ توڑ کر کتاب کا مسودہ نکالا، اور مال روڈ پر ڈاکٹر اسلم صاحب (برادر صوفی محمد اقبال) کے مکان کے بالائی حصہ میں پناہ لی، اسی قیام کے دوران مولانا شاہ حلیم عطا صاحب شیخ الحدیث دار العلوم ندوۃ العلماء کی وفات کی اطلاع ملی، جن کا ۲۰ر صفر ۱۳۷۵ھ (۹ر اکتوبر ۱۹۵۵ء) کو دماغی فالج کے نتیجہ میں انتقال ہوا تھا، علمی اور دینی خسارہ کے ساتھ یہ ایک ذاتی اور خاندانی حادثہ بھی تھا، جس کا بڑا اثر پڑا، اسی زمانۂ قیام میں عزیزی محمد میاں مرحوم کے جاری کئے ہوئے عربی رسالہ "البعث الإسلامی" کا پہلا نمبر ملا اور اس سے بڑی مسرت ہوئی کہ ایسے دعوتی رسالہ کی سخت ضرورت تھی۔

جامعہ سلفیہ میں ایک سپاس نامہ

لاہور کے انہیں اوّلین سفروں میں سے کسی سفر میں ہمارے فاضل دوست مولانا عطاء اللہ حنیف صاحب اور ان کے رفقائے نے ازراہِ محبّت جامعہ سلفیہ (شیش محل روڈ لاہور) میں میرے اعزاز میں ایک تقریب منعقد کی اور جماعت اہلحدیث کے ممتاز لوگوں کو جن میں بعض فضلائے ندوہ بھی تھے، مدعو کیا، میرے لئے یہ بات تو کچھ غیر معمولی اور حیرت انگیز نہ تھی کہ سیّد صاحب کی جماعت میں دونوں فکر اور دونوں عناصر شامل تھے، اور قیادت، مقصد کی وحدت، خلوص اور سچی روحانیت نے ان کو باہم شیر و شکر بنا رکھا تھا، ہمارے خاندان میں بھی اس سلسلہ میں وہ عصبیت نہیں پائی جاتی تھی جس کا تجربہ میں نے باہر نکل کر کیا، خود میرے دو استاد، شیخ خلیل ابن محمد عرب، اور شیخ تقی الدین الھلالی، اسی مسلک و جماعت سے تعلق رکھتے تھے اور میرے حدیث کے شیخ و استاد مولانا حیدر حسن خاں صاحب ٹونکی سخت حنفی تھے، ان اساتذہ کے تلمذ نے بھی میرے اندر ایک اعتدال اور وسعت پیدا کر دی تھی، اس لئے مجھے اس دعوت و اعزاز کے قبول کرنے میں کوئی تردّد نہیں ہوا، لیکن اس وقت مجھے حیرت بھی ہوئی اور ندامت بھی، جب مجھے وہاں ایک سپاس نامہ پیش کیا گیا، اور مولانا سید داؤد غزنوی صاحب نے (جو حقیقتاً میرے اساتذہ و بزرگوں کی صف میں بیٹھنے کے مستحق تھے) اس کو خود پڑھا، یہ ان کی بے نفسی اور تواضع کے ساتھ اس روحانی ربط و تعلق کا نتیجہ تھا، جو ان کے خاندان کو حضرت سیّد صاحب اور ان کے خاندان و مسلک کے ساتھ رہا تھا، ان کے صاحبزادہ مولانا سیّد ابو بکر غزنوی بھی میرے ساتھ بڑی محبّت فرماتے تھے، اس کا کچھ اندازہ، ان کے خطوط[1]

[1] ملاحظہ ہو "پرانے چراغ حصّہ دوم" مضمون مولانا سیّد ابو بکر غزنوی، صفحہ ۲۸۰-۲۸۲

سے ہوسکتا ہے۔

"تاریخ دعوت و عزیمت" کے سلسلہ کا آغاز

عرصہ سے یہ احساس دل میں چٹکیاں لینا تھا (اور اس کا تعلیم یافتہ اور دینی جذبہ رکھنے والے نوجوانوں کے حلقہ میں بیٹھ کر تجربہ ہوچکا تھا) کہ اچھے اچھے سنجیدہ حلقوں میں یہ خیال قائم ہوچکا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ میں اصلاح و تجدید اور انقلاب حال کی کوشش مسلسل اور غیر منقطع طور پر نہیں پائی جاتی۔ بلکہ اس میں بڑے گہرے اور لمبے شگاف ہیں جو صدیوں پر پھیلے ہوئے ہیں، کئی کئی صدی کے بعد کچھ شخصیتیں ابھرتی رہی ہیں، جنھوں نے بگڑے ہوئے حالات اور طاقتوں سے نبرد آزمائی کی، اور کوئی بلند قامت اور کوہ پیکر انسان ان پست قامت انسانوں کی طویل صف میں سر اٹھائے ہوئے نظر آتا ہے، ورنہ عام طور پر سیل حوادث، اور اقتدار اور وقت کے رجحان و مذاق کے ساتھ بہنے والے علما، مشائخ اور مصنفین و مفکرین نظر آتے ہیں۔

یہ بات (جیسا کہ میں نے تاریخ دعوت و عزیمت کے حصّہ اوّل کے دیباچہ میں لکھا ہے) دیکھنے میں بڑی معمولی معلوم ہوتی ہے، مگر اس کے نتائج بڑے اہم اور دوررس ہیں یہ اسلام کی اندرونی طاقت و صلاحیت سے ایک طرح کی بدگمانی اور مایوسی ہے، جو ہر زمانہ میں ضرورت کے آدمی اور اہل دعوت و عزیمت کو پیدا کرتی رہی ہے اور جس کی نظیر کسی دوسرے مذہب اور قوم میں نہیں ملتی، یہ احساس کہتری اور ذہنی شکست خوردگی کا نتیجہ ہے، جس کا ذمّہ دار درحقیقت اسلام کی حیات بخشی اور مردم آفرینی کا نقص نہیں تاریخ اسلام کے طرزِ تصنیف اور ترتیب کا نقص ہے، جو حکومتوں، سیاسی واقعات اور جنگوں کے گرد گھومتی رہی ہے، اور اس نے اسلام کی تاریخ، تجدید و اصلاح کو مرتّب

اور علمی انداز میں پیش کرنے کی سنجیدہ کوشش نہیں کی، مختصر الفاظ میں یہ تاریخ کا نقص نہیں، تاریخ نویسی کا نقص ہے، ایک مرتبہ جب ہہٹ میں شاہ مسعود صاحب کے دولت خانہ پر حضرت کا قیام تھا، ایک فقیر دوست غیر مسلم جو اسلام اور حلقۂ ذکر سے مانوس ہونے لگے تھے اور رائے پور آتے جاتے تھے، صبح کی ہوا خوری میں حضرت کے ساتھ تھے، حضرت نے ان سے فرمایا کہ اسلام کی حقانیت کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اسلام کو جس زمانے میں جس طرح کے مردانِ کار کی ضرورت پیش آئی، اللہ تعالیٰ ان کو پیدا کرتا رہا، اور جس زمانہ میں جس فتنہ نے سر اٹھایا، اس کا مقابلہ کرنے کے لئے خدا نے مناسب شخصیتوں کو پیدا کیا، حضرت کے اس مختصر جملہ نے میرے سامنے تاریخی وعلمی شواہد کا ایک لشکر لاکر کھڑا کر دیا، اور اس موضوع پر مفصل لکھنے کی تحریک پیدا کی، کہ ع

تو خود حدیث مفصّل بخواں ازیں مجمل

حُسنِ اتفاق کہ محرم ۱۳۷۲ھ (ستمبر ۱۹۵۲ء) میں لکھنؤ میں جماعت اصلاح وتبلیغ کی طرف سے اس کا انتظام کیا گیا کہ رفقائے جماعت کے سامنے چند ضروری عنوانات اور پہلوؤں پر ایسی تقریریں کی جائیں جن سے اُن کی ذہنی تربیت کا سامان ہو، اور ان کی معلومات اور واقفیت میں اضافہ، اس سلسلہ کا ایک عنوان "اصلاح وتجدید کی تاریخ اور اس کی اہم شخصیتیں" راقم سطور کے حصہ میں آیا، تقریباً ایک ہفتہ اس موضوع پر عرض کیا جاتا رہا۔ اس وقت صرف ایک مختصر یادداشت سامنے ہوتی تھی، اس میں کچھ عنوانات اور اشارے ہوتے تھے، جن کی مدد سے تقریر کی جاتی تھی، جماعت کے ایک دوست عبدالصمد صاحب بریلوی نے ان تقریروں کو اسی وقت منضبط کرنے کی کوشش کی، جب ان کے مسوّدہ پر نظر ڈالی گئی تو معلوم ہوا کہ اگر اس پر علمی وتاریخی انداز میں محنت کی جائے، اور اس کو

کتابی شکل میں منتقل کر دیا جائے تو یہ ایک بڑا مفید کام ہوگا، اس کام کی تکمیل سے نہ صرف اصلاح ودعوت کی تاریخ مرتب ہو جائے گی، بلکہ ضمناً مسلمانوں کی فکری وعلمی انحطاط وارتقاء کی تاریخ بھی وجود میں آجائے گی، خدا کے بھروسہ پر اس کام کا بیڑہ اٹھالیا گیا، شروع کرنے کے بعد اس کام کی مشکلات، تاریخ کی گمشدہ کڑیوں کی بازیافت اور ان کے ایک دوسرے سے مربوط کرنے کی نازک اور دشوار ذمہ داری کا اندازہ ہوا، لیکن اب یہ موضوع (مصنف کے مزاج اور افتادِ طبع کے مطابق) اس کے ذہن واعصاب پر مستولی ہو گیا تھا، اور دریا سے کمبل نکالنے والے کو کمبل نے پکڑ لیا تھا، حالت یہ ہوئی کہ مرشد محترم حضرت رائے پوریؒ مرکز میں مقیم ہیں، اور میں ہی اصل داعی اور میزبان ہوں، لیکن صبح کے ضروری کاموں سے فراغت کر کے مرکز کے بالائی حصّہ پر چلا جاتا، اور حضرت کے کھانے کے وقت تک لکھنے میں مشغول رہتا، کئی بار خیال آیا کہ حضرت میری اس غیر حاضری کو محسوس کرتے ہوں گے لیکن پھر اطمینان ہوتا تھا کہ اس کوشش کی تکمیل جب سامنے آئے گی، تو حضرت ہی سب سے زیادہ خوش ہوں گے۔

پہلی جلد اکتوبر ۱۹۵۴ء میں مکمّل ہوگئی، اس میں ایک بسیط اور پُر از معلومات مقدمہ کے علاوہ جس میں اصلاح وتجدید کی ضرورت اور تاریخ اسلام میں ان کے تسلسل کا بیان تھا، اور جس میں دوسرے مذاہب کی تاریخ میں تجدیدی شخصیتوں کی کمی کو ان مذاہب کی تاریخی شہادتوں کے ساتھ ثابت کیا گیا تھا حضرت عمر بن عبد العزیزؓ کی اصلاحی کوششوں (پہلی صدی ہجری) سے لے کر مولانا جلال الدّین رومیؒ (ساتویں صدی) کے تجدیدی وانقلابی فکری کارنامہ تک کی رُوداد درج تھی، اس کتاب کی اشاعت کے لئے دار المصنفین اعظم گڑھ سے زیادہ موزوں ادارہ نظر نہیں آتا تھا (اس وقت تک مجلس تحقیقات ونشریاتِ اسلام

کا وجود عمل میں نہیں آیا تھا) میں نے ادارہ کے ناظم برادر محترم مولانا شاہ معین الدّین صاحب ندوی کو اس کی اطلاع دی، انھوں نے بڑے قدر و شوق کے ساتھ دار المصنّفین کی طرف سے اس کی طباعت و اشاعت منظور کی اور وہ ۱۹۵۵ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی، اور علمی و اسلامی حلقوں میں توقع کے مطابق اس کا خیر مقدم ہوا۔

جیسا کہ اوپر گذرا اس کی سب سے زیادہ قدر مرشد محترم حضرت رائے پوریؒ نے کی یہاں پر حضرت کے خطوط کے چند اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں، ۲۲ر اکتوبر ۱۹۵۶ء کے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

"احقر آج کل آپ کی کتاب "تاریخ دعوت و عزیمت" سن رہا ہے۔ شاہ صاحب[۱] کے یہاں سے مل گئی تھی، ماشاء اللہ بہت اچھی کتاب ہے، آپ کو اللہ تبارک و تعالیٰ جزائے خیر مرحمت فرمائے، آپ نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے کتاب لکھی ہے واقعی یہ آپ کا بڑا کارنامہ ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ قبول فرمائیں، کیا عرض کروں ایسا ذوق معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کچھ اندازہ نہیں کو ہے۔"

۲۸ر نومبر ۱۹۵۶ء کے ایک مکتوب گرامی میں مولانا رومؒ کے ان اشعار کے نقل کرنے کے بعد، جو انھوں نے حضرت شمس تبریزؒ کے اشتیاق میں کہے تھے، ارشاد فرماتے ہیں:

"آپ کی کتاب دوسری تیسری دفعہ سن رہا تھا کہ آج اس کو قاضی احسان صاحب نے مانگ لیا، وہ لے گئے ہیں، آپ کی کتاب سے سیری نہیں ہوتی۔"

ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

"بہت ہی اچھا ہوگا، کتاب کی دوسری جلد بھی شائع ہو جائے۔"

---

[۱] شاہ محمد مسعود صاحب رئیس بہٹ سہارن پور

علماء اہلِ قلم و مصنفین میں سے سب سے زیادہ مخدوم محترم مولانا سیّد مناظر احسن گیلانی نے کتاب کی داد دی، جو خود اس موضوع پر شاید عالمِ اسلام میں کم سے کم ہندوستان میں لکھنے کا سب سے زیادہ حق رکھتے تھے اور جن کی تحریروں سے خود مصنّف نے بڑا فائدہ اٹھایا تھا، مولانا نے کتاب پاکر جو خط لکھا اس کا ایک اقتباس درج ہے:

"دعوت و عزیمت" کی تاریخ ملی ہے، اپنی گم گشتہ چیز ہاتھ آگئی ہے، خدا ہی جانتا ہے کتنی دفعہ اس کے مطالعہ سے استفادہ کرتا رہوں گا، پڑھ رہا ہوں اور جی سیر نہیں ہوتا، خدا ہی جانتا ہے میرے کتنے خوابوں کی تعبیر آپ کے ذریعہ پوری ہوگی"

الحمد للہ کہ اگست ۱۹۵۶ء میں اس کی دوسری جلد مکمّل ہوگئی، جو شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحؒ کے تذکرہ پر مشتمل اور ان کے ساتھ مخصوص ہے، اس کا پہلا ایڈیشن بھی دار المصنفین اعظم گڑھ کی طرف سے ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا، دوسری اور تیسری جلد کے درمیان میرے طویل سفروں اور دوسرے تدریسی و تبلیغی و تصنیفی مشاغل کی وجہ سے چھ سال کا طویل وقفہ ہوا، چونکہ حضرت کو معلوم تھا کہ اس تیسری جلد میں سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین محبوبِ الٰہی کا تذکرہ آئے گا، اس لئے حضرت کو اس جلد کا اور بھی زیادہ تقاضہ اور اشتیاق تھا، جب باہر سے حاضرِ خدمت ہوتا تو پہلا سوال یہی فرمایا جاتا کہ تیسرا حصّہ مکمّل کرلیا؟ بعض مرتبہ میں ذکر و سلوک کے سلسلہ میں اپنے نقص اور بے حاصلی کی شکایت کرتا، تو جواب میں صرف یہ ارشاد فرماتے، کہ "آپ تو "تاریخ دعوت و عزیمت" کا تیسرا حصّہ مکمّل کردیجئے"۔

ادھر راقم کا یہ حال ہوگیا تھا کہ گویا اس نے قلم رکھدیا ہے اور اس موضوع سے مناسبت جاتی رہی ہے "وَلِلّٰہِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" کہ اکتوبر ۱۹۶۱ء میں رائے بریلی کی سئی ندی میں سیلاب آیا، جس کے کنارہ ہم لوگوں کے مکانات ہیں، مجبوراً پاس کے

ایک گاؤں میدان پور میں جس کی سطح قدرے بلند ہے، پناہ لینی پڑی، اس حالت حصار میں کہ شہر اور لکھنؤ سے بھی آمد و رفت کے ذرائع یا تو بند تھے یا بہت دشوار، اس کے سوا کوئی چارہ اور مشغلہ نظر نہیں آیا، کہ جس طرح ابو تمّام نے سیلاب کی وجہ سے مجبور اور ایک ذی علم میزبان کے مکان میں محصور ہو کر "دیوانِ حماسہ" مرتب کر لیا، اسی طرح میں "تاریخ دعوت و عزیمت" کا تیسرا حصّہ ترتیب دوں، اس وقت میری نگاہ (موتیا بندھ کی وجہ سے) بہت کمزور ہو گئی تھی، عزیزی سیّد مشرف علی ندوی نے نقل و کتابت کی ذمّہ داری قبول کی، اور میں نے ایک یادداشت کی مدد سے جس میں "سیر الاولیاء" وغیرہ کے اقتباسات تھے کتاب لکھوانی شروع کر دی، اور تقریباً تین ہفتے میں حضرت سلطان المشائخ والا حصّہ مکمل ہو گیا، اگر کسی کتاب کی شدید ضرورت ہوتی تو ندوۃ العلماء کے وسیع کتب خانہ سے طلب کرتا، اور وہ مہیّا ہو جاتی، میں نے ایک عریضہ کے ذریعہ حضرت کو اس کی اطلاع دی، کہ ان کے ارشاد کی تعمیل ہو گئی، سیلاب کی زحمت دور ہونے کے فوراً بعد میں حاضر ہوا۔
حضرت نے میرے پہنچتے ہی کتاب سُنانے کا تقاضا کیا، ظہر کے بعد سے عصر تک اور عصر کے بعد سے مغرب تک برابر یہ سلسلہ جاری رہتا، کبھی کبھی کمرہ میں اندھیرا ہونے کی وجہ سے لالٹین جلا کر کتاب پڑھی جاتی، جب تک کتاب ختم نہیں ہو گئی کوئی دوسرا کام ان وقتوں میں نہیں ہوا، افسوس ہے کہ اسی کتاب کا دوسرا حصّہ جو حضرت مخدوم الملک شیخ شرف الدین یحییٰ منیری سے متعلّق ہے، حضرت کی زندگی میں مکمل نہیں ہو سکا، حضرت کے مرضِ وفات (اگست ۱۹۶۲ء) میں لاہور کے زمانہ قیام میں میں اس کی تکمیل میں مشغول تھا اور اس کا بہت سا حصّہ ہو چکا تھا، لیکن حضرت کی صحت اور مرض کی کیفیت اس کی متحمّل نہ تھی، کہ اس کو خدمت میں پیش کیا جا سکتا، حضرت کی وفات کے بعد اپریل ۱۹۶۳ء میں یہ حصّہ

مجلسِ تحقیقات ونشریات اسلام کی طرف سے (جس کا قیام ۱۹۵۹ء میں ہوچکا تھا) شائع ہوا، مجلس نے کتاب کے پہلے دونوں حصّے بھی شائع کئے اور اس کے کئی کئی ایڈیشن نکلے

حصّۂ چہارم میں جو حضرت مجدّد الف ثانیؒ کے ساتھ مخصوص تھا اور بھی دیر لگی کہ وہ کام پچھلے حصوں کے مقابلہ میں بھی (ان وجوہ کی بنا پر جن کا مقدمہ میں تفصیل سے ذکر ہے) اور بھی نازک اور دشوار تھا، اٹھارہ سال کے طویل وقفہ کے بعد، اپریل ۱۹۸۰ء میں اس کی توفیق ہوئی، اور ایک بڑا کام انجام پایا، الحمدللہ کہ تین حصّوں (حصّہ اوّل، دوم، چہارم) کا عربی میں، اور چاروں حصّوں کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہوگیا، اب صرف پانچواں حصّہ باقی ہے جو حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ، اور ان کی اولاد امجاد اور خلفائے نامدار کے ساتھ مخصوص ہوگا، ممکن ہے کہ بیرونِ ہند کی ان شخصیتوں اور ان کے کارناموں کا بھی ذکر آجائے جو شاہ صاحبؒ کی معاصر نہیں، اور اُن میں اور شاہ صاحبؒ کی دعوت و اصلاح میں کسی قدر مماثلت اور بعض باتوں میں اشتراک پایا جاتا ہے، سیرت سیّد احمد شہیدؒ کا کام بحمداللہ پہلے سے تکمیل پاچکا ہے، اس طرح یہ تاریخ اصلاح و تجدید تیرھویں صدی تک مکمل ہوجاتی ہے، مصنّف کے قلم سے اس کے بعد کی بھی چند جلیل القدر دعوتی و اصلاحی شخصیتوں کے تذکرے اور سوانح میں کتابیں نکل چکی ہیں، جو ان کے بعد کے عہد کی اصلاحی، تربیتی، روحانی اور دعوتی کوششوں پر روشنی ڈالتی ہیں۔[1]

[1] مثلاً "تذکرہ حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادیؒ" "سوانح حضرت مولانا محمّد الیاسؒ" "سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ"، "سوانح حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب سہارن پوریؒ"

باب پنجد ہم[15]

دمشق یونیورسٹی کی دعوت پر خطبات کا سلسلہ اور سفرِ شام، لبنان و ترکی

دمشق یونیورسٹی کا دعوت نامہ

مجھے مصر و شام کے سفر سے آئے ہوئے پانچ برس ہو رہے تھے اور بظاہر مشرق وسطیٰ اور بلادِ عربیہ کے کسی دوسرے سفر کا کوئی موقعہ اور تقریب نہیں تھی، حجاز اور عرب سے میرا رابطہ محض خط و کتابت یا نئے رسائل و تصنیفات کی اشاعت کے ذریعہ رہ گیا تھا، کہ اچانک جون ۱۹۵۵ء کی آخری تاریخوں میں فاضل گرامی اور اپنے عزیز و محترم دوست ڈاکٹر مصطفےٰ السّباعی کا خط ملا، جن سے شام کے قیام کے دوران دوستانہ اور برادرانہ روابط قائم ہو گئے تھے، وہ میری کتاب "ماذا خسر العالم" کے بڑے قدردان تھے اور میں ان کی محققانہ و مومنانہ تصنیف "السنّة ومكانتها في التشريع الاسلامي" سے جو اپنے موضوع پر منفرد تصنیف ہے، بہت متاثر تھا، وہ شامی پارلیمنٹ کے ممبر، اپنی ایک مخصوص اسلامی پارٹی کے صدر، اخوان کے نگراں کار اور دمشق یونیورسٹی میں اسلامی قانون کے پروفیسر تھے، انھوں نے اپنے اس خط میں بڑی مسرّت اور افتخار کے ساتھ اس کی اطّلاع دی تھی کہ بڑی کوششوں کے بعد دمشق یونیورسٹی (الجامعة السورية)

میں کلیۃ الشریعۃ (شریعت کالج) کھل گیا ہے اور اس سے شام کے دینی حلقوں میں مسرّت کی ایک لہر دوڑ گئی ہے، انھوں نے اس خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ کالج کی کمیٹی نے میرے ذمّہ یہ خدمت سپرد کی ہے کہ میں آپ تک اس کی یہ خواہش و درخواست پہنچا دوں کہ آپ دو سال یا ایک سال کے لئے اس میں تدریس کی ذمّہ داری قبول کرلیں اور یہاں آنا منظور کرلیں، اس سلسلہ میں آپ کے جو شرائط و مطالبات ہوں، ان سے مطلع کریں، اس خط پر ۲۲ر شوال ۱۳۷۴ھ، ۱۲ جون ۱۹۵۵ء کی تاریخ اور عمید کلیۃ الشریعۃ (شریعت کالج کے پرنسپل) کی حیثیت سے ان کے دستخط تھے۔

میں نے اس خط کے جواب میں ان کو اس کامیابی پر مبارکباد دی اور بحیثیت باضابطہ استاد کے اس کے اسٹاف میں شریک ہونے، اور سال دو سال اپنے مستقر (ہندوستان) سے (جہاں کام کا بڑا میدان اور مسلمانوں کی بڑی ذمّہ داری ہے) دور رہنے سے تو معذرت کی، لیکن اس پر آمادگی ظاہر کی کہ ایک محدود اور مختصر وقت کے لئے آؤں اور کسی موضوع پر منظم طریقہ پر مقالات پڑھوں، کالج کی کمیٹی نے اس کو منظور کرلیا اور صدر جمہوریہ شام محترم شکری القوتلی نے میرے استاد زائر VISITING PROFESSER ہونے کے کاغذ پر دستخط کر دیئے[1] ڈاکٹر مصطفےٰ السباعی نے اپنے مکتوب مورخہ ۱۱ر دسمبر ۱۹۵۵ء میں اس منظوری کی اطلاع دی اور میری اس تجویز کو بھی منظور کرلیا، کہ میں تاریخ اسلام کی عہد آفرین و انقلابی، اصلاحی و تجدیدی کوششوں اور ان کی اہم شخصیتوں پر لکچر دوں گا، میں نے اس موضوع کا انتخاب اس لئے کیا کہ اس عنوان سے میں کالج اور

---

[1] مرسوم نمبر ۱۵۲۷ تاریخ ۱۵ر اپریل ۱۹۵۶ء، اس مرسوم پر، اس وقت کے وزیر تعلیم مامون الکزبری کے دستخط بھی ہیں۔

یونیورسٹی کے نوجوان طلباء اور فضلاء و اساتذہ کے سامنے اپنے تاریخ کے مطالعہ کا وہ نتیجہ و ماحصل پیش کرسکوں گا، جو اس تاریخ ساز سرزمین میں نئے سرے سے دینی فکر و عمل اور اصلاح و انقلاب حال پر آمادہ کرسکے اور ایک مہمیز کا کام دے۔

اس خط و کتابت کے دوران میں رائے پور حاضر ہوا، یہ بات حضرت کے علم میں لایا اور اجازت طلب کی، حضرت نے بخوشی اجازت دی اور اس پر بڑی مسرّت کا اظہار کیا۔ مجھے اس کے بعد ہی ایک تبلیغی پروگرام میں شرکت کرنی تھی، جو یوپی کے مشرقی اضلاع سے تعلق رکھتا تھا، میں اسی پروگرام کے ماتحت رائے بریلی میں تھا، کہ مجھے یونیورسٹی کی طرف سے منظوری و موافقت کی آخری اطلاع ملی، وقت بہت کم رہ گیا تھا، غالباً تین ہفتے سے زیادہ وقت نہیں تھا، میں نے لکھنؤ واپس جا کر مقالات کی تیّاری کا کام شروع کردیا، چونکہ ٹھیک اسی موضوع پر تاریخ دعوت و عزیمت کی پہلی جلد مرتب اور شائع ہوچکی تھی اس لئے از سرِ نو مجھے محنت کرنے کی ضرورت نہ تھی، میں نے اس کو بنیاد بنا کر، عربی مآخذ کو سامنے رکھ کر مقالات لکھانے کا سلسلہ شروع کردیا، اس کے لئے میں نے عزیزی مولوی سعید الرحمٰن ندوی کے ابتدائی دو گھنٹے خالی کروالئے، وہ صبح مرکز چلے آتے تھے، میں جو کچھ لکھتا تھا اس کی وہ تبییض کرتے جاتے تھے، اس طرح محاضرات کا بڑا حصّہ تیار ہوگیا، جو رہ گیا تھا اس کو دمشق پہنچ کر مکمل کرنے کا ارادہ کیا، یہ طے ہوا کہ شعبان ۱۳۷۵ھ اپریل ۱۹۵۶ء سے ان محاضرات (لکچرز) کا سلسلہ شروع ہوجائے۔

میں اس حقیقت کو چھپانا نہیں چاہتا کہ مجھے ایک ترقی یافتہ عرب ملک (شام) کی ایک مؤقّر دانش گاہ کی طرف سے ایسی دعوت آنے پر بڑی مسرّت ہوئی، اور میں نے

اس کو ایک علمی اعتماد و اعزاز کا مرادف سمجھا، میں اپنی محدود علمی و ذہنی صلاحیت اور اپنی سطح اور حیثیت سے ناواقف نہ تھا، اس لئے الحمد للہ اس بارے میں کسی خود فریبی اور غلط اندیشی کا شکار نہیں ہوا، میں نے اس کو محض اللہ تعالیٰ کا انعام، والدہ کی دعاؤں کی قبولیت، بھائی صاحب کی شفقت اور اساتذہ کی محنت کا ثمرہ ہی سمجھا، لیکن فطری طور پر اس سے جو خوشی ہونی چاہیئے تھی اس سے انکار نہیں کرتا، اہلِ تعلّق کو بھی اپنے اپنے تعلق کے بقدر اس سے مسرّت ہوئی اور انھوں نے مبارک باد دی' یہاں صرف مولانا سیّد مناظر احسن صاحب گیلانیؒ کے ایک خط کا اقتباس (مورخہ ۹ جنوری ۱۹۵۶ء) نقل کیا جاتا ہے، جو انھوں نے اخباروں میں اس خبر کے شائع ہونے پر[1] تحریر فرمایا، اس کے لفظ لفظ سے ان کی محبّت و خلوص، بے نفسی اور اخلاقی بلندی کا اظہار ہوتا ہے:

"اخبار "الجمعیۃ" اسی کے بعد "مدینہ" میں بھی اس تاریخی امتیاز کی خبر پڑھی، جو صدیوں کے بعد ہندوستان کو حاصل ہوا، علامہ صفی الدّین بداؤنی[2] کے بعد شاید آپ دوسرے ہندی عالم ہیں جن کو شام میں پڑھانے اور اپنے علوم سے شامیوں کو فائدہ پہنچانے کا موقعہ ملا، بلکہ صفی ہندی تو خود گئے تھے اور آپ کو تو وہاں کی حکومت اور جامعہ نے طلب کیا ہے، داستان بینہا یہ امتیاز آپ کی شخصیت تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ سارے ہندی علماء کے لئے

---

[1] اس زمانہ میں عزیزی مولوی سید محمود الحسن ندوی اخبار "قومی آواز" میں کام کرتے تھے، انھوں نے یہ خبر "قومی آواز" میں دے دی، اس کو دوسرے اخبارات نے نقل کیا۔

[2] علّامہ صفی الدین الہندی شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے معاصر تھے اور ان کے ساتھ مناظرہ کرنے میں شام میں وہی لائے گئے تھے۔ ان کا ترجمہ "نزھۃ الخواطر" ج ۲ میں دیکھا جاسکتا ہے۔

سرمایۂ افتخار ہے، یالیت کثّر اللہ اُمثالکم فینا۔ ڈاکٹر صاحب اور آپ کے سارے خاندان کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتے ہوئے جو خوشی مجھے ہو رہی ہے، اس کا اظہار لفظوں میں نہیں ہوسکتا، خدا ہی جانتا ہے۔ آپ نے بھی ایک دفعہ فرمایا تھا کہ آپ کے خانوادہ عزّ و شرف کے ساتھ دل کے تعلّق کی نوعیت وہی معلوم ہوتی ہے، جو اپنے گھر کے لوگوں سے آدمی رکھتا ہے۔ معلوم نہیں کب تک روانگی ہوگی؟ آپ ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ کے گھر جا رہے ہیں، کتنے علمی تحائف سے علمائے ہند کو سرفراز فرمائیں گے، علّامہ شامی کے پاس فقہی کتابوں کا ذخیرہ ہندوستان سے پہنچا، میرے لئے یہ نیا علم ہے جو آپ ہی کے ذریعہ مجھ تک پہنچا ہے[1]، اب شامی کے وطن سے اس کا معاوضہ حاصل کیجئے۔"

دمشق میں

یہ حسن اتفاق تھا کہ اسی اپریل کے مہینہ میں جس میں مجھے سفر کرنا تھا، بمبئی سے دمشق کے لئے پہلی مرتبہ ایر انڈیا کی ڈائرکٹ سروس شروع ہوئی، میری روانگی کی تاریخ وہی تھی جو اس کے افتتاح کی تھی، اپنے مخلص دوست وکرم فرما عالی مرتبت شیخ یوسف الفوزان سفیر مملکت سعودیہ کی سفارش وکوشش سے مجھے اس کے فرسٹ کلاس کی ایک سیٹ مل گئی، یہ میرا پہلا طویل ترین ہوائی سفر تھا، دہلی سے انڈین ایر لائنس کے طیّارہ سے بمبئی پہنچا اور وہاں سے نصف شب کے قریب دمشق کے لئے روانہ ہوا، راستہ میں صبح

[1] یہ بات "مذکرات سائحٍ فی الشرق العربی" میں مصنف نے علامہ محمد کرد علی کے حوالہ سے لکھی تھی، مولانا نے یہ روز نامچہ اور سفرنامہ بڑے شوق و ذوق سے پڑھا تھا اس کی طرف اشارہ ہے

ہوگئی تھی، اور سورج نکل آیا تھا، لیکن چونکہ میں مغرب کی طرف جارہا تھا، اس لئے جب دمشق کے ہوائی اڈہ پر پہنچا تو طلوع آفتاب سے پہلے صبح کا سہانا وقت تھا، چونکہ یہ ہندوستان اور شام کے مابین پہلی پرواز تھی اس لئے اس کی فلم لی گئی، جس کا مجھے پتہ نہیں چلا، لیکن دو ہی تین چار دن کے بعد لکھنؤ کے پہچاننے والوں نے کسی سینما میں یہ فلم دیکھی، اور جہاز سے اترتا ہوا مجھے دیکھا، اور عزیزوں کو بتایا کہ انھوں نے مجھے دمشق میں دیکھا، ہوائی اڈہ پر ہمارے اصل داعی اور آمد کے محرک ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی ان کے متعدد احباب و رفقاء اور دمشق یونیورسٹی کے اساتذہ جن میں سے استاد محمد المبارک اور استاد مصطفیٰ احمد الزرقاء کا نام یاد ہے، موجود تھے جو بڑی محبت اور تپاک سے ملے اور میری آمد پر مسرت کا اظہار کیا، اور ان کے ساتھ دار العلوم کے تین فاضل نوجوان سید رضوان علی ندوی، سید محمد اجتبار ندوی اور محمد راشد ندوی بھی تھے، جن کے لئے میری تحریک پر کلیۃ الشریعۃ نے تعلیمی وظائف منظور لئے تھے اور وہ اس کے پہلے بیچ کے طالب علم بن چکے تھے، موسم نہایت خوشگوار مائل بہ خنکی تھا، سباعی صاحب نے مجھے یونیورسٹی کے مہمان کی حیثیت سے فندق الیرموک میں ٹھہرایا، جہاں پر چند دن ٹھہر کر میں اپنی قدیم قیام گاہ شیخ عبدالوہاب الصلاحی کے مکان میں جو محلہ حلبونی میں واقع تھا، منتقل ہوگیا، سو، اتفاق کہ اس کے دوسرے تیسرے دن ہی سباعی صاحب اپنے ایک تعلیمی دورہ پر یورپ جانے والے تھے، جس کا پروگرام پیشتر سے بن گیا تھا، انھوں نے اگلے دن دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا اور دفتری کارروائی اپنے سامنے مکمل کرادی اور میرے محاضرات کا سلسلہ شروع ہوگیا، پہلا لکچر ۲۲ شعبان ۱۳۷۵ھ ہ، اپریل ۱۹۵۶ء کو یونیورسٹی کے مرکزی ہال میں چہار شنبہ ۲ بجے شام کو ہوا، جس کا عنوان تھا التجدید والمجددون

فی تاریخ الفکر الاسلامی' یونیورسٹی کی طرف سے طلباء کے علاوہ اساتذہ جامعہ علماء و اعیانِ شہر اور ممتاز اہلِ ذوق اور اہلِ علم کو دعوت دی گئی تھی، ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، اوپر گیلری میں طالبات و خواتین تھیں، افسوس ہے کہ خود داعی اور محرک (ڈاکٹر سباعی) موجود نہ تھے، جس کا ان کو بھی قلق تھا اور اس کا اظہار انھوں نے اپنے اس مقدمہ میں کیا ہے، جو کتاب کی طباعت کے موقعہ پر لکھا گیا، یہ طے ہوا کہ ہر چہار شنبہ کے دن محاضرہ ہوگا، اس کے لئے نئے دعوت نامے جاری کئے جائیں گے، کل آٹھ محاضرات ہوئے آٹھواں محاضرہ (لکچر) ۱۹؍شوال ۱۳۷۵ھ، ۳۰؍مئی ۱۹۵۶ء کو ہوا، جس کا عنوان تھا:

حجۃ الاسلام الغزالی (مصلحاً اجتماعیاً)[1]

محاضرات میں آمد کا سلسلہ برابر جاری رہا، ہال حاضرین سے بھر جاتا تھا، حیرت کی بات یہ تھی کہ دمشق کے ممتاز فضلاء اور اساتذۂ جامعہ مثلاً استاد محمد المبارک' استاد مصطفیٰ احمد الزرقاء، ڈاکٹر محمد معروف الدوالیبی' اور علماء میں سے علامہ محمد بہجۃ البیطار جیسے فضلاء، عام نوجوانوں اور طلباء کی طرح پابندی سے شرکت کرتے تھے، اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ تیسرے محاضرہ سے جو ۱۹؍اپریل ۱۹۵۶ء کو ہوا، رمضان شروع ہوگیا، یہ محاضرہ جس کا عنوان "امام حسن بصری اور ان کے خلفاء" تھا۔ ۹؍رمضان ۱۳۷۵ھ کو ہوا۔ رمضان میں تین محاضرے ہوئے اور وقت ۸½ بجے شب کا ہوتا تھا، اس کے باوجود جلسہ کی رونق میں کوئی فرق نہیں آیا، آخری محاضرہ سے پہلے ۱۵؍شوال ۱۳۷۵ھ ۲۶؍مئی ۱۹۵۶ء

---

[1] اس کے بعد کے پانچ محاضرات جو سیدنا عبد القادر جیلانی اور مولانا جلال الدین رومی سے متعلق ہیں بعد میں لکھ کر محاضرات کے مجموعہ "رجال الفکر والدعوۃ فی الاسلام" میں شامل کئے گئے، جس کو پہلے یونیورسٹی نے شائع کیا، پھر دار القلم کویت سے بقیہ اجزاء کے ساتھ طبع ہوا۔

کو یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر احمد السّمان کی طرف سے مہمان کے اعزاز میں دمشق کے بڑے ہوٹل نادی الشرق میں ظہرانہ دیا گیا، جس میں یونیورسٹی کے پروفیسر اور بہت سے معزّزینِ شہر مدعو تھے، خوش قسمتی سے الجزائر کے مجاہد و فاضل رہنما علامّہ محمد بشیر الابراہیمی اس زمانہ میں دمشق آئے ہوئے تھے، وہ بھی اس دعوت میں شریک ہوئے، اس طرح بحمد اللہ عزّت و نیک نامی کے ساتھ محاضرات کا یہ سلسلہ مکمل ہوا، میں نے ایک مرتبہ اصرار کر کے کالج کی ایک کلاس بھی لی، درجہ کے طلباء سے تعارف ہوا اور براہِ راست مخاطبت۔

دمشق کے اس تین مہینے کے قیام میں (جس میں سے دو مہینے محاضرات اور ان کی تیاری کی مشغولیت میں گزرے) دمشق کے علماء، ادباء، اہلِ فکر، اسلامی تحریکوں اور تنظیموں کے قائدین اور اداروں کے سربراہوں سے برابر روابط قائم رہے، تعلّقات کی نوعیت ایسی ہوگئی تھی کہ پورے رمضان میں صرف دو یا تین دن اپنی قیام گاہ (دولت کدۂ شیخ عبد الوہاب الصلاحی) پر افطار و طعام کی نوبت آئی، روزانہ کسی نہ کسی دوست کے ہاں مدعو ہوتا، خوش قسمتی سے اس زمانہ میں ہمارے محب و محبوب دوست ڈاکٹر سعید رمضان بھی دمشق ہی میں مقیم تھے اور وہیں سے وہ اپنا مؤقّر رسالہ "المسلمون" نکالتے تھے۔ ان کے یہاں کا معاملہ تو بالکل گھر کا سا تھا، اکثر دیر رات تک وہاں مجلس رہتی، جس میں متعدّد اسلامی الفکر نوجوان اور علماء بھی شریک رہتے، تراویح کا انتظام (ان ممالک میں "اَلَمْ تَرَ کَیْفَ" والی تراویح کے رواج کی وجہ سے) مکان پر کیا تھا، عزیزی مولوی رضوان علی ندوی ایک پارہ سناتے تھے جو ہمارے عرب دوستوں کے لئے (سوائے اخوان کے جن کے مرکز میں باقاعدہ تراویح ہوتی تھی) ایک تعجب خیز بات تھی۔

شام کے ایک عارف بزرگ شیخ احمد الحارون لعسل الجبّار

مصر کے ایک فوجی افسر، محمود الغراب جو جمال عبد الناصر کے اقتدار کے بعد شام چلے آئے تھے میرے پاس آنے جانے لگے، انھوں نے کئی مرتبہ مجھے شوق دلایا کہ یہاں ایک عارف بزرگ اور شیخ جو شیخ اکبر شیخ محی الدّین ابن عربی کے علوم کے اس وقت سب سے بڑے غوّاص و محقق ہیں، تشریف رکھتے ہیں، رات کو ان کی مجلس ہوتی ہے آپ کبھی اس میں شریک ہوں، میں رمضان المبارک کی مصروفیت اور اپنی کمزوری صحت کی بنا پر عذر کرتا رہا، ان کے بار بار کہنے سے ایک دن شرم آئی۔ اور میں تراویح کے بعد ان کے ساتھ چلا گیا، دیکھا کہ ایک کوٹھی میں ایک مؤقر مجلس ہے جس میں شہر کے مرفّہ الحال لوگ اور بڑے تاجر شریک ہیں، صدر مجلس میں ایک بزرگ خاموش بیٹھے ہوئے ہیں، مجلس کا رنگ، ہمارے یہاں کے بزرگوں اور مشائخ کی مجلسوں سے مختلف نظر آیا، یہاں لوگ ہنس بول رہے تھے اور شیخ کے افادات سننے کے بجائے زیادہ تر خود ہی مصروف تکلّم تھے، شیخ بھی اس پر کسی ناگواری کا اظہار نہیں فرماتے تھے اور گفتگو میں شریک تھے، مجلس کے خاتمہ پر کسی صاحب نے کہا کہ اس مجلس میں شیخ ابو الحسن الندوی موجود ہیں، ہم ان سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ کچھ کہیں۔ میں نے کہا کہ میں تو شیخ کے پاس استفادہ کے لئے حاضر ہوا ہوں، میری تقریر کا کیا موقعہ ہے؟ لوگوں نے اصرار کیا اور میں کھڑا ہوا اور کہا کہ میں ایسی اہم مجلس میں کیا عرض کروں، آپ کو صرف ایک لطیفہ سنانا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ کسی شخص کو ایک بیش قیمت سچا موتی مل گیا، واقف لوگوں نے بتایا کہ اس میں سوراخ کرنے کی ضرورت ہے اس کے بغیر اس میں آب اور قیمت پیدا نہیں ہوگی، اس نازک کام کے لئے ایک ماہر فن کی ضرورت

تھی جو موتیوں میں سوراخ کرتا تھا، اس نے ان کی خدمات حاصل کیں اور پورے دن کے لئے اس کو اپنے گھر لے آیا، بعض لوگوں کو زیادہ بات کرنے کی عادت ہوتی ہے، صاحبِ خانہ بھی اسی فضول گوئی کا مریض تھا، اس نے جوہری سے پوچھا کہ آپ کیا کیا فن جانتے ہیں؟ اور کس کس چیز میں دخل رکھتے ہیں؟ باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ اس کو گانا بھی آتا ہے۔ صاحبِ خانہ نے فرمائش کی اور اس نے سنانا شروع کیا، اس میں شام ہوگئی اور پورا دن نکل گیا، جوہری نے چلتے وقت اپنی فیس مانگی جو ایک بیش قرار رقم ہوتی تھی، صاحبِ خانہ نے کہا کہ فیس کس بات کی؟ تم نے تو ابھی موتی کو ہاتھ بھی نہیں لگایا، اس نے کہا کہ میرا دن تو پورا تمہارے گھر پر اور تمہاری فرمائش کی تعمیل میں صرف ہوا، یہ میرے وقت کی قیمت ہے، تم نے موتی کا کام لیا یا گانا سنا، میری فیس تو واجب ہوگئی، بالآخر صاحب خانہ کو فیس ادا کرنی پڑی اور موتی اس دن بغیر سوراخ کے رہ گیا۔

حضرات! مجھے ڈر ہے کہ کہیں ہمارا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی نہ ہو کہ ہم ایک عارف باللہ شیخ کے پاس ان کی باتیں سننے اور ان کی افادات و تحقیقات سے مستفید ہونے کے لئے آتے ہیں، لیکن ان کی سننے کی بجائے اپنی سناتے ہیں اور خالی ہاتھ واپس جاتے ہیں"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری اس گذارش میں شیخ نے اپنے دل کی ترجمانی اور حقیقتِ حال کی تصویر محسوس کی، جس چیز کو وہ اپنے منھ سے کہنا نہیں چاہتے تھے خدا نے میرے منھ سے نکلوائی، اس مجلس کے بعد ان کا تعلق مجھ سے بہت بڑھ گیا، وہ بہت کم کسی کے یہاں جاتے تھے، لیکن میری قیام گاہ پر خود تشریف لے آتے اور کبھی کبھی مجھے دمشق کی گرمائی سیر گاہوں (مصائف) میں جہاں وہ اپنے احباب و مریدین کے ساتھ

کچھ وقت گزارنے جاتے، مجھے مکان پر آکر خود اپنے ساتھ لے جاتے، بار بار ملنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا ان کے ساتھ خاص معاملہ ہے، انھوں نے باقاعدہ تعلیم نہیں پائی شاید حرف شناس ہوں، لیکن گہرے علوم ومعارف کا اظہار فرماتے، شیخ اکبر کے علوم ومعارف کے علم میں تو وہ اپنے عہد کی یگانہ شخصیتوں میں تھے، لیکن اسی کے ساتھ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے بھی بڑے قدر دان اور مرتبہ شناس تھے، مجھے ان کے ادراکِ باطنی اور کشف کا اس طرح تجربہ ہوا، کہ مجھے شیخ اکبر کے رسالہ "رُوح القدس" کی ضرورت تھی، میں اس میں سے "مُختارات" کے لئے کچھ حصّہ لینا چاہتا تھا، یہ رسالہ نایاب اور تنہا انہیں کے پاس تھا، انھوں نے مجھے عنایت فرمایا، میں نے کہا، اس پر ہدیہ کے الفاظ تحریر فرمادیں، وہ مجھے صرف ابوالحسن الندوی کے نام سے جانتے تھے۔ کسی نے میرا خاندانی تعارف نہیں کرایا تھا جب وہ اہداء کے الفاظ لکھنے لگے تو اچانک سر اٹھاکر مجھ سے فرمایا کیا تم فلاں خاندان سے تعلق رکھتے ہو؟ میں نے کہا کہ ہاں ہندوستان میں لوگ یہی سمجھتے اور کہتے ہیں، فرمایا: ابھی خوشبو آئی، میرے دمشق سے آجانے کے بعد بھی عرصہ تک ان کے گرامی نامے آتے رہے، اور ان کے بعض مریدین ومعتقدین ان کی مجلس کے افادات وملفوظات بھی بھیجتے رہے، شام سے آنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ دمشق کا روشن خیال علمی طبقہ جو اُن سے نامانوس اور اُن کے مرتبہ سے ناواقف تھا، میری آمد ورفت کی وجہ سے اس کو بھی توجہ ہوئی اور خاص طور پر ڈاکٹر مصطفےٰ السباعی صاحب نے ان کے یہاں حاضری دینی شروع کی، اور ان کے عقیدتمند ہوئے، وہ اپنی وصیت کے مطابق انھیں کے جوار میں دفن بھی ہوئے۔ رحمہم اللہ جمیعاً۔

ریڈیو پر دو تقریریں

دمشق کے قیام کے دوران، دمشق ریڈیو اسٹیشن سے دو تقریریں

بھی کرنے کی نوبت آئی، غالباً بعض دوستوں نے ریڈیو کے ذمہ داروں کو توجہ دلائی وہ قیام گاہ پر آئے اور مجھ سے چند تقریروں کی فرمائش کی۔ میں نے پہلی تقریر اسمعی یاسوریۃ[۱] کے عنوان پر کی جس میں میں نے پہلے شام سے اپنی واقفیت اور دینی، روحانی اور جذباتی ربط کی تاریخ سنائی، جس کا آغاز بچپن ہی سے ہوگیا تھا، پھر شام کی ان جلیل القدر شخصیتوں کا ذکر کیا (جن میں سے ایک بڑی تعداد صحابہ کرامؓ کی، دوسری عظمائے اسلام کی ہے) جو شام کی سرزمین میں امانت اور اس کے لئے قابلِ فخر اور باعثِ زیب وزینت ہیں'

ع دفن ہوگا، نہ کہیں ایسا خزانہ ہرگز

اور بتایا کہ دنیا ان بزرگوں کی بدولت کس کس تقریب سے شام کو یاد کرتی اور اس سے پچھلی تاریخ دہرانے کی استدعا کرتی ہے، پھر بتایا کہ اس کی گزشتہ عظمت کا راز کس چیز میں تھا اور کس طرح اس نے دنیا کے ایک بڑے حصہ کو اپنے دامن عاطفت اور سایۂ رحمت میں لیا تھا، اور اب کس طرح وہ دوبارہ یہ عظمت واپس لاسکتی ہے، قومیں زبانوں، کلچروں، تمدنوں اور قومیتوں سے عزت ومحبوبیت کا مقام نہیں حاصل کرتیں یہ مقام ان کو مخصوص پیغاموں، دعوتوں، صالح مقاصد اور انسانیت کی بے لوث خدمت سے حاصل ہوتا ہے، شام کو اسی کے لئے کوشش کرنی چاہیئے، موجودہ دنیا کی نجات اب اس میں ہے کہ مشرق ومغرب اس کو موجودہ مصائب سے نجات دینے کے لئے باہم تعاون کریں، مشرق اپنے ایمان کے ذریعہ، اور مغرب اپنی تنظیم اور جدید علوم کے ذریعہ، اس کارِ خیر میں شام کا اسلامی ملک شایانِ شان حصہ لے سکتا ہے۔

---

[۱] یہ تقریر علیحدہ رسالہ کی شکل میں شام اور ہندوستان میں شائع ہوئی اور مصنف کے مجموعۂ مضامین "العرب والاسلام" میں مستقل طور پر شامل کردی گئی۔

آخر میں عرض کیا گیا کہ ہندوستان کو محمد بن قاسم ثقفی کے ذریعہ اسلام کی جو نعمت سب سے پہلے ملی تھی، وہ خلیفہ اموی ولید بن عبدالملک کے عہد کا ایک جرنیل اور داعی تھا اور ولید کا پایۂ تخت یہی دمشق کا شہر تھا، یہ اعلان و اعتراف اسی احسان کا ایک جواب اور عقیدت و محبت کا خراج ہے۔

دوسری تقریر "محمد اقبال فی مدینۃ الرسولؐ" کے عنوان سے ہوئی، اس تقریر میں "ارمغانِ حجاز" کے ان شوقیہ، ولولہ انگیز اور خیال افروز اشعار کو عربی میں منتقل کر کے اقبالؔ کے اس سفر مدینہ کی داستان سنائی گئی جو انھوں نے جذب و شوق کے پروں سے اُڑ کر عالمِ خیال میں کیا تھا، اس تقریر کا ترجمہ محمد میاں کے قلم سے "کاروانِ مدینہ" میں "اقبال درِ دولت پر" کے عنوان سے شامل ہے، اسے پڑھا جا سکتا ہے۔

لبنان اور ترکی کے سفر

دمشق کے قیام کی فرصتوں سے فائدہ اٹھا کر میں نے شام سے باہر کے دو سفر کئے، ایک لبنان کا، دوسرا ترکی کا ۱۹۵۱ء کے سفرِ شام میں دونوں کا موقعہ نہیں مل سکا تھا۔ پہلے محاضرہ کے بعد جو ۲۲ شعبان ۱۳۷۵ھ/۴ اپریل ۱۹۵۶ء کو ہوا تھا اور اب اگلے چہار شنبہ ۲۹ شعبان/ ۱۱ اپریل کو دوسرا محاضرہ ہونے والا تھا، ایک ہفتہ کا وقفہ تھا، بیروت دمشق سے کچھ زیادہ دور نہیں ہے میں نے سفر کی نیت کر لی، اور اپنے قدیم مصری اخوانی دوست استاذ سعد الدین الولیلی سے درخواست کی کہ وہ ساتھ چلیں، ہم بیروت کے لئے روانہ ہوئے اور چند گھنٹوں میں بیروت پہنچ گئے، لبنان چار دن قیام رہا، جس کے دوران ہم نے شہر کے تاریخی مقامات کی سیر بھی کی، امام اوزاعیؒ کی قبر کی زیارت بھی، وہاں کی دینی علمی شخصیتوں اور دینی تحریکوں کے قائدین سے ملاقات بھی، جن میں خاص طور پر تحریک

عبادالرحمٰن[1] کے بانی وقائد محمد عمر داعوق، شیخ محمد علایا مفتی جمہوریہ لبنان، شرعی عدالت عالیہ کے صدر شیخ شفیق یموت، مشہور نومسلم فاضل مصنف ومفکر محمد اسد سابق لیوپولڈ ویس (جو اپنی کتاب ROAD TO MECCA کے دوسرے حصہ کی تصنیف میں بیروت میں مقیم تھے) مشہور مسلمان سماجی کارکن اور داعی ڈاکٹر مصطفےٰ الخالدی، مشہور جزائری مجاہد استاذ الفضیل الورتلانی شامل تھے، اداروں میں سے مرکز عبادالرحمٰن، الکلیۃ الشرعیۃ خلیۃ الملک سعود[2] (جو بیروت کا اسلامی مرکز، لکچر ہال اور اسلامی تقریبات منانے کی جگہ ہے) کا معائنہ کیا، ایک دن کے لئے ہم شام کے مشہور اسلامی، تاریخی شہر طرابلس بھی گئے، جو سیاسی سازشوں کے اثر سے شام سے کاٹ کر لبنان میں ملا دیا گیا ہے۔ راستہ میں علامہ سید رشید رضا کے وطن قلمون سے گزرے، بحرِ روم کے ساحل پر خوبصورت مناظر کے درمیان ایک طویل مسافت طے کرکے ہم طرابلس پہنچے اور مرکز عبادالرحمٰن میں قیام کیا، طرابلس میں ہم نے الکلیۃ الشرعیۃ، مرکز المولویہ (سلسلۂ مولویہ جو مولانا جلال الدین رومی کی طرف منسوب ہے کا مرکز ہے) مدرسہ ابن خلدون، مدرسۃ الغزالی وغیرہ کا معائنہ کیا، وہاں نوجوانوں کے سامنے ایک تقریر بھی کی۔

طرابلس سے واپس آکر خلیۃ الملک سعود میں ایک چیدہ مجمع کے سامنے میری تقریر ہوئی، جس کا موضوع تھا کہ "قومیں تمدّنوں کے بل پر زندہ نہیں رہتیں پیغاموں کے دم سے زندہ رہتی ہیں اور روح اور خصوصیات ان کی محافظ و معاون ہوتی ہیں"۔

---

[1] یہ تحریک لبنان میں اخوان کی تحریک کا بالکل چربہ اور اس کا لبنانی ایڈیشن ہے، اس نے نوجوانوں کی اصلاح و تنظیم اور ان کو لبنان میں پھیلے ہوئے اخلاقی انتشار اور مغربی تہذیب کے اثرات سے بچانے میں قابلِ قدر خدمت انجام دی۔

[2] شاہ سعود نے اس ادارہ کے لئے دو سو اکسٹھ ہزار لبنانی لیرہ عطا کیا تھا اس لئے ان کے نام پر اس ادارہ کا نام رکھا گیا۔

لبنان کا یہ مختصر سفر ختم کر کے ہم دوسرے محاضرہ کے وقت سے پہلے دمشق پہنچ گئے[1]

جامعہ کے محاضرات سے فارغ ہو کر ۲ رذی قعدہ ۱۳۷۵ھ، ۱۲ر جون ۱۹۵۶ء کو دو ہفتوں کی فرصت نکال کر ترکی کے لئے روانہ ہوا، حلب میں ایک شب قیام رہا، جہاں اخوان کے مرکز میں میری ایک اہم تقریر "حاجتنا إلى إيمان جديد" (نئے ایمان کی ضرورت) کے عنوان سے تھی، تقریر دعوتی انداز کی تھی اور نہایت صاف گوئی کے ساتھ عربوں سے خطاب تھا، جس میں خاصی تلخی تھی، لیکن مجمع ہمہ تن گوش تھا، معلوم ہوتا تھا کہ اس صاف گوئی نے ان کے دل کے تار چھیڑ دیئے ہیں، اس میں قومیت عربیہ پر خاصی تنقید تھی، اور عربی انداز میں گویا یہ کہا گیا تھا کہ اگر آپ قومیت عربیہ کو اپنا دین وایمان بنائیں گے تو ہم برصغیر کے مسلمانوں کے ساتھ جو اپنی پوری تاریخ میں قومیت اسلامیہ سے وابستہ رہے ہیں، "چار سو بیس" کریں گے، کہ خود ہمیں تو اسلام کی دعوت دی اور خود اپنی قدیم جاہلیت کی طرف چلے گئے، تقریر ختم ہوئی تو ایسا معلوم ہوا کہ محبت کا دریا امنڈ آیا، کم کبھی کسی مجمع نے اپنی محبت کا اس طرح والہانہ اظہار کیا ہوگا، یہ عربوں کی فراخ دلی اور عالی ظرفی کا ثبوت ہے جس کی مثال (ایسی سخت تنقید کے موقعہ پر) کسی اور قوم اور ملک میں ملنا مشکل ہے۔

حلب سے حیدر پاشا تک (جو ترکی حدود کا آخری ریلوے اسٹیشن ہے) TAURUS EXPRESS سے سفر ہوا، ترکی کے اس دو ہفتے کے سفر میں ہم نے استنبول (قسطنطنیہ) انگورہ، قونیہ (مولانا رومؒ کا مسکن ومدفن) کی زیارت کی، قسطنطنیہ میں ہنڈی کے پھاڑے جانے

---

[1] اس سفر کا پورا روزنامچہ "من كرات سائح في الشرق العربي" کے تازہ تیسرے ایڈیشن کے آخر میں ضمیمہ کے طور پر شامل ہے

جن دوستوں کے یہاں ٹھہرنا تھا اور ان سے مدد ملنے کی امّید تھی، ان کے اسٹیشن پر نہ پہنچنے، اور پریشانی و سرگردانی کا وہ تاریخی واقعہ پیش آیا جس سے زیادہ پریشان کن واقعہ اس وقت تک زندگی میں پیش نہیں آیا تھا، پھر اللہ تعالیٰ کی جس طرح مدد ہوئی اور جس محبّت، ضیافت، گرم جوشی اور اسلامی جذبے کا اس سفر میں عملی تجربہ ہوا اس کا بھی مشاہدہ کیا، ترکی کی سرزمین رنگ و بو بھی دیکھی جو خونِ شہداء سے بارہا لالہ زار بنی اور صدیوں تک عالمِ اسلام کی آبرو، یورپ کے صلیبی ملک میں اسلامی مینح، حرمین کی پاسبان، مقامات مقدسہ اور ممالک عربیہ کے لئے حصار بنی رہی "شکوہ ترکمانی" کا بھی نظارہ کیا، اور اس غیور ملّت کے شاہینوں اور شہبازوں کو بھی دیکھا، پھر اتاترک کے اسلامی و عربی اثرات کے یکسر مٹا دینے کی باعزم و پرنظم کوششوں کے نتائج بھی دیکھے رسم الخط کے بدل جانے سے اسلامی ثقافت سے دوری اور اسلامی کتب خانہ سے محرومی کا منظر بھی دیکھا، اس سفر کی مفصّل روداد اور مسلسل روزنامچہ میری کتاب "دو ہفتے ترکی میں"[1] آچکا ہے، اس لئے یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں

دمشق کی مؤتمر اسلامی

ترکی کے سفر سے عین واپسی پر دمشق کی مؤتمر اسلامی کا انعقاد ہوا جس کے داعی و محرّک ہمارے عزیز دوست اور بھائی ڈاکٹر سعید رمضان اور منتظم و مؤید ڈاکٹر محمّد معروف الدوالیبی تھے، یہ مؤتمر ۲۶ جون ۱۹۵۶ء سے شروع ہو رہی تھی، میں ۲۵ر کی شب میں آدھی رات کو دمشق پہنچا، صبح کو اس کا پہلا جلسہ تھا، اس کانفرنس میں شرکت کے لئے متعدد ممالک عربیہ کے ممتاز لوگ آئے تھے، پاکستان سے مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا

---

[1] شائع کردہ "مکتبہ اسلام" گوئن روڈ لکھنؤ

ظفر احمد صاحب انصاری تشریف لائے، پہلے اجلاس میں ڈاکٹر محمد ناصر سابق وزیر اعظم انڈونیشیا کا بحیثیت صدر اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور میرا بحیثیت نائب صدر انتخاب ہوا، مجھے اس مؤتمر میں مضمون پڑھنا تھا اور میں وعدہ کر گیا تھا، لیکن مضمون تیار کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی، میں نے صبح سویرے اٹھ کر مضمون تیار کیا جس کا عنوان تھا "ارتباط قضیّۃ فلسطین بالوعی الاسلامی" (مسئلہ فلسطین کا مسلمانوں کے اسلامی شعور سے تعلّق) اس مضمون میں دکھایا گیا تھا کہ مسئلہ فلسطین کے سلسلہ میں اس کے قائدین اور ہمدردوں نے عالم اسلام سے تعاون اور ہمدردی اور جوش وخروش کی جو توقعات قائم کی ہیں اور جو اس مسئلہ کے سلسلہ میں ایک کاری ہتھیار اور دنیا کی رائے عامہ پر اثر ڈالنے والی طاقت ہے، اس کا سارا انحصار مسلمانوں کے جذبۂ اسلامی اور ملّی شعور پر ہے اور ہمارے قائدین اور اس مسئلہ کے وکیلوں کو علم نہیں کہ عالم اسلام میں اس سلسلہ میں کتنا انحطاط اور تغیّر آچکا ہے، یہ جذبہ کتنا سرد پڑ چکا ہے اور یہ شعور کتنا کمزور ہو چکا ہے، ہمارے قائدین اور اس مسئلہ کے لئے سینہ سپر ہونے والوں کو اس کی فکر کرنی چاہیئے، اس لئے کہ یہی ہر مسئلہ کا حل اور ہر قفل کی کنجی ہے، ان کو عالم اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لئے نئے سرے سے جدّوجہد کی ضرورت ہے، پھر میں نے مختصراً اس کا طریقِ کار اور حقیقی اسباب کا ذکر کیا۔[1]

میں نے بڑی عجلت میں قلم برداشتہ یہ مضمون لکھا، مؤتمر کے سکریٹری نے اس کو فوراً سائیکلو اسٹائل کرایا، میں اس کو مؤتمر کے پہلے یا دوسرے اجلاس میں پڑھ سکا۔

---

[1] یہ مضمون مصنف کے مجموعہ مضامین المسلمون وقضیۃ فلسطین (۱۸۵-۱۹۲) میں دیکھا جاسکتا ہے افسوس ہے کہ اس کا ترجمہ "عالم عربی کا المیہ" میں شامل نہ ہوسکا۔

مؤتمر اس حیثیت سے کامیاب رہی کہ مختلف ممالک کے اسلامی الفکر اور مسلمان قائدین اس تاریخی شہر میں جمع ہوئے اور ایک دوسرے سے ملے، شام کی حکومت نے بھی ان کے لئے (ڈاکٹر محمد معروف دوالیبی کے اثر سے) آسانیاں مہیّا کیں، ۲۸؍جون کو پارلیمنٹ کے اسپیکر ڈاکٹر ناظم القدسی کی طرف سے (جو کئی بار وزیر اعظم بھی رہ چکے تھے) اور آخر میں صدر جمہوریہ شکری القوتلی کی طرف سے مؤتمر کے مہمانوں کا استقبال اور ضیافت ہوئی، مہمانوں کے فلسطینی پناہ گزینوں کے دیکھنے کے لئے القریٰ الأمامیہ تک ایک ٹرین کے سفر کا بھی انتظام کیا گیا، جس میں میں ایک تقریری پروگرام کی وجہ سے جو دینیات کے اساتذہ کے سامنے کرنی تھی نہیں جا سکا۔

دمشق کے قیام کے آخری دن اور روانگی

دمشق کا تقریباً تین مہینے کا قیام، زندگی کے خوشگوار ترین ایام تھے جو ابھی تک (حرمین شریفین کو مستثنیٰ کر کے) کہیں میسّر نہیں آئے، قلبی فرحت وانبساط، جسمانی صحت، موسم کی خوش گواری، دوستوں کی محبت وگرم جوشی، ملک کا قدرتی حسن اور ایک خاص طرح کی روحانیت (جو غالباً صحابۂ کرامؓ اور اولیائے عظامؒ کے مدفن اور اسلامی جہاد وفتوحات کا مرکز ہونے کی وجہ سے) تھی، سب کے امتزاج نے لطف ومسرّت کی ایک عجیب فضا پیدا کر دی تھی، خود اہلِ دمشق اور اہلِ شام کے لئے بھی وہ زمانہ بڑے سکون واعتدال، بے فکری اور فارغ البالی اور اسلامیت کا تھا، اس کے بعد وہاں بھی انقلاب کا چکّر چل گیا اور پھر اس ملک کی چول ابھی تک بیٹھنے نہیں پائی اور ان سطور کی تحریر کے وقت تو وہ ایک غیر مسلم اور اسلام دشمن حکومت کے پنجۂ غضب میں ہے۔ وَلَعَلَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا۔

دمشق کے سفر وقیام کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کتاب "عوارف المعارف فی انواع العلوم والمعارف" کی طباعت کو "المجمع الاسلامی العلمی" نے منظور کرلیا، اور ۱۹۵۸ء میں اس کو "الثقافۃ الاسلامیۃ فی الھند" کے نام سے شائع کردیا، یہ کتاب ہندوستان کی اسلامی تصنیفات کی ڈائرکٹری، اور یہاں کے علماء کے علوم اسلامیہ کی خدمت کا مرقّع ہے۔

المجمع العلمی دمشق میں کئی بار جانا ہوا، جس کا نام بچپن سے سنتا تھا اور جس کی رکنیت کسی عالم و محقق کے لئے بڑے اعزاز کی بات سمجھی جاتی تھی، ہمارے ملک کے دو نامور فاضل اس کے اس وقت تک رکن تھے، ایک علامہ عبدالعزیز المیمنی، دوسرے مسیح الملک حکیم اجمل خاں، اس کے صدر خلیل مردم بک متعارف و مانوس ہو گئے تھے، میری ہندوستان واپسی کے بعد، اس اکیڈمی نے مجھے اپنا رکن بنایا اور صدر جمہوریہ کی طرف سے سند آئی۔

اتاترک کے بارے میں حقیقت حال کا اظہار اور مولانا مدنیؒ کی حق پسندی

ہندوستان واپسی کے بعد میں نے اپنی تقریروں اور گفتگوؤں میں کمال اتاترک کے بارے میں اپنے تاثرات کا بے تکلف اظہار کرنا شروع کردیا، اور وہاں کے اسلام پسند طبقہ کا عام طور پر اس کے متعلق جو خیال تھا اور اس کی "اصلاحات" سے اسلام کو ترکی میں جو نقصان پہنچا تھا اور جو معنوی روحانی و علمی نسل کشی (GENOCIDE) عمل میں آئی تھی اس کو صاف صاف بیان کرنا شروع کردیا، تنہا رسم الخط کے بدل جانے سے جو انقلاب عظیم برپا ہو گیا تھا جس کو فلسفی مؤرخ ٹوئن بی (TOYNBEE) نے اس طرح بیان کیا ہے کہ "اب کسی ملک کے ذخیرۂ کتب یا

عظیم کتب خانہ کے جلانے کی ضرورت نہیں (جس سے مفت میں بدنامی ہو) کسی قوم کا رسم الخط بدل دینا کافی ہے"، میرا یہ تبصرہ اور تنقید ان حلقوں پر بڑی گراں گذری، جو کمال اتاترک کو ترکی کا نجات دہندہ اور عظمتِ انسانی وخدمت اسلامی کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقام پر رکھتے تھے اور انھوں نے برملا مجھ سے ناگواری اور ناراضگی کا اظہار کیا۔

اس کے برخلاف واپسی کے قریب ہی زمانہ میں مولانا مدنیؒ لکھنؤ تشریف لائے میں نے ترکی کے سفر کے حالات وتاثرات بیان کئے اور اتاترک کی اسلام کُش پالیسی کا ذکر کیا، مولانا نے ایک لفظ بھی اس کی حمایت میں نہیں فرمایا اور نہ چہرہ پر ادنیٰ درجہ کی ناگواری ظاہر ہوئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ ان کے قلبِ سلیم نے فوراً ان حقائق کو تسلیم کرلیا اور ان کا عمل دُر مع الحق حیث دار پر ہے۔ ع

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں

مجھ پر مولانا کی اس حقّانیت وربّانیت کا بڑا اثر ہوا، کہ ان کے نزدیک معیار اسلام ہے، نہ سیاسی کامیابیاں، نہ جنگی فتوحات، نہ مغربی طاقتوں کو چیلنج کرنا یا نقصان پہنچانا۔

افسوس ہے کہ اس کے کچھ عرصہ بعد ہی (دسمبر ۱۹۵۷ء میں) مولانا نے اس دنیا سے رحلت فرمائی، میں وقتاً فوقتاً معتقدانہ حاضر ہوتا تھا، وفات سے صرف ایک ہفتہ پہلے بھی بغرض عیادت حاضر ہوا، میں مولانا کے اخلاص واخلاق اور ان کی سیرت کی مرکزی صفت، اور کمالات کے مرکزی نقطہ "عزیمت" و "حمیّت" کا ہمیشہ قائل رہا اور کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی اس میں تردّد پیدا نہیں ہوا۔[1]

---

[1] ملاحظہ ہو "پرانے چراغ حصّہ اوّل" کا مضمون "مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ" ص ۹۶-۱۱۶

بغداد میں

میں جولائی کی کسی تاریخ کو دمشق سے روانہ ہوا، دمشق سے میں نے بغداد اور کراچی کا راستہ اختیار کیا، کہ اس سے پہلے کبھی بغداد جانا نہیں ہوا تھا، بچپن سے جو نام مکّہ مدینہ (شرّفہما اللہ) کے بعد سب سے پہلے کان میں پڑا تھا، وہ قاعدۂ بغدادی کی برکت سے، جس سے اس وقت کے مسلمان بچے بسم اللہ کرتے تھے، بغداد سے کان آشنا ہوئے، مولانا حالی کے یہ شعر بچپن سے کان میں پڑے ہوئے تھے ؎

وہ بلدہ کہ فخر بلاد جہاں تھا ترو خشک پر جس کا سکّہ رواں تھا

پڑا غلغلہ جن کا تھا کشوروں میں وہ سوتے ہیں بغداد کے مقبروں میں

بغداد صرف دو تین دن ٹھہرنے کا اتفاق ہوا، جو اس شہر کی عظمت و وسعت اور وہاں کے آثار و مقابر کے لحاظ سے کچھ نہیں تھا، لیکن مالایدرک کلہ لایترک کلّہ کے لحاظ سے غنیمت تھا، اس شہر میں مجھے سیّدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف خاص انجذاب اور ان سے عقیدت و محبّت کا غیر معمولی احساس ہوا، اور یہ کوئی تعجّب کی بات نہ تھی کہ میرا پہلا سلسلہ قادری ہی تھا اور کتب انساب سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے جدّ امجد امیر کبیر سید قطب الدین محمد المدنی حضرت کے بھانجے تھے، اس مختصر قیام میں ہم نے حضرت معروف کرخیؒ، امام اعظم ابو حنیفہؒ، امام موسیٰ کاظم اور سلمان پاک جاکر حضرت سلمان فارسیؓ کے قبور کی زیارت کی، مدائن کا تاریخی شہر بھی دیکھا جو ایرانیوں کا پایۂ تخت تھا۔

اس سفر میں ۲۳ سال کے بعد اپنے استاذ ڈاکٹر تقی الدین ہلالی سے ملاقات

بھی کی جو ان دنوں بغداد میں مقیم تھے، ان کی بصارت تقریباً جا چکی تھی، مگر میری آواز سے انھوں نے مجھے فوراً پہچان لیا، انھوں نے کھانے پر مدعو کیا، سب کی خیریت دریافت کی اور استادانہ و پدرانہ شفقت سے پیش آئے، میں نے ان کو یہ کہہ کر کہ جیسے زمانہ طالب علمی میں آپ میری اصلاح فرماتے تھے، میں آپ کو اپنا عربی کا ایک رسالہ پڑھ کر سناتا ہوں، آپ میری اصلاح و تصحیح فرمائیے، انھوں نے شفقت آمیز الفاظ کہنے کے بعد اس کو قبول کیا اور میں نے ان کو اپنا رسالہ الدعوۃ الاسلامیۃ فی الھند وتطورھا تھا پڑھ کر سنایا، ایک دو عربی ترکیبوں کے متعلق انھوں نے کہا کہ یہ جدید ترکیبیں ہیں، قدما اس کو دوسری طرح سے ادا کرتے تھے، ایک دو مفید مشورے بھی دیئے۔

میرا قیام جمعیۃ انقاذ فلسطین کے دفتر میں رہا، اخوانیوں نے میری موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے (مختصر قیام کے باوجود) اسی دفتر کے وسیع صحن میں ایک جلسہ کر لیا، میں نے "أزمة ایمان و أخلاق" (اصل بحران CRISIS صرف ایمان و اخلاق کا ہے) کے عنوان پر تقریر کی، یہ تقریر ایک رسالہ کی شکل میں بعد میں شائع ہوئی۔

کراچی میں

بغداد سے B.O.A.C کے جہاز میں جو لندن سے آرہا تھا کئی گھنٹے لیٹ کراچی پہنچے، وہاں عم محترم الحاج سید محمد خلیل صاحب نہٹوری کے فرزند سید محمد جمیل صاحب (اکاؤنٹنٹ جنرل پاکستان) اور برادر عزیز سید احمد الحسنی ہوائی اڈہ پر موجود تھے۔ قرابت قریبہ اور تعلق خصوصی کی بنا پر احمد بجا طور پر متوقع تھے کہ میں ان کے گھر ٹھہروں گا، لیکن میں نے منشی صاحب کے احترام میں اور ان کے والد صاحب سے خاص تعلقات کی بنا پر ان کے یہاں قیام کو ترجیح دی، غالباً تین دن ان کے یہاں قیام رہا، جس میں اعزہ، افراد خاندان سے ملاقاتیں ہوئیں، جن کی

بڑی تعداد کراچی ہی میں تھی، ایک دن سفیر شام استاد جواد المرابط نے (جن سے جدّہ میں ملاقات کا تذکرہ اوپر گزر چکا ہے) میرے اعزاز میں سفارت خانہ میں دعوت کی جس میں علامہ محمد بشیر الابراہیمی جو کراچی آئے ہوئے تھے، اور مولانا محمد یوسف صاحب بنّوری نے شرکت کی، اسی قیام کراچی میں ماہر القادری صاحب سے پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی جو کئی بار جمیل صاحب کے مکان پر آئے، سب سے بڑی بات یہ کہ اپنے علمی مربّی اور استاذ خلیل عرب صاحب کی زیارت و ملاقات سے آنکھوں کو نور اور دل کو سرور حاصل ہوا، جو تقسیم کے بعد کراچی منتقل ہو گئے تھے، یقین ہے کہ ان کو اپنے اس نااہل شاگرد کی (جس سے وہ اولاد کی طرح محبت کرتے تھے) اس عزت افزائی سے خوشی ہوئی ہو گی، اور انھوں نے اس کو اپنی تعلیم اور خلوص کا فیض سمجھا ہو گا، جو اس کی جامعہ دمشق کی دعوت سے ہوئی، کراچی سے دہلی ہو کر لکھنؤ آگیا، اور اس طرح یہ سفر بخیر و خوبی تمام ہوا۔ وللہ الحمد فی الأولی والآخرۃ۔

باب شانزدہم

ہندوستان کا قیام، بعض اہم واقعات، رنگون اور کویت کے سفر

(۱۹۵۶ء تا ۱۹۶۲ء)

مشائخ عصر کی خدمت میں

دمشق سے ہندوستان واپس آکر ۱۹۵۶ء، ۱۹۵۷ء کا سال تبلیغی دوروں، تحریر و تصنیف، سہارنپور رائے پور، دہلی کے سفروں میں گزرا، میں نے دار العلوم میں بعض اسباق بھی اپنے ذمہ لے لئے، اسی زمانہ میں بخاری شریف کا درس اپنے ذمہ لیا، اس کے مطالعہ اور تیاری کے دوران (جس کے لئے اکثر رات کو بھی شروح اور باریک حواشی دیکھنے پڑتے تھے) نظر کی کمزوری کا بشدت احساس ہوا، بھائی صاحب کے مشورہ سے سیتاپور جاکر معائنہ کرایا، تو معلوم ہوا کہ موتیا بند (کٹریکٹ) خاصا ترقی کر گیا ہے، اور اگرچہ پورے طور پر پختہ نہیں ہوا، لیکن آپریشن ہو سکتا ہے، اس وقت احتیاطاً اس سے گریز کیا گیا، البتہ براہ راست لکھنے کے بجائے املاء DICTATE کا سلسلہ شروع کر دیا جو (الحمد للہ بصارت بحال ہونے کے بعد بھی) ان سطور کی تحریر تک جاری ہے۔

مشائخ عصر کی خدمت میں اپنے مرشد و مربّی حضرت مولانا عبد القادر صاحب رائے پوری اور اپنے اولین شیخ حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری کے ماسوا (جن کی خدمت میں حاضری، تقسیمِ ملک کے بعد مشکل ہو گئی تھی) تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد مسترشدانہ اور خادمانہ حاضری ہوتی رہتی سب سے زیادہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب سے ربط و تعلق تھا، رائے پور آتے جاتے ان کی خدمت میں قیام ضروری تھا، شیخ کی جامعیت، بے پایاں شفقت اور علمی مناسبت (جس میں ایک خورد و خوشہ چین تھا دوسرا بزرگ محقق و محدثِ عصر) نے اس ربط و تعلق میں اور اضافہ کر دیا تھا، اسی شفقت و اعتماد کا نتیجہ تھا کہ حضرت شیخ نے اپنی تمام عربی تصنیفات اور جن کتابوں کی انھوں نے تحقیق و تکمیل فرمائی تھی، ان پر مجھ سے باصرار مقدمہ لکھوایا، ان کی شفقتوں دل جوئیوں اور کرم فرمائیوں کی تفصیل ان کی سوانح میں دیکھی جا سکتی ہے، جو ابھی حال میں راقم ہی کے قلم سے نکل کر شائع ہوئی ہے[1]، یہاں پر ایک گرامی نامہ کا مختصر اقتباس نقل کیا جاتا ہے، جس کو شیخ کی سوانح میں درج کرنے میں تو حجاب محسوس ہوا لیکن اپنی سوانح میں تحدیث بالنعمۃ کے طور پر درج کرنے میں حرج نہیں۔

"دعاؤں میں نہ مکّہ میں دریغ ہوا، نہ مدینہ پاک میں، اور یہ بھی یاد نہیں کہ کسی دن آپ کے لئے صلوٰۃ و سلام میں تخلّف ہوا ہو، اس سے تو آپ کو بھی انکار نہیں ہوگا کہ دل بستگی جتنی آپ سے ہے، اتنی کسی سے بھی نہیں رہی[2]"

شیخ الحدیث کے ماسوا، مشائخ عصر میں سے سب سے زیادہ ذہنی مناسبت

---

[1] ملاحظہ ہو صد ۲۳۲، صد ۲۳۴
[2] مکتوب از مدینہ منورہ ۲۲ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۹۳ھ

بھوپال کے حکیم و عارف شیخ حضرت شاہ محمّد یعقوب مجدّدیؒ سے تھی، بھوپال کے سالانہ تبلیغی اجتماع کے سلسلہ سے (جو ۲۵۔۳۰ سال سے قائم ہے) راقم سطور قریب قریب ہر سال بھوپال حاضر ہوتا تھا، خاندان اور سلسلہ کے روابط، مزید برآں رفیق قدیم مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب کے حضرت سے خصوصی ربط و تعلق کی بنا پر حضرت کے یہاں حاضری دینی شروع کی، حضرت کی بہت جلد توجّہ خاص ہوگئی، اجتماع کے موقعہ پر خاص طور پر مجھے دریافت فرماتے اور میری آمد کا انتظار فرماتے، ایک مرتبہ ازراہ شفقت مجھے نہ پاکر اور مجمع کو دیکھ کر ایک مکتوب[1] میں یہ شعر تحریر فرمایا ؎

ہمہ شہر پر ز خوباں منم و خیال ماہے
چہ کنم کہ چشم بدبیں نکند بہ کس نگاہے

دل را بہ دل رہیست، مجھے بھی حضرت کے ارشادات و ملفوظات میں تصوف و احسان کے لطیف نکتوں، نادر تحقیقات کے ماسوا بھی، زندگی کے عمیق مطالعہ، مسلمانوں کے مختلف طبقوں سے گہری واقفیت اور ان کی کمزوریوں اور مغالطوں کی نشان دہی اصلاح باطن کی ضرورت کو اس زمانہ کے طبائع و اذواق کے مطابق بیان کرنے اور اسکو ایک بدیہی حقیقت اور ضرورت ثابت کرنے، شکستہ دلوں کی تسکین، اور مثالوں اور چھوٹی چھوٹی حکایتوں کے پیرایہ میں عمیق و دقیق حقائق کو بیان کر دینے کا ایسا خداداد ملکہ اور کمال اور اس کے ایسے دل آویز نمونے نظر آئے جن کی مثال کم سے کم اس دور انحطاط اور سمت میں نہیں دیکھی[2] وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ

---

[1] مکتوب مورخہ ۱۰ ذی قعدہ ۱۳۸۹ھ ۱۹ جنوری ۱۹۷۰ء
[2] راقم نے ۱۳۸۶ھ (۱۹۶۷ء) سے حضرت کے ملفوظات قلمبند کرنے کی کوشش شروع کی (باقی اگلے صفحہ پر)

حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب کے بعد سب سے زیادہ ربط اور عقیدت مولانا وصی اللہ صاحب فتح پوری سے رہی، جو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے خلفائے کبار میں تھے[1] اور تقسیم کے بعد کم سے کم ہندوستان میں ان کے خلیفۂ اجل اور ان کے طریقۂ تربیت کے حامل و امین تھے، ۱۹۵۴ء میں ان کی خدمت میں خود ان کے وطن فتح پور تال نرجا حاضری ہوئی، اور پہلی حاضری میں ہی انھوں نے ایسی خصوصی شفقت فرمائی کہ مجھے بھی حیرت اور شرمندگی ہوئی، مولانا کے فتح پور سے منتقل ہو جانے کے بعد گورکھپور، پھر الہ آباد جہاں مستقل قیام فرما لیا تھا، وقفوں کے بعد حاضری ہوتی رہی بمبئی کے قیام میں بھی جہاں سے آخر میں مولانا کا خاص ربط پیدا ہو گیا تھا، حاضری دیتا رہا، الہ آباد جاتا تو مولانا ہی کا مہمان ہوتا، اور مولانا کی شفقتوں کے عجیب انداز اور ادائیں دیکھتا، خط و کتابت بھی رہی، ایک مکتوب میں تحریر فرمایا " جو حضرات اہلِ علم میرے پاس آمد و رفت فرماتے ہیں، ان میں غالباً سب سے زیادہ قلب کا رجحان جناب کی طرف ہوتا ہے[1] " نومبر ۱۹۶۷ء کو آخری سفر حجاز کے موقعہ پر جو سفرِ آخرت ثابت ہوا، آخری ملاقات ہوئی، اپنے گدّے پر بٹھایا، اور بڑی رازداری کے ساتھ لب مبارک کو کان کے پاس لا کر فرمایا کہ دعا کرو کہ حاضری ہو جائے، جہاز ہی پر بیت کے بجائے ربّ البیت کے پاس پہنچ جانے کا جو اچانک واقعہ پیش آیا، اس نے اس جملہ کی حکمت[2]

(مسلسل) ..... یہ مجموعہ مکتبہ "الفرقان" لکھنؤ کی طرف سے "صحبتے با اہلِ دل" کے نام سے شائع ہو چکا ہے جس میں تیس۳۰ مجلسیں ہیں، جو مختلف سنین واوقات میں قلم بند کی گئیں، اس کتاب کے کئی ایڈیشن ہندوستان پاکستان میں نکل چکے ہیں۔

[1] مکتوب شوّال ۱۳۷۷ھ

[2] ان تعلقات و روابط کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "پرانے چراغ" حصّہ اوّل کا مستقل مضمون ص۱۶۳-۱۸۱

واضح کردی۔

مولانا وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ تھانوی سلسلہ کے ایک دوسرے بزرگ حاجی عبدالغفور صاحبؒ جودھپوری سے بھی عقیدت و مناسبت رہی، ایک مرتبہ جودھپور رفیق محترم مولانا محمد منظور صاحب کے ساتھ جاکر دو ایک دن ان کی خدمت میں اشرف منزل میں قیام کیا، ان کی سادگی، بے نفسی، شفقت اور ماحول وخاندان میں ان کی تربیت وصحبت کے برکات دیکھے، تھانوی سلسلہ اور اس کے مزاج و مذاق کی متعدد بہترین خصوصیات کو انھوں نے اپنے اندر جذب کرلیا تھا۔

ان حضرات کے بعد، اب مولانا محمد احمد صاحب پھول پوری، یادگار سلف اور مشائخ کبار کا نمونہ رہ گئے ہیں، جب کبھی توفیق ہوتی ہے انھیں کی خدمت میں حاضر ہوکر ذکر الہی، فکرِ آخرت اور تواضع واخلاص کے وہ نمونے اور مناظر دیکھ لیتا ہوں جو جو اب صرف کتابوں کے اندر ملتے ہیں، اطال اللہ بقاءہ۔

جہاں تک اپنے شہر لکھنؤ کا تعلق ہے، یہاں دو بزرگ ہستیاں تھیں، جن کی خدمت میں نیاز حاصل تھا، ایک مولانا شاہ وارث حسن صاحب جن کا قیام شاہ پیر محمد صاحب کے ٹیلہ پر رہتا تھا، وہ ہمارے شہر لکھنؤ کے کثیر التعداد وکلاء، اعلی عہدیداروں اور صاحب وجاہت لوگوں کے پیر و مرشد تھے، اور ان کے ذریعہ اس طبقہ میں بڑی اصلاح ہوئی اور دینداری پیدا ہوئی، ان کو بیعت حضرت گنگوہیؒ سے تھی اور اجازت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ صاحب سے، وہ میرے والد صاحب اور بھائی صاحب سے اچھی طرح متعارف تھے، میں بہت زیادہ تو توان کی خدمت میں حاضر نہیں ہوسکا وہ میری طالب علمی و مدرسی کا دور تھا، لیکن جب بھی حاضر ہوا، خاندانی بزرگوں کی طرح

شفقت فرمائی اور یہ معلوم کرکے کہ میں قرآن شریف کا درس دیتا ہوں، مزید عنایت اور حوصلہ افزائی فرمائی اور برکت کی دعا دی۔

دوسری قابلِ احترام اور شہرۂ آفاق شخصیت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقیؒ کی تھی، جن سے قدیم روحانی اور خاندانی تعلقات تھے، اس لئے کہ ان کے والد ماجد مولوی ناظر علی صاحب میرے والد کے ماموں حضرت مولانا سیّد عبدالسّلام صاحب ہسوی مجدّدی (خلیفۂ خاص حضرت شاہ احمد سعید صاحب دہلوی مجدّدی) کے مرید باختصاص اور مجاز تھے، مولانا عبدالشکور صاحب کو اس سلسلہ کے بزرگوں سے عام طور پر اور حضرت مولانا عبدالسّلام صاحب سے عقیدت ہی نہیں عشق سا تھا، وہ اس تعلق کی بنا پر ہمارے خاندان کے ہر فرد بلکہ بچہ بچہ کا احترام کرتے تھے، مجھ پر بھی خصوصی شفقت فرماتے[1] میری ہی درخواست پر ایک مرتبہ میرے ساتھ حضرت مولانا محمّد الیاسؒ صاحب کے پاس نظام الدین دہلی تشریف لے گئے، اللہ تعالیٰ نے صحابۂ کرامؓ کی سینوں کے دل میں عظمت پیدا کرنے، ان کے حقوق و مقام سے آشنا کرنے اور شیعیت کے ان اثرات کو دور کرنے کے سلسلے میں (جو سلطنت اودھ کے اثرات سے اودھ میں گھر گھر پھیلے ہوئے تھے) ان سے تجدیدی خدمت لی۔ مجھے خاص طور پر ان کی جس ادا نے فریفتہ کیا اور ان کا معتقد بنایا، وہ اوّلاً ان کی سادگی، تواضع اور بےنفسی تھی، دوسرے ان کا حقانی و ربّانی وعظ جو علمائے سلف کی طرح ہر طرح کی لفّاظی اور تصنّع سے پاک، عقائد کی اصلاح، فرائض کی پابندی اور تذکیر بالآخرۃ پر مشتمل ہوتا تھا۔

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "پرانے چراغ" حصّہ دوم، مضمون مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی صفحہ ۲۱۵-۲۲۵

یہ تفصیل اس لئے لکھدی کہ مصر وشام اور ترکی کے ترقی یافتہ ملکوں اور وہاں کے نیز ہندوستان کے اعلیٰ سے اعلیٰ علمی، ادبی حلقوں میں شریک ہونے اور خود اپنے مطالعہ اور تصنیف اور اپنے اس "پیچ وتاب رازی" کے ساتھ جس نے کبھی ساتھ نہیں چھوڑا، دولئے دل بیچنے والوں اور عشق واخلاص کی دو کانوں سے برابر رابطہ رہا، کہ اس دورِ مادّیت اور ادّعائے علم میں یہی چیز کسی درجہ میں حفاظت کرنے والی ہے بقول اقبال ؎

می نہ روید تخمِ دل از آب و گِل
بے نگاہے از خداوندانِ دل

قادیانیت پر کتاب

دسمبر ۱۹۵۷ئ کے اواخر اور جنوری ۱۹۵۸ئ کے اوائل میں پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام لاہور میں مجلس مذاکرات اسلامی (اسلامی کلوکیم) کا انعقاد ہوا، جس میں خاص طور پر شرق اوسط کے سر برآوردہ علمائے نے شرکت کی، دعوت نامہ موصول ہونے کے باوجود، راقم سطور ان تاریخوں میں نہیں پہنچ سکا کہ وہ برار کے ایک طویل اور مفید دورہ پر تھا، جس میں تبلیغی دعوت کے ساتھ "پیامِ انسانیت" کے جلسے بھی شامل تھے جو بڑے کامیاب ہوئے اور برار کی نرم وحاصل خیز زمین، اور وہاں کی اثر پذیر طبیعتوں نے دونوں دعوتوں کا گرم جوشی سے استقبال کیا، دورہ کے اختتام پر بھوپال کے سالانہ اجتماع میں شرکت کی، اس طرح کلوکیم کی تاریخیں گذر گئیں۔

مصر وشام وعراق کے متعدد علماء اور قائدین فکر نے مذاکرات میں شرکت کرنے والے ہندوستانی علماء سے دریافت کیا کہ کیا قادیانیت کے مسئلہ پر عربی میں کوئی

ایسی کتاب ہے جس سے وہ اس کی حقیقت اور تاریخ سمجھ سکیں؟ علمائے کرام کوئی ایسی کتاب نہ پیش کر سکے جو جدید ذہن کو سامنے رکھ کر شیریں اور فصیح عربی میں لکھی گئی ہو، حضرت مولانا عبد القادر رائے پوریؒ کو جو اس زمانہ میں لاہور میں مقیم تھے اور جن کو قادیانیت میں اسلام کے لئے وہ خطرہ محسوس ہوتا تھا اور اس سے ان کی طبیعت کو ایسا اِبا، اور توحّش تھا جو شاید مولانا محمد علی مونگیریؒ اور مولانا انور شاہ صاحبؒ کے بعد علماء و مشائخ میں سے کم تر کسی کو رہا ہو گا، میری آمد کی اطلاع مل چکی تھی، حضرت کو شدّت سے میرا انتظار تھا، اور فرمار کھا تھا کہ میں اس کام کی تکمیل کے لئے اس سے اصرار کروں گا، میں حاضر ہوا تو مجھے اس موضوع پر عربی میں ایک مکمل کتاب کی تالیف کا حکم دیا، مجھے پہلے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے میرے سر پر پہاڑ رکھ دیا کہ میں اس کوچہ سے یکسر نابلد تھا، میں نے اس وقت تک کوئی کتاب پڑھی تھی نہ ان کی تردید میں کچھ دیکھا تھا، ۱۹۵۳ء میں جب پاکستان میں ختم نبوّت کی تحریک چل رہی تھی، اور مارشل لاء نافذ تھا، میں نے عربی میں ایک مضمون القادیانیۃ ثورۃ علی النبوّۃ المحمدیّۃ کے عنوان سے لکھ کر مصر و شام اور عراق کے دوستوں اور بزرگوں کے پاس بھیجا تھا، جس کو ان حضرات نے مصر و شام و کویت میں بھی شائع کرا دیا تھا اور رابطہ عالم اسلامی نے بھی اس کو بہت بڑی تعداد میں شائع کیا، لیکن وہ ایک سرسری جائزہ تھا، جس کا ماخذ اُردو کے چند رسائل تھے، میں نے پہلے تو عرض کیا کہ چونکہ میں عربوں کے ذہن، اور عالم عربی کے طریقِ فکر سے واقف ہوں، اس لئے کتاب کا خاکہ بنا دوں گا بہتر ہے کہ مولانا محمد یوسف صاحب بنّوری جو بلند مرتبہ عالم، محدّث، اور عربی لکھنے پر ہر طرح قادر ہیں، وہ اس کام کو انجام دیں، لیکن شاید حضرت کی توجہ قلبی کا نتیجہ تھا کہ میرا ذہن

خود بدل گیا، اور میں نے اس کام کی ذمہ داری لے لی۔ میں نے ایک مہینہ صوفی عبد الحمید صاحب مرحوم (سابق وزیرِ پنجاب) کی کوٹھی میں جہاں حضرت کا قیام تھا، اس علمی وتصنیفی اعتکاف میں اس طرح گزارا کہ گویا دنیا کی خبر نہ تھی، مرزا صاحب کی تمام کتابیں پڑھیں، نوٹس لئے، تقریباً ۲۳-۲۴ دن میں عربی میں "القادیانی والقادیانیة" کے نام سے کتاب تیار ہوگئی، جس کے کئی ایڈیشن بمبئی، لکھنؤ، جدہ اور مدینہ طیبہ سے نکل چکے ہیں اور عالم عربی میں اس کی خوب اشاعت ہوئی، یہ کام فروری ۱۹۵۸ء میں مکمل ہوگیا۔

اگلے سال پھر جب لاہور حاضری ہوئی تو حضرت نے اس کو اردو میں منتقل کرنے کا حکم دیا، الحمد للہ کہ قلیل مدت میں کتاب اردو میں منتقل ہوگئی، اس کتاب کی مناظرانہ جوش کے بجائے مؤرخانہ متانت، طنز وتشنیع کے بجائے استدلال اور اندرونی شہادتوں پر بنیاد رکھی گئی ہے، قادیانیت کے سرکاری اخبار الفضل نے اس پر ریویو کرتے ہوئے لکھا کہ "اس بات کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ پوری کتاب (اس موضوع کی دوسری کتابوں کے برخلاف) متین وشائستہ زبان میں لکھی گئی ہے، صرف اس کا نام قابلِ اعتراض اور اشتعال انگیز ہے" مصنف نے اس کا بھی لحاظ رکھا کہ جس غصہ اور کراہت کا اظہار وہ اپنے قلم سے کرسکتا ہے، وہ قارئین کے دل میں کتاب کے مواد سے خود پیدا ہو، چنانچہ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے میثاق میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ "مصنف پر تعجب آتا ہے کہ جہاں ان کو غصہ آنا چاہیے وہاں بھی ان کو غصہ نہیں آیا" حضرت نے اس کام کی تکمیل پر اپنی بڑی مسرت کا اظہار فرمایا اور بعض مرتبہ ہاتھ میں لے کر حاضر الوقت خدام واحباب سے فرمایا کہ یہ کتاب خرید وا ور پڑھو، مصنف کو پوری امید ہے کہ اس نے یہ خدمت انجام دیکر حضرت کے قلب کو مسرور کیا، اور ان کی

دعائیں لیں، اور یہ حقیر خدمت ان کے مزید قرب کا ذریعہ بنی[1]

سفرِ حیدر آباد

نومبر ۵۸ء میں جامع مسجد سکندر آباد (حیدر آباد) میں ہونے والے جلسۂ سیرت کی جو وہاں بڑے اہتمام سے ہوتا تھا، دعوت آئی، اس مجلس کے سکریٹری سکندر آباد کے مشہور تاجر پارچہ ایچ، ایم حسین تھے، ان کو مولانا محمد علی صاحب صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ نے مشورہ دیا کہ اس سال وہ مجھے بلائیں، یہ بھی کہا کہ جب تک تبلیغی جماعت کی طرف سے اس کی سفارش و کوشش نہیں کی جائے گی، وہ نہیں آئیں گے، میں عرصہ سے حیدر آباد نہیں گیا تھا اس سے قدیم و عزیزانہ روابط تھے اور وہ مسلمانوں کا ایک بڑا ثقافتی و تہذیبی مرکز تھا، میں نے دعوت قبول کی، میرے قیام کا انتظام جماعت کے احباب نے خیریت آباد کی مسجد کے سامنے ایک مکان میں کیا تھا اور میرے اس سفر و قیام کو مفید اور نتیجہ خیز بنانے کی پوری کوشش کی۔[2]

سکندر آباد کی جامع مسجد میں عظیم الشان جلسہ ہوا، مولانا محمد علی[3] صاحب نے جن سے میرا کوئی تعارف نہ تھا، میرے تعارف میں ایک نرالے انداز سے تقریر کی انھوں نے رواج کے مطابق میری تعریف میں کچھ نہیں کہا، فرمایا، خانۂ خدا میں کسی انسان کی تعریف زیب نہیں دیتی، میں اس خدا کی تعریف کرتا ہوں جس نے اس طرح

---

[1] اس کتاب کا انگریزی ترجمہ ڈاکٹر ظفر اسحٰق انصاری نے کیا، انڈونیشی اور افریقی زبانوں میں بھی اس کا ترجمہ ہوا۔

[2] اس کام میں محترمی ڈاکٹر سید وحید الزماں صاحب، مولوی رکن الدین ارشد صاحب اور مولوی عبدالقادر صاحب پیش پیش تھے۔

[3] مولانا محمد علی صاحب، مولانا گیلانی کے بعد شعبہ کے صدر ہوئے، وہ حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب سے بیعت و ارادت کا تعلق رکھتے تھے۔

کے انعامات فرمائے اور اپنے بندے کو ایسی ایسی توفیق دی۔ خدا کی شان کہ میں اس تقریر کے بعد ایک جماعت کے ساتھ حیدرآباد کے ایک ضلع غالباً نظام آباد کے ایک پروگرام میں گیا، اتیچ ایم حسین صاحب بھی ساتھ تھے، وہاں سے واپسی ہوئی تو دیکھا کہ بازار بند ہے، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ مولانا محمد علی صاحب کا انتقال ہو گیا[1]، ان کا جنازہ سکندرآباد کی جامع مسجد میں آنے والا ہے، ہم لوگ وہاں پہنچے تو مولانا کے خسر نواب حکیم مقصود جنگ صاحب نے مجھے نماز جنازہ پڑھانے کا حکم دیا ایسا معلوم ہوا گویا قدرت نے اسی کا سامان کیا تھا۔

سکندرآباد کے جلسۂ سیرت کے ماسوا حیدرآباد کے احباب نے مختلف علمی و دینی حلقوں میں مفید و بامقصد پروگرام رکھے تھے، ایک روز پرنس مکرم جاہ بہادر (نبیرہ اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں) نے بھی کھانے پر بلایا، جہاں پروفیسر الیاس برنی صاحب سے بھی ملاقات ہوئی، اور انھوں نے بڑی عنایت فرمائی، میں نے ان کی کتاب "قادیانی مذہب" کے بارے میں اپنے تاثّر و تشکّر کا اظہار کیا، جس سے مجھے اپنی کتاب "قادیانیت" کا خاکہ بنانے میں مدد ملی تھی، اور انھوں نے میرے ان مضامین کی تحسین کی جو ہندوستانی مسلمانوں اور ان کی دینی و علمی و وطنی خدمات کے سلسلے میں لکھے گئے تھے[2]، اور ان کا کچھ حصّہ "رہنمائے دکن" میں شائع ہوا تھا۔

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کا قیام

۵۸-۵۹ء میں ہمارے دوست سعید رمضان جو "المسلمون"

---

[1] مولانا کا انتقال ۱۱ نومبر ۵۸ء کی شب میں ہوا۔ غفرلہٗ

[2] یہ میری ریڈیائی تقریروں کے مجموعہ "المسلمون فی الھند" کے اردو ترجمہ سے ماخوذ تھے۔

رسالہ کو دمشق سے نکال رہے تھے، ڈاکٹریٹ کرنے کے لئے جرمنی چلے گئے انھوں نے مجھ سے خواہش کی کہ ان کی غیر موجودگی میں "المسلمون" کا اداریہ میں لکھدیا کروں، میں نے کئی مہینے اس کی تعمیل کی، اس سلسلہ میں میرا پہلا مضمون "رِدّۃ ولا ابا بکر لہا" کے عنوان سے تھا، جس میں میں نے عالمِ اسلام میں ایک نئے قسم کے ارتداد کی نشان دہی کی یہ وہ ارتداد ہے جو مشرق اسلامی پر یورپ کی سیاسی و تہذیبی تاخت کے پیچھے پیچھے آیا ہے اور سب سے عظیم ارتداد ہے جو عہدِ رسالت سے لے کر آج تک کی اسلامی تاریخ میں رونما ہوا ہے، یہ دینِ لادینیت ہے، جو مسلمان تعلیم یافتہ طبقہ کے بے شمار افراد کو اپنی گرفت میں لے چکا ہے لیکن پچھلی ارتدادی تحریکوں اور لہروں کے برخلاف اس ارتداد کی زد میں آنے والا اور ضروریاتِ دین اور حقائقِ دینی کا انکار کرنے والا کسی کلیسا یا مندر میں نہیں جاتا اور نہ تبدیلِ مذہب کا خود اعلان کرتا ہے اور نہ اس کا اسلامی معاشرہ اس پر چونکتا ہے اور اس سے فصل و انقطاع کا وہ معاملہ کرتا ہے جو مرتدین سابقین کے ساتھ کیا جاتا تھا، درحقیقت اس خیال کی بنیاد اور اس مسئلہ کی طرف توجہ فاضلِ گرامی ڈاکٹر رفیع الدین صاحب مرحوم کے ایک مضمون سے ہوئی تھی، میں نے یہ بنیادی تصوّر لے کر اس کو اس مضمون میں شرح و بسط کے ساتھ لکھا، لادینیت کی عالمگیر اشاعت کا راز بھی بتایا، عالمِ اسلام میں اس کے اہم مظاہر کی بھی نقاب کشائی کی، پھر اس کے علاج کے طریقے، نئی طاقتور دعوت ایمان اور اس کے لئے نئے علمی اداروں کی ضرورت، نئے ذہن کو سامنے رکھ کر طاقتور لٹریچر کی تیاری پر زور دیا، اور اس سنگین صورتِ حال کی تصویر کشی کی جس سے عالمِ اسلام دوچار ہے۔

یہ مضمون دو قسطوں میں "رِدّۃ جدیدۃ" اور "دعوۃ جدیدۃ" کے عنوان سے "المسلمون" میں شائع ہوا، بعد میں یہی ایک مستقل رسالہ کی شکل میں "رِدّۃٌ ولا أبابکرؓ لھا" (فتنۂ ارتداد ہے، اور اس کا مقابلہ کرنے کے لئے کوئی ابوبکرؓ نہیں) کے عنوان سے شائع ہوا، جو مختلف وقتوں میں اور مختلف اداروں کی طرف سے ہزاروں ہزار کی تعداد میں طبع ہوا اور منیٰ و عرفات تک میں اس کی تقسیم ہوئی، غالباً راقم کا کوئی مضمون، رسالہ، یا کتاب اتنی بڑی تعداد میں نہ شائع ہوئی نہ اثر انداز، اُردو میں اس کا ترجمہ مولوی عتیق الرحمٰن سنبھلی صاحب مدیر "الفرقان" کے قلم سے "نیا طوفان اور اس کا مقابلہ" کے عنوان سے پہلے "الفرقان" پھر رسالہ کی شکل میں کئی بار شائع ہوا۔[1]

اس مضمون کے لکھنے اور شائع ہونے کے بعد، شدت سے اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اس اعتقادی اور تہذیبی ارتداد اور اس فکری و اخلاقی انتشار کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک مستقل مجلس ACADEMY کی تاسیس ہونی چاہیئے

---

[1] اس سلسلہ میں ایک دلچسپ لطیفہ قابل ذکر ہے، غالباً سنہ ۱۹۶۴ء تھا، رابطہ کے اجلاس ہو رہے تھے، ہم لوگ رابطہ کے مرکز (مکہ معظمہ) میں بیٹھے ہوئے تھے کہ دروازہ سے ایک شیعہ عالم داخل ہوئے، میں چونکہ لکھنؤ کا رہنے والا ہوں اس لئے فوراً پہچان لیا کہ کوئی شیعہ مجتہد ہیں، مفتی سید امین الحسینی صاحب مرحوم (جو کچھ دن ایران میں رہے تھے) بڑھے اور ان کا استقبال کرکے لائے۔ اور ایک ایک سے تعارف کرانا شروع کیا، یہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ہیں، یہ فلاں ہیں یہ فلاں ہیں میری باری جب آئی تو انھوں نے کہا کہ ھذا الشیخ أبو الحسن الندوی، یہ نو وارد زائر (آیت اللہ) روح اللہ خمینی صاحب تھے، میرا نام سن کر بولے، ہاں ہاں میں نے آپ کا رسالہ ردّۃ ولا أبابکرؓ لھا پڑھا ہے، میرے خیال میں تو اس کا نام ردّۃ ولا أباحسنؓ لھا ہونا چاہیئے تھا، (مراد حضرت علیؓ ہیں) میں نے کہا جی نہیں! عربی کا محاورہ یہ نہیں ہے، عربی کا محاورہ ہے قضیّۃٌ ولا أباحسنؓ لھا (مشکل مسئلہ ہے اور اس کے حل کے لئے حضرت علیؓ نہیں ہیں) اس رسالہ کے لئے ردّۃ ولا أبابکرؓ لھا ہی کا عنوان موزوں تھا۔ اس پر وہ خاموش ہو گئے۔

جو اس کام کا بیڑہ اٹھائے، اور اسی کو اپنا موضوع بنائے، چنانچہ مئی ۱۹۵۹ء میں ایک صاحبِ خیر[1] کی ایک ہزار کی رقم سے اس کی تاسیس "مجلسِ تحقیقات و نشریاتِ اسلام" ACADEMY OF ISLAMIC RESEARCH & PUBLICATIONS کے نام سے عمل میں آئی، اس نے پہلی کتاب مقالاتِ سیرت مصنفہ ڈاکٹر محمد آصف قدوائی کے نام سے شائع کی، ان سطور کی تحریر کے وقت تک اس کی مطبوعات کی تعداد ۱۶۸ تک پہنچ گئی ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ کم سے کم انگریزی میں اس تحتی برِّ اعظم میں کسی ادارہ نے دعوتی و علمی انداز اور اچھی اور معیاری انگریزی میں دین و شریعت عقائد و ارکانِ اسلام، حدیث و سنت، سیرتِ طیبہ، خلفائے راشدین، اور تاریخ اصلاح و تجدید، نیز ہندوستان میں اسلام اور مسلمان کے تعمیری و رفاہی کاموں کے تعارف میں اس سے زیادہ لٹریچر شائع نہیں کیا، یورپ، امریکہ، اور جنوبی افریقہ اور عرب ممالک میں اس کی کتابیں بحمد اللہ بہت مقبول ہیں، یہ سب کام محض تائیدِ الٰہی سے ایسے تھوڑے سرمایہ اور ایسے محدود و مختصر عملہ کے ذریعہ وجود میں آیا، جس پر آسانی سے یقین کرنا مشکل ہے۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے مسئلے سے دلچسپی اور تعاون

راقم کو جس مکتبِ فکر اور جماعت سے تعلق تھا اور جس ماحول میں اس کا نشو و نما ہوا تھا اسے کسی دور میں علی گڑھ تحریک کے بانی سر سیّد احمد خاں مرحوم کے دینی خیالات و تحقیقات، مغربی تہذیب اور حکومت کے بارے میں ان کے موقف اور ان کی تعلیمی پالیسی اور جس انداز پر

[1] اس سے مراد حاجی محمد حسین صاحب حیدرآبادی ہیں جو ایچ ایم حسین کے نام سے مشہور ہیں اور ان دنوں راقم کے ساتھ حیدرآباد سے لکھنؤ آئے ہوئے تھے

وہ M.A.O. کالج کو لے جانا چاہتے تھے، اس سے کبھی کلّی اتفاق نہیں رہا[1] والد ماجد مولانا سیّد عبدالحی صاحبؒ کا سرسیّد کے نام ایک طویل مکتوب، جو ہمارے دینی و علمی حلقے کے حقیقی خیالات واحساسات کی پوری ترجمانی کرتا ہے، "حیاتِ عبدالحی" میں بجنسہٖ نقل کر دیا گیا ہے، لیکن اس سب کے باوجود میں نے میرے خاندان اور ندوۃ العلماء کے ذمّہ داروں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو مسلمانوں کا ایک ایسا بیش قیمت ملّی اثاثہ سمجھا، جس پر ۱۸۵۷ء کے بعد تعلیم یافتہ مسلمانوں کی بہترین توانائیاں اور ذہانتیں صرف ہوئیں اور وہ ہندوستانی مسلمانوں (ہزار اختلاف کے باوجود) اور شریف گھرانوں کے نوجوانوں کی سب سے بڑی تربیت گاہ ان کے مستقبل کو ڈھالنے والی کارگاہ اور ان کی علمی و عملی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے والی دانش گاہ سمجھی گئی، جن کے ہاتھ میں ملک کی تہذیبی، معاشرتی و سیاسی قیادت آنے والی تھی، اس لئے ان لوگوں کے لئے جن کی ان حقائق پر نظر تھی، اس سے صَرفِ نظر کرنا کسی زمانے میں جائز نہ تھا۔

میری یونیورسٹی میں آمد و رفت ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کی وائس چانسلری کے آخری دور سے شروع ہوئی اور اس کا سلسلہ ابھی تک قائم ہے، ڈاکٹر ذاکر حسین خان مرحوم (صدر جمہوریۂ ہند) کے برادر خورد ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے پرو وائس چانسلری کے زمانہ ۵۸-۵۹ء میں جب علی گڑھ جانا ہوا تو انھوں نے خصوصی تعلق و اعتماد کا اظہار کیا اور نجی مجلسوں میں ان خطرات و اندیشوں کا اظہار کیا، جو ہر حساس و دردمند مسلمان کے لئے باعثِ تشویش تھے،

---

[1] اس سلسلے میں مصنف کے اصلی خیالات اور اس تحریک کے بانی پر اس کے تبصرہ سے واقف ہونے کے لئے مصنف کی کتاب "مسلم ممالک میں اسلامیت و مغربیت کی کشمکش" کے اس باب کا مطالعہ کرنا چاہیئے جو علی گڑھ تحریک سے مخصوص ہے۔

دوسری طرف محبی ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشی اور محترمی ظفر احمد صدّیقی صاحب کی وجہ سے جن کو اپنی یونیورسٹی سے محبّت ہی نہیں بلکہ عشق تھا، علی گڑھ کے مسئلے سے دل چسپی اور اس سے ایک درجے کی وابستگی پیدا ہوئی۔

بدرالدّین طیّب جی نے جب ۱۹۶۲ء میں وائس چانسلری کا چارج لیا تو میں نے ان کو ایک مفصّل خط لکھا جس میں یونیورسٹی کی اہمیت اور ان کے عہدے کی ذمّہ داریوں اور نزاکتوں کی طرف توجّہ دلائی جس کا انھوں نے اثر لیا۔

پھر جب یونی ورسٹی کا اقلّیتی کردار اور اس کے وہ بنیادی مقاصد جن کے لئے وہ قائم کی گئی تھی خطرے میں پڑ گئے اور وہ ذہنی و اخلاقی انتشار اور تخریبی تحریکات کا مرکز بنتی نظر آئی، تو اس صورتِ حال کے خلاف سب سے پہلی آواز لکھنؤ سے بلند ہوئی ——— گنگا پرشاد میموریل ہال میں اس مسئلہ پر پہلا پبلک جلسہ ہوا جس میں میں نے تقریر کی، پھر لکھنؤ کے علیگ حلقہ نے جس میں حاجی شفیق الرحمٰن صاحب ایڈوکیٹ، الحاج مسعود حسن ایڈوکیٹ اور ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشی اور ظفر احمد صدّیقی پیش پیش تھے — اس کو ایک تحریک و تنظیم کی شکل دے دی، اور اسی زمانہ میں 'S.O.S. FOR MUSLIM UNIVERSITY ALIGARH' کے عنوان سے ایک مؤثر و فکر انگیز رسالہ شائع کیا جس پر ملک کے ممتاز ترین مسلمانوں کی بڑی تعداد میں دستخط ہیں، جن میں بھائی صاحب بھی تھے، اس تحریک کے ساتھ میرا تعاون اخیر تک جاری رہا، اور میں نے اس کو ہر دور میں مسلمانوں کی ایک بڑی ملّی خدمت اور وقت کا تقاضا سمجھا۔

برما کا سفر دارالعلوم ندوۃ العلماء کی (جس کی بحیثیت نائب ناظم اور اس سے

زیادہ خاندانی اور ذاتی تعلق کی بناء پر مجھ پر بھی ذمہ داری تھی) مالی حالت بہت کمزور چلی جارہی تھی، تقسیم کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی قوتِ امداد و اعانت اور اس کے وسائل و ذرائع، بہت محدود رہ گئے تھے، ہندوستان کے پڑوسی ملکوں میں برما ایک ایسا ملک تھا جہاں ہندوستانی (بالخصوص گجرات، سورت اور اس کے نواح) کے مسلمان تاجر بکثرت کئی پشتوں سے آباد، اور تجارت میں بحمداللہ کامیاب تھے وہ اپنے وطن کے بہت سے اداروں کی بھی بڑی اولوالعزمی کے ساتھ مدد کرتے تھے، حسنِ اتفاق کہ دیوبند کے ایک فاضل قاری عبدالرحمٰن صاحب قاسمی نے ذاتی تعارف و روابط کی بنا پر مجھے رنگون آنے کی دعوت دی تاکہ وہاں کے علمی و دینی حلقوں میں کچھ نئی حرکت اور بیداری پیدا ہو، ساتھ ہی ساتھ دارالعلوم کی طرف بھی جس سے وہاں کا متمول طبقہ بیشتر ناآشنا تھا، توجہ ہو، دارالعلوم کے ہمدردوں کے مشورے اور بھائی صاحب کی اجازت و ہدایت سے (جو اس زمانہ میں بلڈ پریشر کے سخت مریض تھے) میں نے عزیز گرامی محمد معین اللہ صاحب ندوی کی معیت میں سفر کا ارادہ کرلیا، ہم ۱۸ دسمبر ۱۹۶۰ء کو رنگون پہنچے، اخبارات میں چھپا کہ "آزاد برما میں کسی عالم کا اس سے پہلے ایسا استقبال نہیں ہوا" قاری عبدالرحمٰن صاحب قاسمی، مولانا ابراہیم احمد صاحب مظاہری[1]، اور مفتی محمود داؤد صاحب کی توجہ اور سعی سے رنگون کے دینی حلقہ میں ہماری آمد کی عام اطلاع ہوگئی تھی، ہمارا قیام چند دن

---

[1] یادش بخیر، مولانا ابراہیم احمد صاحب مظاہری مدیر "دورِ جدید" (رنگون) کی شخصیت بڑی دل آویز اور جامع تھی اور ان کی داستانِ حیات بڑی عبرت انگیز اور سبق آموز، ۲ مارچ ۱۹۶۴ء کو ان کا انتقال ہوا، راقم نے اپنے ایک عربی مضمون میں جو حضارۃ الاسلام دمشق میں "رجلٌ فقدناہ" کے عنوان کے ماتحت شائع ہوا تھا ان کا تعارف کرایا تھا۔

حاجی عبدالمجید صاحب سورتی کے مکان پر، پھر دوستوں کے مشورہ سے حاجی احمد علی موکانی کی کوٹھی پر رہا، جو ایک بڑی نائلون فیکٹری کے مالک اور شہر کے بڑے تجاّر میں تھے، رنگون میں ایک مہینہ سے زیادہ قیام رہا، جس میں درجنوں نہیں بلکہ بیسیوں تقریریں ہوئیں، جن میں اہلِ برما کو اس ملک میں اسلام کی حفاظت و اشاعت اور یہاں کی آبادی کو اسلام سے متعارف اور مسلمانوں سے مانوس کرنے کے ضروری کام کی طرف متوجہ کیا گیا اور صاف طور پر یہ کہا گیا کہ اگر یہ کام نہ ہوا تو یہاں مسلمانوں کی خیر نہیں، اور نہ ان کی تجارت اور خوش حالی کی کوئی ضمانت ہے پہلی تقریر رنگون کی مشہور سورتی مسجد میں ہوئی، جس میں اس ملت کا دورِ ابراہیمیؑ اور نبوت محمدیؐ سے رشتہ بتاکر ابراہیمیؑ، محمدیؐ تہذیب کی حقیقت بیان کی گئی، اور بتایا گیا کہ حبّ الوطنی اور ابراہیمیؑ محمدیؐ تہذیب میں کوئی تضاد نہیں، ملّتِ ابراہیمیؑ کسی کا اجارہ نہیں، اس کا عملی مظاہرہ اور اس کی نمائندگی ہر ملک اور ہر زبان کے سایہ میں کی جاسکتی ہے، عربی کے بعد تمام زبانیں برابر ہیں، اس لئے برمی مسلمانوں کو برمی زبان میں پوری مہارت پیدا کرنے اور اسلام کے تعارف کی ضرورت ہے اور بتایا گیا کہ وہ کیا حدود اور سرحدی خطوط ہیں جن کی حفاظت کرنی ہے اور ان کے اندر رہ کر پوری آزادی ہے، مجھے یہ معلوم کرکے بڑی خوشی ہوئی کہ حضرت تھانویؒ جب یہاں تشریف لائے تھے، تو ان کا پہلا وعظ اسی مسجد میں اور ملّتِ ابراہیمیؑ پر ہی ہوا تھا۔

رنگون پہنچ کر ہم نے جو کام کئے، ان میں اوّلین فرصت میں ہندوستان کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر مرحوم کی قبر پر حاضری اور فاتحہ خوانی تھی، جہاں دل کے

داغ، اور دماغ کے تاریخی نقوش تازہ ہوگئے۔

برما کے قیام کے زمانہ میں ایک دو مقامات خاص طور پر مانڈلے اور میمیو MAYMYO کا سفر ہوا، برما کے قیام میں اوُرشید صاحب منسٹر برما سے خاص تعلق رہا، ندوۃ العلماء کے لئے اچھی رقوم فراہم ہوئیں، لیکن ان کا بہت کم حصّہ ہندوستان منتقل ہوسکا، ندوۃ العلماء کا مالی فائدہ تو کم ہوا، لیکن برما کا دینی فائدہ بفضلہ تعالےٰ ضرور ہوا، اور برسوں گذر جانے کے بعد اب بھی وہاں کے متعدد دوستوں سے دینی روابط ہیں۔

ہمارے آنے کے کچھ ہی عرصہ کے بعد وہاں فوجی انقلاب ہوا، اور کمیونسٹ حکومت آگئی اور وہ سب پیش آیا جس کا خطرہ ان تقریروں میں ظاہر کیا گیا تھا اور جو کسی کشف اور خارق عادت چیز پر مبنی نہیں تھا، قرآن مجید کے تھوڑے بہت فہم، اور تاریخ کے مطالعہ نے اس کی طرف رہبری کی تھی، لوگ اب ان تقریروں کے ریکارڈ سنتے ہیں اور تعجّب کرتے ہیں۔

آزاد ہندوستان میں دینی تعلیم کی عظیم مہم اور صوبائی دینی تعلیمی کانفرنس بستی

ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد جہاں تک ملّتِ اسلامیہ ہندیہ کا تعلق ہے اس کے اہم ترین اور موت وحیات کا فیصلہ کرنے والے مسائل میں، مسلمانوں کی نئی نسل کا اسلام کے بنیادی عقائد، ایمانیات، اور اپنے ملّی تشخّص اور امتیاز پر برقرار رہنے کا مسئلہ تھا، جو ہندوستان کے ایک سیکولر (نامذہبی) اسٹیٹ بن جانے کے بعد بڑی اہمیت اختیار کرچکا تھا، اس نامذہبی اسٹیٹ میں مسلمان بچوں کی دینی تعلیم کا انتظام حکومت کے فرائض میں نہیں تھا، دستوری

اور قانونی حیثیت سے یہ معاملہ سارے فرقوں کے ساتھ مساوی ہونا چاہیئے تھا لیکن حکومت کی مشنری کے اکثریت کے طبقہ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے فطرتاً اس میں سارے فرقوں کے ساتھ یکساں اور مساویانہ طرزِ عمل کا باقی رہنا نہایت دشوار تھا، اسی کے ساتھ مسلمانوں کے بارے میں ماضی کی تلخیاں، پاکستان کا وجود، اور ہندو احیائیت (REVIVALISM) کی موجودگی، غیر مذہبی نصاب کے واضعین کی بھی ہندو ذہنیت، ان سب نے مل کر مسئلہ کو نہایت پیچیدہ بنا دیا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقسیم کے فوراً بعد ہی بیسک ریڈروں میں ہندو دیو مالا (MYTHOLOGY) کی باتیں اور مشرکانہ کہانیاں اور اسباق صاف صاف آنے لگے اور یہ نظر آنے لگا کہ اگر یہ سلسلہ چند سال اور جاری رہا تو ملّتِ ابراہیمیؑ اور امت محمدیؐ کی نئی نسل اسلام کے عقیدۂ توحیدِ خالص سے ناآشنا یا منحرف، اور شرک جلی اور کفریہ عقائد کی معتقد یا ان سے متاثر ہو جائے گی۔

اس سلسلہ میں کرنے کے دو کام تھے، ایک سلبی (NEGATIVE) اور ایک ایجابی (POSITIVE) منفی اور انتظامی تو یہ کہ حکومت سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ اپنی تعلیمی پالیسی میں دیانت داری کے ساتھ نامذہبی اور غیر جانبدار ہو اور سب فرقوں کے ساتھ یکساں معاملہ کیا جائے، نیز یہ کہ نصاب کو بھی انگریزی دور کی طرح سیکولر بنایا جائے جس کی نصابی کتابوں میں عام معلومات کی چیزیں یا کتے، بلی کی بے ضرر کہانیاں ہوتی تھیں، لیکن کسی مذہب کی تلقین نہیں کی جاتی تھی، مثبت یہ کہ بیسک اور بنیادی تعلیم کا انتظام مسلمان اپنے بچّوں کے لئے خود کریں، اس کے لئے مکاتب و مدارس قائم کریں، جن میں اردو اور عقائد و دینیات کی ابتدائی تعلیم ہو، اور مسلمان بچّوں کے ذہن میں اسلامی نقوش ثبت ہو جائیں۔

قاضی محمد عدیل عباسی

اس خطرہ کا واضح طور پر احساس سب سے پہلے قاضی محمد عدیل عباسی صاحب کو ہوا جو ایک ممتاز نیشنلسٹ اور کانگریسی مسلمان تھے، یوپی اسمبلی کے ممبر بھی رہے، اور ڈسٹرکٹ بورڈ بستی کے اہم رکن اور عہدیدار بھی، ڈسٹرکٹ بورڈ کے اندر رہتے ہوئے اور خاص طور پر ایجوکیشن کمیٹی کے عرصہ تک چیرمین رہنے کی وجہ سے، اور پھر اپنی وسیع واقفیت، حقیقت پسندانہ ذہن اور اسلامی ضمیر و احساس کی وجہ سے انھوں نے اس خطرہ کو نہ صرف یہ کہ جلد ہی بھانپ لیا، بلکہ یہ ان کے ذہن و اعصاب پر ایسا مستولی ہوگیا کہ انھوں نے اپنی پوری توانائی، اور اپنی تمام ذہنی صلاحیتیں اس پر مرکوز کردیں، وہ عرصہ تک اپنے ضلع کے حدود ہی میں اس خطرہ کا مقابلہ، اور مکاتب و مدارس قائم کرنے کا کام خاموشی سے کرتے رہے، ان کو ایک ایسا چٹکلہ ہاتھ آگیا جس سے وہ عام چندہ سے بڑی حد تک مستغنی ہوگئے۔ یہ چٹکلہ چٹکی فنڈ تھا، انھوں نے یہ تحریک چلائی کہ ہر گھر میں کھانا پکاتے وقت ایک مٹھی آٹا ایک ہانڈی میں جو اس کے لئے مخصوص کردی جائے، ڈال دیا جایا کرے اسی کو فروخت کرکے مقامی مکتب کا خرچ چلایا جائے، وہ اسی دائرہ کے اندر عرصہ تک محدود ہوکر کام کرنا چاہتے تھے، لیکن جب مولانا محمد منظور صاحب نعمانی، راقم سطور، اور بعض دوسرے دوستوں کے سامنے وضاحت کے ساتھ یہ مسئلہ آیا تو ہم نے ان سے اصرار کیا کہ وہ اپنے اس دائرہ سے باہر قدم نکالیں اور اس کو کم سے کم صوبائی پیمانہ پر انجام دینے کی کوشش کریں۔

ہماری گفتگوؤں کے بعد وہ اس پر آمادہ ہوگئے اور انھوں نے ۳۰، ۳۱ دسمبر ۱۹۵۹ء، یکم جنوری سنہ ۱۹۶۰ء کی تاریخوں میں بستی میں، ایک صوبائی دینی کانفرنس بلائی

جس میں انھوں نے صرف صوبہ ہی نہیں بلکہ صوبہ کے باہر سے بھی ممتاز مسلمان دانشوروں تعلیمی مسئلہ سے دل چسپی رکھنے والوں، قومی، ملّی کارکنوں، اور تنظیموں کے سربراہوں کو بلایا، اس پہلی کانفرنس کی صدارت کے لئے قرعۂ فال میرے نام نکلا، کونسل کی صدارت کے لئے بھی میرا ہی انتخاب ہوا، میں نے عجلت میں سہارن پور اور ہردوئی کے درمیان ٹرین ہی پر خطبہ لکھا، جو چھپ گیا، اور اس کا انگریزی ترجمہ بڑی اچھی زبان میں مولوی عبیدالرحمٰن صاحب ایڈوکیٹ بستی نے کیا، جو انگریزی کے ایک بڑے اچھے ادیب اور انشاء پرداز ہیں، یہ کانفرنس اور خطبہ ایک طرح سے اس سفر اور سمت میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے، اور ہندوستانی مسلمانوں کے ملّی تشخص اور ان کے بنیادی مسائل کی تاریخ لکھنے والا اس کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔[1] تقسیمِ ہند کے بعد مشکل سے دو ایک تحریکیں ہوں گی جو دینی تعلیمی کونسل کی تحریک کی طرح ٹھوس بنیادی اور وقت کے اہم ترین مسئلہ پر شروع کی گئی ہوں گی۔

ظفر احمد صدّیقی صاحب

دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش کو ایک لائق و مخلص رہنما اور کارپرداز، اور اس کے بانی اور جنرل سکریٹری قاضی محمد عدیل عباسی صاحب کو ایک سرگرم رفیق و معاون ظفر احمد صدیقی صاحب (علیگ) ایڈوکیٹ سیتاپور کی شکل میں مل گیا، جنھوں نے اگست ۱۹۶۴ء میں بحیثیت سکریٹری دینی تعلیمی کونسل، اپنا کامیاب پیشۂ وکالت ترک کر کے اور سیتاپور سے لکھنؤ منتقل ہو کر اپنی پوری زندگی اور توانائیاں مسلمانوں کی دینی تعلیم کے مسئلہ اور دینی تعلیمی کونسل کے لئے وقف کر دیں، مسلمانوں کے تعلیمی مسئلہ اور اس سلسلہ میں گورنمنٹ کی تعلیمی پالیسی

---

[1] قاضی صاحب نے ۲۲؍ مارچ ۱۹۸۰ء کو انتقال کیا۔

مختلف اوقات میں اس کے اعلانات اور محکمۂ تعلیم کے افسروں کے طرزِ عمل سے دور دوران سے زیادہ واقف آدمی کا ملنا مشکل تھا، انھوں نے ایک سپاہی اور رضاکار کے انداز میں پوری سادگی بلکہ جفاکشی کے ساتھ دینی تعلیمی کونسل کے غریبانہ دفتر ۹۹ گوئن روڈ، لکھنؤ میں قیام اختیار کرلیا، اور سب کشتیاں جلاکر، ایک ایسے مسئلہ کے آستانہ پر آکر پڑگئے، جو ان کے نزدیک مسلمانوں کی موت و حیات کا مسئلہ تھا۔

اس دینی تعلیم کے مسئلہ کے علاوہ، وہ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کے غالباً سب سے بڑے وکیل و ترجمان، اور اس کے لئے سینہ سپر تھے، اسی مسلسل جدوجہد اور مشغولیت کے دوران، ان پر فالج کا حملہ ہوا، اور تقریباً دو سال اس میں مبتلا رہ کر ۴/ اکتوبر ۱۹۸۰ء کو جان جاں آفریں کے سپرد کی اور اپنے وطن موضع راما بھاری ضلع سیتاپور میں سپردِ خاک کئے گئے۔ ع

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے

۴، ۵/ جون ۱۹۶۱ء کو یہ صوبائی دینی تعلیمی کانفرنس لکھنؤ میں، اور اسی سال ۱۱، ۱۲/ نومبر کو ٹونک راجستھان میں، ۲۰، ۲۱/ جون ۱۹۶۴ء کو الہ آباد میں ہوئی، اور ہر مرتبہ میں نے بحیثیت صدر کے خطبہ دیا جو پہلے سے چھپا ہوا تھا، یہ خطبات صورتِ حال کی صحیح عکاسی، مسلمانوں کے جذبات اور نقطۂ نظر کی صحیح ترجمانی ہی کی حیثیت سے نہیں، خود حکومت ہند، وزارتِ تعلیم اور اکثریت کی خیرخواہی اور رہنمائی اور وطن دوستی کے لحاظ سے بھی تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔[1]

---

[1] یہ خطبات اور اس کے بعد کے خطبات صدارت صدر دفتر دینی تعلیمی کونسل ۹۹ گوئن روڈ، لکھنؤ سے مل سکتے ہیں، نیز کونسل کا دوسرا لٹریچر، اور قاضی صاحب اور دوسرے ماہرین تعلیم کے (باقی اگلے صفحہ پر)

کیرالا کا ایک سفر اور ایک اہم خطبہ

۱۸ ار شعبان ۱۳۸۰ھ (۵ فروری ۱۹۶۱ء) کو کالی کٹ میں ندوۃ المجاہدین کا سالانہ اجلاس تھا، جو کیرالا کی اہم اور فعّال دعوتی، تعلیمی اور اصلاحی انجمن ہے، انجمن کے ذمّہ داروں کے اصرار اور بعض دوستوں کی سفارش پر میں نے اس کی صدارت کرنا منظور کیا، اور عربی میں (اس علاقہ میں اردو نہ ہونے کے برابر ہے) خطبہ تیّار کیا۔ جس میں ملّتِ ابراہیمیؑ اور تہذیب اسلامی کے عناصر ترکیبی اور نمایاں خط و خال پیش کئے، اور ان کو مضبوطی سے پکڑنے اور ان پر قائم رہنے کی دعوت دی، ایک غیر مسلم اکثریت کے ملک میں جو اپنا خود ایک فلسفہ، تاریخ اور تہذیب رکھتا ہے، دینِ حنیف کے متّبعین کی ذمّہ داریاں، راہ کی مشکلات اور صحیح طریقِ کار کیا ہے؟ اور دعوت و داعی کے کیا لازمی صفات، اور فرائض ہیں؟ اس مقالہ میں بتایا گیا کہ ہر زمانہ کی طرح اس زمانہ میں بھی اس دین کی دعوت (جس کی تاسیس حضرت ابراہیمؑ کے ذریعہ اور تکمیل و تجدید خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ ہوئی) سے زیادہ موزوں دعوت اور اس معاشرہ و تمدّن سے جس کی بنیاد اسلام نے رکھی، صالح اور عادل معاشرہ و تمدن نہیں ہو سکتا، اس دعوت و تمدّن کے امتیازی خط و خال عقیدۂ توحید، عقیدۂ آخرت، عدل و مساوات، احترام انسانیت، ہدایتِ عامہ کی فکر، اور اور دین کی آفاقیت ہے[1]۔ علماء اور دین کے شارحین کو یہاں کس عمیق فہم دین

(مسلسل)..... مضامین و خطبات دستیاب ہوسکتے ہیں — اس کونسل کی کارکردگی اور قاضی محمد عدیل عباسی صاحب کی جد وجہد کا اندازہ اس سے ہوگا کہ کونسل کے قیام کے تیسرے ہی سال، ۳۰ نومبر ۱۹۶۳ء کو دینی تعلیمی کونسل کی رپورٹ میں بتایا گیا کہ آٹھ ہزار مکاتب اور ۴ لاکھ طالب علم ہیں۔

[1] اس موضوع پر بعد کی تقریروں میں میں نے ایک اور خصوصیت کا اضافہ کیا جس کا عنوان "طہارت" ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

وسعت قلب سے کام لینا چاہیئے۔ اور کس حد تک حالات کی رعایت کرنی چاہیئے، آخر میں تعلق باللہ اور اتباع سنّت، اور جزوی اختلافات کو زیادہ اہمیت دینے سے اجتناب کی تلقین کی گئی، یہ مقالہ "ملّۃ ابراھیمؑ وحضارۃ الاسلام" کے عنوان سے عربی ٹائپ میں چھپ چکا ہے، اس کا اردو ترجمہ اضافوں کے ساتھ "اسلام مکمّل دین، مستقل تہذیب" کے عنوان سے چھپا ہے۔

بھائی صاحب کی وفات اور زندگی کا اہم حادثہ

۷ مئی ۱۹۶۱ء کو بھائی صاحب کی وفات کا وہ حادثہ پیش آیا، جو میری شعوری زندگی کا سب سے بڑا حادثہ تھا، اور میں نے یتیمی کی وہ کیفیت محسوس کی جو کمسنی کی وجہ سے والد صاحب کی وفات پر نہیں محسوس کی تھی، اس حادثہ کی المناکی کو اس بات نے اور بڑھا دیا کہ رائے پور اور سہارن پور کے سفر کی وجہ سے میں نہ وفات کے وقت موجود تھا، نہ جنازہ اور تدفین میں شریک ہو سکا، اسی دن سہارنپور میں شدید اور نازک علالت کا تار ملا، اور میں پہلی گاڑی سے (شام کو دہرہ ایکسپرس سے) لکھنؤ کے لئے روانہ ہو گیا، یہ سفر جس طرح طے ہوا، اور راستہ جس حال میں گذرا، خدا اس طرح کا دن پھر نہ لائے، ہونے والے واقعہ کا دھڑکا لگ گیا تھا، میں ڈر رہا تھا کہ راستہ میں خود میرے ساتھ کوئی واقعہ نہ پیش آجائے، لکھنؤ پہنچا تو عزیزی مولوی معین اللہ صاحب اور چند احباب پلیٹ فارم پر موجود تھے، جنھوں نے واقعہ کے متعلّق کچھ نہیں کہا، یہ کہا کہ آپ کو رائے بریلی چلنا ہے، میں سب سمجھ گیا، باہر

(مسلسل) ... دنیا کے دوسرے مذاہب واقوام صرف "نظافت" کے مفہوم سے آشنا ہیں "طہارت" کا عمیق اور جامع تصور صرف ملّتِ ابراہیمیؑ، اور شریعت محمدیؐ میں ہے۔

سیّد صدیق حسن صاحب (آئی، سی، ایس) کی موٹر کھڑی تھی، میں رائے بریلی پہنچا تو یہاں سب کچھ ہو چکا تھا، تدفین کو دو ہی تین گھنٹے ہوئے تھے، ابھی تک جس گریہ کو ضبط کئے ہوئے تھا، عزیزی محمد میاں کو دیکھ کر وہ اُمنڈ پڑا، اسی طرح کا واقعہ (سفر اور غیبت میں والد وسرپرست کی وفات وتدفین) بھائی صاحب کے ساتھ والد صاحبؒ کے معاملہ میں، اور میرے دادا مولوی حکیم سیّد فخر الدین صاحبؒ کا اپنے والد مولانا سیّد عبد العلی صاحب کے معاملہ میں پیش آچکا تھا۔

یہاں پر ادیب کبیر مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی کا تعزیت نامہ نقل کیا جاتا ہے کہ وہ صورتِ حال کی پوری تصویر، اور جذباتِ دلی کی پوری تعبیر ہے:

بسم اللہ

دریاباد
۹ مئی ۱۹۶۱ء

برادرم۔ السّلام علیکم ورحمۃ اللہ،

مرگ مومن کی حقیقت مجھ سے زیادہ آپ پر روشن ہے، اس لئے تعزیت میں آپ سے کچھ عرض کرنا، لقمان کو حکمت کا درس دینا ہے۔ لیکن معرفت کی جس منزل پر بھی اللہ آپ کو پہنچا دے، بہرحال انسان ہی ہیں، جیسا کہ میں انسان ہوں، اور اپنے بھائی کے غم کا تجربہ حال میں اُٹھا چکا ہوں۔

گوشت پوست کا بنا ہوا دل کیسے ممکن ہے کہ پتھر کا بن جائے، اور جو صدمہ طبعی ہوتا ہے، اس کی انتہائی تلخی اور چبھن محسوس نہ کرے مدّتوں اور برسوں نہیں، کہنا چاہیئے کہ ابھی دنوں کی بات ہے

کہ آپ نے میرے بڑے بھائی کی[1] تعزیت مجھ سے کی تھی، آج بجنسہٖ اسی منزل پر آپ خود آگئے۔

مرحوم آپ کے لئے بھائی کی سی نہیں، باپ کی سی شفقت رکھتے تھے اس کا مجھے علم ہے، آپ سب کے دلوں پر جو کچھ گزر رہی ہوگی، وہ آپ ہی جانتے ہوں گے، امتحان واقعی سخت ہوتا ہے، لیکن آپ تو ظرف بھی اسی قدر عالی رکھتے ہیں، انشاء اللہ پوری طرح صبر ہی نہیں، مقام تسلیم و رضا پر ثابت رہیں گے، اور آپ خود اپنی ذات سے مرحوم کی بچیوں اور صاحبزادہ کے لئے نمونۂ استقامت کا کام دیں گے، مرحوم کا آپ سے تو خیر خون کا رشتہ تھا، میرے لئے بھی بھائی سے کم نہ تھے، اور اس میں شاید کچھ مبالغہ نہ ہو کہ جس طرح آج آپ اپنے والد مرحوم کی وفات دوبارہ محسوس کر رہے ہوں گے، میں بھی اپنے بھائی مرحوم کی وفات کا صدمہ از سرِ نو محسوس کر رہا ہوں۔

بہر حال جس کی حکمت نے یہ وقت ڈالا ہے، اسی کی رحمت اسے کاٹ بھی دے گی، اور میں اپنی کیا کہوں، ایک بہترین اور شفیق معالج سے میں اکیلا نہیں، سارا خاتون منزل[2]، کیا بڑے کیا چھوٹے، سب ہی محروم ہوگئے، اور آپ کی خانگی ذمہ داریاں بھی دفعتًا کئی گنا بڑھ گئیں۔

---

[1] مولوی عبد المجید صاحب ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر (والد برادرم مولوی حکیم عبد القوی دریابادی، حال مدیر "صدق جدید") مراد ہیں۔

[2] لکھنؤ میں مولانا اور مولانا کے خاندان کی قیام گاہ واقع گولا گنج، جہاں پرانا ندوہ تھا۔

جو چھوٹا تھا وہی سب سے بڑا بنا دیا گیا، اور اسی کو اب خاندان کا

افسر بن کر رہنا ہے، رہیں مرحوم کی دینی و ملّی خدمات تو ؏

سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

انشاء اللہ اسی ہفتہ کے اندر اصالۃً بھی حاضر ہو کر شرکتِ غم کروں گا۔

جن بچیوں کو ابھی ماں کا داغ تازہ تھا، ان پر کتنی جلدی یہ دوسرا پہاڑ

صدمہ و غم کا آپڑا۔

والسّلام

دعاگو

عبدالماجد

کویت کا سفر

بھائی صاحب کے انتقال کے بعد جو اخیر وقت تک ندوہ کے ناظم رہے بڑی ذمہ داری مجھ پر آگئی تھی، ۱۸ جون ۱۹۶۱ء کے جلسۂ انتظامیہ میں بحیثیت ناظم ندوۃ العلماء کے میرا باقاعدہ انتخاب ہو گیا، اس لئے ذمّہ داری میں اور اضافہ ہو گیا، دارالعلوم کی مالی حالت بدستور کمزور چل رہی تھی، برما کے سفر کا بھی (پوری رقوم کے منتقل نہ ہونے کی وجہ سے) کوئی بڑا عملی فائدہ نہ ہوا، ادھر کویت میں (جو پٹرول پیدا کرنے والا ایک دولتمند ملک ہے، اور ساتھ ہی ساتھ عربی زبان اور دین کے ذریعہ سے وہاں ندوہ کا تعارف آسان اور مؤثر بھی تھا) بعض اصحابِ خیر جن میں کھنڈوہ کے رہنے والے ڈاکٹر عبداللطیف صاحب (جن کے دو بچے کچھ عرصہ دارالعلوم میں رہ چکے تھے)، کویت آنے کی دعوت دے رہے تھے، ڈاکٹر صاحب جو پاکستانی قومیت رکھتے تھے، اور عربی زبان پر بھی ان کو زیادہ قدرت نہ تھی، اس سلسلہ میں زیادہ تر کویت کے

ایک مخلص اور دیندار، مخیّر اور بااثر تاجر و عالم شیخ عبد الرّزاق الصّالح پر اعتماد رکھتے تھے جو پہلے سے میری عربی تصنیفات کے ذریعہ متعارف ہو چکے تھے، اور خود بھی میرے آنے کے خواہش مند تھے، انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ ندوہ کے وفد کے آجانے کے بعد وہ اپنے حلقۂ اثر میں ندوہ کی امداد و خدمت کی پوری تحریک کریں گے، اور یہ دورہ ہر طرح کامیاب ہوگا، میں نے یہ شرط کی کہ میں وہاں کہیں آؤں جاؤں گا نہیں ان حضرات کو خود ہی کہنا ہوگا، اور کوشش کرنی ہوگی، میرا سفر دینی و دعوتی ہوگا کریم النفس اور عالی حوصلہ داعیوں نے سب شرطیں منظور کیں، میں اپنے دو رفیقوں مولوی معین اللہ ندوی، اور محمد رابع ندوی کی معیت میں ۲۴؍ جنوری ۱۹۶۲ء کو براہ بمبئی ہوائی جہاز سے روانہ ہوا، ہمارے داعی اور میزبان ہوائی اڈہ پر موجود تھے ان دو کرم فرماؤں میں، ایک تیسری شخصیت کا اضافہ ہوا، وہ ایک نجدی عالم مقیم کویت شیخ عبد الرحمٰن الدّوسری تھے، جو نہایت درجہ باحمیّت مسلمان، ممتاز فاضل اور پرجوش داعی تھے، کویت میں قیام ایک ہوٹل میں رہا، لیکن کھانا ناشتہ (گوشت کے مشتبہ ہونے کی وجہ سے جو باہر کے ملکوں سے منگوایا جاتا تھا) ڈاکٹر عبد اللطیف صاحب کے یہاں ہوتا تھا، ڈاکٹر صاحب اور شیخ عبد الرّزاق الصّالح نے تعاون میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، شیخ عبد الرزاق الصّالح کی محکم دینداری، تعاون علی البرّ والتقویٰ کا جذبہ اور خلوص و للّٰہیت دیکھ کر طبیعت بہت متاثر ہوئی، انھوں نے ہمیں کہیں جانے کی زحمت نہیں دی، اور دورہ کو ندوۃ العلماء کی امداد کے لحاظ سے پورے طور پر کامیاب بنایا، ہم نے رمضان کا پہلا عشرہ بھی وہاں گزارا، وہاں کے علمی و دینی حلقوں کی ممتاز شخصیتوں سے رابطہ رہا، کئی جمعے کے خطبے اور متعدد بار تقریریں کی

نوبت آئی، مجلس سماع اور قوّالی میں حال آنے کے واقعات تو بکثرت سنے تھے لیکن دینی تذکیر و وعظ میں حال آنے اور بے اختیارانہ نعرہ لگانے کا مشاہدہ وہیں ہوا، میں جمعہ کے بعد ایک بڑی مسجد میں تقریر کر رہا تھا، تقریر کا انداز تقریباً وہی تھا جو پشاور کی تقریر کا تھا، کہ اگر کفّارِ قریش موجودہ مسلمانوں کی حالت کو دیکھ لیں، تو سخت احتجاج کریں کہ ہمیں اس کا ہرگز اندازہ نہ تھا کہ مسلمان طالبِ دنیا و ریاست بن جائیں گے، ہم سے جنگ تو صرف ایک مخصوص دعوت، عقیدۂ توحید اور ایک نئی سیرت اور طرزِ زندگی کی بنیاد پر تھی، اگر مسلمانوں کو یہی کرنا تھا تو ہم نے پہلے ہی اس کی پیش کش کر دی تھی، مگر اس کو ٹھکرا دیا گیا، میں یہ کہہ رہا تھا کہ مسجد کے ایک گوشہ سے ایک نعرہ کی آواز سنی گئی اور میں نے دیکھا کہ لوگ ایک صاحب کو جو بے ہوش ہو گئے ہیں، اٹھا کر لے جا رہے ہیں۔

اس سفر میں ایک دن کویت ریڈیو پر "اِسمعی یا زھرۃ الصّحراء" کے عنوان سے میری ایک تقریر ہوئی جس میں کویت کے اس فجائی ظہور و ترقی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ جیسے کسی ریگستان میں اچانک ایک پھول نمودار ہو جائے، بتایا کہ کویت اب دنیا کے موجودہ تمدّن اور موجودہ نقشہ میں کیا رول ادا کر سکتا ہے وہ دنیا کو کیا دے سکتا ہے، اس کو اپنی کس شخصیت اور اپنے کس نمایاں کیرکٹر کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہیئے؟ اور وہ کس طرح جدید دنیا کا احترام اور عزت کا مقام حاصل کر سکتا ہے[1]؟ کویت کے اسی سفر میں امیر کویت شیخ عبداللہ السالم الصّباح کو ایک خط پیش کیا گیا، جس میں عربوں کی ترقی، وحدت و قیادت اور ان کے

---

[1] یہ ریڈیو تقریر بھی "العرب والاسلام" کے مجموعہ میں شامل ہے۔

مشکلات کے حل کا راستہ بتایا گیا، اور آخر میں اس ملک میں غیر مسلم عبادت گاہوں کی تعمیر کے خطرہ سے آگاہ کیا گیا[1] جو کویت اور خلیج کی ریاستوں میں بننا شروع ہوگئی تھیں اور جو لایترك بجزیرۃ العرب دینان[2] (جزیرۃ العرب میں دو مذہبوں کو بیک وقت رہنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی) کی وصیت نبوی اور تعلیم کے صریح منافی ہے

تین ہفتے کویت میں قیام کر کے رمضان کے دوسرے عشرہ میں ہم لوگ کامیاب کویت سے روانہ ہوکر دو دن دوحہ (قطر) ٹھہرتے ہوئے بحرین کے راستہ بمبئی واپس آئے، اور یہ سفر دعوتی وفکری لحاظ سے بھی بہت مفید ثابت ہوا، اس سفر کا آغاز اس وقت کیا گیا جب مرشدنا حضرت رائے پوریؒ نے بخوشی اس کی اجازت دی، اور کامیابی کے لئے دعا فرمائی، کویت میں ہم گمنام اور کم حیثیت لوگوں کا جس طرح اعزاز ہوا، اور وہاں کے دینی، علمی اور باوجاہت طبقہ نے جس طرح ہم لوگوں کی پذیرائی کی، اس کا ذکر کرتے ہوئے میں نے ایک عریضہ میں جو حضرت کی خدمت میں بھیجا گیا تھا، غالبؔ کا یہ شعر لکھا ؎

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا ۔۔۔ وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے؟!

واپسی میں حضرت نے تفصیل سے حالات سنے، چلتے وقت فرمایا تھا کہ، ان بھلے مانسوں سے کہنا کہ دولت کا صحیح استعمال کریں، اس کے متعلق خاص طور پر دریافت فرمایا، کہ یہ پیغام کہاں تک پہنچایا جاسکا۔

---

[1] خط پر ۲۲ر شعبان ۱۳۸۱ھ، ۳۰ر جنوری ۱۹۶۲ء کی تاریخ درج ہے۔

[2] احمد اور طبرانی

بابِ ہفدہم

جامعۂ اسلامیہ مدینہ منوّرہ اور رابطۂ عالمِ اسلامی مکہ مکرمہ کا قیام اور حجازِ مقدّس کا تیسرا سفر، اور "ندائے ملّت" کا اجراء

جامعۂ اسلامیہ کا قیام

میرے دوسرے سفرِ حجاز (۵۰-۱۹۵۱ء) کو اب دس برس سے زیادہ ہو چکے تھے، اس عرصہ میں حجاز جانے کی کوئی تقریب اور تحریک پیدا نہیں ہوئی، میں خود تو اس سفر کی استطاعت نہ پہلے رکھتا تھا نہ اب، (۱۹۶۱-۶۲ء میں) کسی اور قابلِ احترام جہت سے بھی کوئی تحریک نہیں ہوئی، نہ کسی مناسب حجِ بدل کی پیش کش، کسی وقت یہ خیال آتا تھا کہ شاید پچھلی کسی حاضری کے موقعہ پر کوئی ایسی بے ادبی سرزد ہوئی کہ ہمیشہ کے لئے اس شرف سے محروم کر دیا گیا، ہم لوگ کویت میں تھے کہ اس وقت کے مملکت سعودیہ کے وزیر مالیہ معالی الشیخ محمد سرور الصبّان کا (جن کو کسی ذریعہ سے ہمارے کویت آنے کا علم ہو گیا تھا) تار ملا کہ آپ کویت تک آگئے ہیں، میں آپ کو حجاز اور حج کی دعوت دیتا ہوں، ظاہر تھا کہ میرے اور میرے رفقاء کے سفر کا انتظام وہ بآسانی کر سکتے تھے، اور ان کی طرف سے مخلصانہ پیش کش کی گئی تھی، لیکن میں نے اپنے ساتھیوں سے کہہ دیا کہ کسی کی شخصی دعوت پر، اور اس کا ذاتی طور پر ممنون ہو کر یہ سفر اختیار نہیں کیا جائے گا، مجھے اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ وہ غیب سے اس کا سامان کرے گا۔

مارچ ۱۹۶۲ء کی آخری تاریخوں میں علی گڑھ موتیابند (CATARACT) کے ایک چھوٹے آپریشن کے لئے گیا ہوا تھا، اور گاندھی ہاسپٹل میں داخل تھا، کہ مملکت سعودیہ کے سفیر، عالی مرتبت شیخ

یوسف الفوزان ملنے کے لئے آئے لیکن صحیح رہبری نہ ہونے کی وجہ سے مجھ تک نہیں پہنچ سکے، جب میں فارغ ہوکر لکھنؤ آیا تو ان کا خط ملا، کہ آپ کے لئے ایک اہم اور محترم پیغام ہے' آپ یا تو خود دہلی آنے کی تکلیف کریں' یا اپنا کوئی معتمد بھیج دیں' میں نے عزیزی محمد رابع سلّمہ کو اس کام پر مامور کیا، سفیر صاحب نے بتایا کہ مملکت سے مولانا کی دعوت کا خط آیا ہوا ہے' مدینہ طیبہ میں جامعہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا ہے' ہماری حکومت چاہتی ہے کہ مولانا وہاں تدریسی خدمت قبول کریں۔[1]

میرا ردّ عمل اس کے بارے میں وہی تھا جو دمشق یونیورسٹی کی پیش کش کے موقعہ پر ہوا تھا یعنی مستقل ملازمت کا تعلق تو منظور نہیں جزوی و عارضی خدمت کے لئے تیار ہوں، میں نے یہی جواب سفیر صاحب کو دیا انھوں نے یہ پیغام پہنچا دیا، کچھ عرصہ کے بعد مجھے اطلاع ملی کہ مجھے جامعہ اسلامیہ کی مجلس استشاری کا رکن بنایا گیا ہے' اس کا پہلا اجلاس ذی الحجہ کے تیسرے ہفتہ مدینہ طیبہ میں ہوگا، میں نے اس کو ایک لطیفۂ غیبی اور اپنے حق میں ایک نعمت و بشارت سمجھا، سب سے پہلے تو حضرت شیخ الحدیث سے مشورہ اور حضرت رائے پوری سے اجازت لی، حضرت نے بخوشی اجازت دی' میں نے اپنی منظوری کی اطلاع دے دی، اور سفیر صاحب نے میرے سفر کے انتظامات مکمل کر لئے، اور مجھے دہلی آنے کی دعوت دی، میں نے مولوی معین اللہ صاحب کو بھی اس سفر میں شریک کر لیا، خوش قسمتی سے محبّی ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین صاحب قریشی بھی اسی سال حج کے لئے روانہ ہو رہے تھے، وہ اور کاکپی کے ایک دوست حاجی واحد بیگ حجاز پہنچ کر ہمارے قافلہ میں شامل ہوگئے۔

ذوالقعدہ کے عشرۂ اخیر (مئی سنہ ۱۹۶۲ء) میں ہم لوگ ممبئی سے (T.W.A) کے

---

[1] کئی سال بعد جامعہ اسلامیہ کے امین عام (رجسٹرار) شیخ محمد ناصر العبودی نے بتایا کہ یہ شاہ سعود کا ذاتی خط تھا، جو انھوں نے میرے نام لکھا تھا، وہ عام طور پر کسی کو ذاتی خط نہیں لکھتے، لیکن انھوں نے اس موقعہ پر یہ خصوصیت برتی تھی۔

جہاز سے ظہران اور وہاں ایک شب ٹھہر کر سعودی طیارہ سے احرام باندھ کر مکۂ معظمہ کے لئے روانہ ہوئے، عزیزی مولوی عبداللہ عبّاس ندوی اس وقت جدّہ میں سعودی ریڈیو اسٹیشن پر کام کرتے تھے، انھوں نے ایک جلسۂ تعارف و تکریم ترتیب دیا، جس میں بعض عرب ممالک کے سفراء اور متعدد اعیانِ شہر، نیز عراقی اخوانی رہنما مشہور مجاہد شیخ محمد محمود الصوّاف بھی شریک ہوئے، میں نے وحدت اسلامی، اور اسلام ہی کے طاقت و عزّت کا سرچشمہ ہونے اور قومیتِ عربیہ کے خلاف تقریر کی، جس پر مناسب تبصرہ شیخ محمد محمود الصّواف نے کیا، اس وقت صدر جمال عبدالنّاصر کی زبان سے قومیتِ عربیہ (وحدت دینی اور دعوت اسلامی کے متوازی اور اسی جوش و ہماہمی کے ساتھ) کی دعوت شروع ہوگئی تھی، نہر سوئز کے قومیانے کی کامیاب کوشش، اور اسرائیلی برطانی حملہ کی پسپائی نے اس میں جادو کا اثر پیدا کردیا تھا، اور عرب نوجوان اس کے خلاف ایک لفظ سننے کے لئے تیار نہ تھے، بلکہ مصری صحافت، اور بعض مصری اہلِ قلم صدر ناصر کو نبیّ القومیۃ العربیۃ کے لقب سے یاد کرتے تھے، عقائد پر بھی اس کا اثر پڑ رہا تھا، اور بہت سے عرب نوجوانوں کی زبان سے کفریہ کلمات تک نکلنے لگے تھے[۱]

راقم نے اس پر تنقید تو اسی وقت سے شروع کردی تھی، لیکن اس کو اپنا خصوصی موضوع اس وقت بنایا اور اس کو وقت کا جہاد سمجھا، جب ۱۹۶۷ء کی مصرو اسرائیل جنگ میں مصر و جمال عبدالناصر کی قیادت کو شرمناک شکست ہوئی، اور

---

[۱] تفصیل اور حوالوں کے لئے ملاحظہ ہو، مصنف کی کتاب "عالمِ عربی کا المیہ" ص۲۱، ۲۲

بیت المقدس اور الضفة الغربیة (دریائے اردن کے مغربی کنارہ) کا پورا مسلم علاقہ ہاتھ سے نکل گیا۔

ان تقریروں اور مضامین کا مجموعہ عربی میں "المسلمون وقضیة فلسطین" سنہ ۱۹۶۹ء میں، اور اس کا اردو ترجمہ "عالم عربی کا المیہ" (قرآن حکیم کے مطالعہ اور قانون فطرت کی روشنی میں) کے نام سے ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا۔

میرے پہنچنے سے کچھ ہی عرصہ پہلے حاجی ارشد صاحب پشاوری سعودی عرب میں آٹومیٹک ٹیلی فون کی اسکیم کے نگراں اور افسر کی حیثیت سے اس محکمہ کا چارج لے چکے تھے، اور جدّہ میں مقیم تھے، ان کا گھر اپنا ہی گھر تھا، اس مرتبہ جدّہ میں وہیں قیام رہا، میں نے انھیں کے گھر میں سعودی ریڈیو کی فرمائش پر "وفود الأمة بین یدی نبیہا" (امّت کے وفود آقا کے حضور میں) کے عنوان سے ایک تقریر تیار کی، اس تقریر میں عالم خیال میں یہ دکھایا گیا ہے کہ امت کے تمام طبقوں نے، ائمہ مجتہدین سے لے کر، علوم وفنون کے واضعین، اور ائمہ نحو وبلاغت تک، صالحینِ امت اور اولیائے بلند مرتبت سے لے کر بانیان سلطنت و فرماں روایانِ مملکت تک، قائدینِ امت اور مجاہدینِ وقت سے لے کر جہاد وآزادی اور صالح انقلاب کا صور پھونکنے والے شعراء تک، اور طبقۂ ذکور سے لے کر طبقۂ اناث تک، ہر طبقہ اور ہر نوع نے بارگاہِ رسالت میں اپنا اور اپنی کوششوں اور کاوشوں کے میدان کا نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔ اور اس کا اعتراف و اعلان کیا کہ یہ سب بعثت محمدیؐ کا صدقہ اور اس کی آدم گری و مردم سازی اور مختلف شعبہ ہائے زندگی اور کمالاتِ انسانی پر اس کے احسانات کا نتیجہ ہے۔ یہ ایک ولولہ انگیز اور ایمان افروز مضمون ہے، جس کو سعودی ریڈیو

اور خود لکھنؤ کے ریڈیو اسٹیشن نے کئی بار نشر کیا[1]

حج کی تاریخوں کے قریب مکہّ معظمہ پہنچنا ہوا، چونکہ ہم حکومت کے مہمان تھے اس لئے پہلی مرتبہ مکہّ کے سب سے بڑے ہوٹل لوکانده مصر میں قیام ہوا، جہاں حج میں آئے ہوئے مختلف ملکوں کے سربرآوردہ حُجّاج اور حکومت کے مہمان مقیم تھے، ہوٹل حرم شریف کے قریب ہی ہے اس لئے حاضری میں کوئی دقّت نہیں ہوتی تھی، پرانے دوستوں سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا، حرمین شریفین سے جو روحانی اور جذباتی وابستگی ہمیشہ سے تھی اور وہاں دو مرتبہ طویل عرصہ قیام رہ چکا تھا، اس لئے ایسا معلوم ہوا کہ یہاں سے گئے ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا اور گویا اپنے وطن آئے، بقولِ شاعر ؎

نہ ہم آئے نہ تم آئے کہیں سے — پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے

رابطہ عالمِ اسلامی کا قیام

اسی زمانۂ قیام میں ایک اور لطیفۂ غیبی پیش آیا، اللہ کا جب انعام ہوتا ہے تو پے در پے ہوتا ہے، ایک دن ایک شخص تلاش کرتا ہوا آیا، اس نے ہمارے پُرانے کرم فرما اور مکہّ کے ایک رئیس اور سربرآوردہ بزرگ شیخ محمد صالح[2] القزّاز کا خط دیا، جس میں یہ لکھا تھا کہ ذی الحجہّ

---

[1] اصل عربی مضمون "الطّریق إلی المدینة" میں۔ اور اس کا اردو ترجمہ (محمد میاں مرحوم کے قلم سے) "کاروانِ مدینہ" میں شامل ہے۔ پاکستان میں مؤتمرِ اسلامی کی طرف سے وہ علٰحدہ رسالہ کی شکل میں شائع ہوا۔

[2] شیخ محمّد صالح سے سنہ ۵۱-۱۹۵۰ء کے زمانہ قیام مکہ میں خصوصی روابط پیدا ہو گئے تھے، انھوں نے ایک عجیب اور پُرلطف طریقہ پر دعوت کا سامان کیا، وہ یہ کہ ہم کو غارِ ثور کی زیارت کی دعوت دی جو مکہ معظمہ سے فاصلہ پر ہے، اور اس میں دو پہاڑوں کی چڑھائی چڑھنی پڑتی ہے، انھوں نے اس کا پورا اہتمام کیا، ہم اپنے بہت سے احباب اور تبلیغی جماعت کے افراد کے ساتھ انہیں کی موٹروں پر وہاں پہنچے، راستہ میں مشروبات و فواکہ (باقی اگلے صفحہ پر)

کی ۱۴؍تاریخ کو ایک اسلامی مؤتمر ہوگی، قصر ملکی میں اس کا جلسہ ہے، جس میں ملک (سعود) خود شریک ہوں گے، آپ سے شرکت کی استدعا ہے، مقررہ تاریخوں پر جلسہ ہوا، جس میں ملک ادریس سنوسی (فرماں روائے لیبیا) اور بہت سی اہم شخصیتیں شریک ہوئیں، وہیں رابطۃ العالم الاسلامی کے نام سے ایک عالمی تنظیم کا قیام عمل میں آیا اور بنیادی ارکان کا انتخاب ہوا، جن میں میں بھی تھا، رکنیت کے ساتھ یہ شرف بھی حاصل ہوا کہ جب اس کے مستقل صدر شیخ محمد بن ابراہیم آل الشیخ (مملکت کے شیخ الاسلام اور رئیس القضاۃ) جلسہ سے کسی ضرورت سے اٹھ کر جاتے یا نہ تشریف لاتے، تو مجھے صدارت کی خدمت تفویض ہوتی، رابطہ کے اس پہلے اجلاس میں میں نے "الأخوۃ الإسلامیۃ فوق العصبیات" کے عنوان پر مضمون پڑھا، جو "القومیۃ فی میزان العلم والتاریخ" کے عنوان سے میرے مجموعۂ مضامین "العرب والاسلام" میں شامل ہے، یہ حجاز حاضری کی (جامعہ اسلامیہ کے ماسوا) ایک دوسری سالانہ تقریب پیدا ہوگئی۔

حج سے فراغت کے بعد مدینہ طیبہ حاضری ہوئی، ۲۲؍ذی الحجہ کو مجلس استشاری کا اجلاس ہوا، اس کے ارکان میں چیدہ و ممتاز اہل علم وفکر، ماہرین تعلیم اور مختلف

(مسلسل) ... کا پورا انتظام تھا، اوپر پہنچ کر اطمینان کے ساتھ زیارت کی، پہاڑ کی چڑھائی اُتر کر نیچے آئے تو ظہر عصر کے مابین وقت تھا، ہم سب تھکے ہوئے اور بھوکے تھے انھوں نے کھانے کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا، دیکھا تو دستر خوان لگا ہوا ہے، ان کے خدّام بڑے اہتمام سے کھانا تیّار کر کے لائے ہیں، اس زیارت کی برکت اور اس کھانے کی لذّت کبھی نہیں بھولتی، شیخ محمد سرور کی وفات کے بعد شیخ محمد صالح ہی رابطہ کے سکریٹری جنرل منتخب ہوئے، انھیں کے زمانہ میں میرا افغانستان، ایران اور مشرق وسطیٰ کا دورہ ہوا۔

عرب ملکوں کی جامعات اور دینی مدارس کے سربراہ شامل تھے، پاکستان سے مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کا انتخاب کیا گیا تھا جو کئی سال تک ممبر رہے، میں نے پہلے اجلاس میں، ایک معیاری و دعوتی تعلیمی مرکز کا (جو مدینہ طیّبہ میں قائم ہو) تخیّل و نقشہ پیش کیا، اور اس کے نظام و نصاب کے اہم پہلوؤں کو روشن و اجاگر کیا اور بتایا کہ اس کا بنیادی اور مرکزی مقصد کیا ہونا چاہیئے[1] اس مرتبہ اپنے مخلص و محترم دوست الحاج محمد لوزنور ولی صاحب کی خواہش پر قیام "بستانِ لوزولی" میں رہا، اور اس کے بعد سے قیام مدینہ میں وہیں قیام کرنے کا معمول بن گیا[2]

اس مبارک آغاز کے ساتھ، حجاز مقدس کی سالانہ حاضری (اور بعض مرتبہ دو دو مرتبہ کی حاضری) کا سلسلہ شروع ہوگیا، اور وعدۂ خداوندی "وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ" کا ظہور ہوا، محرم کے مہینہ میں ہم لوگ ہندوستان واپس آگئے۔

جامعہ میں "محاضرات" کا سلسلہ

اگلے ہی سال ۱۳۸۲ھ (۱۹۶۳ء) میں جامعہ کی طرف سے مجھے محاضرات (خطبات) کی دعوت دی گئی، میں نے مدینہ کی مناسبت سے "النبوة والأنبياء في ضوء القرآن" کے عنوان کا انتخاب کیا، اور اسی موضوع پر خطبات تیّار کئے، جو بعد میں اسی عنوان سے

---

[1] یہ مضمون "خطوط عریضة لجامعةٍ للدعوة والارشاد" کے عنوان سے راقم کے تعلیمی مضامین کے مجموعہ "التربية الاسلامية الحرة" میں شامل ہے۔

[2] مدینہ طیبہ کے قیام میں (کسی حکم شرعی کی بنا پر نہیں محض جذباتی طور پر) قیام کسی ہوٹل میں گوارا نہیں ہوتا، جس کا انتظام جامعہ کی طرف سے اپنے مہمانوں کے لئے ہر مرتبہ ہوتا ہے، اس معمول میں صرف ایک مرتبہ فرق آیا، جب لبنان میں حجاج کا قیام تھا اور محب محترم ڈاکٹر عبداللہ زاہد نائب رئیس الجامعہ نے "قصر الرّحاب" میں قیام کے لئے اصرار کیا، جو مسجد شریف کے بہت قریب تھا۔

عربی میں، اور ان کا ترجمہ اُردو میں "منصب نبوّت اور اس کے عالی مقام حاملین" کے نام سے شائع ہوا، ۱۱؍مارچ ۱۹۶۳ء کو حجاز کے لئے روانگی ہوئی، اس سفر میں عزیزی محمد رابع ندوی میرے ساتھ تھے، محاضرات کا سلسلہ ۳؍ذی قعدہ ۱۳۸۲ھ ۳۰؍مارچ ۱۹۶۳ء سے شروع ہوکر آٹھ خطبات میں ختم ہوا، یہ محاضرات ہر دوشنبہ اور جمعرات کو ہوتے تھے، جامعہ کے وائس چانسلر اور مملکت کے عظیم ترین عالم اور داعی شیخ عبدالعزیز بن باز بنفسِ نفیس شریک ہوتے، اور خطبہ ختم ہونے کے بعد خود اس پر تبصرہ فرماتے، اس سفر میں بھی قیام بستان لوزولی میں رہا، دارالعلوم کے پانچ طالب علم عزیزان مزمّل حسین صدیقی رامپوری، سراج الرحمٰن اندوری، محمد یونس نگرامی، مظفرالحق ندوی کانپوری اور تقی الدین بہاری بھی جامعہ کے وظیفہ پر تعلیم پارہے تھے، ان کی وجہ سے اور سہولت وراحت ہوئی، شاید مقصدِ سفر اور اس موضوع کا اثر تھا (جس کا خاص تعلق مقام رسالت اور ذاتِ نبویؐ سے تھا) کہ اس حاضری میں جو لذّت وعزّت حصّہ میں آئی وہ کم کسی حاضری کے موقعہ پر آئی ہوگی۔

اس سفر کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ پہلی مرتبہ حرم شریف میں مصلّی شافعیؒ کے اوپر منبر سے (جس کے چند گز کے فاصلہ پر بالکل بالمقابل بیت اللہ شریف اور مطاف ہے) مجھے حجّاج سے خطاب کرنے کا موقعہ دیا گیا، یہ عجیب منظر تھا جو کبھی نہ بھولے گا، کہ حج سے دو تین دن پہلے جب حج کا مجمع اپنے عروج پر، اور طواف کا مبارک ودل کش عمل اپنے اوج پر تھا، تقریر کی سعادت، اور بیت اللہ شریف کی دید کی لذّت بیک وقت حاصل ہورہی تھی۔

ملک فیصل مرحوم سے ملاقاتیں اور مراسلت

حجاز کی ہر حاضری کے موقعہ پر اس سرزمین مقدس میں جو اسلام کا مرکز ہی نہیں اسلام کا دھڑکتا ہوا دل ہے، دینی و اخلاقی انحطاط کے آثار، اور دولت و مغربیت کے بڑھتے ہوئے اثرات دیکھے، دعوت اور دینی تعلیمات کی گرفت معاشرہ پر سے برابر ڈھیلی ہوتی جارہی تھی اور امر بالمعروف والنہی عن المنکر (جس کے نام سے مملکت میں، ایک مستقل ادارہ قائم تھا، جس کو حکومت کی تائید و سرپرستی حاصل تھی) اپنا اثر اور رعب کھوتا جارہا تھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ محمد بن عبدالوہابؒ کی دعوت نے جہاں عقائد کے میدان میں اور توحید خالص کی تبلیغ اور ردِّ شرک کے دائرہ میں (جو بعثتِ انبیاءؑ کا اہم ترین مقصد اور اسلام کی بنیادی دعوت ہے) ایک انقلابی اور تجدیدی کارنامہ انجام دیا تھا، وہاں وقت و فرصت نہ ملنے اور دعوت کے اپنی باطنی قوت میں اس درجہ تیار نہ ہونے کی وجہ سے (جو ایسی اصلاحی تحریکوں کے لئے ضروری ہے) وہ اس نسل کو تیار نہیں کرسکی تھی جو مادّیت و دولت کی فراوانی، اور ترقی و تمدّن کی طغیانی کے موقعہ پر قناعت و اعتدال، دنیا پر آخرت کو ترجیح اور استقامت نفس کا نمونہ پیش کرسکے، پھر علمائے کبار اور شیخ کے خاندان کے ذی علم و ذی اثر افراد کے (جو آل الشیخ کہلاتے ہیں) حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز اور حکومت کے تنخواہ یاب ہونے کی وجہ سے رضا کارانہ خدمت علم و دین اور زاہدانہ و متقشفانہ زندگی کا وہ نمونہ عوام کی نظر سے اوجھل ہوگیا، جس کا معاشرہ پر سب سے زیادہ اثر پڑتا ہے ادیان و ملل کی تاریخ بتاتی ہے کہ دین کی روح و جوہر، دینی و اخلاقی خصوصیات، اور

روح عصر اور زمانہ کے تقاضوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کا کام اور فساد و انحراف کے وسائل و مواقع کی موجودگی میں صراط مستقیم پر قائم رہنا مشکل ترین کام ہے، جو عمیق و ہمہ گیر تربیت، اعلیٰ درجہ کی استقامت، اور اعلیٰ درجہ کی ذہانت کی طالب و متقاضی ہے، اور تاریخ انسانی میں یہ کارنامہ تنہا صحابہ کرامؓ کی جماعت کی خصوصیت ہے جو سلطنت و دولت کے متلاطم دریا سے گزر گئے، اور ان کا دامن بھی تر نہ ہوا، افسوس ہے کہ حکومت سعودیہ کو (جو اس عہد کی وہ واحد مسلم سلطنت ہے جس کی بنیاد، دعوت و جہاد پر پڑی تھی) وہ مخلص و ذہین، بے لوث و بے غرض مشیر سلطنت اور منصوبہ بند نہیں ملے، جو حکومت کے اس آغاز و عروج کے درمیان مناسبت اور دین کی تعلیمات، اور تمدن و ترقی کی ناگزیر تقاضوں کے درمیان تعاون و مفاہمت پیدا کر سکتے، اس کو زیادہ تر مصری و شامی مشیر و کارپرداز ملے جو خود اس حکومت اور اس دولت کا استحصال کرنا چاہتے تھے اور جن کی خود مصلحت یہ نہیں تھی کہ یہ نوخیز سلطنت (جو اپنی روح توحید و جہاد سے عالم اسلام کی عظیم ترین طاقت بن سکتی تھی) دینی پابندی اور احتیاط و اعتدال کے اسی دائرہ میں رہے جس میں ان کے مقاصد کی تکمیل کا سامان نہیں۔

ادھر دوسری آزمائش یہ پیش آئی کہ ۱۹۶۰ء کے بعد سے صدر ناصر نے قومیت عربیہ کی آواز بلند کی، اور اس بات کی کوشش کی کہ مشرق وسطی میں صرف انہیں کی بالاتری اور قیادت قائم ہو، اس سلسلہ میں ان کا سب سے بڑا نشانہ مملکت سعودیہ تھی، جہاں سے نیا نیا پٹرول نکلا تھا، اور دولت کا سب سے بڑا ذخیرہ تھا، انھوں نے پیہم اس مملکت کو للکارنے، اس کے حکمرانوں کی کمزوریوں کی تشہیر کرنے اور اس مملکت میں انتشار

پیدا کرنے کا ایسا کام شروع کر دیا، جس سے مملکت میں، ایک بے اعتمادی اور احساسِ کہتری کی فضا پیدا ہونے لگی، مصر کا ریڈیو اور اس کا پریس، عالمِ عربی کا طاقتور ترین ریڈیو اور پریس تھا، اس کا علاج بعض دانش مندوں نے یہ سمجھا کہ خود اس ملک کو ترقی اور جدید تمدّن کے مظاہر سے آشنا کیا جائے، یہاں تفریح اور حظِّ نفس کے مواقع مہیّا کئے جائیں، حجاز مقدس کو بھی اس سطح پر لے آیا جائے، کہ کسی "زندہ دل" کا دم یہاں نہ گھٹے، اور اس کو مصر جانے اور وہاں کے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے پروگراموں سے دل بہلانے کی مجبوری پیش نہ آئے۔

مجھے ۱۹۶۳ء کی حاضری میں مملکت کے اس رجحان کا علم و اندازہ ہو گیا تھا، اس وقت شاہ سعود سربراہ مملکت اور ان کے بھائی امیر فیصل ولی عہد اور وزیرِ اعظم تھے، حسنِ اتفاق سے میرے قیامِ مدینہ کے دوران ایک مرتبہ وہ مدینہ آئے، میں نے اپنے کرم فرما اور بزرگ دوست شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ الباز سے، جو جامعہ اسلامیہ مدینہ منوّرہ کے وائس چانسلر تھے، اور امیر فیصل خاص طور پر ان کا احترام کرتے تھے، درخواست کی کہ وہ تنہائی میں میری ان سے ملاقات کا انتظام کر دیں انھوں نے اس کا انتظام کر دیا، اور میں مدینہ میں ان کی شاہی قیام گاہ پر ایک خصوصی مجلس میں ملا، جس میں صرف میرے عزیز رفیق محمد رابع ندوی تھے، میں نے جاتے ہی ان سے درخواست کی کہ میں جب تک اپنی معروضات پیش کروں وہ صرف سماعت پر اکتفا فرمائیں، انھوں نے اس کو قبول کیا، میں نے زبانی گفتگو کی، اور اس اندیشہ کا اظہار کیا کہ مملکت بالخصوص حجاز مقدس کو ترقی یافتہ عرب ملکوں کے راستہ پر لے جایا جارہا ہے، اور ایسے منصوبے زیرِ غور ہیں، جن سے حرمین شریفین میں

حاضری کے مقاصد، ان کے ایک مثالی اسلامی شہر ہونے کی حیثیت اور ان کے تقدّس کے متاثر ہونے کا اندیشہ ہے۔ انھوں نے خاموشی کے ساتھ میری گفتگو سنی، حجاز مقدس کی تخطیط (منصوبہ بندی) کے بارے میں اپنی مملکت کی احتیاط اور نیک نیتی کا اظہار کیا، اور مجھے اطمینان دلایا کہ یہاں کوئی ایسی بات نہیں ہوگی، جو مرکز اسلام کے مقام و پیغام کے منافی ہو۔

میں نے اس کے بعد، جب انھوں نے زمام سلطنت سنبھالی، ایک مفصّل مکتوب لکھ کر پیش کیا، جس کا بنیادی خیال یہ تھا کہ حجاز مقدّس کی ایک مخصوص "شخصیت" مقام و پیغام ہے، اور ہر دَور میں اس کی حفاظت ضروری ہے، تجدّد و ترقی کا کوئی قدم، اور کوئی رفاہی و تفریحی اقدام جائز نہیں، جو اس کی شخصیت اور مقاصد کو ادنیٰ درجہ کا نقصان پہنچاتا ہو، اس کے بعد ایک دوسرا مکتوب لکھا جس میں صاف طریقہ پر عرض کیا کہ کسی ملک کی آبادی کے لئے فارغ البالی، تفریح طبع اور من مانی زندگی گزارنے کے اسباب اور مواقع مہیّا کرنے اور اس کے ذریعہ اس کو حکومت پر نکتہ چینی اور حالات میں تبدیلی اور اصلاح پیدا کرنے کے خیال سے غافل و مشغول رکھنے کا تجربہ بنواُمیّہ کے دور سے اس وقت تک ناکام رہا ہے، یہی طبقہ جس کے اندر دولت کی ریل پیل ہوتی ہے اور اس کو کچھ اور سوچنے کی بظاہر فرصت نہیں ہوتی، سب سے زیادہ غیر مطمئن، ناشکرا، اور احسان فراموش ہوتا ہے، اور سرکشی اور بغاوت کا ظہور اسی سے ہوتا ہے، اس کے بالمقابل دیندار طبقہ ہی قابلِ اعتماد اور وفادار ثابت ہوتا ہے[1]۔ اس کا جواب انھوں نے اپنے ۹ صفر ۱۳۸۵ھ

[1] یہ اصل مکتوب "کیف ینظر المسلمون إلی الحجاز وجزیرۃ العرب" کے صفحات ۴۴-۵۴ پر ملاحظہ ہو۔

(۱۱ر جون ۱۹۶۵ء) کے مکتوب میں دیا۔ جس پر ان کے دستخط[1] ہیں، اس کے ماسوا ایک مرتبہ جدّہ میں، اور ایک مرتبہ مکہ معظمہ میں میری ان کی تنہائی میں گفتگو ہوئی جس میں میں نے اپنے خدشات ظاہر کئے، اور انھوں نے بمبر وار اپنی اور حکومت کے موقف کی وضاحت کی، میں ملک معظم کی غیر معمولی ذہانت، تحمل و حسن اخلاق وسادگی سے بڑا متاثر ہوا، اور یہ تاثر ہمیشہ قائم رہا، لیکن اندازہ ہوا کہ اسباب و مجبوریاں کچھ بھی ہوں، مملکت اسی رُخ پر چلتی رہی جس سمت پر اس نے ۶۳-۱۹۶۴ء میں قدم اٹھایا تھا۔

ہفتہ وار "ندائے ملّت" کا اجراء

۶۰-۱۹۶۱ء میں شدت سے یہ بات محسوس ہونے لگی تھی، کہ صحافت و سیاست دونوں میدانوں میں ایسی جرأت مندانہ قیادت اور رہنمائی کی کمی ہے جو مسلمانوں کے مسائل اور حالات حاضرہ سے گہری واقفیت، دیانتدارانہ تجزیہ اور بے لاگ مشورے پر مبنی ہو، اور اسی کے ساتھ اس پر دینی فکر کا رنگ غالب ہو، اس احساس نے مولانا محمد منظور صاحب نعمانی اور مجھ کو مجبور کیا، کہ وسائل کی قلت اور خالص علمی و دینی مزاج ہونے کے باوجود اس میدان میں کچھ اقدام کریں خوش قسمتی سے ہم کو ڈاکٹر محمد آصف صاحب قدوائی کا جیسا بالغ نظر سیاستداں اور پختہ کار اہلِ قلم بھی مل گیا، جو اکثر اس کے اداریئے لکھتے تھے، اور ہم نے خدا کے بھروسہ پر ۱۲؍ مارچ ۱۹۶۲ء کو "ندائے ملّت" کا پہلا پرچہ شائع کیا، جس نے

---

[1] اس خط کا فوٹو مصنف کی اصل عربی کتاب "کیف ینظر المسلمون إلی الحجاز و جزیرۃ العرب" میں ص ۵۴-۵۵ کے درمیان دیکھا جاسکتا ہے۔

بہت جلد مسلمانوں کے سنجیدہ اور صاحبِ فکر حلقہ میں مقبولیت حاصل کرلی "ندائے ملّت" نے مسلم اخبارات ورسائل میں اپنا ایک مقام پیدا کرلیا، اور ایسا نظر آنے لگا، کہ ایک نئی دینی، فکری قیادت ابھر رہی ہے، لیکن مسلمانوں کے بہت سے کاموں کی طرح ۶ـ ۷ سال تک کامیابی کے ساتھ نکلنے کے بعد اس کو بھی نظر لگ گئی، اور اس کے مختصر سے عملہ میں بھی انتشار پیدا ہوگیا، اور مجبوراً ۱۹۶۸ء کے اخیر یا ۱۹۶۹ء کے شروع میں اس کے انتظامیہ میں بنیادی تبدیلی کرنی پڑی۔[1]

---

[1] اخبار اب بھی جاری ہے، ہمارے دوست ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی اس کے مرتّب و منتظم ہیں۔

باب ہیژدہم

چند اہم حوادث، یورپ کا پہلا سفر اور اندلس کی زیارت

ہندوستان کی صنعتی پٹی کے فسادات

حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ اور حضرت رائے پوریؒ کی وفات

۱۹۶۲ء میں، میں دو عظیم حادثوں سے دوچار ہوا، ایک حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ کی وفات کا حادثہ، جو ۱۸ رمضان ۱۳۸۱ھ (۲۳ فروری ۱۹۶۲ء) کو پیش آیا، اس کے چھ مہینے کے بعد حضرت رائے پوریؒ کی وفات کا واقعہ پیش آیا، جو ۱۳ ربیع الاول ۱۳۸۲ھ (۱۶ اگست ۱۹۶۲ء) کو لاہور میں پیش آیا۔ اس سے کچھ ہی پیشتر مجھے محب عزیز ڈاکٹر سعید رمضان کا ان کے مرکز اسلامی جنیوا کے جلسۂ انتظامی میں شرکت اور یورپ میں مقیم مسلمان طلبہ کے ساتھ چند دن رہنے، اور ان سے خطاب کرنے کا دعوت نامہ ملا تھا اس کے پورے قرائن موجود تھے کہ میں اس کو منظور کر لیتا، لیکن اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہوا کہ حضرت رائے پوریؒ کی نازک علالت کی اطلاعات کے پیشِ نظر میں نے اس وقت اس سے معذرت کر دی، اور یورپ کے سفر پر لاہور کے

سفر کو ترجیح دی، اس کی وجہ سے مجھے یہ سعادت حاصل ہوئی کہ حضرت کی زندگی کے آخری ایّام میں حاضرِ خدمت رہوں، اور نعش مبارک کے ساتھ ان کے وطن جاکر تدفین میں شریک ہوں، اگر صورتِ حال اس کے برعکس ہوتی، تو مجھے ساری عمر اس کا قلق رہتا، کہ خدا کے مخلص و مقبول بندوں کی زندگی کے آخری دن، رحمتِ الٰہی کے نزول، اور ان کی توجہ اور فیضان کے خاص دن ہوتے ہیں "ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ"[1]

یورپ کا سفر

ستمبر ۱۹۶۳ء میں یورپ کا وہ سفر پیش آیا، جو دیارِ مغرب کا اپنی زندگی میں پہلا سفر تھا اور جو ۱۹ ستمبر ۶۳ء سے شروع ہو کر نومبر ۶۳ء کے پہلے ہفتہ میں ختم ہوا، اپنی رفاقت و معیت کے لئے میں نے محبّی ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی کا انتخاب کیا، جو اپنی طبی تعلیم کے سلسلے میں لندن میں قیام کر چکے تھے، اصل سفر اپنے عزیز دوست ڈاکٹر سعید رمضان کی دعوت پر جنیوا کے اسلامک سنٹر کے (جس کا میں رکنِ انتظامی تھا) اجتماعات میں شرکت کے لئے تھا، جن کے لئے انھوں نے وسطِ یورپ کے زیرِ تعلیم عرب و مسلمان طلبہ کو دینی استفادہ اور تربیت کے لئے دعوت دی تھی، یہ سفر P.I.A سے براہ کراچی ہوا، جہاں اعزہ واحباب سے ملاقات ہوئی۔

اس سفر میں جنیوا، لوزان، برن، پیرس، لندن، کیمبرج، آکسفورڈ، گلاسگو ایڈنبرا، اسپین میں میڈرڈ، ٹولیڈو (قدیم طلیطلہ) سولِّ (سابق اشبیلیا) قرطبہ و غرناطہ

[1] لاہور کے قیام، حضرت کے مرض وفات، حادثۂ ارتحال اور تدفین کی تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو "سوانح حضرت مولانا عبد القادر رائے پوریؒ" ص ۲۲۲–۲۲۵

جانا ہوا، تقریروں میں ایڈمبرا یونیورسٹی کی اسلامی مجلس کی تقریر، لندن یونیورسٹی کی یونین ہال کی تقریر، بی، بی، سی پر دو تقریریں، ایک "زائرِ لندن کے تاثرات" دوسرا مکالمہ جو عربی زبان کی ترقی کے امکانات، اور مسلم ممالک کے ساتھ اس کے تعلقات کے موضوع پر تھا، سب سے اہم لندن یونیورسٹی ہال کی تقریر تھی جو عربی میں "بین الشرق والغرب" کے عنوان سے تیار کی گئی تھی، اور اس کا ترجمہ ڈاکٹر ظفر اسحٰق انصاری صاحب نے جو اس وقت لندن میں مقیم تھے قلم برداشتہ BETWEEN EAST & WEST کے عنوان سے کیا تھا، اور ایک نومسلم انگریز مصطفیٰ ایوانس نے بڑے جوش و اثر کے ساتھ پڑھا[1] فضلائے مغرب میں سے آکسفورڈ کے صدر شعبہ عربی پروفیسر BEESTON کیمبرج کے مشہور مستشرق فاضل Dr. ARBERY اور SCHOOL OF ORIENTAL & AFRICAN LANGUAGES میں تاریخ ہند (قبل اسلام) کے پروفیسر BASHEM سے ملاقات ہوئی، ایک دوسرے مشہور مستشرق ERIC BERTH سے ملاقات ہوئی، جو امریکہ کی مشرقِ وسطیٰ کے دوستوں کی انجمن کے صدر ہیں، اور جن کی یمن پر فاضلانہ کتاب میں پڑھ چکا تھا، مسلمان فضلاء میں سے محمد اسد صاحب اور ڈاکٹر حمید اللہ، ڈاکٹر زکی علی وغیرہ سے ملاقات ہوئی، اس سفر میں بڑی سہولت اور راحت حاصل ہوئی۔

لندن کے قیام کے دوران برٹش میوزیم کی لائبریری، اور انڈیا آفس لائبریری

---

[1] عربی، انگریزی، اردو تینوں زبانوں میں یہ مقالہ "حدیث مع الغرب" اور "مغرب سے صاف صاف باتیں" اور SPEAKING PLAINLY TO THE WEST کے مجموعوں میں شائع ہو گیا ہے۔

سے استفادہ کا موقعہ ملا، اور میں نے اپنی زیرِ تالیف کتاب "مسلم ممالک میں اسلامیت و مغربیت کی کشمکش" کا مقدمہ لندن کے اسی قیام میں لکھا، خوش قسمتی سے اس زمانہ میں عزیز گرامی مولوی عبد اللہ عباس ندوی کا قیام لندن میں تھا، اس لئے انہیں کے فلیٹ ۲۱ کوئنس وے (QUEEN'S WAY) لندن میں قیام رہا، اور اس سے بڑی سہولت اور راحت حاصل ہوئی۔

اندلس کی سرزمین پر

اس سفر کا سب سے اہم اور عزیز حصّہ اندلس مرحوم (موجودہ اسپین) کی زیارت تھی، کوئی ایسا ملک یا ذہن جہاں مسلمان رہے ہوں، اور پھر ان کا نام و نشان مٹ گیا ہو، اور وہاں جاکر ایسا اُنس ایسی محبّت، ایسی دل کشی محسوس ہوئی ہو کہ معلوم ہوتا ہو کہ فضائیں لپٹ رہی ہیں اور ذرّہ ذرّہ اُنس کا پیغام دے رہا ہو، جیسا اسپین میں محسوس ہوا، وہاں کی نمازوں اور ٹوٹے پھوٹے ذکر میں بھی وہ رقّت اور لذّت محسوس ہوئی جو کمتر مقامات پر محسوس ہوئی تھی، اسپین میں مدینۃ الزّھرا کے کھنڈر بھی دیکھے اور الحمراء کے بام و در اور نقش و نگار بھی، افسوس ہے کہ اس کا سفر نامہ نہ لکھا جاسکا، اس لئے اجمالاً چند تاثرات و مشاہدات کا ذکر کیا جاتا ہے:

اسپین کے سفر میں، داغِ کہن، بلکہ زخمِ دل تازہ ہو گئے، کئی صدیوں کی جاہ و جلال اور فضل و کمال کی تاریخ جو نفح الطیّب[1] اور الحلل السندسیۃ[2] کے ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور جس کو مختصراً زمانہ طالب علمی میں علامہ کرد علی کی کتاب

---

[1] علامہ مقّری کی مشہور و ضخیم کتاب

[2] امیر شکیب ارسلان کی پُر از معلومات تصنیف

"غابر الأندلس وحاضرها" اور مولوی خلیل الرحمٰن صاحب کی کتاب "اخبار الاندلس"
میں پڑھا تھا، حافظہ میں تازہ اور عالمِ خیال میں سامنے آکر ایستادہ ہوگئی۔

اسلامی عربی آثار میدرڈ (سابق مجریط) میں کم، اور ٹولیڈو (سابق طلیطلہ) میں زیادہ ہیں، ہم میڈرڈ سے ٹولیڈو ٹورسٹ بس پر گئے، سیاح اور زائرین انگریزی سمجھنے والوں اور فرنچ سمجھنے والوں کے درمیان تقسیم کردیئے گئے، ہمارا گائیڈ انگریزی میں آثار و مقامات کا تعارف کراتا تھا، وہ جب کسی تاریخی جگہ کا تعارف کراتا تو اکثر یہ جملہ کہتا WHEN WE EXPELLED THE ARABS (جب ہم نے عربوں کو ملک سے نکالا) میں نے ایک دو مرتبہ یہ فقرہ سنا، پھر برداشت نہ ہوسکا، میں نے کہا، برائے مہربانی یہ جملہ بار بار نہ دہرایئے، ہمیں اس سے تکلیف ہوتی ہے، اس نے یہ جملہ کہنا بند کردیا، معذرت کی اور کہا کہ ہمارے حکمراں جنرل فرانکو عربوں سے بڑے اچھے تعلّقات رکھتے ہیں اور ہم رواداری برتتے ہیں۔

میڈرڈ سے قرطبہ جاتے ہوئے ٹرین پر کھڑکی کے سامنے گھنٹوں کھڑا رہا اور اقبال کے اس شعر کی تصدیق کرتا رہا ؎

بوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے
رنگِ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے

مسجد قرطبہ میں پہنچا تو سب سے بڑھ کر اقبال کی معرکۃ الآرا نظم "مسجد قرطبہ" جو کلامِ اقبال ہی میں نہیں (پروفیسر رشید احمد صدّیقی مرحوم اور میرے خیال کے مطابق) ادبیات عالم میں اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہے، کانوں میں گونجنے لگی، اور اقبال کے یہ شعر خاص طور پر یاد آئے ؎

تیرا جلال و جمال مرد خدا کی دلیل　　وہ بھی جلیل و جمیل تو بھی جلیل و جمیل

تیری بنا پائیدار، تیرے ستوں بیشمار　　شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجوم نخیل

مسجد کے اندر بنے ہوئے گرجوں نے جن کی تعداد چھ بتائی گئی، اس کا حلیہ بگاڑ رکھا ہے، اور سمت قبلہ کا تعین بھی دشوار بنا دیا ہے، پھر بھی تحقیق کر کے محراب میں کھڑا ہو گیا، مسیحی گائڈ نے بتایا کہ یہاں جو آواز دی جائے گی، وہ مسجد کے آخری گوشہ تک پہنچے گی، یہ وہ قدرتی مائک ہے، جو اندلس کے عرب معماروں نے دریافت کیا[1] میں نے بے اختیار وہاں بلند آواز سے "قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا" پڑھنا شروع کیا، گائیڈ نے شور مچا کر میری آواز دبانے کی کوشش کی، اور ایک بار قرآن مجید کی آیت "وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهَٰذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُونَ" (کفار نے کہا، اس تلاوت پر کان نہ دھرو اور شور کرو، تاکہ تمہاری آواز اس آواز کو دبا دے) کی تفسیر سامنے آگئی، ایک جگہ میں نے ممانعت کے باوجود اقبال کی طرح دو رکعت نماز پڑھ ہی لی[2] عصر کی نماز کا وقت تھا، ہم لوگوں نے باہر نکل کر مسجد کے صحن میں اذان و جماعت کے ساتھ نماز پڑھی، اور شہر کے بہت سے مسیحی باشندے تعجب کے ساتھ اس منظر کو دیکھتے رہے۔

---

[1] بیجاپور کی جامع مسجد میں بھی یہ صنعت موجود ہے اور دہلی کی مغل دور سے پہلے کی ایک مسجد میں بھی یہ صفت پائی جاتی ہے۔

[2] عرصہ ہوا، اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ جامع قرطبہ واگذار کر دی گئی، اور اب اس میں نماز ادا کرنے کی ممانعت نہیں، معلوم نہیں اس میں کتنی صداقت ہے۔

غرناطہ کے قیام میں جہاں سے مسلمانوں کا آخری قافلہ اس سرزمین سے رخصت ہوا، اور جہاں کی سرزمین نے عربوں کی سلطنت وتمدّن کی آخری بہاریں دیکھیں، جذبات کا یہ تأثر اور بڑھ گیا اور اقبالؔ کا یہ شعر حسب حال معلوم ہوا، ؎

دیدۂ انجم میں ہے تیری زمیں آسماں
آہ کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں

غرناطہ کے قیام میں جمعہ پڑ گیا، ہم نے عرب طلبہ کو جن میں اکثر مغرب اقصےٰ (مراکش) کے رہنے والے تھے، دعوت دی کہ ہم سب مل کر آج جمعہ کی نماز پڑھیں وقت کی کمی اور نوجوانوں کی کم ہمتی سے بہت تھوڑی تعداد آئی، لیکن ہم نے ایک عرب نوجوان کے کمرہ میں جمعہ کی نماز پڑھ لی، معلوم نہیں کتنی صدیوں کے بعد اس سرزمین پر جمعہ پڑھا گیا، ہماری واپسی کے عرصہ کے بعد ایک عرب طالب علم نے اطلاع دی کہ یہ سلسلہ کچھ نہ کچھ قائم ہے، معلوم نہیں اب بھی وہ باقی ہے کہ نہیں ؟

مسلمانوں کی کم ہمتی اور بے توفیقی پر دل خون ہوتا ہے کہ کسی ملک کے مسلمانوں نے بھی (بالخصوص عربوں نے) اس فردوس گم گشتہ کو بازیاب کرنے کی کوشش نہیں کی، حکومت وسلطنت کا قیام تو دور کی بات ہے، اس ملک میں اسلامی دعوت اور اس کے تعارف کی بھی کوئی کوشش نہیں کی گئی، اتنا بھی نہیں ہوا کہ کچھ نوجوان اسپینی زبان سیکھتے اور اسپین جا کر اہل اسپین کو بتاتے کہ انھوں نے اسلام اور مسلمانوں کو دیس سے نکال کر کیا کھویا اور کیا پایا، اور اپنے ملک وقوم کو کس بلندی سے پستی میں اتار دیا۔" فإلی اللہ المشتکی۔"

سفر یورپ کے بعض تأثرات

یورپ کے اس سفر کی تفصیل اس لئے ضروری نہیں ہے کہ میرے ان خطوط میں

جو میں نے اپنے عزیزوں کے نام لکھنؤ بھیجے تھے، مختصر سفر نامہ، اور ضروری روئیداد آگئی ہے۔[1]

مولانا عبید اللہ صاحب سندھی ۱۹۴۲ء کے اوائل میں جب لکھنؤ آئے تھے اور ندوہ کے مہمان خانہ میں ٹھہرے تھے، تو انھوں نے مجھ سے ایک دن کہا کہ "مولوی ابوالحسن صاحب! آپ کا جوہر عالی ہے مگر ماحول محدود، آپ کو یوروپ کا ایک سفر کرنا چاہیئے"۔ میری بھی عرصہ سے خواہش تھی کہ میں مغربی تہذیب، اور مغرب پر اپنی کتابوں اور مضامین میں تبصرہ کرتا رہا ہوں، لیکن "شنیدہ کے بود مانند دیدہ"؟ مجھے براہ راست اس دنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہیئے، خدا کا شکر ہے کہ میں نے اپنی آنکھوں سے یورپ کے اہم ترین مرکزی مقامات کو دیکھ لیا، اور اس کا رہا سہا ذہن پر جو رعب تھا، وہ بھی جاتا رہا، یہاں پر اپنے خطوط کے چند اقتباسات پیش کرتا ہوں، جس سے کچھ تاثرات کا اندازہ ہوگا، پیرس سے یکم اکتوبر ۱۹۶۳ء کو عزیزی محمد میاں کے نام جو خط لکھا ہے، اس میں عورت کو یورپ میں جو "عزّت و احترام حاصل ہے اور اس کا دنیا میں ڈنکا بجا ہوا ہے، اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا:

"یوروپ میں عورت کو جو مقام و احترام حاصل ہے، اس کا طلسم بھی خوب ٹوٹا، بے چاری بھاڑے کا ٹٹو بن گئی ہے، دوکان دار وہ ہے، قلی وہ ہے ادنیٰ ادنیٰ اسامیوں پر مامور، ریل، میٹرو، لبسوں سب جگہ دھکے کھاتی پھرتی ہے، مرد آرام سے بیٹھا ہوتا ہے اور عورت کھڑی، نسوانیت، حیا اور کشش

---

[1] ملاحظہ ہو "مکاتیب یورپ"، شائع کردہ مکتبۂ اسلام لکھنؤ۔

اس سے بالکل مفقود ہو چکی ہے، اس سے موجودہ ادب، تصویر، فلم سازی افسانوں کے موجودہ رجحان اور روز افزوں عریانی کی وجہ سمجھ میں آئی کہ عورت میں کوئی دل آویزی اور کشش باقی ہی نہیں رہی، اس لئے وہ اس کو ان ذرائع سے پیدا کرتے ہیں، اور مردوں کے احساسات کو بیدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں[1]"

لندن ۱۵ اکتوبر ۶۳ء کے دوسرے خط میں:

"شنیدہ کے بود مانند دیدہ ــــ کسی نے صحیح کہا ہے، خوبیاں اور خامیاں مشاہدہ بن گئیں، مغربی تہذیب سے مایوسی اور بُعد بڑھ گیا، اس پتھر میں جونک لگنی بڑی مشکل معلوم ہوتی ہے، دور سے بڑی خوش گمانی ہوتی ہے یہاں تو بالکل مشینی و مصنوعی زندگی ہے، قدرت الٰہی ہی کچھ انتظام کر سکتی ہے کہ یہ لوگ کسی اور بالاتر حقیقت پر غور کریں[2]"

ایک اور اقتباس یورپ کی پوری زندگی، تہذیب اور شخصیت پر روشنی ڈالتا ہے:

"انگلستان کے ساتھ انگریز اور فرنگ کے ساتھ فرنگی کا ذکر بھی ضروری ہے، مادّیت، زندگی کے انہماک، تنازع للبقا، اور خود ساختہ معیاروں اور مقاصد کے حصول کی تگ و دو نے لطیف تر احساسات، روحانی تشنگی اور خدا طلبی کے جذبہ کو تقریباً فنا کر دیا ہے، اسی لئے اپنی تمام ذہنی صلاحیتوں، قوتِ ارادی، احساس ذمہ داری، نظم و ضبط اور بہت سی خوبیوں کے باوجود، وہ صحیح

---

[1] مکاتیب یورپ ص ۲۷ [2] ایضاً ص ۳۹-۴۰

روحانی تحریکوں، اور دینی و روحانی فتوحات سے محروم ہیں، اور ماہرین فن کی یہ سرزمین، جس نے دنیا کا نقشہ اور زندگی کا دھارا بدل دیا، "عارفین" سے خالی ہے، شاید اسی بنا پر مغرب کے رمز شناس اقبال نے کہا تھا، ؏

یہ وادیٔ ایمن نہیں شایانِ تجلّی

اور ان کی فطرت سلیم نے کچھ دن ان فرنگی ساحروں کے درمیان رہنے کے بعد اس طرح احتجاج کیا ؎

نشستم بانکویان فرنگی　　　　ازاں بے سوز تر روزے ندیدم

رہی سہی فطرت کی سلامتی، اور نفس لوّامہ کی سرزنش خمر و خنزیر نے ختم کر دی، یہاں چند دن رہ کر جمّاع الاثم کی حرمت کی حکمت (جس پر الحمد للہ ایمان بالغیب اور شرح صدر ہمیشہ تھا) عین الیقین بن گئی۔[1]

یورپ کا دوسرا سفر

اکثر تجربہ ہوا ہے کہ جب تک کہیں کا سفر نہیں ہوتا عرصہ تک نہیں ہوتا، اور جب ایک مرتبہ ہو جاتا ہے تو اکثر بار بار پیش آتا ہے، یہی یورپ کے سفر کے معاملہ میں ہوا، کہ اگلے ہی سال اکتوبر سنہ ۱۹۶۴ء[2] میں پھر مرکز اسلامی جنیوا میں شرکت کے لئے عزیزی محمد رابع ندوی کی رفاقت میں دوسرا سفر ہوا، اس مرتبہ لندن میں قیام محترمی سیّد منور حسین صاحب بہاری کے دولت خانہ پر (FINESBURY PARK) میں رہا، سید صاحب وہاں کی

---

[1] مکاتیب یورپ ص ۵۵-۵۶

[2] اس سفر کو تاریخی ترتیب کے لحاظ سے مجلسِ مشاورت کے قیام ۱۹۶۴ء کے بعد آنا چاہیئے تھا، لیکن یورپ کے دونوں سفروں کو ایک سلسلہ میں بیان کرنے کی غرض سے اس کا یہاں تذکرہ کر دیا گیا

جماعت تبلیغ کے امیر بھی تھے، اور برطانوی شہریت حاصل کرچکے تھے اس سفر میں بجائے فرانس کے جرمنی جانا ہوا، جس میں برلن، آخن اور میونخ ٹھہرنے کا موقعہ ملا، بون سے بھی گزرنا ہوا، اور خاص بات یہ ہے کہ مشرقی برلن میں جاکر اشتراکی نظام کے غیر فطری، مصنوعی اور جبریہ ہونے کا ایسا مشاہدہ ہوا، کہ اگر پچاس کتابیں پڑھی جاتیں تو اس کا اندازہ نہ ہوتا، اس سفر کی اہم تقریبات میں اسلامک سنٹر بیکر اسٹریٹ لندن کی اہم تقریر جو مسلمان طلبہ اور نوجوانوں کے سامنے ہوئی[1]، برلن میں (۲۷/ اکتوبر ۱۹۶۴ء کو) یونیورسٹی آف انجینئرنگ میں جرمن قوم سے خطاب جو عربی میں ہوا اور جرمن زبان میں اس کا تیار کیا ہوا ترجمہ اسی وقت سنایا گیا، قابلِ ذکر ہے[2] واپسی میں ایک روز استنبول (قسطنطنیہ) جہاں ایک چیدہ مجمع کے سامنے تقریر ہوئی، اور تین روز دمشق ٹھہرتے ہوئے کراچی کے راستہ سے ہندوستان واپسی ہوئی، اس سفر کے بعد دو سفر یورپ کے اور ایک سفر ۱۹۷۸ء میں امریکہ کا پیش آیا، جس کا مفصل سفر نامہ اور روزنامچہ "دو مہینے امریکہ میں" کے نام سے مولوی محمد رابع ندوی کے قلم سے شائع ہو چکا ہے۔

کلکتہ، جمشید پور اور راؤڑ کیلا کے ہولناک فرقہ وارانہ فسادات

دسمبر ۱۹۶۳ء کی آخری اور جنوری ۱۹۶۴ء کی ابتدائی تاریخوں میں کلکتہ میں فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑا، جس سے مسلمانوں کا عظیم جانی مالی نقصان ہوا، اور ان کی صنعتی تجارتی زندگی بُری طرح متاثر ہوئی، ایک

---

[1] یہ تقریر بھی "مغرب سے صاف صاف باتیں" کتاب میں پڑھی جاسکتی ہے۔

[2] یہ تقریر "عظیم جرمن قوم کے نام" کے عنوان سے کتاب میں شامل ہے۔

طرف اتلاف جان و مال، دوسری طرف مسلم جماعتوں اور تنظیموں کا (جنھوں نے اپنے اپنے جھنڈے کے نیچے ریلیف کا کام شروع کیا تھا) باہمی اختلاف و انتشار، اور عدم تعاون کا جذبہ، سب سے بڑھ کر ملک میں مسلمانوں کی متحدہ قیادت اور مشترک پلیٹ فارم کا فقدان، جس کے ذریعہ مسلمان اپنی شکایات ایوان حکومت اور حکمراں پارٹی تک پہنچا سکیں اور اپنی آواز کو مؤثر بنا سکیں، صاحب جمیّت مسلمانوں کو دعوت فکر دے رہی تھی کہ جلد وہ اس کا مداوا سوچیں، عوام بھی اس صورتِ حال سے نہ صرف بے چین بلکہ بیزار ہو رہے تھے اور مطالبہ کرتے تھے کہ مسلمان قائدین اور جماعتوں کے سربراہ ایک جگہ جمع ہوں، اور اگر کوئی جماعت یا فرد تنہا قیادت نہیں کر سکتا، تو وہ ایک اجتماعی قیادت (COLLECTIVE LEADERSHIP) پیدا کریں اور مسلمانوں کا ایک مشترکہ پلیٹ فارم بنائیں، ڈاکٹر سیّد محمود صاحب جو اس زمانہ میں کلکتہ گئے تھے اس صورت حال سے خاص طور پر متاثر تھے۔

مارچ ۱۹۶۴ء میں شمالی ہند کی سرحدی پٹی رانچی، جمشید پور، اور راؤڑکیلا میں بھیانک ہندو مسلم فسادات پھوٹ پڑے، جن میں صرف جمشید پور اور راؤڑکیلا میں تین ہزار سے زیادہ مسلمان مقتول ہوئے[1]، اس کی سنگینی اور اس میں حصّہ لینے والوں کی سفّاکی اور سنگدلی کا اندازہ کرنے کے لئے مسٹر جے پرکاش نرائن کے اس بیان کا ایک اقتباس کافی ہوگا، جو ان کے اس خط سے نقل کیا جاتا ہے، جو انھوں نے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں (لوک سبھا اور راجیہ سبھا) کے صدر اور سیاسی جماعتوں

[1] شری نابا کرشنا چودھری سابق وزیر اعلیٰ اڑیسہ، و شری من موہن چودھری کی مشترکہ رپورٹ

کے نام لکھا تھا، وہ لکھتے ہیں :

"جہاں تک مظالم کا تعلق ہے، میرے خیال میں کوئی حد باقی نہیں رہی، ہر نفرت انگیز اور شرمناک حرکت کی گئی، عام طور پر جو کچھ ہوا، وہی عبرت ناک تھا، لیکن بعض معاملوں میں تو بے رحمی اور گراوٹ کا اندازہ کرنا محال ہے، ایسی ایسی ہیبت ناک باتیں کی گئیں ہیں، جن کے بارے میں دہلی یا ملک کو قطعی علم نہیں ہے کہ کس پیمانہ پر کیا ہوا؟"

آگے چل کر لکھتے ہیں :

"یہ بھی ثابت ہو گیا کہ تعلیم درندگی اور مجرمانہ حرکتوں کی طرف میلان کا تدارک نہیں، اور یہ بھی کہ حکومت کی انتظامی مشینری کس قدر ناکافی اور نااہل ہے"

اولین توجہ کا مسئلہ

اس واقعہ نے جس کی نوعیت اور جس کا رقبہ اور پیمانہ پچھلے تمام فسادات سے بڑھ گیا تھا، میرے اور میرے ساتھیوں کے اعصاب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا، اور ہر سوچنے سمجھنے والے کو اس بات پر غور کرنے پر مجبور کر دیا، کہ اگر اس طرح کے واقعات کا سلسلہ جاری رہا اور ان کے روک تھام، اور سدِّ باب کی کوئی سنجیدہ اور مؤثر کوشش نہیں کی گئی، تو ہندوستان میں نہ صرف یہ کہ کسی تعلیمی و تعمیری کام کی گنجائش نہیں رہے گی، مسلمانوں کا ملّی وجود بھی مشکوک ہو کر رہ جائے گا اور ان کو ملک چھوڑ کر کسی محفوظ جگہ چلے جانے کے خیال سے (جہاں وہ آزادی اور عزّت کی زندگی گزار سکیں) یا پھر اچھوتوں اور پس ماندہ اقوام کی طرح جو اپنے تمام ملّی تشخصات اور شعائرِ دین سے دست بردار

ہونے کے لئے تیار ہیں، بچایا نہیں جا سکے گا، اس لئے تمام تعلیمی اور تعمیری کاموں سے پہلے اس مسئلہ کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ اس کے لئے اکثریت کے فرقہ کے کچھ ایسے جانباز اور سرفروش قائدین کی ضرورت ہے جو اس وقت گاندھی جی کی طرح میدان میں اتر آئیں، اور اس کے لئے جان کی بازی لگا دیں، اس لئے کہ مسلمان قائدین کتنے ہی بے لوث اور غیر فرقہ وارانہ طریقہ پر یہ کام کریں گے، اس کا وہ اثر اور احترام نہیں ہوگا جو غیر مسلم افراد کے سینہ سپر ہونے کا ہوگا، اس لئے کہ مسلمان اقلیت میں ہیں اور کمزور ہیں، اس تحریک و کوشش کو اپنے فرقہ کے تحفّظ اور کمزوری و بزدلی پر محمول کیا جائے گا۔

جب اس سلسلہ میں غور کیا گیا تو پہلی نظر مسٹر جے پرکاش نرائن اور اچاریہ ونوبا بھاوے جی پر پڑی، اوّل الذکر پر اس لئے کہ انھوں نے ان فسادات کے خلاف بڑی اخلاقی جرأت کے ساتھ آواز بلند کی تھی، اور ایک امن فوج (شانتی سینا) کی تجویز پیش کی تھی، ثانی الذکر پر اس لئے کہ وہ گاندھی جی کے جانشین، سروودے تحریک کے رہنما، اور ایک انسانیت دوست فقیر منش آدمی تھے، اس خیال کے ماتحت میں نے اور مولانا منظور صاحب نے اپنا سفر شروع کیا، ۲۲؍ مارچ ۱۹۶۴ء کو ہم نے جے پرکاش نرائن جی سے دہلی میں ان کی قیام گاہ پر ملاقات کی، اس گفتگو میں ونوبا بھاوے جی کے ایک خاص رفیق انّا جی بھی موجود تھے، ہمارے ساتھ مولوی محمد مسلم صاحب مدیر "دعوت" بھی گفتگو میں شریک تھے، جے پرکاش نرائن جی نے بھی ونوبا بھاوے جی سے ملنے کا مشورہ دیا، اور یہ بھی کہا کہ میرا بھی ادھر آنے کا ارادہ ہے، میں بھی اس

کام میں آپ کی مدد کروں گا۔

ونوبا بھاوے جی سے ملاقات اور مایوسی

میں اور مولانا محمد منظور صاحب اس مہم پر ناگپور کے لیے روانہ ہوئے، بھوپال سے میں نے مولانا حافظ محمد عمران خان صاحب ندوی کو بھی اپنے ساتھ لے لیا، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کی ہدایت پر قاضی مسعود صاحب نانوتوی بھی ہمارے اس وفد میں شریک ہو گئے، ونوبا بھاوے جی اس زمانہ میں واردھا سے جو ان کا مستقل ہیڈ کوارٹر تھا، پدیاترا پر نکلے ہوئے تھے، ہم ۲۸ مارچ ۱۹۶۴ء کو ناگپور سے چھ میل دور ایک دیہات میں ان سے ملے اتفاق سے اس دن ان کا وہ برت تھا، جس میں وہ بول نہیں سکتے تھے، میں نے پہلے سے ایک میمورنڈم تیار کر لیا تھا[۱] جس کا انگریزی ترجمہ اپنے ساتھ لے گیا تھا اس میمورنڈم کا ایک اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے،

"باہمی اعتماد و محبت پیدا کرنے کے لئے ہمیں ایک مجنونانہ اور سرفروشانہ جدّوجہد کی ضرورت ہے۔ ہندوستان تاریخ کے ایک نازک موڑ اور فیصلہ کن دوراہے پر کھڑا ہے، ایک راستہ ہمیشہ کے لئے تباہی، نہ مٹنے والے انتشار اور نہ ختم ہونے والے زوال کی طرف جاتا ہے، ایک راستہ ہمیشہ کے امن وامان اتحاد و یک جہتی کی طرف جاتا ہے، ہر ایسے موڑ پر کچھ ایسے لوگ سامنے آجاتے ہیں، جو تاریخ کا رُخ اور واقعات کا دھارا بدل دیتے ہیں، ان کی دلیری ان کی صاف گوئی، اور ان کی جاں بازی، پورے پورے ملک اور قوم کو بچا

---

[۱] یہ میمورنڈم "ندائے ملت" ۳ ؍اپریل ۱۹۶۴ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔

لے جاتی ہے، یہی لوگ ملک کے معمار ہوتے ہیں، اکثر ایسے لوگ سیاست وحکومت کے ایوانوں سے باہر، ملک کے بے لوث خادموں اور سچے روحانی اور درویشوں میں پائے جاتے ہیں، جن کی نیتوں پر شبہ نہیں کیا جاتا، جن کی صداقت اور بے غرضی مسلّم ہوتی ہے، اور ان کا ماضی ہر داغ سے پاک ہوتا ہے۔

ہم اسی اُمید پر آپ کے یہاں آئے ہیں کہ آپ اس نازک موقع پر ملک کی قیادت کریں گے اور اپنے پورے خلوص، عزم، قربانی کے جذبہ اور انسانیت دوستی کا بوجھ ڈال دیں گے۔"

میں نے اس بیان میں اس فرقہ وارانہ فساد کی ہولناکی کی طرف بھی اشارے کئے تھے اور ونوبا بھاوے جی کو اپنے ذرائع سے بھی اس کے متعلق صحیح معلومات حاصل ہو چکی تھیں، لیکن ہم نے محسوس کیا، کہ اس بیان کو پڑھ کر ان کے دل پر جو چوٹ لگنی چاہیئے تھی، اور ان کے چہرہ اور آنکھوں میں اس وحشیانہ عمل، اور انسان کشی کا جو اثر ظاہر ہونا چاہیئے تھا وہ ظاہر نہیں ہوا،

۲۹ مارچ کو ۳ بجے ناگپور میں اچاریہ جی سے دوسری تفصیلی ملاقات ہوئی جے پرکاش نرائن جی بھی اس وقت تک آچکے تھے، ان سے بھی ملاقات ہوئی لیکن ہم کو امیّد کی کوئی کرن نظر نہیں آئی، بعد کے واقعات نے اس کی تصدیق کردی، کہ ان کے ذہن میں بھودان تحریک اور تحفظ گاؤ کے مسئلہ کی جتنی اہمیت تھی، اتنی ان فرقہ وارانہ فسادات کو روکنے اور انسانوں کی جان بچانے کی نہیں تھی، اس سلسلہ میں جان کی بازی لگانے کا مسئلہ تو بہت دُور کا

تھا، انھوں نے اس کے لئے کوئی ایسی مؤثر اور مسلسل مہم بھی نہیں چلائی، جو اس صورت حال پر اثر انداز ہو سکتی، بعد میں تو ان کی ساری توجہ کا مرکز (خاص طور پر زندگی کے آخری دنوں میں) گائے کے تحفظ کے لئے قانون بنوانے اور اس کی ہتیّا روکنے پر مرکوز ہو گئی تھی، ان کے اس طرزِ فکر اور طرزِ عمل کو سامنے رکھتے ہوئے ہمیں ان کے لئے "بے توفیق" سے زیادہ بلیغ لفظ (جس کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں کرنا مشکل ہے) نہیں ملتا۔

فسادزدہ علاقہ کا معائنہ اور جمشید پور اور راؤڑکیلا کا سفر

غالباً اپریل کے اواخر یا مئی کے اوائل میں مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے، مولوی معین اللہ صاحب ندوی کی معیت میں جمشید پور اور راؤڑکیلا کا سفر کیا، انھوں نے واپس آکر، کچھ ایسا تاثر ظاہر کیا کہ ان مقامات میں خود جائے بغیر واقعہ کی سنگینی کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا، انھوں نے مجھے بھی آمادہ کیا کہ میں بھی وہاں کا ایک سفر کروں کہ ع

شنیدہ کے بود مانند دیدہ

میں مئی کے کسی آخری تاریخ کو مولوی ابو العرفان صاحب ندوی کی معیت میں سیوان کو روانہ ہوا، جہاں ایک تبلیغی اجتماع میں شرکت کرکے سون پور میں اسٹیمر پر سوار ہو کر پٹنہ اترے اور وہاں سے جمشید پور، راؤڑکیلا کے لئے روانہ ہوئے وہاں اپنی آنکھوں سے دیواروں پر خون کے چھاپے اور میدان میں انسانی سروں کو کھیتوں میں خربوزے اور تربوز کی طرح پڑا ہوا دیکھا، سفّاکی اور خون آشامی کی

داستانیں سنیں، چند ایسے لوگوں سے بھی ملاقات ہوئی جنھوں نے اس میں عملی حصہ لیا، اور ان لوگوں سے بھی ملاقات ہوئی جنھوں نے بلاتفریق مذہب و ملّت جانوں اور عزّتوں کو بچانے کا بے لوث اور خطرناک کام کیا، ان میں شری نابا کرشنا چودھری سابق وزیر اعلیٰ اڑیسہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جن سے راوڑکیلا میں ملاقات ہوئی ہم آگم بابو سے بھی ملے، جنھوں نے انسانی ہمدردی اور شرافت و جرأت کا ثبوت دیا تھا، ان دونوں کو دیکھ کر یہ آس بندھی کہ ابھی دنیا میں اور ہر فرقہ میں ایسے شریف و جری اور صاحب ضمیر اور صاحب دل انسان موجود ہیں، جو اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر دوسروں کی جان بچاتے ہیں، اور جن کو بڑی سے بڑی آزمائش کے موقعہ پر بھی سچی بات کہنے میں، اور ایسی شہادت دینے میں باک نہیں ہوتا، جو خود ان کے فرقہ کے خلاف پڑتی ہے[1]۔ ایسے ہی اکثریتی فرقہ کے ایک دو افراد سے اور ملاقات ہوئی، اور ہم نے ان کے اس شریفانہ اور بہادرانہ کام کی پوری داد دی، اور ان کو خراج تحسین پیش کیا، جون کے پہلے ہفتہ کی آخری تاریخوں میں ہماری واپسی ہوئی۔

مسلم مجلس مشاورت کی دعوت اور اس کا قیام

اس کوشش کا انجام دیکھنے کے بعد ہم لوگوں کے سامنے ایک ہی راستہ تھا، وہ یہ کہ ایک طرف مسلمانوں میں حالات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت و عزم اور خدا اعتمادی اور خود اعتمادی کی شان پیدا کی جائے اور قیادت کے اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش کی جائے جس کو

[1] ملاحظہ ہو شری نابا چودھری کی کتاب "میں خاموش نہیں رہ سکتا" (انگریزی)

ان ناشدنی حالات کے پیدا کرنے میں بہت بڑا دخل ہے، دوسری طرف ملک میں ایسی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی جائے جس سے یہ اعصابی تناؤ کم ہو، ملک کے شہری، انسانوں اور ہم وطنوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گزارنے پر آمادہ ہوں، اور انسانیت کا احترام پیدا ہو، اور دلوں سے منافرت کا وہ زہر امکانی حد تک دور ہو جو فرقہ وارانہ سیاست، اشتعال انگیز تقریروں، اور غیر ذمّہ دار پریس نے پیدا کر دیا ہے۔

ڈاکٹر سیّد محمود صاحب اس صورتِ حال سے سب سے زیادہ فکرمند اور مغموم رہتے تھے، ان کا خیال تھا کہ سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کے ذہن ضرور بڑی حد تک مسموم ہو گئے ہیں، لیکن ہندوستان کے عوام ابھی سیاسی زہر سے محفوظ ہیں، ان کا ضمیر ابھی مردہ نہیں ہوا ہے، ان تک پہنچنے اور ان کے دلوں کے دروازوں پر دستک دینے کی ضرورت ہے، ان کا خیال تھا (اور صحیح تھا) کہ اس ملک میں اخلاقی قیادت کا ایک خلا ہے جو صرف مسلمان ہی (قرآنی تعلیمات اور اسوۂ رسولؐ کی مدد سے) پُر کر سکتے ہیں، ان کو اس قیادت کی ذمّہ داری قبول کرنی چاہیئے، اس سلسلہ میں مجھ سے اور مولانا محمد منظور صاحب سے لکھنؤ میں اور مفتی عتیق الرّحمٰن صاحب، مولانا ابواللیث صاحب ندوی امیر جماعت اسلامی اور مولوی محمد مسلم صاحب مدیر "دعوت" سے (جنھوں نے اس سلسلہ میں اہم کردار ادا کیا) دہلی میں ان کا مستقل رابطہ قائم تھا، ان مشوروں کا نتیجہ یہ نکلا کہ جلد سے جلد ایک مسلم مشاورتی اجتماع بلایا جائے جس میں راہِ عمل متعیّن کی جائے اور کام شروع کر دیا جائے، بعض مصالح کی بناء پر مناسب معلوم ہوا کہ یہ اجتماع بجائے دہلی کے لکھنؤ میں رکھا جائے، میں نے اور مولانا محمد منظور صاحب نے

اس کی ذمّہ داری قبول کی، ۸ - ۹ راگست ۱۹۶۴ء کی تاریخیں اس کے لئے مقرر کی گئیں اور مسلم جماعت کے قائدین اور ملّت کے ممتاز دانش وروں اور دردمندوں کے نام دعوت نامے جاری کر دیئے گئے۔

بمبئی میں آنکھ کا آپریشن اور لکھنؤ میں مجلس مشاورت کا جلسہ

اسی عرصہ میں وسطِ جولائی میں مجھے اپنی آنکھ کے آپریشن کے لئے بمبئی جانا پڑا، میجر ایرانی نے آنکھ کا آپریشن کیا، بمبئی کے اس قیام میں عزیز گرامی مولوی مرتضیٰ صاحب کی رفاقت رہی، بمبئی کے مخلص احباب میں سے حاجی احمد غریب صاحب مرحوم، محمد بھائی (بمبئی آندھرا ٹرانسپورٹ کمپنی کے مالک) صوفی عبدالرحمٰن صاحب (عمر بھائی چاند بھائی) اور محمد اسمٰعیل منصوری صاحب نے بڑے مخلصانہ تعلّق کا ثبوت دیا، آپریشن سے فراغت کے بعد محمد بھائی کے مکان دھوبی تلاؤ میں قیام رہا، اس کے بعد سے انہیں کے دولت خانہ واقع مدن پورہ میں قیام کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اس دوران میں تفصیلات سے بے خبر، اور عملی کاموں سے بے تعلق رہا اگست کے پہلے ہفتہ میں میری واپسی ہوئی، سرجن نے مکمل احتیاط اور آرام کی ہدایت کی تھی، اور چھ ہفتے تک مطلق تقریر اور زور سے بات کرنے سے بھی منع کیا تھا، میں اپنے وطن رائے بریلی میں تھا کہ اچانک مولانا محمد منظور صاحب کا پیغام پہنچا کہ ۸ راگست کو ہونے والے کل ہند مسلم مشاورتی اجتماع کے خیر مقدم کے لئے مجھ کو کچھ لکھوا دینا چاہیئے، اس فرمائش میں مُلّا جان صاحب کا ایماء شامل تھا، جن سے میری ابھی ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی، اصطلاحی خطبۂ استقبالیہ سے

جو اپنے ساتھ خاص آداب وروایات رکھتا ہے، قصداً احتراز کرتا تھا، لیکن میرا فریضہ تھا کہ میں اجمالی طور پر اس اجتماع کے محرّکات دواعی کا تذکرہ کروں، اور اس کے لئے سنجیدگی، احساس ذمّہ داری، اور مسلمانوں کے مسائل کو دینی ذہن اور اخلاص وبے غرضی کے اس جذبہ کے ساتھ سمجھنے اور ان کا حل تلاش کرنے کی فضا پیدا کی جائے، جو عام طور پر ایسے اجتماعات میں پیدا نہیں ہوتی جہاں سیاسی نوعیت کے مسائل زیرِ بحث ہوتے ہیں، اور جماعتوں کے مفادات ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں، یہ کام یوں بھی دشوار تھا، لیکن میری صحت کی اس وقت کی کیفیت کی بنا پر نہ صرف دشوار تر بلکہ خطرناک تھا، لیکن جس فضا میں یہ اجتماع ہونے جارہا تھا اس نے کسی اور چیز کو سوچنے اور اہمیت دینے کا موقعہ ہی نہیں دیا، میں نے ایک مضمون لکھوا دیا، مضمون کے دوران آنکھ میں تکلیف بھی ہوئی، اور مجھے کچھ دیر کیلئے آرام کرنا پڑا، مگر الحمد للہ وہ مکمّل ہوگیا، اس اجتماع کے پہلے اجلاس میں عزیز گرامی مولوی ابو العرفان صاحب ندوی نے اس کو پڑھ کر سنایا، اور وہ اپنے مقصد میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوا۔[1]

تقدیری بات کہ آپریشن سے وہ نتائج برآمد نہیں ہوئے جن کی توقع تھی، کچھ تو (میونخ کے جرمن سرجن کے بقول) آپریشن میں کچھ خامیاں رہ گئی تھیں، کچھ اپنی طرف سے بھی ضروری احتیاط میں کمی رہی، ادھر مجلس مشاورت کی شرکت کے درمیان کئی ایسے بحرانی لمحات (CRISIS) آئے کہ معلوم ہوا کہ یہ شیرازہ منتشر ہوتا اور یہ مجلس ناکامی

---

[1] ماخوذ از "پرانے چراغ حصّہ اوّل" ص ۳۹۴ تا ص ۳۹۵ اجتماع کی بقیہ تفصیلات، اور پیدا ہونے والے حالات کے لئے "پرانے چراغ حصّہ اوّل" کا مضمون "ڈاکٹر سیّد محمود صاحب" ملاحظہ ہو۔

پر ختم ہوتی ہے، جس سے پورے ملک میں مایوسی اور بدنامی پیدا ہوگی، ایسے موقعوں پر محبیّ ڈاکٹر فریدی صاحب کی آگاہی کے باوجود، میں اپنے کو جوش وتاثر اور آنکھ کو خطرہ میں ڈالنے سے روک نہیں سکا، نتیجہ یہ ہوا کہ جلسہ تو کامیابی پر ختم ہوا، لیکن آنکھ کی کیفیت پر اثر پڑ گیا۔

مجلس کے وفد کے دورے

ادھر مجلس کے ذمہ داروں نے یہ دانشمندانہ فیصلہ کیا کہ مجلس کو سب سے پہلے یہ کام کرنا چاہیئے کہ اس کا ایک مؤقّر اور نمائندہ وفد فساد زدہ علاقوں کا دورہ کرے، اس وفد میں میری شرکت بھی ضروری سمجھی گئی، میں اپنی اس مجروح ومریض آنکھ کے ساتھ اس وفد میں شریک ہو گیا، وفد کا دورہ ستمبر ۶۴ء کے دوسرے ہفتہ سے شروع ہوا، اس دورہ کی منزلوں میں رانچی، چکردھرپور، چائی باسا (ضلع سنگ بھوم) جمشید پور اور راوڑکیلا تھے، جمشید پور وہ مقام تھا جس کی زمین سے شاید چند دن پہلے ہی مسلمانوں کے جسم کے بہے ہوئے خون کے نشانات مٹے ہوں، رات کو ایک کھلے میدان میں جلسۂ عام ہوا، ٹاٹا کمپنی کے جنرل منیجر نے (جو ایک پنجابی ہندو تھے) جلسہ کی صدارت کی، میدان آدمیوں سے بھرا ہوا تھا، جہاں کثیر تعداد میں ہندو اور عیسائی بھی تھے۔

میں نے اپنی تقریر میں جمشید پور کی صنعتی مرکزیت کو (جس میں لوہا خاص کردار ادا کرتا ہے) موضوع بنا کر انسانوں کی پستی اور انسانیت کی ناکامی کا ذکر کیا، اور کہا کہ اگر اس آہن خام کی زبان ہوتی تو وہ بآواز بلند کہتا کہ "ہم کو ہمارے خالق نے اس لئے نہیں پیدا کیا تھا اور ہم پر ان کارخانوں میں اس لئے محنتیں صرف نہیں ہوئیں

کہ ہم سے انسان کا جو اشرف المخلوقات ہے، گلا کاٹا جائے، اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں، ان پڑھے لکھے انسانوں کا قصور ہے، جو ہم سے حفاظت کے بجائے ہلاکت کا، تعمیر کے بجائے تخریب کا، اور تہذیب کے بجائے تعذیب کا کام لیتے ہیں"۔
صدر جلسہ جو اُردو اچھی طرح سمجھتے تھے، اور ان کو درمیان میں اُٹھ کر جانے کی ضرورت تھی، راستہ بدل کر میرے پاس آئے اور میرے کان میں کہا، کہ آپ کی تقریر بہت برموقعہ تھی، اور مجھے بہت پسند آئی، اسی طرح کی تقریروں کی ضرورت ہے۔

جمشید پور سے وفد راوڑکیلا گیا، میرے یوروپ کے دوسرے سفر کی تاریخیں قریب تھیں، اس لئے میں جمشید پور سے واپس ہوگیا، لکھنؤ آکر عزیزی محمد رابع ندوی کو ساتھ لے کر میں براہ لاہور، کراچی P.I.A سے جنیوا کے لئے روانہ ہوگیا، جہاں مرکز اسلامی کے جلسہ میں شرکت کرنی تھی[1] میونخ میں ڈاکٹر سعید رمضان نے وہاں کے سب سے بڑے آئی سرجن اور پروفیسر سے آنکھ کے معائنہ کے لئے وقت لے رکھا تھا، اس نے معائنہ کرنے کے بعد بتایا کہ آپریشن ضروری احتیاط کے ساتھ نہیں کیا گیا، اور قریبی زمانہ میں بصارت کے چلے جانے کا خطرہ ہے، اس نے دوبارہ فوری آپریشن کا مشورہ دیا، جس کے لئے میں اپنے کو (بعض وجوہ کی بنا پر) تیار نہیں کرسکا، اور اگلے ہی دن استنبول اور دمشق ہوتا ہوا ہندوستان واپس ہوگیا۔

دسمبر ۱۹۶۴ء میں مجلس کے وفد نے گجرات کا دورہ کیا، اس وفد میں بھی

---

[1] اس سفر کا تذکرہ "یوروپ کے سفر" کے عنوان میں آچکا ہے۔

میں شریک تھا، میں نے محمد میاں مرحوم کو بھی اپنے ساتھ لے لیا تھا، اور عزیزی عبدالرزّاق نواب سفر حضر میں ساتھ ہی رہتے تھے، اس دورے میں پنڈت سندر لال بھی شریک تھے، اور تقریباً تمام اہم ارکان مجلس، وفد نے احمد آباد کے مضافات اور نواحی قصبات کا بھی دورہ کیا، ہر جگہ اس کا جوش وخروش سے استقبال ہوا، بڑے بڑے جلسے منعقد ہوئے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تحریک خلافت کا دَور واپس آگیا ہے، اہم مقامات میں سے نڈیاڈ، گودھرا، بڑودہ، بھڑوچ اور سورت تھے۔

ان دوروں میں سب سے طویل، وسیع، مؤثر اور کامیاب دورہ، ریاست میسور کا تھا، لیکن چونکہ وہ ۱۹۶۵ء کے بعد کا (۱۱-۲۲ نومبر ۱۹۶۶ء) کا قصّہ ہے اس لئے وہ اس وقت کے دائرۂ تحریر سے باہر کی بات ہے[1]

رابطہ کی مؤتمر میں شرکت

ذی الحجہ ۱۳۸۴ھ (اپریل ۱۹۶۵ء) میں رابطہ عالم اسلامی نے اپنی پچھلی قرارداد کے مطابق اپنی پہلی مؤتمر کا انعقاد کیا، جس کے لئے مختلف اسلامی ممالک کی اہم شخصیتوں کو مدعو کیا، اور اکثر اسلامی ممالک اور بعض غیر مسلم اکثریت کے ان ممالک نے جن میں مسلمان خاص پوزیشن رکھتے تھے، اپنے وفود بھیجے، میں نے اور مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے (جو کچھ ہی عرصہ پہلے رابطہ کے رکن منتخب ہوئے تھے) بحیثیت رکن کے شرکت کی،

ایک خبر صاعقہ اثر

مکہ معظمہ پہنچے ہوئے چند ہی دن گزرے تھے، اور ابھی

[1] اس دورہ پر راقم کا ایک پورا رسالہ "۱۲ دن ریاست میسور میں" کے نام سے شائع ہوچکا ہے۔

حج اور مؤتمر میں کئی دن باقی تھے، کہ ایک دن اچانک حرم شریف میں کسی دوست نے بتایا کہ پاکستان سے خبر آئی ہے کہ مولانا محمد یوسف صاحب کا لاہور میں انتقال ہوگیا[1]، یہ خبر بجلی بن کر دل و دماغ پر گری، لیکن دل کو یہ کہہ کر تسکین دی کہ دور کی بات ہے، حج کا ہجوم اور افواہوں اور بلاتحقیق خبروں کی کثرت ہے، اطلاع کا ذریعہ اور اس کا سرچشمہ معلوم کیا، تو معلوم ہوا کہ کراچی سے کوئی صاحب ابھی آئے ہیں اور انھوں نے بتایا ہے، پھر معلوم ہوا کہ ہمارے دوست ڈاکٹر اسمٰعیل میمنی ابھی کراچی سے آئے ہیں، ان کی تلاش ہوئی، ملاقات پر انھوں نے بتایا کہ کراچی سے روانگی سے کچھ پیشتر ان کو اس کی اطلاع ملی، اور روانگی سے پہلے اس کی تصدیق بھی ہوگئی، اب شک کرنے کی کوئی گنجائش نہ تھی، بعد میں دوسرے ذرائع اور مدرسہ صولتیہ سے اس کی مزید تصدیق ہوئی، ہم سب لوگ دل پکڑ کر رہ گئے، اللہ تعالیٰ کی شان بے نیازی پر یقین و ایمان اور بڑھ گیا، مولانا کی ایمانی اور دعوتی قوتیں اور ترقیاں اپنے نقطۂ عروج پر تھیں دعوت کی کمان پورے طور پر چڑھی ہوئی تھی، اور مساعئ جمیلہ و جلیلہ کا درخت پورے طور پر برگ و بار لا رہا تھا، اور انھوں نے دنیا کو ہلا رکھا تھا کہ اس غنی عن الخلق اور قادر مطلق کی بارگاہ سے طلبی ہوگئی، اِنّ لِلّٰہ ما اخذ وللّٰہ ما اعطیٰ وکلّ شئ عندہ باجل مسمّی۔

اہل تعلق ایک دوسرے سے تعزیت کرتے تھے، اور اپنے تاثر و تاسّف کا اظہار، رابطہ عالم اسلامی کے مرکز میں خبر پہنچی تو شیخ عبدالعزیز بن باز (نائب صدر رابطہ اور نائب رئیس جامعہ اسلامیہ) اور شیخ محمد سرور الصبّان (امین عام رابطہ) نے

---

[1] مولانا کا انتقال ۲۹ ذی قعدہ ۱۳۸۴ھ ۱۲، اپریل ۱۹۶۵ء کو ہوا۔

خصوصی اور قریبی تعلّق کی بنا پر اس عاجز سے تعزیت کی۔

یہاں وہ چند سطریں نقل کی جاتی ہیں جو مولاناؒ کی سوانح (مرتبہ عزیزی محمد ثانی مرحوم) پر راقم کے مقدمہ سے ماخوذ ہیں:

"عالمِ اسلام سے وسیع واقفیت کی بنا پر یہ کہنے کی جراُت کی جاتی ہے کہ ایمان بالغیب کی دعوت، دعوت کے شغف و انہماک اور تاثیر کی وسعت و قوّت میں اس ناکارہ نے اس دور میں مولانا محمد یوسف صاحب کا کوئی ہمسر اور مقابل نہیں دیکھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان کی اس دعوت ایمانی نے وہ نتائج پیدا کئے جن سے ہماری "متوازن و معتدل" دعوتیں (جن کی عصر حاضر کے حقائق پر نظر ہے) قاصر رہیں، اور صاف اندازہ ہوا کہ ع

لاکھ حکیم سر بجیب، ایک کلیم سر بکف"

مؤتمر کے جلسے

حسن اتفاق سے اسی سال شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ حج پر آئے تھے، رابطہ نے ان کو بھی شرکت کی دعوت دی اور وہ شریک ہوئے[1]، ہندوستانی وفد میں مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی (جو رابطہ

---

[1] یہاں اس واقعہ کا ذکر کرنا خالی از دلچسپی اور بے محل نہ ہوگا کہ شیخ صاحب اپنی ہندوستان واپسی کے بارے میں بہت متردد تھے، ان کو یقین تھا کہ اگر وہ ہندوستان واپس گئے تو فوراً گرفتار کر لئے جائیں گے، اور یہ بات بعید از قیاس نہ تھی، ان کا رجحان تھا کہ وہ یورپ میں کہیں رہ کر اپنے مقدمہ (کشمیر) کی وکالت و وضاحت کریں، میں نے کہا کہ شیخ صاحب یہ بہت بڑی غلطی ہوگی، تجربہ یہ ہے کہ جس نے ملک چھوڑا، وہ ہمیشہ کے لئے گیا۔ آپ گرفتار تو ہو جائیں گے لیکن رہیں گے نہیں، انھوں نے کہا کہ آپ استخارہ کر دیجئے، میں نے استخارہ کیا اور پھر اسی پر اصرار کیا، وہ ہندوستان واپس آگئے، اور پہنچتے ہی ان کی گرفتاری عمل میں آئی، لیکن بالآخر حکومتِ ہند کو، ان کو چھوڑنا پڑا، اور ان کی اہمیت و عظمت میں بہت بڑا اضافہ ہوا، اور بالآخر وہ باتفاق ریاست کے وزیر اعلےٰ منتخب ہوئے۔

کی طرف سے مدعو تھے) الحاج محمد یونس سلیم صاحب اور انوار الدین صاحب بیرسٹر و میئر دہلی کارپوریشن اور مولوی سید عبد العلی صاحب برکتی پروفیسر مدرسہ عالیہ کلکتہ شریک تھے۔

میں نے اسی مؤتمر میں نائیجیریا کے وزیر اعظم، وہاں کے صاحب ایمان مسلم قائد اور دینی داعی احمدو بلّو کو قریب سے دیکھا، اور ان کی انگریزی میں ایمان افروز تقریر سنی، جس میں انھوں نے قومیت عربیہ پر کھلی ہوئی تنقید کی، ملک فیصل مرحوم نے پہلے جلسہ کا افتتاح کیا، اور صدارت فرمائی، بعد کے جلسوں کی صدارت وقیادت امیر فہد نے انجام دی، میں نے اس مؤتمر کے لئے مضمون تیّار کیا تھا جس کا عنوان اور روح تھی "اسلامی زندگی کا صحیح نمونہ پیش کرنا بلد امین کی ذمّہ داری ہے، اور اس کو ہر زمانہ میں اپنی خصوصیات برقرار رکھنا چاہیئے" یہ مضمون میں نے عجلت میں بحرین کے ہوائی اڈّہ پر لکھوایا، جہاں پورا دن جہاز کے انتظار میں گزارنا تھا، میں ضعف بصارت کی وجہ سے مضمون خود نہیں پڑھ سکتا تھا، میری درخواست پر استاد عمر الداعوق بانئ جماعت عباد الرحمٰن (لبنان) نے پڑھ کر سنایا۔

اس سفر میں میرے رفیق و معاون کی حیثیت سے مولوی معین اللہ صاحب ندوی ہمراہ تھے، سفر کراچی اور بحرین کے راستہ سے ہوا، حج و مؤتمر سے فارغ ہو کر مدینہ طیبہ حاضری اور جامعہ کی مجلس استشاری میں شرکت ہوئی۔

ڈاکٹر محمد عبد الجلیل فریدی

مجلس مشاورت کے قیام کے بعد جب مسلمانوں میں سیاسی بیداری خود اعتمادی خود شناسی اور ملک کے مشترک مفاد کے لئے جد و جہد کا ایک نیا دور شروع ہوا، تو ڈاکٹر محمد عبد الجلیل فریدی صاحب

سے جو ہمارے شہر کی ایک جانی بوجھی شخصیت، ایک نامور و کامیاب ڈاکٹر اور ایک جری، بے غرض قومی کارکن تھے، میرا ذاتی ربط بڑھا، اس ربط میں ان کی شرافت نفس، دین کے احترام اور میرے ساتھ حسن ظن کو زیادہ دخل تھا، وہ جتنے قریب آتے گئے، اور ان سے زیادہ ملنا ہوا، ان کی خوبیاں اور ذہنی، عملی صلاحیتیں روشن ہو کر سامنے آئیں اور معلوم ہوا کہ وہ لکھنؤ ہی نہیں صوبہ کی سطح پر بھی ایک مقبول اور کامیاب طبیب ہیں، جن کو امراض صدر کے علاج میں مہارت خصوصی حاصل ہے، لیکن وہ خود ملّت کے درد اور اس کے لئے حد سے زیادہ فکرمندی کے مریض ہیں، "پرانے چراغ" میں میں نے ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "میرے محدود علم میں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم کے بعد کسی مسلمان لیڈر نے اپنے پیشہ کی اتنی بڑی قربانی ملّت اور ملک کے مسائل کے لئے نہیں دی، اور نہ اس طرح بے دریغ اپنا وقت اور پیسہ اس راہ میں صرف کیا۔ جس طرح ڈاکٹر صاحب نے کیا۔" میں نے ان کے متعلق یہ بھی لکھا کہ "وہ سو بار غلطی کر سکتے تھے، لیکن ایک بار بک نہیں سکتے تھے۔" وہ بار بار فرماتے تھے کہ وہ میرے کہنے پر ملّی خدمت کے اس میدان میں آئے ہیں، اور اس میں شبہ نہیں کہ میں نے یہ سمجھ کر ہمیشہ ان کی ہمّت افزائی اور تقویت کی کوشش کی کہ ان کی سی جرأت و بے غرضی کا کوئی دوسرا رہنما ان کی سطح اور معیار کے لوگوں میں پایا نہیں جاتا، آخر میں ان کو اپنی تنہائی اور ساتھ دینے والوں کی کمی کا شدّت سے احساس تھا، انھوں نے کئی بار مجھ سے کہا کہ اب اجازت دیجئے کہ میں بھی سیاست کا میدان چھوڑ کر، اپنے مطب اور پیشہ میں مصروف ہو جاؤں، میں جانتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب خود اس پر عمل کرنے پر قادر نہیں ہیں۔

کہ ان کا اور ملّی سیاست کا قصّہ پیرک اور ریچھ کا روایتی قصّہ تھا، پھران کا قائم مقام بھی کوئی نہیں تھا، اس لئے میں بھی تسلّی اور ہمّت افزائی کے کلمات کہہ کر خاموش ہوجاتا اور وہ بھی اس میدان میں ہاتھ پاؤں مارتے رہتے، کوئی اہم مسئلہ پیش آتا تو وہ فوراً میری قیام گاہ دائرہ شاہ علم اللہؒ رائے بریلی آجاتے، اس وقت سڑک بھی نہیں بنی تھی، اس لئے خام راستہ پر موٹر سے آنے میں ان کو سخت پریشانی ہوتی، اگرچہ یہ خام راستہ اس نشیب و فراز اور دشوار گذار راستہ سے غنیمت تھا جس پر وہ میدان سیاست میں گامزن تھے، ۱۹۶۹ء لندن کے سفر میں بھی انھوں نے آنکھ کے سلسلہ میں ڈاکٹری مشورہ حاصل کرنے میں میری بڑی مدد و رفاقت فرمائی، بالآخر ۱۴ر مئی ۱۹۷۰ء کو انھوں نے داعی اجل کو لبّیک کہا، اور مجھے مدینہ طیبہ میں (جہاں اس زمانہ میں قیام تھا) اس کی اطلاع ہوئی، ع

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

آنکھ کی تکالیف اور بار بار اسپتال کا داخلہ

میں دینی تعلیمی کونسل کی طرف سے مغربی یوپی کے ایک دورہ میں تھا، گرمی سخت تھی اور لو چل رہی تھی، بسوں کے ذریعہ سفر تھا، اور بعض جگہ کئی کئی گھنٹے دوپہر کی گرمی میں ٹھہرنا اور انتظار کرنا پڑا، ۲۲ر جون ۱۹۶۵ء کو میرٹھ کا پروگرام تھا، شب میں ایک جلسۂ عام میں تقریر کی، فراغت پر اپنی قیام گاہ پر آکر سو گیا، فجر سے پہلے آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ بائیں آنکھ کی (جس میں آپریشن ہوا تھا) نظر بالکل جاتی رہی ہے، طبیعت پر اس کا سخت اثر پڑا، مجھے میرٹھ سے دیوبند دارالعلوم کے جلسۂ شوریٰ میں شرکت کے لئے جانا تھا، میں ایک دن

شریک ہوکر حضرت مہتمم صاحب سے اجازت لے کر سہارن پور آگیا، حضرت شیخ نے فوراً لکھنؤ جانے کی ہدایت کی، لکھنؤ آکر ۲۶ جون ۱۹۶۵ء کو سیتا پور کے مشہور آنکھ کے اسپتال میں داخل ہوا، معلوم ہوا کہ ہیمرج (HAEMORRHAGE) ہوا ہے ڈاکٹروں نے جو بڑی توجہ سے علاج کر رہے تھے اور جن میں ڈاکٹر پاوا خاص طور پر قابل ذکر ہیں، انجکشنوں کے ذریعہ جلد کنٹرول کرلیا، اور ۱۴ اگست ۱۹۶۵ء کو چھٹی دے دی، میں اپنے مستقر پر واپس آکر اپنی عادت کے مطابق علمی کام اور لکھانے میں مشغول ہوگیا، اسی زمانہ میں مجلس مشاورت کے ایک خصوصی اجلاس کے لئے جو ڈاکٹر فریدی صاحب کے مکان پر ہو رہا تھا اور جس میں ڈاکٹر سیّد محمود صاحب اور قائدین مجلس شرکت کر رہے تھے، مجھے ایک اہم مضمون تیار کرنا تھا، مجھے شدید نزلہ تھا، ایسی دوائیں استعمال کر کے جس سے فوری طور پر نزلہ کا زور کم ہو جائے، اور میں اپنا کام کرسکوں، میں نے مضمون لکھوادیا، شاید اس کا ردعمل تھا کہ اس کے دو ہی چار دن بعد ۱۶ دسمبر ۱۹۶۵ء کو اسی آنکھ پر GLAUCOMA (سنبل بائی) کا سخت حملہ ہوا، اگلے ہی روز، ۷ دسمبر ۱۹۶۵ء کو سیتا پور اسپتال میں دوبارہ داخلہ ہوا جہاں پانچ آپریشن ہوئے، مگر خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا، یہ میری زندگی کے سب سے زیادہ آزمائشی اور ایک طرح سے موت وحیات کی کشمکش کے دن تھے، کئی بار شدتِ تکلیف سے دعا کی کہ اگر اسی حالت کا باقی رہنا مقدّر ہے تو ایمان کے ساتھ دنیا سے اٹھا لیجئے، ایسا نظر آتا تھا کہ اب نابینا اور دوسروں کا محتاج ہو کر زندگی کے باقی دن پورے کرنے ہیں، تکلیف ودرد (جس کا دورہ پڑتا رہتا تھا) مستزاد، میری اس تکلیف اور بیماری کی خبریں سن سن کر میری ضعیف والدہ کا

(جن کی عمر اب نوّے سے متجاوز تھی، اور جن کی ماں کی فطری محبت سے کچھ بڑھی ہوئی محبّت وشفقت تھی) جو کچھ حال ہوتا ہوگا، اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں، گھر کے افراد، عزیز اور دوست بکثرت سیتاپور آتے تھے، اور میرا حال دیکھ کر مغموم ومتاثر ہوتے تھے، لیکن کوئی مدد نہیں کرسکتا تھا، اس حالت میں والدہ صاحبہ بہنوں اور عزیزوں اور گھر کے افراد کے علاوہ جو دن رات دعائیں کررہے تھے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب اور حضرت مولانا وصی اللہ صاحب فتحپوری بھی بہت بے قرار تھے، اور دعاؤں میں مصروف۔

سیتاپور کے دونوں مرتبہ قیام کی پوری مدّت میں جو بعض اوقات ڈھائی تین مہینے کے قریب بھی ہوئی، میرے اور میرے ساتھ ٹھہرنے والوں، اور عیادت کے لئے باہر سے آنے والوں کے کھانے کا انتظام کلّیۃً بھائی ظفر احمد صاحب صدّیقی وکیل سیتاپور نے کیا، اور اس کا انحصار اپنے کھیت کے غلّہ اور اپنی جائداد کی آمدنی پر رکھا، میں کبھی ان سے درخواست کرتا کہ یہ سلسلہ بہت وسیع اور طویل ہے، اب ہم کو خود اپنا انتظام کرنے کی اجازت دیجئے، تو آبدیدہ ہوجاتے، اور کہتے بس یہ بات نہ کہیئے اور جو کچھ آپ حکم دیں، اس کی تعمیل ہوگی، ان کے ماسوا محترمی حاجی محمد حسین صاحب لسوانی، ان کے فرزند عزیزی تفضّل حسین (جن کے یہاں سے دوائیں آتی تھیں) محترمی مجتبیٰ حسین صاحب ایڈیٹر بی، شیخ بنیاد حسین صاحب ایڈوکیٹ، اور سیتاپور کے دوسرے دوستوں نے دل جوئی، راحت رسانی اور ہمدردی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، دن رات کے رفیقوں اور مدد کرنے والوں میں عزیزان محمد سعید بنوافریقی، علی آدم ندوی افریقی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جزاھم اللہ جمیعاً خیر الجزاء

بالآخر کوئی مفید نتیجہ نہ دیکھ کر، اور مولانا وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فتحپوری کی ہدایت و مشورہ[1] پر تقریباً ڈھائی مہینے اسپتال میں رہ کر، ۲۰ر فروری ۱۹۶۶ء کو لکھنؤ واپسی ہوئی اور ہومیوپیتھک علاج کیا، جس سے بحمد اللہ تکلیف جاتی رہی۔

سیتاپور اسپتال سے نکلنے کے بعد میں مستقل اپنے کو ایک ایسا زندانی سمجھنے لگا جو پیرول (PAROLE) پر رہا ہوا ہے، اس لئے اس کو اپنی اس عارضی آزادی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا کر ضروری کاموں کی تکمیل کر لینی چاہیئے، اس خیال نے مجھے بہت فائدہ پہنچایا، اور میں نے اسپتال سے باہر آکر کئی ضروری کاموں کی تکمیل کی، ان میں سے اپنی ایک اہم تصنیف "الارکان الاربعہ" کی تالیف ہے، جس کا تقاضا اسپتال کے زمانۂ قیام میں شدّت سے پیدا ہوا تھا، دوسرے والد صاحب کی اہم تصنیف "جنۃ المشرق" کی ترتیب و تکمیل، جو بعد میں دائرۃ المعارف کی طرف سے "الھند فی العھد الاسلامی" کے نام سے شائع ہوئی، نیز "نزھۃ الخواطر" کے جلد ثامن کے تراجم کی تکمیل، اور ان بیاضوں کی خانہ پُری جو مسوّدہ میں رہ گئے تھے[2]۔

میری آنکھ کی یہ معذوری یکم جولائی ۱۹۷۸ء کے اس وقت تک قائم رہی

---

[1] تفصیلات ملاحظہ ہو "پرانے چراغ حصۂ اوّل" مضمون "مولانا وصی اللہ صاحب فتحپوری" ص ۱۷۳-۱۷۴

[2] بڑی ناسپاسی ہوگی اگر اس موقعہ پر فاضل گرامی ڈاکٹر محمد عبد المعید خاں مرحوم ناظم و سکریٹری دائرۃ المعارف العثمانیہ کا ذکر خیر نہ کیا جائے، انہیں کے علمی ذوق اور قدردانی کی بنا پر الھند فی العھد الاسلامی کی دائرہ کی طرف سے طباعت کا انتظام ہوا، اور انہیں کے تقاضے اور اصرار سے میں نے ضعف بصارت اور شدتِ مصروفیت کے باوجود نزھۃ الخواطر جلد ثامن کے تراجم کی تکمیل، اور باقی ماندہ سنین وفات کا اضافہ کیا، ڈاکٹر صاحب اپنے عہد کے ان فضلاء میں تھے جنھوں نے بیرونی جامعات سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، اپنے علم و قابلیت اور اس کے ساتھ انسانی فضائل اور شرافت نفس میں خاص مقام رکھتے تھے۔ ۲۶ر ستمبر ۱۹۷۳ء کو وہ راہئ ملک بقا ہوئے، غفرلہ۔

جب فلاڈلفیا امریکہ میں دائیں آنکھ کا بفضلہ تعالیٰ کامیاب آپریشن ہوا، اور میں براہِ راست پڑھنے لکھنے کے قابل ہو گیا[1] اور گویا دوبارہ زندگی ملی، زندگی کا لطف اور آزادی سے چلنے پھرنے اور پڑھنے لکھنے کا مزا آیا[2] معذوری کے اس زمانہ میں درجنوں اندرونی و بیرونی سفر ہوئے، جن میں سخت دقّت پیش آتی تھی، اور بعض اوقات شرمندگی اٹھانی پڑتی تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے حفاظت فرمائی اور بالآخر نیم نابینائی اور معذوری کا یہ دور ختم ہوا۔

رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ

وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَأَدْخِلْنِي بِرَحْمَتِكَ فِي عِبَادِكَ الصَّالِحِينَ ۝

---

[1] تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو کتاب "دو مہینے امریکہ میں"۔ از مولوی محمد رابع ندوی صفحہ ۳۱-۳۱۴

[2] قدرتِ الٰہی کا عجیب کرشمہ ہے کہ چودہ[۱۴] برس کی اس آنکھ کی معذوری میں جب میرے لئے ایک خط بھی لکھنا اور چند صفحے پڑھنا بھی دشوار تھا، میری اہم متعدد تصنیفیں جن کے لئے بکثرت مراجع کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہوتی تھی، وجود میں آئیں۔